رنگارنگ کہانیوں سے آراستہ دلچسپ جریدہ
ماہنامہ
نئے افق
کراچی
دلچسپ کہانی نمبر
aanchalpk.com aanchalnovel.com
WWW.PAKSOCIETY.COM
سالِ نو مبارک
قیمت =/50 روپے

ابتدائیہ

دستک	مشتاق احمد قریشی	10
گفتگو	عمران احمد	12
اقراء	طاہر قریشی	19

متفرق کہانیاں

یارب	غلام میراں	21
نایافت	راحیلہ ناز	63
نوآموز	اسرار احمد	71
مارگزیدہ	اسعد علی	81
کھلاڑی اناڑی	محمد اعظم خاں	95
تریاق	محمد سلیم اختر	155
آتشِ انتقام	خلیل جبار	169

پبلشر مشتاق احمد قریشی پرنٹر جمیل حسن مطبوعہ ابن حسن پرنٹنگ پریس ہاکی اسٹیڈیم کراچی
دفتر کا پتا: 7 فرید چیمبرز عبداللہ ہارون روڈ صدر کراچی

ایک رات	شہناز بانو	173
مسٹر دلچسپ	انجم فاروق ساحلی	197
دوسری دنیا	حسیب جواد علی	209
پتایا میں تین دن	آلیشبہ مخدوم	219
عزت نفس	ریحانہ سعیدہ	245

سلسلے وار ناول

قلندر ذات	امجد جاوید	111
جگت سنگھ	شمیم نوید	255

مستقل سلسلے

روحانی علاج	حافظ شبیر احمد	249
ذوق آگہی	عفان احمد	251
خوشبو سخن	عمر اسرار	253

خط و کتابت کا پتہ: "آنچل" پوسٹ بکس نمبر 75 کراچی 74200 فون: 021-35620771/2
فیکس: 021-35620773 کے از مطبوعات نئے اُفق پبلی کیشنز۔ ای میل info@aanchal.com.pk

دستک

مشتاق احمد قریشی

حیراں ہوں دل کو روؤں کہ پیٹوں جگر کو میں

عالمی مارکیٹ میں تیل کے نرخ گرنے کے فوراً بعد ہی دنیا کے ترقی یافتہ اور ترقی پذیر بلکہ غیر ترقی یافتہ پسماندہ ممالک میں بھی پٹرولیم مصنوعات کے نرخ کم ہو گئے، تھے اگر کم نہیں ہوئے تھے تو صرف وطن عزیز اسلامی جمہوریہ پاکستان میں۔ شاید حکمرانوں کے نزدیک ہمارے عوام اس قابل نہیں کہ انہیں سستی اشیا فراہم کی جائیں۔ حکمرانوں سے ہماری مراد صرف برسر اقتدار پارٹی نہیں بلکہ مافیا سے ہے جسے اقتدار میں آنے کی ضرورت نہیں۔ یہ مافیا سرمایہ داروں، جاگیرداروں اور ان کے حاشیہ نشینوں پر مشتمل ہے جو عالمی استعمار کی مدد سے برسر اقتدار آنے والی ہر پارٹی کو اپنے زیر اثر لے آتی ہے۔ یہ مافیا بااثر وزیروں کو کمیشن اور کک بیک کے ذریعے خریدتی ہے انہیں اپنا ہم نوا بنا کر اپنے مطلب کے فیصلے، معاہدے کراتی ہے اور ایسی پالیسیاں تشکیل دلواتی ہے جس کا فائدہ افراد کو ہی ہوتا ہے۔ باقی قوم جائے باڑھ میں۔ آج پٹرول چوراسی روپے کچھ پیسے میں فروخت ہو رہا ہے۔ پیسوں کی بھی خوب رہی ایک پیسہ پانچ پیسے کا رواج تو مدتوں پہلے متروک ہو چکا ہے نئی نسل نے تو پانچ پیسے کا سکہ بھی نہیں دیکھا ہوگا۔ لیکن حکومت اپنوں کو نوازنے کے لیے پھر بھی اس نظام کو قائم رکھے ہوئے ہے یعنی اگر کوئی بائیکر ایک لیٹر پٹرول خریدے گا تو اسے پمپ مالکان کو پچاس یا ساٹھ پیسے زائد ادا کرنا ہوں گے۔ یعنی پیٹرول کے نرخ میں کمی کا فائدہ پمپ مالکان کو ہی ہو رہا ہے رہ گئی حکومت تو وہ پہلے ہی پٹرول پر لگے نجانے کتنے سرچارج کے نتیجے میں اپنا حصہ مدتوں سے وصول کر رہی ہے اور کرتی رہے گی۔ خیر بات کہیں اور نکل گئی۔ ہم بات کر رہے تھے پٹرولیم مصنوعات کے نرخوں میں کمی کی۔

دیر آید درست آید کے مصداق ہم تمام تر تحفظات کے باوجود محترم وزیر اعظم جناب میاں محمد

نواز شریف کے شکر گزار ہیں کہ انہوں نے عوام کا ''خیال'' کیا۔ سنا ہے جنوری میں وہ مزید ''خیال'' کرنے کے موڈ میں ہیں (اللہ ان کا موڈ اچھا رکھے) وہ پٹرول کے نرخوں میں کمی کے ساتھ ساتھ بجلی کے نرخوں میں بھی کمی کا سوچ رہے ہیں۔ یعنی قوم کے پو بھارے ہونے کو ہیں۔ دوسرے لفظوں میں چپڑی اور وہ بھی دو دو، اب اس کا کیا کریں کہ سندھ اور بلوچستان کے بڑے بڑے ٹرانسپورٹر حکومت کے فیصلے سے خوش نہیں ہیں۔ انہوں نے کرایوں میں کمی کرنے سے صاف انکار کر دیا ہے۔ اب حکومت کیا کرے؟ اگر ٹرانسپورٹرز بھی ''نابینا'' ہوتے تو ڈنڈے کے زور پر قانون سکھا دیا جاتا یا پھر ماڈل ٹاؤن والی فلم دہرا دی جاتی۔ بدقسمتی سے وہ ان کے اپنے ہیں۔ اس لیے انہیں سات خون معاف۔ دوسری طرف ہمارے دھرنے والے شادیانے بجا رہے ہیں کہ قیمتوں میں کمی کرانے کا تاج ان کے سر پر رکھا جائے کہ حکومت ان کے دباؤ میں آ کر یہ غلطیاں کر رہی ہے۔ لہٰذا عوام زیادہ سے زیادہ ان کے دھرنوں کو کامیاب کرائیں کسی کی نوکری جاتی ہے تو جائے مگر ان کا ساون نہ چلا جائے۔ اب عوام غصے میں ہیں۔

حیراں ہوں دل کو روؤں کہ پیٹوں جگر کو میں

اب جو بھی ہو انقلاب آئے یا آزادی ملے یا یہی جمہوریت کی کھٹارا گاڑی چلتی رہے۔ پسنا تو عوام نے ہی ہے کیونکہ انقلاب آزادی اور جمہوریت تینوں عوام کے ایندھن سے چلتے ہیں۔ دوسرے لفظوں میں گھاٹا عوام کا ہی ہوگا۔ جو بھی آئے گا چاہے وہ کفن چور ہو یا ڈنڈے والا وہ آئے گا تو عوام ہی کے ووٹوں سے۔ اس سسٹم کے تحت ان کے علاوہ کسی اور کی گنجائش ہی نہیں ہے۔ ہاں اگر عوام کو غلطی سے عقل آ جائے اور وہ اپنے دل و دماغ پر دستک دیں تو ایک راستہ ہی باقی رہ جاتا ہے۔ وہ ہے توبہ کا...... استغفار کا...... من الحیث القوم اگر ہم سب مل کر خالق کائنات کے حضور گڑگڑا کر اپنے گناہوں کی معافی طلب کریں تو قدرت راستہ فراہم کر سکتی ہے...... سب کچھ تبدیل ہو سکتا ہے۔ بس ہماری نیت نیک ہو جائے اور ہم اس کے ہو جائیں تو پھر وہ ہمارا ہو جائے گا اور ہمارا اشارہ اس کا اشارہ بن جائے گا...... ہماری زبان اس کی زبان بن جائے گی...... اور ہمارا قدم اس کا قدم بن جائے گا۔

گفتگو

عمران احمد

رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: ''مومنوں کی مثال آپس میں محبت، وابستگی اور ایک دوسرے پر رحم و شفقت کے معاملے میں ایسی ہے جیسے ایک جسم کی حالت ہوتی ہے کہ اس کے کسی عضو کو تکلیف ہو تو سارا جسم بخار اور بے خوابی میں مبتلا ہوتا ہے۔'' (بخاری و مسلم)

عزیزان محترم...... سلامت باشد۔

دنیا بھر کی مسیحی برادری کو سال نو مبارک ہو۔

دلچسپ نمبر حاضر ہے امید ہے کہ آپ کے مزاج اور معیار پر پورا اترے گا۔ ہم نے اپنے قارئین اور تمام لکھاریوں سے کئی ماہ پہلے درخواست کی تھی کہ وہ خصوصی نمبروں کے لیے اپنی تحریریں وقت سے پہلے ارسال کر دیں لیکن اس کے باوجود دلچسپ نمبر کے لیے خاصی تاخیر سے کہانیاں ملیں جس کی وجہ سے ہمیں بھی مشکلات کا سامنا کرنا پڑا۔ شاید آپ کو نہیں معلوم کہ پرچے کی تیاری کئی مراحل پر مشتمل ہوتی ہے۔ اگر پہلے مرحلے میں کوئی کوتاہی یا تاخیر ہو جائے تو آگے کے تمام مراحل متاثر ہوتے چلے جاتے ہیں اور پرچا تاخیر کا شکار ہو جاتا ہے۔ ہماری تمام قارئین اور لکھاریوں سے درخواست ہے کہ وہ وقت کا خیال رکھیں کہ وقت کا پنچھی بہت بے رحم ہے وہ کسی نہیں سنتا۔ مارچ کا شمارہ سیاسی جرائم نمبر ہوگا لہٰذا اس حوالے سے اپنی تحریریں جلد سے جلد ارسال کریں۔ دلچسپ نمبر کے لیے معروف ادیب انجم فاروق ساحلی نے مسٹر دلچسپ، شہناز بانو نے ایک رات اور لاہور سے غلام میراں نے یارب کے عنوان سے خاص کہانیاں بھیجی ہیں۔ جبکہ آلیشبہ مخدوم نے اپنا ایک بہت ہی دلچسپ سفرنامہ پٹایا میں تین دن ارسال کیا جو شامل اشاعت ہے۔ روایت سے ہٹ کر تحریر کردہ یہ سفرنامہ آپ کو ضرور پسند آئے گا۔

اللہ کے کرم سے محترم محمد بخش صابر لنگاہ صحت یاب ہو گئے ہیں اور انہوں نے ایک ناول ارسال کیا ہے جس کی رسید حاضر ہے۔ قابل اشاعت ہے یا نہیں اس کا فیصلہ ابھی نہیں ہوا اللہ تعالیٰ انہیں مزید تندرستی دے، آمین۔

قارئین نوٹ فرمالیں

مارچ میں	سیاسی جرائم نمبر

مئی میں	طنز و مزاح نمبر
جولائی میں	آپ بیتی نمبر
ستمبر	خوفناک و پراسرار نمبر

ساحل دعا بخاری...... بصیر پور۔ السلام علیکم! سب سے پہلے تو ہماری ہر سانس اور ہر دھڑکن اللہ کی عطا کردہ ہر نعمت کا اس قدر شکر ادا کرتی ہے جس قدر کہ اللہ کی رحمت و علم ہے اور اسی قدر درود و سلام نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم پر جس قدر کہ وہ اس گناہ گار امت پہ مہربان ہیں۔ نئے افق ہمارے ہاتھوں میں ہے ٹائٹل اچھا تھا۔ دستک ہر بار کی طرح لاجواب تھی۔ باقی خطوط سبھی کے اچھے تھے باقی ہمارے فیورٹ عمر فاروق ارشد گزشتہ چند ماہ سے غائب ہیں۔ عمر صاحب خیریت؟ ایک اہم بات گفتگو میں تمام بہن بھائی ہمیں "میل" سمجھتے ہوئے صاحب کہہ کر مخاطب کیا کرتے ہیں۔ جی حضرات ہم وہ ہیں جن سے ہے "تصویر کائنات میں رنگ" سو پلیز تمام بہن بھائی تصیح کر لیں اور آئندہ ہمیں صاحب کہنے سے گریز کیا جائے کہانیاں ابھی پڑھی نہیں انشاء اللہ اگلے ماہ بھرپور تبصرہ کریں گے۔ دو تحریریں ارسال خدمت ہیں امید ہے زیادہ انتظار نہیں کرائیں گے اور آپ سے گزارش ہے کہ پلیز شاعری کے صفحات بڑھا دیں تاکہ ہم لوگ بھی اس میں شامل ہوا کریں کئی بار مراسلات ارسال کیے مگر نو لفٹ اور پلیز خطوط کا جواب دیا کریں۔ اب اجازت اللہ بزرگ و برتر ہر مسلمان کی ہر جائز حاجت پوری کرے اور ہر قسم کی پریشانی دور کرے، آمین اللہ سب کا حامی و ناصر ہو۔

ریاض بٹ...... حسن ابدال۔ السلام علیکم! ماہ دسمبر کا شمارہ 21 نومبر کی ایک خنک اور یخ بستہ شام کو ملا۔ حسبِ معمول خوب صورت سرورق لیے ہوئے تھا۔ ہمارے پسندیدہ رسالے (نئے افق) کا سرورق اتنا منفرد اور صاف ہوتا ہے کہ ہم فخر کے ساتھ اسے گھر میں رکھ سکتے ہیں۔ یعنی سرورق ایسا نہیں ہوتا جس کو دیکھ کر شرم محسوس ہو۔ اس بار فہرست دیکھ کر دل باغ باغ ہو گیا۔ کہانیوں پر تبصرہ بعد میں کروں گا۔ پہلے بات ہو جائے گفتگو کی، اس بار ریحانہ سعیدہ صاحبہ کرسی صدارت پر براجمان ہیں بہن آپ کا خط اور تبصرہ اچھا ہے لیکن اس بار آپ بھائی کو بالکل بھول گئیں نہ کہانی کے متعلق کچھ لکھا اور نہ ویسے ذکر کیا۔ خیر کبھی کبھار ایسا بھی ہو جاتا ہے۔ باقی آپ نے دھرنوں کے متعلق بالکل ٹھیک لکھا ہے کہ یہ سب عوام کو بے وقوف بنایا جا رہا ہے۔ ان دھرنوں کا کوئی فائدہ نہیں ہوا غریب اور سادہ لوح عوام کو، ریاض حسین قمر بھائی آپ نے بالکل صحیح لکھا ہے کہ اصلاح گھر سے ہونی چاہیے۔ بھائی مبارک حسین، مہروں کی تکلیف اب کم ہے۔ آپ نے میرے لیے دعا کی خدا آپ کو ہمیشہ خوش رکھے اور ہر مصیبت اور غم سے دور رکھے آمین۔

عبدالرحمان بھائی میری کہانی پسند کرنے کا بے حد شکریہ۔ محمد شفا آپ کا مختصر خط بھی محفل میں آپ کی موجودگی کا احساس دلا رہا ہے۔ عثمان عبداللہ آپ کے خیالات میں وزن ہے۔ میری کہانی اعتراف جرم پسند کرنے کا بے حد شکریہ۔ اب بات ہو جائے ذوق آ گہی اور خوشبوئے سخن کی۔ ذوق آ گہی میں غلام فاطمہ کا انتخاب کھانے کا اسلامی طریقہ خوب صورت اور سبق آموز ہے اس کے علاوہ دو طرح کے آدمی (امجد علی) اللہ کے ذمہ (سائرہ) اخلاق (ارشاد علی) بھی دل کو چھو گیا۔ ارشد امین کے انمول موتی واقعی انمول ہیں۔ خوشبوئے سخن میں یوں تو سارا انتخاب لاجواب ہے۔ لیکن ریحانہ سعیدہ کی آنکھیں قدیر رانا کی غزل اور ریاض حسین قمر کی غزل سب سے بہترین رہیں۔ اب بڑھتے ہیں کہانیوں کی طرف۔ ''جگت سنگھ'' کی قسط زبردست ہے یہ ناول میں نے کافی عرصہ پہلے پڑھا تھا لیکن اپنے رسالے میں پڑھنے کا لطف ہی اور ہے اور ذہن کے نہاں خانوں میں یادوں کو تازہ کر رہا ہے۔ امجد جاوید بھی خوب لکھ رہے ہیں۔ یہ قسط بھی اچھی ہے۔ شہر خرابی ایک اچھی تحریر ہے۔ واقعی انسان کبھی کبھی تنہائی سے تنگ آ کر ایسے فیصلے کر لیتا ہے جو اس کے لیے پریشانی اور مصیبت کا باعث بنتے ہیں۔ زریں قمر کی پناہ گزیں نے آنکھوں سے بے ساختہ آنسو رواں کر دیے یقین کریں میں بہت ملول ہوا اسرائیل کی کھلی دہشت گردی امریکہ بہادر کو نظر نہیں آ رہی۔ بہن یہ آپ کا ہی جگرا ہے جو آپ ایسی کہانیاں لکھ لیتی ہیں۔ باقی رسالہ ابھی زیر مطالعہ ہے۔ آخر میں بات ہو جائے کترنوں کی۔ مظہر عرف مجو کے لطائف بہت اچھے ہیں۔ محمد اظہر کی دو کرسیاں بھی خوب ہیں۔ پطرس بخاری کے کیا کہنے، باقی کترنیں بھی پڑھنے کے قابل ہیں۔
والسلام

محمد اسلم جاوید...... فیصل آباد۔ السلام علیکم! بڑی آرزو تھی ملاقات کی پھولوں کی طرح ہمیشہ مسکراتے رہو، جناب مشتاق احمد قریشی صاحب، نیک دعاؤں اور خیریت و عافیت کے ساتھ حاضر ہوں۔ خدا آپ کو اپنی امان میں رکھے، چند دن ہوئے شہر ضروری کام کے سلسلے میں جانا پڑا وہاں بک اسٹال پر ماہ دسمبر 2014ء کا تازہ پرچہ دیکھ کر میرا دل خوشی سے باغ باغ ہو گیا اندر جھانکا تو رنگ برنگی تحریروں سے ملاقات ہو گئی۔ اس کے سارے سلسلے انگوٹھی میں نگینے کی طرح فٹ ہیں۔ مثلاً دستک، اقرا، گفتگو، بزم سخن، ناقابل فراموش واقعات، سلسلہ وار کہانیاں، تراجم کہانیاں، روحانی مسائل اس بار سرورق کوئی خاص نہیں تھا۔ بجھا بجھا سا ذرا توجہ دیں سرورق ہی تو پرچے کی جان ہوتا ہے۔ نئے افق کا اپنا انداز ہے ہر ماہ کے آخر پر ہمیں اس کا بڑی شدت سے انتظار ہوتا ہے غزل شائع کرنے کا شکریہ۔ آپ کا خلوص ہی ہمیں خط تحریر کرنے پر مائل کرتا ہے۔ میرے دل کی دھڑکنوں میں چھپے ہوئے ہیں کیا ہوا آپ ہم سے ہزاروں میل دور ہیں اگر آپ پرچے میں کچھ تبدیلیاں کریں تو بہتر ہے اس بار تمام کہانیاں لاجواب تھیں۔ غزلیں

اور اشعار خوب تھے گزرتے ہوئے سال میں آپ کا میرے ساتھ تعاون رہا آئندہ بھی میرے ساتھ تعاون کریں گے۔ کچھ دوست احباب میری غزلیں پسند کرتے ہیں میں ان کا بے حد شکر گزار ہوں جو مجھے اپنی دعاؤں میں یاد رکھتے ہیں۔ اس جاتے ہوئے سال نے ہم کو بہت دکھ دیئے کوئی راحت اور خوشیوں کا سماں نہ تھا ہر طرف آنسوؤں اور آہوں کا طوفان تھا۔ معاشی حالات بہتر نہیں تھے ہم آپ کو اپنا دل چیر کر دکھا نہیں سکتے اگر حکومت اچھی ہو تو ہر چہرے پر نور کے سائے اور ہر طرف خوشحالی کا دور ہو۔ لوڈشیڈنگ، بدحالی، مہنگائی، ہر انسان کی زندگی مہکا رہی ہے کچھ دنوں بعد یہ سال ہم سے ہمیشہ کے لیے رخصت ہو جائے گا۔ آئندہ شمارہ ماہ جنوری 2015ء کا پہلا پرچہ ہوگا میری جانب سے آپ کو اور تمام اسٹاف کو نیا سال مبارک ہو۔ قارئین کو بھی نیا سال مبارک ہو خدا کرے یہ آنے والا سال ہم سب کی حسین امنگوں کا ترجمان ہو اور زندگی میں بہت سی خوشیاں دیکھنا نصیب ہوں۔ نئے آنے والے سال سے ہمیں بہت سی امیدیں وابستہ ہیں اور کوئی قابل تحریر بات نہیں۔ زندگی نے وفا کی تو پھر ملاقات ہوگی۔ خدا حافظ

ادیب سمیع چمن...... حیدر آباد۔ محترم وقابل احترام مشتاق احمد قریشی صاحب۔ آپ کو آپ کے جملہ اہل مجلس ادارت اور تمام حاضرین وقارئین محفل کی خدمت میں پر خلوص اور پر عقیدت السلام علیکم ورحمتہ اللہ۔ گزشتہ ماہ دسمبر کے شمارے کی محفل گفتگو میں حاضر نہ ہوسکا۔ وجہ میری گھریلو اور معاشی مجبوریاں بن رہی ہیں۔ میں ایک محنت کش بچوں کے ادب کا لکھاری ہوں۔ عموماً بچوں کے ننانوے فیصد ادیب اور لکھاری حضرات محکمہ تعلیم سے وابستہ ہوتے ہیں۔ ان کی تنخواہیں بھی ماشاء اللہ پہلے کی بہ نسبت آج کل خاصم خاص ہیں۔ یہ زبان زدعام ہے کہ سرکاری اسکولوں میں پڑھائی برائے نام تعطیلات سال میں آٹھ ماہ اور...... چار چھ گھنٹوں کی سروس میں بھی آرام ہی آرام ہے۔ سو ان میں اور میری آمدنی میں زمین وآسمان کا فرق ہے۔ میرے ایک دوست ہیں جو استاد ہیں ان کو تو یہ بھی نہیں معلوم ہے کہ فاتح اندلس کون تھا اور پاکستان کے پہلے بانی تو حضرت قائداعظم محمد علی جناح ہیں مگر دوسرا بانی ومہربان کون تھا۔ افسوس تو یہ ہے کہ آج ایک یہ ہی کیا ہماری قوم کے لاکھوں نہیں کروڑوں پڑھے لکھوں کو نہ پاکستان سے نہ ان بانیوں سے بلکہ اپنے اپنے مسلک کے اپنے اپنے مطلب کے سیاسی لیڈران سے انس اور عقیدت واحترام ہے۔ پاکستان کا نعرہ لگانے والے اور بنانے والے نہ کوئی فرقہ پرست تھے۔ نہ ہی گروہ پرست تھے۔ وہ صرف اور صرف ایک خدا ایک رسول ایک قرآن کے چاہنے والے تھے۔ لہٰذا برصغیر کے جب تمام اہل ایمان نے اس نعرہ کو دل کی آواز بنایا گیا پاکستان مطلب کیا لا الہ تو مسلمان شیشہ پلائی دیوار بن گئے اور انہوں نے ایک پرچم اور ایک قائد محمد علی جناح کو اپنا لیڈر چن لیا اور لیڈر بھی ایسا عظیم کے جس نے اس قوم اور اس وطن کی عظمت کی خاطر اپنی چہیتی اکلوتی اولاد

اپنی پیاری جگر کا ٹکڑا بہن دینا جناح کو فراموش کر دیا اور اسلامی عقائد اور اس قوم وطن کے لیے قائد اعظم کی یہ کتنی بڑی قربانی تھی۔ ہماری اس موقع پرست اور خود غرض قوم نے اس کا یہ صلہ دیا کہ ایک پرچم کی جگہ درجنوں اپنے اپنے گروہ کے پرچم بنا ڈالے اور ہر ایک نے اپنا اپنا لیڈر چن لیا۔ اگر کوئی پرچم قومی پرچم سے عظیم ہے اگر کوئی لیڈر قائد اعظم سے عظیم ہے تو ایسی سوچیں پاکستان کو کہاں سے کہاں لے کر جا رہی ہیں۔ خدارا کچھ کیجیے اور ایسے لوگوں کو جگائیے جنہیں قائد اعظم کے جاں نثار ساتھیوں اور ان کے اصولوں، علامہ اقبال بانگ درا سے محبت اور ایثار ہو۔ آپ کو شاید ضرور یاد ہوگا کہ شہید ملت لیاقت علی خان کے بعد صرف سات برس کے دوران اتنی جلدی جلدی وزیر اعظم بدلے گئے تھے کہ ایک موقع پر ہندوستان کے اس وقت کے وزیر اعظم جواہر لعل نہرو نے طنزیہ کہا تھا کہ میں کس سے بات کروں؟ میں اپنی دھوتی نہیں بدل پاتا پاکستان میں وزیر اعظم بدل جاتے ہیں۔ شروع کے ان سات آٹھ سالوں میں یہ تصور بین الاقوامی طور پر سامنے آ گیا تھا میں سوچتا ہوں کہ اگر پاکستان کی حکومتی تاریخ میں اگر فیلڈ مارشل محمد ایوب خان کی حکومت نہ آتی اور ایوب خان ملک کو سنبھالا نہ دیتے اور تاریخی اقدامات نہ کرتے، ملکی تاریخ کی تعمیرات مصنوعات کو دن رات ترقی پر گامزن نہ کرتے تو آج پاکستان بچا ہی نہ ہوتا۔ بعد میں قائد اعظم محمد علی جناح کی محترم بہن مادر ملت کا الیکشن رزلٹ جادوئی زور سے دھڑن تختہ کر دیا گیا جمہوریت کے اس قتل نے بعد میں سانحہ مشرقی پاکستان کو جنم دیا۔ اس کے بعد سے آج تک الیکشن کا قتل اور دھاندلی کا جاری ہے۔ اب ذرا ادھر ملاحظہ کریں مجھے ہنسی آتی ہے عمران خاں صاحب کی چیخ وپکار پر ان کی فریاد ہے کہ چار حلقے صرف چار حلقے کھولنے کو کہا تھا میری نہیں سنی گئی اس وجہ سے میں نے زمین آسمان اٹھایا ہوا ہے ان کی بات سے دنیا میں جگ ہنسائی ہوتی رہی۔ ان کی بلا سے اقوام عالم میں ہم ذلیل ہوتے رہیں ان کی بلا سے ملک کی معیشت اکانومی تباہ و برباد ہوتی رہے۔ دلہا مرے یا دلہن، انہیں تو ہر قیمت پر حکومت اور وزارت چاہیے۔ 1964ء میں، میں تیسری جماعت کا طالبعلم تھا مجھے عمر کے لحاظ سے جو یاد ہے وہ تو ہے مگر ہوش سنبھالنے کے بعد جو بزرگوں سے سنا اور تجزیہ کیا تو یہ عقدہ کھلا کہ پاکستان کی تاریخ میں اس زمانے میں جب ٹی وی تک ناپید تھا صرف ریڈیو اور اخبارات میں ہمارے ذرائع اور میڈیا تھے۔ محترمہ فاطمہ جناح کے جلوس اور جلسے جیسے جلوس اور جلسے عمران خان تو کیا بھٹو اور الطاف حسین بھی نہ پیدا کر سکیں گے۔ دیکھیں ان قومی لیڈران کا ظرف وہ آپ کی طرح کفن پھاڑ کر دھرنے اور گانے بجانے اور لوگوں کی بھیڑ کو سیاست نہیں سمجھتے تھے۔ فاطمہ جناح کے ساتھ کم از کم اسی فیصد عوام تھے عمران خان صاحب اگر وہ ایک حکم دیتیں تو 64ء کے الیکشن کی دھاندلی کرنے کرانے والوں کا عوام سے تکا بوٹی کرا دیتیں۔ مجھے ان کی تقریر یاد ہے فاطمہ جناح نے فرمایا۔ یہ جان کر بھی کہ الیکشن میں قابل مذمت دھاندلی کی گئی ہے مگر ملک کے

احترام میں، میں یہ نتائج قبول کرتی ہوں۔ میں نہیں چاہتی کہ میں اپنے اقتدار کے لیے ملک کا امن تباہ و برباد اور خون خرابہ دیکھوں۔ یہ ہوتا ہے قومی لیڈران کا ظرف۔ آج ملک اور قوم کی عزت کی اینٹ سے اینٹ بجائی جارہی ہے۔ خدا کے لیے کوئی ایوب خان جیسا مردآہن پاکستان کو بچانے والا لیڈر آجائے اور ان خودغرض لیڈران سے اس ملک اور قوم کو بچالے آمین۔ میں نے زندگی بھر تجارت کی۔ اب میرا روزگار ختم ہوگیا ہے۔ اب تو میں خود لاتعداد امراض کا شکار ہوں۔ چالیس سال بچوں کے ادب کی خدمت کی، دو رسالے شائع کیے جو حاسد دوستوں کی سازش کا شکار ہوگئے۔ لاکھوں کا نقصان برداشت کیا آنکھوں میں کالا موتیا اتر آیا معدہ کے امراض پیدا ہوگئے میرے پاس تو ان کا علاج کرانے کا بندوبست نہیں۔ ابھی تو قرضہ بھی ادا کرنا ہے۔ ان شاء اللہ پھر اللہ اچھے دن نصیب کرے گا پھر رسالہ نکالوں گا فی الحال دعا کریں۔ آپ جیسے چند لوگ اور میرے وطن میں پیدا ہوجائیں تو یقین ہے قوم کی اصلاح بھی ہوگی اور وطن بھی سنبھل جائے گا نئے افق کے ذریعہ نئے چراغ روشن نئی راہیں دکھا کر۔ کراچی کے شیخ ابراہیم، نازسلوش ذشے، پنڈی کے ابن مقبول جاوید احمد صدیقی، مبارک حسین چیچہ وطنی، کراچی کے محمد شفا، زین الدین شانی ریلوے کالونی، ثمینہ پیرزادہ حیدرآباد، شاہد علی، خورشید پیرزادہ صاحب، زریں قمر صاحبہ، سلمٰی غزل، قیصر عباس، ریاض بٹ، رفعت محمود اور لنگاہ صاحبان آپ سب کو میرا سلام اپنے اپنے قلموں کے ذریعے اس قوم اس پاک وطن کی آبیاری کے لیے اٹھ کھڑے ہوں۔ محترم مشتاق احمد قریشی صاحب آپ نئے افق کو فرضی اور من گھڑت تحریروں سے پاک کر کے حقیقی تحریریں اور قومی جذبات، انقلابی انداز میں پرچہ ترتیب دیں۔ یا پھر دوسرا پرچہ نکال لیں۔ قدرت نے آپ کو اس ملک اور قوم کا عظیم سپوت ہی نہیں ایک مجاہد قلم کا اعزاز دیا ہے۔ خدارا کچھ کیجیے۔

ماریہ' اقراء وسیم...... اللہ والا ٹائون، کراچی۔ میں نئے افق کی خاموش قاری ہوں' کافی عرصہ سے نئے افق کا مطالعہ کرتی آئی ہوں' گفتگو میں پہلی بار شرکت کررہی ہوں۔ اہالیان نئے افق، عمران بھائی ڈھیروں دعائیں اور نئے سال کی مبارک باد۔ مبارک دینے سے یاد آیا کہ مبارکباد یں تو سبھی دے دیتے ہیں پر کسی کو سال مبارک آتا ہے اور کسی کو نہیں خیر دعا تو یہی ہے کہ یہ نیا سال سب کے لیے خوشیوں کی نوید لائے اور مصائب و آفات سے بچائے اور یہ تبھی ممکن ہے جب اعمال کی درستگی کی جائے۔ قریشی صاحب کی دستک پڑھ کر ان سے اتفاق کرتے ہیں' اللہ تعالیٰ مشتاق قریشی صاحب کو لمبی عمر اور صحت کاملہ عطا فرمائے۔ گفتگو میں عمران صاحب کا کہا ہر ایک لفظ بھی سچ ہے۔ اقراء میں طاہر قریشی نے رہنمائی فرمائی۔ صدارتی کرسی پر تشریف فرما ریحانہ سعیدہ کو سلام اور مبارک باد۔ دلی خوشی ہوئی آنٹی دعاؤں کی طلبگار رہوں۔ اب آتے ہیں تبصرے کی طرف' ساحر جمیل سید صاحب نے تخلیق زدہ میں خوب لکھا' کہانی پسند آئی۔

اچھا یاد آیا کافی مہینوں سے ہمارے بزرگوار جناب فقیر محمد بخش صابر لنگا صاحب غیر حاضر ہیں' کوئی خیر خبر بھی نہیں۔ ہماری دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ ان کو صحت کاملہ عطا فرمائے ہم آپ کو بہت یاد کر رہے ہیں انکل جلدی اطلاع دیں اپنی خیر خیریت کی۔ گفتگو میں خطوط کم ہوتے جا رہے ہیں' لگتا ہے کچھ لوگ ناراض ہو گئے ہیں' مہربانی فرما کر جلدی سے گفتگو میں انٹری دیں۔ اس دفعہ کی ساری کہانیاں ایک سے بڑھ کر ایک تھیں' قسط وار کہانیوں میں قلندر ذات کی قسط زبردست رہی' اگلی قسط کا انتظار ہے۔ روحانی علاج کے بعد خوشبوئے سخن میں جھانکا سبھی نظمیں' غزلیں ٹھیک تھیں۔ ''ذوق آگہی'' کی تمام تحریریں بے مثال تھیں۔ آخر میں ''جگت سنگھ'' جو کہ میں ہمیشہ پہلے پڑھتی ہوں کیونکہ میری سب سے پسندیدہ یہی ہے اور اس کا تو مجھے بے صبری سے انتظار رہتا ہے۔ اس کے ساتھ ہی اس بار کا شمارہ ختم ہوتا ہے اور میرا خط بھی ان شاء اللہ زندگی رہی تو پھر حاضر ہوں گی کیونکہ پچھلے چند ماہ سے بے حد مصروفیت تھی سو تمام قارئین ساتھیوں سے دعا کی اپیل کرتی ہوں اور تمام غلطیوں کمی کوتاہی یا کسی کی بھی دل آزاری ہو گئی ہو تو کھلے دل سے معافی چاہتی ہوں اپنا ڈھیر سارا خیال رکھیے گا۔ اللہ پاک ہم سب کا اور پاکستان کا حامی و ناصر ہو' آمین۔ اللہ حافظ

مصنفین سے گزارش

☆ مسودہ صاف اور خوشخط لکھیں۔
☆ صفحے کے بائیں جانب کم از کم ڈیڑھ انچ کا حاشیہ چھوڑ کر لکھیں۔
☆ صفحے کے ایک جانب اور ایک سطر چھوڑ کر لکھیں' صرف نیلی یا سیاہ روشنائی کا ہی استعمال کریں
☆ خوشبوئے سخن کے لیے جن اشعار کا انتخاب کریں ان میں شاعر کا نام ضرور تحریر کریں۔
☆ ذوق آگہی کے لیے بھیجی جانے والی تمام تحریروں میں کتابی حوالے ضرور تحریر کریں۔
☆ فوٹو اسٹیٹ کہانی قابل قبول نہیں ہوگی۔ اصل مسودہ ارسال کریں اور فوٹو اسٹیٹ کروا کر اپنے پاس محفوظ رکھیں کیونکہ ادارہ نے ناقابل اشاعت کہانیوں کی واپسی کا سلسلہ بند کر دیا ہے۔
☆ مسودے کے آخری صفحہ پر اردو میں اپنا مکمل نام پتا اور موبائل فون نمبر ضرور خوشخط تحریر کریں۔
☆ ''گفتگو'' کے لیے آپ کے ارسال کردہ خطوط ادارہ کو ہر ماہ کی 3' تاریخ تک مل جانے چاہیے۔
☆ اپنی کہانیاں دفتر کے پتا پر رجسٹرڈ ڈاک کے ذریعے ارسال کیجیے۔ 7' فرید چیمبرز' عبداللہ ہارون روڈ' کراچی۔

اقراء

ترتیب: طاہر قریشی

مؤلف مشتاق احمد قریشی

اللہ

اللہ

ترجمہ:۔اوراس کی ایک نشانی یہ بھی ہے کہ آسمان وزمین اس کے حکم سے قائم ہیں‘ پھر جب وہ تمہیں آواز دے گا صرف ایک بار کی آواز کے ساتھ ہی تم سب زمین سے نکل آؤ گے۔ (الروم۔۲۵)

یعنی اللہ کے تکوینی حکم کے آگے سب بے بس اور لاچار ہیں‘ صرف یہی نہیں کہ اس کے حکم سے ایک دفعہ وجود میں آگئے بلکہ ان کا مسلسل قائم رہنا اور تمام نظاموں کا چلتے رہنا یہ سب اسی ایک اکیلے اللہ تعالیٰ کے حکم سے ہے۔ اگر ایک لمحے کو بھی اس کا حکم نہ رہے تو یہ سارا نظام کائنات یک لخت درہم برہم ہو کر بکھر جائے۔ کائنات کا مدبرو خالق اللہ تعالیٰ جس نے انسان کو اور اس کے لئے اس ساری کائنات کو پہلی بار بغیر کسی نمونے ومثال کے پیدا کیا ہے اُس کے لیے سب کو دوبارہ زندہ کر کے اٹھانا کونسا بڑا اور اہم کام ہوگا۔ اللہ کے صرف ایک حکم کی بدولت آغازِ آفرینش سے لے کر آج تک اور قیامت تک دنیا میں پیدا ہونے والے سب کے سب انسان زمین کے ہر ہر گوشے سے نکل کھڑے ہو جائیں گے۔

ترجمہ:۔اور زمین وآسمان کی ہر ہر چیز اُسی (اللہ) کی ملکیت ہے اور ہر ایک اس کے فرمان کے ماتحت ہے۔ (الروم۔۲۶)

ان تمام قرآنی آیات سے یہ بات واضح ہو رہی ہے کہ اللہ تعالیٰ ہی تمام کائنات کا تمام مخلوقات کا تمام کمالات اور اپنی عظیم ترین قدرتوں کا مالک ومختارِ کل اور اعلیٰ وبرتر ہے۔

معرفتِ الٰہی‘ یعنی اللہ تبارک وتعالیٰ کے وجود کا یقین کامل ہی اسلام کا بنیادی مرکز ہے اور اگر ایک اکیلے اللہ کے وجود کا یقین ہی نہ ہو تو پھر انسان کا ہر عمل بے روح وبے قیمت ہو جاتا ہے۔ اطاعتِ الٰہی اور الحاد یہ دو متضاد نقطہ ہائے نظر ہیں اور انسانی زندگی پر ان کے گہرے اثرات مرتب ہوتے ہیں۔ دونوں نقطہ نظر انسانی زندگی پر مختلف اثرات ڈالتے ہیں۔ اللہ کا منکر دولت واقتدار پا کر ظلم وشیطانیت کا پیکر بن جاتا ہے‘ کیونکہ اسے اپنے سے بالاتر کسی ہستی کے سامنے جوابدہ ہونے کا خوف ہی نہیں ہوتا۔ جبکہ اہلِ ایمان‘ اطاعتِ الٰہی کرنے والا انسان خوفِ الٰہی میں مبتلا ہوتا ہے وہ ظالم اور مفسد بننے سے اللہ کے خوف اور اپنے اعمال کی جوابدہی کے باعث باز رہتا ہے۔ ملحد‘ منکر ومفسد شخص میں چونکہ اللہ سے ڈرنے کے خوف کا تصوّر تک نہیں ہوتا اس لئے جب اس کے مادی وسائل ختم ہو جاتے ہیں یا چھن جاتے ہیں تو وہ اس بات سے خوف زدہ ہو کر ہراساں اور پریشان ہو جاتا ہے کیونکہ اسے اپنے مادی سہاروں پر ہی بھروسا ہوتا ہے‘ جبکہ اللہ تعالیٰ کی اطاعت وبندگی کرنے والے کو اللہ تعالیٰ کا سہارا اور امید ہوتی ہے وہ اپنی تمام تر بے سروسامانی کے باوجود بھی کسی طرح کے خوف مایوسی ناامیدی کا شکار نہیں ہوتا۔ یہی بات قرآنِ حکیم میں اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمائی ہے۔

ترجمہ:۔اللہ کی رحمت سے مایوس نہ ہو‘ یقیناً اللہ کی رحمت سے صرف کافر ومنکر (ہی) مایوس ہوتے ہیں۔

(یوسف۔۸۷)
سورۂ الحجر کی ۵۶ آیت میں بھی اس بات کو اس طرح کہا گیا ہے۔(ترجمہ) "گمراہ لوگ ہی اللہ کی رحمت سے ناامید ہوتے ہیں۔"

انسان اپنے اردگرد رات دن نہ صرف دنیا کو بلکہ دنیا کے تمام مظاہر کو بھی دیکھتا، سمجھتا ہے انہیں اپنے آرام وسہولت کے لئے استعمال کرتا ہے اور کائنات کو دیکھتا ہے اوران کے بارے میں اس کا تجسس اسے بتاتا سمجھاتا ہے کہ اس زمین وآسمان اور دنیا اور کائنات کی تمام چیزوں اور نظام کو پیدا کرنے والی کوئی ذات ضرور ہے کوئی تو ہے جو نظام ہستی چلا رہا ہے، جس نے یہ سارا نظام کائنات اور نظام حیات مخلوقات قائم کیا، بنایا اور اُسے بغیر کسی تعطل کے، بغیر کسی رخنے کے چلا رہا ہے اوران سب کی پرورش ونگہداشت بھی کررہا ہے علماء عالم کے مطابق دنیا حادث ہے اور ہر حادث کے لئے سبب اور خالق کا ہونا ضروری ہے۔ اور وہ خالقِ کائنات اللہ تبارک وتعالیٰ کی ذاتِ عالی ہے۔ وہ اللہ ہی ہے جس نے اس سارے کارخانۂ قدرت کو بنایا ہے اور چلا رہا ہے۔

اللہ جل شانہٗ

لفظ "اللہ" کے سلسلے میں اہلِ بصارت وبصیرت حیرت زدہ ہیں۔ اللہ کی ذات وصفات کے بارے میں جس طرح عقلِ انسانی ٹھوکریں کھاتی ہے اسی طرح صفاتِ الٰہی کے بارے میں بھی حیرانی اور ششدر رہ جانا ہی مقدر ہے۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ کے قول کے مطابق "اللہ کی صفات کے بارے میں تمام وصفی نام متحیر ہیں، زبانوں کے قواعد گم ہو کر رہ گئے ہیں۔ (تفسیر البیضاوی۔ا:۵)

لفظ "اللہ" ربّ کائنات کا اسمِ ذات بھی ہے اور اسمِ صفات بھی ہے۔ کیونکہ اللہ ہی الہٰ یعنی معبود ہے لہٰذا وہ جملہ صفات کا حامل ہے جن کو ازروئے لغت الہٰ کا محمول تصور کیا جاتا ہے۔ مثلاً الٰہیت، محبت، حیرت ودرماندگی، عجز فہم، لفظ اللہ علم ہے اور جامد للفرد نہ یہ کسی سے مشتق ہے اور نہ اس سے کوئی دوسرا لفظ مشتق ہے۔

اسلام سے پہلے کے عربوں کے خیال سے قطع نظر قرآن مجید کا خطاب صرف خاص عربوں سے نہیں ہے بلکہ تمام عالم انسانیت سے ہے۔ وہ سب پر واضح کرتا ہے کہ دعا اور پرستش (یعنی مانگنے اور عبادت) کے لائق اور نفع ونقصان کی مالک صرف ایک ہی ہستی ہے اوراس ہستی کا نام اللہ ہے۔

دنیا کی کسی بھی زبان میں ایسا کوئی لفظ نہیں ہے، جو معناً اللہ کے مترادف ہو۔ قرآن مجید ہی کی بدولت اس کا سلبی اور ایجابی مفہوم متعین ہوا ہے۔ اللہ تبارک وتعالیٰ سے ہمارا بلکہ تمام انسانیت کا تعلق کیا ہے یہ؟ کتب الٰہی کے ذریعے ہی معلوم ہوا ہے اور اہلِ ایمان مسلمانوں کو بھی اللہ تبارک وتعالیٰ کی حقیقت واہمیت اور انسان سے تعلق خاص کی خبر اور اطلاع بھی قرآن حکیم اور رسولِ کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے ذریعے ہی ہوئی ہے اس کے علاوہ کوئی اور صورت نہیں ہے، نہ تھی کہ انسان کو اللہ سے اپنے تعلق کے بارے میں درست معلومات حاصل ہو سکتیں۔

منکرین اور ملحدین جو ذاتِ باری تعالیٰ سے انکاری ہیں اور مادیت کی باتیں کرتے ہیں ان کے پاس بھی ذاتِ باری تعالیٰ سے انکار وانحراف کے لئے کوئی ٹھوس دلیل ومعلومات نہیں ہیں سوائے اس کے کہ سب کچھ آئینے کی مانند صاف اور سامنے آ جانے کے باوجود وہ شیطان کے چنگل میں پھنس کر خود کو حق سے دور کرتے چلے جائیں۔

(جاری ہے)

یارب

غلام میراں

عدم ادراک سے ادرک تک کی داستان۔ ایک مجرم کی روداد جسے اس کے احساس ندامت نے مجرم نہ رہنے دیا۔کسی برگزیدہ ہستی کی نظر کا کرشمہ۔ایک بے وفا کی بے وفائی کا فسانہ۔

کسی کی بے لوث چاہت کی کہانی۔

ایک عظیم ذی روح کی عظمت کا احوال جوموت کی اذیت بھلا کر اخبار کے گردآلو ٹکڑے پر معاف لکھتا رہا۔

ایک بلند حوصلہ باپ کی بپتا جو اپنے بیٹے کی وصیت پر پابند رہا۔

سلاخوں کے پیچھے مقید قیدیوں کے لیے امید کی ایک کرن۔

آشفتہ دلوں کے لیے بطور خاص آنسوؤں کی روشنائی سے لکھا جانے والا ناول۔

''چاچو طٰہٰ کے کمرے میں کتابوں والی الماری'' ایک چھوٹے سے رقعے پر درج عبارت پڑھتے ہی اس کا سر تاسف سے دائیں بائیں ہلنے لگا۔

وہ مجھ سے (طٰہٰ عالم) سے فقط ایک بار ملی تھی اور اس پہلی ہی ملاقات کے بعد وہ میرے متعلق کیسا سوچتی ہوگی اس بات کا مجھے علم تھا' اس کے ہاتھ میں موجود رقعہ ایک کھیل کا حصہ تھا۔ جو میرے بھتیجے رومی میاں کا ایجاد کردہ تھا۔

ایک غیر ملکی چینل اے ایکس این پر چلنے والے اپنے پسندیدہ کھیل ''منٹ ٹو ون اٹ'' کو رومی میاں نے اپنے انداز میں ''فائنڈ ٹو ون اٹ'' میں کچھ یوں ڈھالا تھا کہ پھر گھر کے مختلف حصوں میں چند رقعے چھپا رکھے تھے' کسی بھی ایک دفعہ کے مل جانے پر اس پر اگلے رقعے تک پہنچنے کے لیے اشارہ عبارتاً درج تھا۔ کم سے کم وقت میں سبھی رقعے کھوج لانے والا۔ اس کھیل کا فاتح ٹھہرتا لیکن وہ تاحال رقعہ ہاتھ میں تھامے جیسے تذبذب کا شکار کھڑی تھی اور میرے کمرے میں آنے سے کترا رہی تھی۔ جب وہ ایک دم سے چونکی۔ اس کی ٹیم کے ننھے منے کھلاڑی اسے بلند آواز میں پکار رہے تھے...... ''گوگو...... یومنہ آنٹی'' بچوں کو یوں پکارتا دیکھ کر لامحالہ اسے میرے کمرے تک آنا ہی پڑا۔ دروازے تک پہنچنے کے بعد اس نے کچھ سوچتے ہوئے جوتے باہر ہی اتار دیئے تھے اور ساتھ ہی دھیرے سے دروازہ کھول کر وہ دبے پاؤں چلتے ہوئے میرے کمرے میں داخل ہوئی۔ اندر پہنچتے ہی اس نے ایک طائرانہ سی نگاہ دوڑا کر کمرے کا جائزہ لیا۔ اب اسے اطمینان ہو چکا تھا کہ میں اپنے کمرے میں نہیں ہوں اور اندر داخل ہوتے ہوئے وہ ایسی ہی دعائیں مانگ رہی تھی۔

کمرے میں کوئی کسی قسم کا برقی قمقمہ روشن نہ تھا۔ فقط مغربی سمت میں کھلنے والی کھڑکی سے سہ پہر کے اس حصے میں سورج کی کرنیں جیسے زینہ بنا کر اتر رہی تھیں۔ یوں وہ کمرے میں پھیلی اس ملگجی روشنی میں سر کو دروازے کی جانب گھما کر دیکھتے ہوئے دھیرے دھیرے چلتے میرے پلنگ کے ساتھ پڑی

الماری کی طرف بڑھ رہی تھی۔ یکا یک جو میں نے ایک طویل سجدے سے اپنے سر کو اٹھایا تو وہ مجھ سے ٹکرا کر بامشکل گرتے گرتے سنبھلی اور بھونچکا سی ہو کر اپنے حلق سے نکلتی چیخ پر اس نے مشکل سے قابو پایا تھا' تو دوسری جانب مجھے بھی اس کا بنا دستک دیئے میرے کمرے میں چلے آنا معیوب لگ رہا تھا۔ میں متعجب سا اپنی نشست سے اٹھ کھڑا ہوا تو اب سوالیہ نگاہوں سے اس کی جانب دیکھ رہا تھا۔ وہ سراسیمہ سی ہو کر میرے سامنے کھڑی تھی۔ اس نے اشارتاً مجھ سے معذرت چاہی اور میں نے بھی اشارتاً ہی اس کی معذرت کو قبول کر لیا تھا۔ ساتھ ہی مجھے یاد آنے لگا کہ چند لمحے پرلے رومی میاں بھی ایسے ہی انداز سے کمرے میں آئے تھے اور الماری میں کچھ چھوڑ کر الٹے پیروں لوٹ گئے تھے۔ یہ خیال آتے ہی میں نے انگشت شہادت سے اس کی عقبی جانب اشارہ کیا' تو وہ میرا اشارہ پا کر وہ پلٹی' اس نے الماری میں پڑا رقعہ اٹھایا اور کاندھے سے کمر کی طرف گرہ لگے آنچل کو کھول کر سر پر اوڑھتے ہوئے جیسے داخل ہوئی تھی ویسے ہی دھیرے سے کمرے سے چلی گئی۔ اس کے جانے کے بعد میں نے بابا رب نواز کی دی کالی چادر کو ایک بار پھر سے کھول کر اپنے کاندھوں کے گرد اوڑھا اور جائے نماز پر بیٹھتے ہی تسبیح ہاتھ میں لے کر آنکھیں موند لیں۔

اگلے روز فجر کی نماز سے فراغت پاتے ہی میں حسب معمول تسبیح ہاتھ میں لیے چھت پر آ گیا تھا۔ چھت پر آنے کی خاص وجہ یہ تھی کہ صبح تڑکے چھت کا رخ کوئی بھی نہ کرتا تھا' یوں مجھے تنہائی میسر آ جاتی تھی اور میں وہاں ایک سرے سے دوسرے سرے تک ٹہلتا ہوا چند وظائف پڑھ لیا کرتا تھا۔ آج یونہی ٹہلتے ہوئے یکا یک میری نظر کسی کے سر پر پڑی کوئی نیچے لان میں جاگنگ کر رہا تھا لیکن گھر میں کوئی بھی ایسا فرد نہ تھا جو یوں طلوع صبح اٹھ کر جاگنگ کرتا ہو تو پھر وہ کون تھی؟ سرعت سے میرے ذہن میں خیال آیا' میں یہ جاننے کے لیے متجسس انداز میں ذرا سا آگے کو جھکا یہاں چھت کہ اس حصے سے لان کا کچھ حصہ ہی دکھائی دیتا تھا لیکن مجھے وہاں کوئی ذی روح دکھائی نہیں دیا۔ میں وہاں سے ہٹنے کو ہی تھا جب وہ مجھے ٹریک سوٹ پہنے کانوں میں ہینڈ فری لگائے جاگنگ کرتی دکھائی دی اور میں اسے دیکھتے ہوئے سوچنے لگا کہ اگر میں پہلا ساطہ عالم ہوتا تو یوں اسے جاگنگ کرتا دیکھ کر جھٹ سے اپنے کمرے میں پہنچ کر ٹریک سوٹ پہنتا اور لان میں پہنچ کر اسے خوب تنگ کرتا کہ وہ چڑ کر اپنے کمرے میں چلی جاتی۔

یومنہ میرے چچا مرزا کی سب سے چھوٹی صاحبزادی تھی اور اس کی والدہ یعنی میری چچی اپنے والدین کی اکلوتی اولاد تھی۔ ان کا تعلق ایک بڑے زمیندار گھرانے سے تھا۔ جب ان کے والدین رضائے الٰہی سے وفات پا گئے تو زمینوں کی دیکھ بھال کی خاطر چچا کو اپنے خاندان بھر کے ساتھ گاؤں جانا پڑا' تبھی سے وہ وہیں مقیم ہو کر رہ گئے تھے اور جب یومنہ کی بڑی بہن آمنہ کے رشتے کی بات مجھ سے بڑے بھائی غلام مصطفیٰ عالم کے لیے چلی تو ماں نے اس رشتے کو قبول کرتے سے صاف انکار کر دیا تھا پھر اس بات کو لے کر جو میرے چچا چچی خفا ہوئے تو اس بات کو بیتے بھی اب عرصہ ہو چکا تھا۔ شاید وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ رنجش رفو ہو گئی تھی یا پھر کوئی مجبوری تھی جو انہیں یومنہ کو ہمارے ہاں بھیجنا پڑا تھا۔ وہ ماسٹر کر رہی تھی' اور چند روز ہی یونیورسٹی کے ہاسٹل میں بتانے کے بعد وہ مستقل طور پر ہمارے گھر رہنے آ گئی تھی۔ پھر یہ بات مجھے

بعد میں معلوم پڑی تھی کہ درحقیقت بڑے ابا اسے ہاسٹل سے گھر لے آئے تھے اور میں یہ جاننے کے بعد سوچنے لگا کہ بزرگوں کی چھایا بھی اللہ کی بڑی نعمت ہے آج جو میں جیتا جاگتا اپنے پیروں پر چلنے پھرنے کے قابل ہو پایا تھا تو اس میں بھی بڑے ابا کا بڑا کردار شامل تھا۔ میرے لبوں پر صدا ان کے لیے دعائیں جاری رہتی تھیں وہ مجھے اپنے ابا سے بھی بڑھ کر عزیز تھے اور جب بھی وہ بہت بیمار پڑ جاتے اور مجھے پاس بلا کر کہتے کہ ''طٰہٰ میاں اب ہمارے جانے کا وقت آ گیا ہے'' تو ان کی یہ بات سن کر میری آنکھیں یوں برس پڑتیں کہ ان کے ہاتھ بھیگ جاتے اور وہ مجھے اپنے سینے سے لگا کر کہنے لگتے کہ ''میاں تمہاری یہ محبت ہی ہمیں اس دنیا میں روکے ہوئے ہے'' اور میں بچوں کی طرح چلانے لگتا کہ بڑے ابا میں آپ کو کہیں نہیں جانے دوں گا۔ میں اپنے بازو پھیلا کر انہیں یوں جکڑ لیتا کہ پاس موجود لوگوں کی آنکھیں بھی رقت جذبات سے بھیگنے لگتیں اور وہ بھی بڑے ابا سے میری محبت اور وابستگی کو دیکھ کر میری طرح ان کی لمبی عمر کے لیے دعائیں کرنے لگتے۔ مجھے یونہی خیالوں میں گم چھت پر ٹہلتے ہوئے آج کچھ زیادہ ہی وقت بیت گیا تھا۔ جب بابا عبدالقادر مجھے ڈھونڈتے چھت پر آ پہنچے تھے۔

''صاحب ناشتے کی میز پر آپ کا انتظار ہو رہا ہے۔'' وہ میرے پاس آ کر ہاتھ باندھے جب یوں مجھ سے مخاطب ہوتے تو مجھے ان پر بڑا پیار آتا تھا۔ انہیں میں یونہی ادب سے ہاتھ باندھے محبت سے بات کرتے دیکھتا تو سوچتا رب سوہنے نے ہم پر جو پانچ وقت کی نماز فرض کی ہے تو اس میں بھی ہمارا ادب سے ہاتھ باندھے کھڑے ہونا رب سوہنے کو کیسا پیارا لگتا ہوگا۔ اسے بھی ہم پر کس قدر پیار آتا ہوگا ذات پات رنگ نسل امیری غریبی سندھی پنجابی بلوچی پٹھان کسی بھی تفریق کے بغیر رب سوہنا سبھی کو اپنی رحمت کی چھایا میں لے لیتا ہوگا۔ جیسے آگے بڑھ کر میں نے اپنا ایک بازو بابا عبدالقادر کے کاندھوں کے گرد حائل کر دیا تھا اور اب میں ان کے ہمراہ قدم سے قدم ملا کر چل رہا تھا۔

ہمارے ڈائننگ ہال میں داخل ہوتے ہی بابا عبدالقادر رسوئی میں جا گھسے اور میں ہولے سے سلام کرنے کے بعد بڑے ابا کے ہاتھ پر بوسہ دے کر ان کی بغل میں ہی خاموشی سے بیٹھ گیا تھا۔ پہلے شاید وہاں کچھ باتیں ہو رہی ہوں لیکن اب میرے وہاں پہنچنے پر مکمل طور پر خاموشی چھا چکی تھی۔ فقط رسوئی سے پانی کے گرنے اور برتنوں کے ٹکرانے کا شور سنائی دے رہا تھا' لیکن چند لمحے بعد ہی اس شور میں انسانی آوازوں کا اضافہ بھی شامل ہو گیا تھا۔ جب یومنہ ہاتھوں میں چند کاغذات تھامے ڈائننگ ہال میں داخل ہوئی تو سبھی کو سلام کرنے کے بعد وہ میرے سامنے والی کرسی پر بیٹھ گئی تھی۔ آج وہ پہلے روز ہمارے ساتھ ناشتے کی میز پر آئی تھی' وہ بچپن میں بھی ایک دو بار ہی ہماری طرف آئی ہوگی' اسی وجہ سے اب اس کے عرصہ دراز کے بعد ہمارے ہاں آنے پر ماں چند روز تک ناشتہ اور کھانا اس کے کمرے میں ہی بھجوا دیتی تھی' تاکہ چند روز میں وہ بھی سے جان پہچان بنا لے تو اسی بیچ اس کی جھجک بھی مٹ جائے گی۔ یوں آج وہ بھی کے ساتھ ناشتے کی میز پر موجود تھی۔ اس کے آجانے کے بعد میری نگاہیں بدستور جھکی ہوئی تھیں۔ جب مجھے ماں کی آواز سنائی دی۔ وہ یومنہ سے مخاطب تھی۔

''بیٹا اگر آپ پڑھنا چاہتی ہو تو ناشتا آپ کے کمرے میں ہی بھجوا دیں۔''

''ارے نہیں آنٹی دراصل آج کلاس میں پریذنٹیشن ہے' میں نے سوچا جب تک ناشتہ مکمل ہوگا چند پوائنٹس ذہن نشین ہوجائیں گے۔'' ماں کی بات سن کراس نے سرعت سے جواب دیا تو بڑے ابا اس کی بات مکمل ہوتے ہی سراہتے ہوئے بولے۔

''بھئی ہماری بیٹی تو بڑی ہونہار ہے۔'' یومنہ بڑے ابا کی بات سن کر شرماتے ہوئے مسکانے لگی اور میں بدستور ابھی تک چپ چاپ ہی بیٹھا تھا۔ جب ابا اس سے دریافت کررہے تھے۔

''بیٹا آپ کی پریذنٹیشن کا موضوع کیا ہے؟''

''جی انکل میرا موضوع ایک نیا دریافت ہونے والا ذرہ ہگ بوسون ہے' جس کا نام دو سائنس دانوں ہگ اور بوسون کے ناموں کی نسبت سے ہی رکھا گیا ہے۔ یہ ہگ اور بوسون کی حالیہ دریافت ہیں جس پر انہیں نوبل پرائز سے بھی نوازا گیا ہے۔'' ابا کے سوال کا جواب دیتے ہوئے یومنہ ہاتھ میں پکڑے صفحات کو بھی الٹا پلٹا کر دیکھتی رہی' ابا اس کے موضوع سے متعلق جان کر اسے سراہے بنا نہ رہ سکے تو ماں یوں خاموش رہی جیسے ان کے پلے کوئی بات ہی نہ پڑی ہو وہ فقط ستائشی نگاہوں سے اسے دیکھتی رہی۔ پھر اچانک جو انہوں نے ایک اچٹتی سی نگاہ مجھ پر ڈالی تو جیسے اب ان کے چہرے سے مسکان غائب ہوچکی تھی اور میں نے بھی جو ایک لمحہ بھر کو نگاہیں اٹھا کر ان کی جانب دیکھا تھا تو فوراً ہی اپنی نگاہیں واپس جھکالی تھیں۔ میں نے اس وقت بھی بابا رب نواز کی کالی چادر کو اوڑھ رکھا تھا اور سر کو قدرے خم دیئے سبھی کی باتیں سن رہا تھا کہ یکا یک یومنہ مجھ سے مخاطب ہوئی۔

''طٰہ سنا ہے آپ یونیورسٹی کے دنوں میں بڑے اچھے مقرر رہ چکے ہیں۔ آپ میری پریذنٹیشن میں کچھ ہیلپ کریں ناں۔'' وہ اپنی بات کہہ چکی تھی اور جواب طلب نگاہوں سے میری جانب دیکھ رہی تھی لیکن اس کی بات ختم ہونے تک میری کیفیت ہی بدل چکی تھی۔ مجھ پر رعشہ سا طاری ہوچکا تھا۔ میں اپنی سیمابی کیفیت پر قابو پانے کی کشمکش میں مبتلا تھا' میرا وجود مجھے سرد ہوتا محسوس ہورہا تھا لیکن ساتھ ہی اپنی ہتھیلیوں اور پیشانی پر پسینے کی موجودگی کو بھی میں محسوس کرسکتا تھا پھر ایک جھماکا سا ہوا اور میرے چار سو منظر بدلنے لگا۔ چار سو چلتی خوفناک آندھی...... اسپیکروں سے نکلتی پھٹی پھٹی آوازیں ...... انسانوں کے انبوہ سے بلند ہوتا نعروں کا شور...... اور تاریک آندھی میں اڑتے اخبارات کے صفحات اب مجھے واضح دکھائی دے رہے تھے' پھر یکا یک ہوا میں اڑتے ان صفحات میں سے ایک خون آلود صفحہ میرے چہرے سے آ چپکا تھا۔ اس سے پہلے کہ میں حواس باختہ ہو کر اپنے ہاتھ اٹھائے چہرے سے چپکے خون آلود اخبار کو ہٹانے کی کوشش میں چیخنے لگتا' میرے قریب بیٹھے بڑے ابا میری دگرگوں ہوتی کیفیت کو بھانپ چکے تھے۔ وہ چند لمحوں تک میری طبیعت کے سنبھلنے کا انتظار کرتے رہے لیکن انہوں نے جب مجھے ہر طرح سے بے بس پایا تو مجھے کاندھوں سے تھامے اٹھایا اور میں ان کے ہمراہ منوں بھاری ہوتے وجود کے ساتھ رینگتا ہوا چلنے لگا۔ ماں اور ابا آزردگی سے سر کو جھکائے وہیں بیٹھے رہے۔ جبکہ یومنہ کی متعجب نگاہیں سوال بنی دیر تک میرا تعاقب کرتی رہیں۔

⊙......●●●......⊙

بڑے ابا مجھے لے کر ڈائننگ ہال سے میرے کمرے میں آئے تھے' لیکن تاحال میں سیمابی کیفیت میں مبتلا گم صم سا تھا اور بڑے ابا بھی فقط

اشاروں کنایوں میں ہی اپنی بات سمجھاتے رہے تھے۔ وہ اس بات کو بخوبی سمجھتے تھے کہ میرے ذہن میں چلتی اتھل پتھل اگر رک سکتی تھی تو ایک ہی صورت میں کہ مجھے تنہا چھوڑ دیا جائے۔ اسی مقصد سے وہ مجھے آرام کرسی پر بیٹھا کر وہاں سے جا چکے تھے۔ ان کے کمرے سے نکلتے ہی میرے ذہن کے سلولائیڈ پر پھر سے ڈائننگ ہال کا منظر چلنے لگا تھا۔ یکا یک جویومنہ نے مجھے مخاطب کیا تو گویا میری روح تک کو ہی جھنجوڑ ڈالا تھا۔

اس سے پہلے کہ ایک بار پھر سے میں ویسی ہی کیفیت کا شکار ہونے لگتا' میں سبھی قسم کے خیالات کو جھٹک کر سوچنے لگا کہ میں اس کی پریذنٹیشن میں کیا مدد کر سکتا ہوں' اس کے بقول کہ آج ہی اس کی پریذنٹیشن ہے اور اس نے جو موضوع بتایا تھا وہ کسی نئے دریافت ہونے والے ذرے کی بات کر رہی تھی جس کا نام دو سائنسدانوں ہگ اور بوسون کے ناموں کی نسبت سے ہی رکھا گیا تھا یعنی کہ اس کا موضوع ہگ بوسون ایک نیا دریافت ہونے والا ذرہ تھا۔ یہ نئی دریافت اور اس کے سائنس دان دونوں ہی میرے لیے بالکل اجنبی تھے۔ معلومات ہی سہی یہ سوچ کر میں نے اپنا کمپیوٹر آن کیا اور سرچ انجن میں ہگ بوسون لکھ کر جو انٹر کا بٹن دبایا تو سرعت سے اس موضوع سے متعلقہ بہت سے صفحات میرے سامنے کھل چکے تھے۔ پھر ایک ایک کر کے میں ان صفحات کا مطالعہ کرنے لگا تھا۔

دنیائے سائنس کس قدر ترقی یافتہ ہو چکی تھی اور پھر اسی ترقی یافتہ دنیا کے دو بڑے سائنس دان ہگ اور بوسون خود دنیا کو بتا رہے تھے کہ "یس" "آئی ایم دابلیور" وہ اس نئے دریافت ہونے والے ذرے کے لیے منعقد ہونے والی اس عظیم وعالیشان تقریب میں جہاں دنیا جہاں سے آئے سینکڑوں اعلیٰ دماغ موجود تھے۔ جن میں ہر مذہب رنگ و نسل سے تعلق رکھنے والے افراد جمع تھے۔ وہ انہی کے سامنے بے ساختہ اپنے ہاتھ اٹھائے خوشی سے سرشار ہو کر بتا رہے تھے کہ انہیں یقین ہو گیا ہے کہ خدا ہے' کوئی ہے' جس کے دم سے اس کائنات کا نظام چل رہا ہے' کسی اعلیٰ وارفع واحد و یکتا ہستی کا وجود ہے جو کائنات کے ذرے ذرے سے ظاہر ہو رہا ہے۔ مجھے یومنہ کا چنا یہ موضوع بے حد پسند آیا' جوں جوں میں مطالعہ کرتا چلا گیا۔ مجھے اس نئی دریافت سے متعلق بہت سی معلومات حاصل ہوتی چلی گئیں پھر ایک دم سے مجھے دہریہ قسم کے لوگوں کا خیال آنے لگا جو سرے سے ہی خدا تعالیٰ کے وجود سے منکر ہیں' میں اپنی اب تک کی زندگی میں کسی ایسے شخص سے نہ ملا تھا لیکن اب سوچ رہا تھا کہ اگر زندگی نے وفا کی اور کبھی ایسا کوئی شخص زندگی میں ملا تو اسے یہ ضرور کہوں گا کہ تم جیسے لوگ جو خدا تعالیٰ کے وجود کو نہیں مانتے' اس کے بھیجے نبیوں کو بھلا کیسے مانو گے' ان پر نازل کردہ مصحف کا بھلا کیونکر مطالعہ کرو گے لیکن آج سائنس بھی اس حقیقت کا اعتراف کرنے پر مجبور ہے جس حقیقت سے تم لوگ نظریں چرا رہے ہو۔ یہ تمہی لوگوں کے لیے لمحہ فکریہ ہے۔

ایسے ہی خیالوں کے دائرے سے میں اس وقت پلٹا جب دروازے پر کوئی دستک دے رہا تھا۔ میں نے آواز دی تو یہ بابا عبدالقادر تھے۔ وہ دوا والی ٹرے اٹھائے اندر داخل ہوئے۔

"صاحب دوا لے لیجیے۔" انہوں نے ٹرے کو میز پر رکھتے ہوئے نہایت شائستگی سے کہا۔ میں دوا کھا لوں گا میں نے فقط انہیں اشارتاً ہی جواب دیا۔ جسے سمجھ لینے کے باوجود وہ وہی کھڑے رہے پھر

میرے مزید کچھ بھی کہنے سے پہلے ہی وہ دوبارہ بولے۔

"بڑے صاحب کا پیغام ہے میں آپ کو دوا کھلا کر ہی کمرے سے باہر آؤں۔" اور میں ان کی بات سنتے ہی سوچنے لگا کہ ایک بڑے ابا کے سوا اور بھی تو گھر میں اتنے سارے لوگ موجود ہیں۔ میں یہ سوچ ہی رہا تھا کہ جب بابا عبدالقادر نے پانی بھرا گلاس میری جانب بڑھا دیا۔ میں نے دوا کھالی تو وہ دوا والی ٹرے اٹھا کر پھر کمرے سے چلے گئے تھے۔

دوپہر کھانے کے بعد میں ذرا استراحت کو لیٹ گیا تھا اور جو عصر کی نماز ادا کرنے کے بعد میں کمرے سے باہر آیا تھا تو میرا مقصد فقط بڑے ابا کے کمرے میں جا کر ان کا حال دریافت کرنا تھا۔ اب اس عمر میں وہ غذا سے زیادہ دوا سے ہی چل رہے تھے۔ پھر میں ان کے کمرے تک پہنچنے ہی والا تھا جب یکا یک مجھے اپنے ہاتھ کے ساتھ کسی ننھے سے ہاتھ کے چھونے کا احساس ہوا اور جو میں نے سر گھما کر دیکھا تو یہ رومی میاں تھے۔ میں نے ان کے مقابل بیٹھتے ہوئے ان کے ہاتھ پر بوسہ دیا تو مجھے ان سے معلوم پڑا کہ وہ میرے لیے کسی کا پیغام لائے تھے اور وہ یومنہ تھی۔ جو اس وقت لان میں بیٹھی میرا انتظار کر رہی تھی۔

رومی میاں کے کاندھے پر ہلکی سی تھپکی لگا کر میں نے کہا کہ انہیں بولنا وہ تھوڑی دیر میں آ رہے ہیں اور میں بڑے ابا کے کمرے کی جانب بڑھ گیا۔ ان کے کمرے میں پہنچ کر مجھے معلوم پڑا کہ وہ اپنے کمرے میں ہی نہ تھے اور یوں اب میں لان کی جانب بڑھتے ہوئے سوچ رہا تھا کہ وہ عمر کے اس حصے میں بھی آرام سے کہاں بیٹھنے والے تھے۔ لازماً کسی کا کوئی مسئلہ سلجھانے گئے ہوں گے یا کسی کی مالی اعانت کو پہنچے ہوں گے۔ ان میں اور میرے ابا میں یہی ایک بڑا فرق تھا۔ میرے ابا ٹھہرے آج کی دنیا کے مادہ پرست انسان' آج وہ جس بھی مقام پر تھے وہ سارا مقام و مرتبہ بڑے ابا کی بدولت ہی تو تھا۔ انہوں نے جو اپنی زندگی کے کئی برس بنا کسی لالچ و طمع کے انسانیت کی بھلائی میں صرف کیے تھے۔ میرے ابا آج ان برسوں کا حساب دولت سمیٹ کر چکا رہے تھے۔ کبھی میں بھی ابا کے ساتھ ان کی دولت سمیت سیاست کا ایک اہم حصہ تھا لیکن آج مجھے ایک ایم این اے کا بیٹا ہونے پر کوئی فخر محسوس نہ ہوتا تھا۔ آج اگر گھر میں میری کوئی پسندیدہ شخصیت تھے تو وہ بڑے ابا ہی تھے۔ یونہی سوچتے ہوئے میں لان میں لگی کرسیوں تک پہنچ چکا تھا۔ یومنہ مجھے دور سے ہی اپنی طرف بڑھتا دیکھ کر اٹھ کھڑی ہوئی تھی۔ تو پاس پہنچ کر میں نے سلام میں پہل کی اور اسے کھڑا دیکھ کر خود بھی بیٹھتے ہوئے اسے بیٹھنے کا اشارہ کیا۔

پھر ایک نظر میں ہی اسے دیکھ کر مجھے یوں لگا جیسے اس روز ڈائننگ ہال میں مجھ پر طاری ہو جانے والی عجیب کیفیت کو دیکھ کر اس کے ذہن میں ایسے بہت سے سوال اٹھ رہے تھے جس کے جواب وہ مجھ سے حاصل کرنا چاہتی تھی۔ وہ اب ہمارے گھر کے ایک اہم فرد کی طرح تھی۔ اگر وہ مجھ سے کچھ جاننا بھی چاہتی تو مجھے اسے کچھ بتانے میں کوئی حرج محسوس نہ ہوتا' لیکن پھر یہ سوچ کر کہ ابھی اسے ہمارے ہاں آئے دن ہی کتنے ہوئے ہیں جو یوں میں اس کے سامنے اپنی زبوں حالی کی روداد کھول کر بیٹھ جاؤں۔ "آج آپ کی پریذنٹیشن کیسی رہی۔" اس سے پہلے کہ وہ مجھ سے کوئی سوال کرتی میں نے موضوع ہی بدل ڈالا۔

"جی...... دراصل میری باری آنے تک پیریڈ

ٹائم آف ہوگیا تھا' یوں اب میری پریذنٹیشن کل ہوگی۔'' اس نے ایک دم سے چونک کر جواب دیا۔ گویا وہ کسی گہری سوچ میں محو تھی۔ اسے پھر سے خاموش پا کر میں بولا۔

''اب اگر آپ کو کسی بھی قسم کی مدد کی ضرورت ہو تو بولیے گا۔'' وہ میری یہ بات سن کر مسکائی اور کہنے لگی کہ اس نے رومی کو میرے پاس اسی مقصد سے بھیجا تھا۔ پھر وہ مجھے اپنی تیاری سے متعلق آگاہ کرنے لگی۔ اسے سننے کے بعد ہی مجھے اندازہ ہوا کہ وہ کافی اچھے ذہن کی مالک تھی۔ وہ ہگ بوسون کے اس نئے دریافت ہونے والے ذرے اور اس کی ساخت کو طبعی یا حسابی انداز میں کلیے سے بڑی مہارت سے بیان کرسکتی تھی۔ اس کی تیاری ایک اعلیٰ پریذنٹیشن کے لیے کافی تھیں۔ وہ بول چکی تھی' اب میری باری تھی۔ میں نے فقط اس کی معلومات کی ترتیب کو درست کیا۔ اسے بتایا کہ وہ پریذنٹیشن کا آغاز وہاں سے کرے جب ایک عظیم و عالیشان تقریب کے دوران ہگ اور بوسون ہر رنگ و نسل اور مذہب سے تعلق رکھنے والے لوگوں کے سامنے بے ساختہ پکار اٹھے تھے۔ ''یس آئی ایم دا بلیور'' ایسا کہتے ہوئے میں اسے دیکھ رہا تھا کہ وہ مجھے سن کر جہاں اسے میری کوئی بات مفید لگتی' وہ اپنے پاس رکھی نوٹ بک میں اسے درج کر لیتی تھی اور جونہی میری بات مکمل ہوئی تو اب وہ مجھے کچھ الگ ہی انداز سے دیکھ رہی تھی۔ پھر اس کے استفسار پر کہ مجھے یہ سبھی معلومات کیسے حاصل ہوئیں۔ میں نے اسے آج اپنی سوچ کے حوالے سے آگاہ کیا تو ہمیں وہاں بیٹھے وقت کے بیتنے کا جیسے احساس ہی نہ ہوا تھا' اب سورج غروب ہونے کو ہی تھا۔ میرے یومنہ کے ساتھ آ کر بیٹھنے کے بعد مجھے اندازہ تھا کہ اب وہاں کوئی اور نہیں آئے گا۔ بڑے ابا تو دور کی بات بھابی' بچوں تک کو میرے قریب نہ آنے دیتی تھی۔ رومی میاں ابھی دو ماہ کے ہی تھے جب میری طبیعت بگڑ گئی تھی' اور جب میری حالت سنبھلی اور میں اپنے گرد و پیش کے ماحول کو ذرا سمجھنے کے قابل ہوا تو رومی میاں بڑے ہو چکے تھے اور پھر صائم میاں جو دنیا میں آئے تو میرا کتنا جی چاہتا کہ میں انہیں انگلی پکڑ کر چلنا سکھاؤں' جب وہ اپنے لڑکھڑاتے قدموں سے میری جانب بڑھتے تو اسے گرنے سے پہلے ہی اٹھا کر اپنی بانہوں میں سمیٹ لوں۔ اوپر ہوا میں جو اچھالوں تو اس کے معصوم قہقہے میرے کانوں میں کیسا سرور بھر دیں اور جو وہ اپنے دودھ کے دانتوں سے میرے ہاتھوں پر کاٹے تو میں اس میٹھے درد کے احساس کو محسوس کرنا چاہتا تھا لیکن بھابی کیا سمجھتی میرے ایسے جذبات کو' ان کے نزدیک تو میں ایک خبطی' جنونی انسان تھا جو کسی بھی لمحے ان کے بچوں کو نقصان پہنچا سکتا تھا۔ ''اشھد ان لا الہ الا اللہ'' ایک دم سے میں خیالوں کے دائرے سے پلٹا' مغرب کی اذان شروع ہو چکی تھی اور یومنہ بھی مجھ سے اجازت لے کر جا چکی تھی۔ میں جھٹ سے اٹھا وضو تو تھا ہی وہیں سے سیدھا مسجد کی جانب چل پڑا۔

گھر سے مسجد تک کا فاصلہ اتنا تھا کہ تکبیر تحریمہ کے ساتھ شامل ہونے کے لیے مجھے اذان کہ شروع ہونے سے ذرا پہلے گھر سے چلنا ہوتا تھا اور اب میرے گھر سے نکلنے تک موذن نصف سے زیادہ اذان کہہ چکا تھا۔ یوں میرے مسجد میں پہنچنے تک جماعت کھڑی ہو چکی تھی لیکن مجھے پہلی ہی رکعت میں جا ملنے کا موقع مل گیا تھا۔ فرض نماز کی ادائیگی کے بعد سنتیں اور نوافل ادا کر کے میں رب سوہنے کے برستے نور و انوار میں بھیگنے کے لیے وہیں بیٹھا

رہا۔ بسا اوقات مسجد میں یونہی بیٹھے ہوئے مجھے وہی پہلے ساطۂ عالم یاد آنے لگتا اور ساتھ ہی مجھے وہ نماز یاد آنے لگتی تھی جو ایک بار میں نے اپنے دوستوں کے ساتھ ادا کی تھی۔

ایک روز جو ہم دوستوں کا گروپ یونیورسٹی سے نکلا تو ہمیں ہر سمت سے اذان کی آوازیں آتی سنائی دے رہی تھیں۔ اس روز ہمارے ساتھ ایک نیا لڑکا اعظم بھی تھا۔ وہ جو نماز پڑھنے کا عادی تھا' تو اس روز اس نے ہمیں بھی مسجد چل کر نماز ادا کرنے کی دعوت دی۔ اس کی دعوت پر جو میرے دوست مسجد کی جانب بڑھے تو لامحالا مجھے بھی ان کے ساتھ چلنا پڑا تھا۔ وگرنہ میں تو کبھی عید کی نماز ادا کرنے کسی عید گاہ تک بھی نہ گیا تھا۔ میری اس روز ادا کی نماز کی حرکات وسکنات کچھ یوں تھیں جیسے کسی نے چلتی وڈیو کو چار گنا کے حساب سے فارورڈ پر چلا دیا ہو۔ دوسروں کے دو رکعت ادا کرنے تک میں باہر کھڑا اپنے دوستوں کے باہر آنے کا انتظار کر رہا تھا اور آج مجھے کیسا سرور ملتا تھا' نماز میں ایک ایک رکعت کو ادا کرنے میں۔ یہی سوچ کر بے ساختہ میرے لب پر ادا ہونے لگا تھا کہ وہی ستار عیوب ہے جو ہماری برائیوں کو اچھائیوں سے بدلتا ہے پھر میں مسجد سے جو باہر نکلا تو میرے دل کی طرح باہر کا موسم بھی بدل چکا تھا۔ گھٹا نے جو برس کر رم جھم سی لگا رکھی تھی تو ساتھ ہی سنسناتی ہوائیں بھی چل رہی تھیں۔ اس برستی پھوار اور رم جھم میں' میں گھر پہنچنے تک کوئی بھیگنے والا نہ تھا' ایسا سوچتے ہوئے میں نے جیسے ہی اپنا پہلا قدم آگے بڑھایا تو تیز ہوا کے جھونکے سے اپنے کاندھوں کے گرد اوڑھی چادر کو میں نے بامشکل کھلنے سے روکا تھا لیکن میں ٹھہرا نہیں اور اب راستہ بھر میں سوچتا چلا جا رہا تھا کہ بابا رب نواز کی دی یہ چادر کیسا

طلسماتی چولا ثابت ہو رہی تھی۔ پہلے تو اس نے میرے جسم کو حرارت پہنچا کر میری روح تک کو گرما دیا تھا اور اب چل رہی یخ بستہ ہواؤں کے سامنے بھی ڈھال ثابت ہو رہی تھی۔ ساتھ ہی مجھے یاد آنے لگا کہ بابا رب نواز نے ہدایت کی تھی۔ ''کہ میاں جب اچھے ہو جاؤ تو اسی جگہ آ کر مجھے یہ چادر لوٹا جانا۔'' ایسا یاد آتے ہی میں نے ارادہ کر لیا کہ جواب بڑے ابا ملیں گے تو میں ان سے اس سلسلے میں بات کروں گا۔

گھر پہنچ کر میں سیدھا اپنے کمرے میں چلا آیا تھا۔ پھر اوڑھی ہوئی چادر پر جو نمی تھی' اسے میں نے جھاڑ کر ایک طرف پھیلا دیا تھا اور بستر پر جو ذرا سی دیر آرام کرنے کو لیٹا ہی تھا کہ دروازے پر دستک ہونے لگی تھی۔ میں نے آواز دی تو بابا عبدالقادر دوا والی ٹرے ہاتھوں میں اٹھائے اندر داخل ہوئے۔ انہیں کمرے میں داخل ہوتا دیکھ کر میں فوراً ہی اٹھ بیٹھا تھا۔ کیونکہ میں جانتا تھا کہ اب وہ مجھے دوا کھلائے بغیر کمرے سے نکلنے والے نہ تھے۔ یہی وجہ تھی کہ پھر کسی بھی حجت کے بغیر میں نے دوا کھا لی تھی۔

اگلے روز ناشتے کی میز پر یومنہ میرے پہنچنے سے پہلے ہی موجود تھی اور میرے وہاں بیٹھنے کے بعد مجھے یہ اندازہ لگانے میں ذرا دیر نہ لگی تھی کہ میرے پہنچنے سے پہلے وہاں میری ہی باتیں ہو رہی تھیں۔ یومنہ اپنی پریذنٹیشن کے لیے مجھ سے حاصل ہوئی معلومات سے سبھی کو آگاہ کر چکی تھی۔ پھر ناشتہ کرتے ہوئے وہ یکا یک مجھ سے مخاطب ہوئی۔

''طٰہٰ آج آپ میرے ساتھ یونیورسٹی چل سکتے ہیں؟'' اس کی بات سن کر فقط میں ہی نہیں باقی لوگوں نے بھی ناشتہ چھوڑ کر یوں حیرت سے اس کی جانب دیکھا۔ جب اس کی بات ختم ہوئی تو میں کیا کوئی جواب

دیتا بڑے ابا فوراً ہی قہقہہ لگاتے ہوئے بولے۔

''بھئی کیوں نہیں جائے گا۔'' پھر وہ میری جانب مسکا کر دیکھتے ہوئے بولے۔ ''طٰہٰ میاں ذرا آج اپنے خاص وقت میں سے کچھ وقت یومنہ بیٹی کے لیے بھی نکال کر اس کی یونیورسٹی چلے جانا۔'' اب کی بار جو بڑے ابا بھی اس کے ہم آواز ہو کر بول پڑے تو پھر میں بھلا ان کی کسی بھی بات کو رد کرنے سے متعلق سوچ بھی کیسے سکتا تھا۔ یوں میں نے مختصر سا جواب دے کر ہامی بھر لی تھی اور میرے ماں اور ابا یوں حیرت سے ایک دوسرے کا منہ تکنے لگے جیسے آج کوئی ان ہونی ہوگئی ہو۔ ماں نے جواب کی بار میری جانب دیکھا تو وہاں مجھے ممتا کی وہی پیاسی جھلک دکھائی دی۔

مجھے احساس تھا کہ میری ذات سے جڑے ان کے کتنے ارمان تھے اگر وہ مجھ سے خفا تھے تو یہ بھی ظاہراً ہی تھا۔ میں نے کبھی ان کی بات جو نہ مانی تھی۔ آخر کو تھے تو ماں باپ ہی۔ چاہے میرے ان سے کتنے ہی اختلافات کیوں نہ ہوں وہ مجھ سے کتنا ہی خفا کیوں نہ ہوں لیکن اس رشتے کی عظمت ان سب باتوں سے بڑی تھی۔

ڈائننگ ہال سے اپنے کمرے میں پہنچ کر مجھے خود پر غصہ آرہا تھا کہ میں نے یومنہ کے ساتھ اس کی یونیورسٹی چلنے کے لیے ہامی کیوں بھر لی تھی؟ لیکن بات تو وہاں سے شروع ہوئی تھی جب یومنہ نے مجھ سے اپنی پریذنٹیشن کے لیے مدد چاہی تھی اگر میں اسی روز انکار کر دیتا تو آج یہ نوبت نہ آتی۔

میں جو کہ عرصہ دراز سے ایک تنہائی سی تنہائی کا شکار تھا تو یہ میرے اردگرد جیسے کوئی مکڑی کا سا جالا بن چکی تھی۔ مجھے اس تنہائی سے پیچھا چھڑانا دشوار معلوم ہوتا تھا اسی لیے گھر میں یا خاندان بھر کی کسی بھی تقریب میں میں جانے سے کتراتا تھا۔ بسا اوقات گھر میں منعقدہ کسی تقریب میں میں بھولے سے پہنچ جاتا تو پھر بھی کو میرا وجود وہاں گراں گزرتا۔ وہ اب اس بات کے عادی ہوچکے تھے کہ میں کسی بھی قسم کی زندگی کی پہلی سی رعنائیوں کا حصہ نہیں بننا چاہتا یوں وہ مجھے کسی قسم کی مصروفیت سے آگاہ کرنا بھی مناسب نہ سمجھتے تھے اور جو کبھی میں ان جانے میں گھر میں منعقدہ کسی تقریب میں اچانک سے جا پہنچتا تو مجھے وہاں پا کر جو ان کا عزوقار مجروح ہونے لگتا تو پھر وہ چاہتے کہ میں جلد سے جلد وہاں سے ہٹ جاؤں۔ اس بات کا مجھے خود بھی احساس ہوتا اور میں وہاں سے ہٹنے میں ذرا وقت نہ لگاتا۔

ابھی اپنے کمرے میں پہنچ کر میں ایسی ہی کشمکش کا شکار تھا کہ یارب جیسا میں نے حلیہ بنا رکھا ہے اسی حلیے میں میں اس کے ساتھ چلوں گا تو وہ کیسا محسوس کرے گی۔ یونیورسٹی میں اس کی کلاس میٹس بھی ہوں گی وہ لازماً مجھے ان سے بھی ملوائے گی تو یوں وہاں اس کا امیج خراب ہوگا اور میں بھلا ایسا کیونکر چاہوں گا۔

ایسا ہی سوچ کر آج عرصہ دراز کے بعد میں ان بند کبرڈ کے پٹ کھولے جہاں وہ سارے ملبوسات میرا انتظار کر رہے تھے جو ماں ابا اور بھائی میری گزری ہر سالگرہ پر مجھے تحفتاً دیتے آئے تھے لیکن میں نے ان کو استعمال کرنا تو دور کی بات کبھی ٹھیک سے دیکھا تک بھی نہ تھا پھر جس سوٹ پر آ کر میرا ہاتھ رک گیا تھا وہ فقط ایک ہی شخص مجھے گفٹ کر سکتا تھا اور وہ جی ایم تھے۔ بڑے بھائی غلام مصطفیٰ کو میں جی ایم ہی کہہ کر پکارا کرتا تھا جی ایم میری پسند نہ پسند سے اس قدر واقف تھے کہ بارہا یوں ہوتا کہ وہ اپنے لیے لایا سوٹ بھی مجھے دے

دیتے کہ میرے تن پر آتے ہی وہ کچھ یوں جچنے لگتا تھا یا یوں کہہ لیں کہ ہم دو بھائیوں میں جو چیز مشترک تھی وہ لباس کی پسندیدگی ہی تھی۔

پھر لباس تبدیل کرنے کے بعد جو ایک اور کام میں نے کیا وہ بابا رب نواز کی دی چادر تھی جسے میں نے رات خشک ہونے کے لیے پھیلایا تھا اور اب ایک بار پھر سے جھاڑ کر تہہ لگا کر اسے اپنے بستر پر رکھ دیا تھا۔ اس کے بعد میں ڈریسنگ کے سامنے کھڑا بال بنا رہا تھا' بال تو خاصے بڑھ چکے تھے اور داڑھی تو میں باقاعدہ رکھ چکا تھا۔ اپنے شانوں تک دراز بال دیکھ کر مجھے کالج کا زمانہ یاد آنے لگا تھا۔ جب ایسے ہی بال بڑھائے میں پونی کیا کرتا تھا۔ پھر یکایک جو میری نظر گھڑی پر پڑی تو میں نے مزید کمرے میں ٹھہرنا مناسب نہ سمجھا اور اپنے کمرے سے نکل کر جو میں پورچ میں پہنچا تو مائیکل ہمارا ڈرائیور مجھے دیکھ کر جیسے دنگ رہ گیا۔ میں اسے اپنی جانب بڑھتا دیکھ کر وہیں ٹھہر گیا۔ تو وہ خوشی سے کیسا سرشار بے قابو ہو کر میری جانب بڑھا چلا آیا تھا پھر میرے قریب پہنچ کر بے ساختہ اس نے مجھے اپنے گلے سے لگالیا تھا اور جب یومنہ اپنے ہاتھوں میں ایک بڑی فائل اور چند ایک کتابیں اٹھائے پورچ میں پہنچی تو ایسی ہی کچھ ملتی جلتی حالت اس کی بھی ہو رہی تھی۔ اس نے آج پہلی بار مجھے کالی چادر کے بغیر دیکھا تھا۔ جسے میں ہمہ وقت اوڑھے رکھتا تھا۔ ان سب کے علاوہ کوئی اور بھی تھا جو مجھے دیکھ رہا تھا۔ کوئی اور بھی تھا جو آج برسوں بعد مجھے زندگی کی پہلی سی رعنائیوں میں واپس پلٹتا دیکھ کر اپنے آنسوؤں پر قابو نہ رکھ پایا تھا۔ میں جانتا تھا کہ ماں اور ابا اپنے کمرے کی اس کھڑکی کے پاس کھڑے جہاں سے پورچ کا سارا منظر واضح دکھائی پڑتا تھا مجھے دیکھ رہے تھے اور اپنے آنسوؤں پر قابو نہ رکھ پائے تھے۔ میں یہ جاننے کے باوجود بھی نہ پلٹا اور میں نے اس کھڑکی کی جانب نہ دیکھا جہاں وہ کھڑے مجھ پر نہال ہو رہے تھے۔

یومنہ گاڑی میں بیٹھ چکی تھی۔ میں بھی آگے بڑھ کر مائیکل کے مقابل سیٹ پر بیٹھا تو میرے بیٹھتے ہی مائیکل نے گاڑی آگے بڑھادی۔ رم جھم سے شروع ہونے والی بارش رات گئے تک موسلا دھار ہو کر برستی رہی تھی جس کے اثرات ابھی تک جگہ جگہ کھڑے پانی کی صورت میں باقی تھے اور آسمان پر بادل اب بھی کہیں کہیں ٹولیوں کی شکل میں تیرتے دکھائی پڑ رہے تھے۔ پھر جب بھی انہی بادلوں کی کوئی مست ٹولی سورج کے سامنے آ کر اس کی کرنوں کو ڈھانپ لیتی تو کہیں دھوپ تو کہیں چھاؤں کا سا منظر دکھائی دیتا۔

ہماری گاڑی سروس روڈ سے نکل کر اب شہر کی ایک اہم مصروف ترین شاہراہ سے گزر رہی تھی۔ سڑک کے بیچ بیچ لگے برقی کھمبے جن پر موجود قمقمے رات کو روشن کر دیئے جاتے تھے۔ ان کے ساتھ لٹک رہے فلیکس ابا کی الیکشن کے دنوں چلائی سیاسی مہم کی یاد دلا رہے تھے۔ کبھی ان پر ابا کے ہمراہ میری تصاویر بھی آویزاں ہوتی تھیں لیکن آج میں خود ان کی کسی قسم کی سیاسی سرگرمیوں کا حصہ بننا نہیں چاہتا تھا۔

اب ہم یونیورسٹی پہنچنے والے تھے۔ یونیورسٹی گھر سے کوئی زیادہ فاصلے پر نہ تھی۔ تھوڑی ہی دیر میں ہم یونیورسٹی جا پہنچے تو مائیکل نے گاڑی پارکنگ ایریا میں جا روکی۔ میں اور یومنہ گاڑی سے اترتے ہی یونیورسٹی کی اندرونی عمارت کی جانب بڑھ چکے تھے۔ آگے بڑھتے ہوئے اب مجھے کئی عمارتیں دکھائی دے رہی تھیں اور یومنہ مجھے وہیں سے الگ الگ شعبوں سے متعلقہ عمارتوں کا تعارف اشاروں سے کروا رہی تھی۔

کچھ ہی پل میں ہم اس عمارت تک پہنچ گئے تھے جس کے آڈیٹوریم میں یومنہ کی پریذنٹیشن ہونا تھی۔ ہال میں داخل ہونے سے ذرا پہلے میں نے اسے کہا کہ میں اس کے ساتھ آ ہی گیا ہوں تو مجھے واپس جانے کی کوئی جلدی نہیں۔ ایسا میں نے فقط اس مقصد سے کہا تھا تاکہ وہ اطمینان سے اپنی پریذنٹیشن دے سکے اور جب اس کی کلاس مکمل ہو تو ہم پھر لوٹیں، وہ میری یہ بات سن کر اس قدر خوش ہوئی کہ پھر جھٹ سے بولی۔

"طہٰ آپ سے میری چند کلاس فیلو بھی ملنا چاہتی ہیں۔" اس کی بات سن کر مجھے لگا جو بات اس نے پریذنٹیشن مکمل ہونے کے بعد کہنا تھی وہ پہلے ہی کہہ دی تھی۔ میں فقط اس کی بات کے جواب میں مسکرا دیا۔ اب ہم آڈیٹوریم ہال میں پہنچ چکے تھے اور میں پچھلی کسی نشست پر جا بیٹھا تھا، جب کچھ دیر میں پریذنٹیشن کا آغاز ہوا تو پہلی باری یومنہ کی ہی تھی۔ اس نے ہگ بوسون تھیوری کا تعارف کروانا شروع کیا تو اس کا موضوع ہی کچھ اس قدر دلچسپ تھا کہ سارے ہال پر جیسے گہرا سکوت طاری ہو گیا اور میری دی معلومات سے بھی اس نے بھرپور استفادہ حاصل کیا تھا۔ وہ پُراعتماد انداز میں اپنی پریذنٹیشن مکمل کرنے کے بعد واپس اپنی نشست پر جا بیٹھی تھی اور یونہی جب ایک، دو اور لڑکیوں نے بھی اپنی پریذنٹیشن مکمل کر لی تو وہ میرے پاس آئی۔ وہ جاننا چاہتی تھی کہ کہیں میں بوریت تو محسوس نہیں کرنے لگا۔ اس کی یہ بات سن کر پہلے تو میں نے اسے خوش دلی سے سراہتے ہوئے بہترین پریذنٹیشن دینے پر داد دی اور پھر اسے کہا کہ اس کی پریذنٹیشن میں نے دیکھ لی ہے اب اگر پیریڈ ختم ہونے تک میں اسے یہاں بیٹھا نہ ملوں تو میں ہال سے باہر کھڑا اس کا انتظار کر رہا ہوں گا۔ وہ میری بات سن کر چلی گئی تو چند لمحوں تک وہی بیٹھے رہنے کے بعد میں وہاں سے اٹھ کر باہر آ گیا تھا۔ امتحانات کے دن ہونے کی وجہ سے یونیورسٹی تقریباً سنسان دکھائی دے رہی تھی۔ وہاں کھڑے رہ کر مجھے اپنے یونیورسٹی کے دن یاد آنے لگے تھے۔ میں اچھے ذہن کا مالک تھا، لیکن میری سرگرمیاں اچھی نہ تھیں۔ اگر میں بھی اپنی تعلیم کو سنجیدہ لے کر چلا ہوتا تو اگر آج جی۔ ایم کی طرح پی ایچ ڈی نہ بھی ہوتا تو کم سے کم انجینئر یا وکیل تو ضرور ہوتا۔

جب وقت گزر جاتا ہے تو ہم اسے مقدر میں ہی نہ لکھے ہونے کا راگ الاپتے پھرتے ہیں۔ سارا خطاوار اپنے مقدر کو گردانے لگتے ہیں۔ حالانکہ یہ ہم پر ہی منحصر ہوتا ہے کہ ہم اس خاص وقت کی قدر و اہمیت کو کس حد تک سنجیدہ لیتے ہیں۔ ہم جانتے بوجھتے اس وقت کو بے دریغ غیر معیاری سرگرمیوں میں لٹا دیتے ہیں اور جب وقت اپنی دھیمی دھیمی رفتار سے گزرتا چلا جاتا ہے تو ماضی ایک پچھتاوا بن کر رہ جاتا ہے۔ ایسی ہی سوچوں کے دائرے سے میں اس وقت پلٹا جب مجھے اپنے عقب سے میٹھی چہکاریاں سی سنائی دیں۔ میں سمجھ گیا تھا کہ یومنہ اپنی کلاس میٹس کے ساتھ ہال سے باہر آ چکی ہے اور اب وہ میری طرف ہی آ رہی ہیں، لیکن یہ جاننے کے باوجود بھی میں پلٹا نہیں، پھر ایک ہاتھ میری جانب بڑھا، ہاتھ کی جانب دیکھتے ہوئے جو میں پلٹا تو یہ یومنہ تھی۔ اس کا میری جانب بڑھا ہوا ہاتھ ابھی تک ہوا میں ہی معلق تھا۔ پھر نہ چاہتے ہوئے بھی مجبوراً مجھے اس کے ہاتھ میں اپنا ہاتھ دینا پڑا اور ساتھ ہی میری نظر پاس کھڑی تین اور لڑکیوں پر پڑی۔ میرا ہاتھ ابھی تک یومنہ کے ہاتھ میں ہی تھا۔ جب وہ سرعت

سے بولی۔

''مجھے پریذنٹیشن میں بہت اچھے مارکس ملے ہیں۔ آئی ایم ریئلی تھینک فل ٹو یوطہ۔''

اس کی بات سن کر مجھے بہت اچھا لگا اور میں سوچنے لگا کہ ساری محنت تو اس کی اپنی ہی تھی پھر وہ اپنا ہاتھ میرے ہاتھ سے جدا کرتے ہوئے مجھے اپنی کلاس میٹس سے ملوانے لگی۔ جانے وہ انہیں میرے متعلق کیا کچھ بتاتی رہی تھی کہ ان کی باتوں سے مجھے یوں محسوس ہو رہا تھا جیسے میں کوئی برگزیدہ ہستی ہوں' جس کی زبان سے ادا ہوئی ہر بات اللہ کی بارگاہ میں قبول ہو اور ساتھ ہی مجھے لگنے لگا کہ ہم لوگ کتنے ظاہر پرست ہوتے ہیں۔ بڑھی ہوئی داڑھیاں' لمبی زلفیں اور چہرے پر دکھائی دیتا نور ہی ہمارے نزدیک پہنچے ہوئے لوگوں کی علامتیں بن چکی ہیں۔

پھر باتوں باتوں میں ہی ہم پارکنگ تک پہنچ چکے تھے۔ یومنہ نے اپنی دوستوں کو الوداع کہا اور ہمارے گاڑی میں بیٹھتے ہی مائیکل نے گاڑی آگے بڑھا دی تھی پھر جب تک ہم گھر پہنچتے عصر کی اذانیں شروع ہو چکی تھیں یوں گھر سے قریب ہی واقع مسجد کے پاس سے گزرتے ہوئے میں نے مائیکل کو روکنے کو کہا اور میرے گاڑی سے اترتے ہی مسجد کی جانب بڑھنے تک مائیکل گاڑی لے کر آگے بڑھ چکا تھا۔

⦿......●●●......⦿

مسجد میں نماز ادا کر کے میں گھر پہنچا تو گھر کے خاص دروازے سے اندر قدم رکھتے ہی مجھے ایک طرف سے بچوں کا شور سنائی دیا۔ میں نے سر گھما کر دیکھا تو یومنہ بچوں کے ساتھ لان میں بیڈمنٹن کھیل رہی تھی۔ میرے گھر میں داخل ہوتے ہی اس نے بھی مجھے دیکھ لیا تھا لیکن میں رکا نہیں بلکہ اسے نظر انداز کیے آگے بڑھ چکا تھا۔ ابھی میں نے چند قدم ہی آگے بڑھائے ہوں گے کہ جب مجھے اپنے عقب سے یومنہ کی آواز سنائی دی۔ وہ مجھے رکنے کے لیے کہہ رہی تھی۔ اس کی آواز سن کر مجھے رکنا پڑا اور میں نے مڑ کر دیکھا تو وہ بچوں کے ساتھ ریکٹ ہاتھ میں تھامے جوشیلے انداز میں میری جانب بڑھی چلی آ رہی تھی پھر میرے قریب پہنچنے سے پہلے ہی اس نے کچھ دور سے ہی ریکٹ میری جانب اچھال دی۔

''طہ کیچ اٹ اینڈ......'' اور باقی کہ چند الفاظ جیسے اس کے حلق میں ہی دب گئے تھے۔ میں اپنی جگہ سے ہلا تک نہ تھا اور نہ ہی اس کے ہوا میں اچھالے ریکٹ کو میں نے آگے بڑھ کر تھامنے کی کوشش کی تھی۔ اسے مہمان سمجھ کر اب تک جو میں نے اس کے ساتھ وقت گزارا تھا تو وہ یوں مجھ سے بے تکلف ہو رہی تھی مجھے اس کی بیڈمینٹن کھیلنے کی آفر پر سخت غصہ آ رہا تھا' اسی لیے میں مزید وہاں اک لمحے کو بھی نہ ٹھہر سکا تھا اور تیز تیز قدم اٹھاتا اپنے کمرے کی جانب بڑھ گیا تھا۔ میرا ایسا رویہ دیکھ کر جیسے یکا یک اس کے چہرے پر بھی پژمردگی سی چھا گئی تھی۔ وہ متعجب ہو کر چند قدم آگے بڑھی جیسے مجھے پھر سے روکنا چاہتی ہو اور پھر وہیں ٹھہر کر اس نے زمین پر گرے ریکٹ کو اٹھایا اور سراسیمہ ہو کر مجھے جاتا ہوا دیکھتی رہی۔

اپنے کمرے میں پہنچ کر بھی میرا غصہ کم نہیں ہوا۔ فرق صرف اتنا تھا کہ پہلے مجھے اس پر غصہ آ رہا تھا اور اب خود پر آنے لگا تھا' مجھے دیکھتے ہی اس نے چہکتے ہوئے خوشی سے سرشار کیسے ریکٹ کو میری جانب اچھالا تھا اور اپنے ساتھ کھیلنے کی دعوت دی تھی لیکن میرے نظر انداز کرنے پر پھر اسے کس قدر تکلیف پہنچی ہو گی' ایسا ہی کچھ سوچتے ہوئے میں مضطرب سا ہو کر کبھی آرام کرسی پر جا بیٹھتا تو کبھی بستر پر لیٹ

جاتا اور سوچنے لگتا کہ مجھے اس کے ساتھ ایسا سلوک اختیار نہیں کرنا چاہیے تھا۔

اسے ہمارے ہاں آئے ابھی دن ہی کتنے بیتے تھے اور وہ یوں میری ذات سے قریب تر ہوتی چلی جارہی تھی' میرے ماضی سے جڑی حقیقت کا اسے کچھ تو ادراک ہو ہی چکا ہوگا۔ بڑے ابا سے نہیں' ماں' ابا اور بھائی سے بھی نہیں یا گھر کے کسی ملازم سے نہ سہی وہ اب تک بھابی سے تو جان پہچان بنا چکی تھی وہ اسے میرے متعلق کچھ نہ کچھ تو بتاتی ہوں گی' یوں پھر اسے میرا احترام نہیں کرنا چاہیے تھا' مجھ سے اسے کسی قسم کی کوئی ہمدردی بھی نہیں ہونی چاہیے تھی اور میں کسی قسم کی ہمدردی کے قابل ہی کہاں تھا۔ اگر ایسا تھا تو پھر آبیرہ بھی تو میرے دل سے زیادہ قریب تھی۔

ہم زندگی میں جن دوستوں پر اپنی ذات سے زیادہ اعتبار کرتے ہیں' سمجھتے ہیں کہ وہ ہمارے بنا رہ ہی نہیں سکتے' ہمارے لیے وہ اپنی جان تک دے سکتے ہیں' انہیں ہم سے اس قدر محبت ہے' وہی اپنے بن کر دغا دے جاتے ہیں۔ شاید زندگی کو اسی لیے ایک معلم کی طرح کہا گیا ہے کہ وقت بیتنے کے ساتھ ساتھ یہ ہمیں کئی طرح کے درس دیتی ہے۔

یونہی وقت نے مجھے بھی ایک ایسی ہی حقیقت سے لذت آشنائی دلائی تھی یہ خیال آتے ہی میں دھیرے دھیرے اپنے ماضی میں اترنے لگا تھا۔ جب ان دنوں مجھ پر اک عجیب سیمابی کیفیت طاری رہتی تھی' مجھ سے سرزد ہوئے گناہوں کا بوجھ مجھے کسی کروٹ چین نہ لینے دیتا تھا اور میں بےکل سا ہو کر یہ سوچ کر گھر سے باہر چلا جاتا تا کہ باہر کی رونق میں کسی طرح سے اپنے دل کو بہلا سکوں' اپنے ضمیر کی آواز کو دبا سکوں لیکن پھر وہی باہر کی رونق میرے لیے عذاب بن جاتی اور میں مضمحل سا ہو کر وہاں سے سیدھا گھر پلٹ آتا' گھر پہنچ کر اپنے کمرے کو مقفل کر کے بستر پر پڑا رہتا اور چند لمحے ہی راحت میں کٹتے کہ پھر سے دھیرے دھیرے میرا کمرہ بازگشت بننے لگتا اور میرے ضمیر کی آہنی ضربیں مجھے بےکل سا کیے دیتیں اور جب یہ خاموشی میں گونجنے والی بازگشت میرے اعصاب پر بھاری ہونے لگتی تو میں سوچنے لگتا کہ کسی سے اپنی کیفیت بیان کروں تو ہوسکتا ہے کچھ راحت نصیب ہو لیکن کہوں تو کسے' ماں اور ابا تو میرا چہرہ تک نہ دیکھنا چاہتے تھے۔ بھابی اور بھائی بھی مجھ سے خفا تھے۔ اک بڑے ابا ہی تھے تو انہیں میں اپنی بپتا سنا کر مزید آزردہ نہیں دیکھ سکتا تھا۔ یونہی ژولیدہ حال ہو کر میں ہیوی بائیک لے کر جو گھر سے نکلتا تو میرا مقصد فقط اپنے کسی دوست سے مل کر دل کا بوجھ ہلکا کرنا ہوتا تھا۔ اسی مقصد سے پچھلے کئی روز سے میں آبیرہ کے گھر کے چکر لگا چکا تھا اور ہر بار مجھے اس کے گھر کے ملازم سے یہی سننے کو ملتا کہ بی بی صاحبہ گھر پر نہیں ہیں۔

آج میں نے پھر سے اس سے ملنے کی خاطر اپنی بائیک اس کے گھر سے باہر جا روکی تھی۔ سوئچ آف کر کے میں بائیک سے اترنے لگا تو جیسے اپنے پیروں پر لڑکھڑا سا گیا تھا۔ میں نشے میں کب تھا' بلکہ اب تو میں ہر قسم کا نشہ ترک کر چکا تھا۔ پھر شاید یہ ان چیزوں کی طلب تھی لیکن ایسا بھی نہ تھا' میں کئی بار چیلنج کے طور پر نشہ ترک کر چکا تھا اور مجھے ایسا کرنے میں اب مہارت حاصل ہو چکی تھی۔ یقیناً پھر یہ میرے دل کا بوجھ تھا' یا میرے ضمیر کی آواز تھی' جو اب جاگ چکا تھا اور دل کا بوجھ ایک بھاری نشہ بن کر میرے اعصاب سلب کیے جارہا تھا۔ میں کافی عرصہ تو صبر کرتا رہا خود سے ہی لڑتا رہا۔ بارہا سوچتا رہا کہ اگر میں اپنے ماضی کو بھلا نہ سکوں تو وقت گزرنے

کے ساتھ ساتھ لامحالہ اس کے ساتھ جینا تو سیکھ ہی لوں گا لیکن پھر ہر بیتا دن ہر بیتا لمحہ مجھے پہلے سے بھاری لگنے لگتا تھا۔ اپنے اوپر طاری اسی بوجھ کو کسی طرح سے ہلکا کرنے کی خاطر میں آبیرہ سے ملنے آیا تھا۔ وہ میری یونیورسٹی فیلو تھی۔ ہم لوگوں کی بہت سی شامیں ایک ساتھ گزرتی تھیں۔ اگر ہم یونیورسٹی بھی جاتے تھے تو یہ فقط ملاقات کا ایک ذریعہ ہوتا تھا۔ ہر ہفتہ اور اتوار کی شب جو میرے فارم ہاؤس پر جشن ہوتا تھا تو وہ بھی آبیرہ کے نام ہوتا تھا۔ یکا یک مجھے آہنی دروازے کا چھوٹا پٹ کھلنے کی آواز آئی' میں بیل بجا کر اب دروازے کے پاس ہی دیوار سے پشت ٹکائے آنکھیں موندے کھڑا تھا۔

''صاحب آپ۔'' ملازم نے باہر نکلتے ہی حیرت سے میری جانب دیکھ کر کہا۔

''مجھے آبیرہ سے ملنا ہے۔'' حیرت زدہ سے کھڑے ملازم کی بات سن کر میں نے جواب دیا۔

''صاحب! آبیرہ بی بی تو سو چکی ہیں۔'' ملازم نے فوراً جواب دیا جسے سن کر میں نے اپنی جیب سے فون نکالا' ابھی پونے دس ہو رہے تھے۔ وہ اتنی جلدی سونے کی عادی نہ تھی۔ میں نے سوچا۔

''دیکھنا اگر سوئی ہوئی ہیں تو ابھی جاگ جائیں گی تمہاری بی بی صاحبہ۔'' میں نے فون سے آبیرہ کا نمبر ملا کر اپنے سامنے کھڑے ملازم کو یوں دیکھتے ہوئے یہ بات کہی جیسے اس کی کوئی چوری پکڑنے کی کوشش کر رہا تھا۔

لیکن شاید وہ صحیح کہہ رہا تھا۔ آبیرہ نے میرے دو' تین بار کال کرنے پر بھی کال وصول نہ کی تھی۔ اب میں ملازم سے کیا کہتا۔ وہ میرے قریب ہی کھڑا یہ دیکھ رہا تھا کہ میرے بارہا کال کرنے کے باوجود آبیرہ نے میری کال ریسیو نہ کی تھی تو اس نے پلٹ کر دروازہ بند کر لیا تھا اور میں بائیک اسٹارٹ کرنے کے بعد جیسے ابھی تک تذبذب کا شکار اوپر بالکونی کی جانب دیکھ رہا تھا۔

بالاخانہ کی پہلی منزل پر بالکونی سے ملحقہ کمرہ آبیرہ کا ہی تھا جہاں برقی قمقمے بھی روشن دکھائی دے رہے تھے۔ پھر جانے مجھے کیا سوجھی میں نے جو بائیک اسٹارٹ کی تھی تو فوراً ہی بند کرتے ہوئے اسے ذرا پیچھے لے جا کر دیوار کے ساتھ لگا کر کھڑا کیا پھر ایک پیر بائیک پر ٹکاتے ہوئے ذرا سا سہارا لے کر میں دیوار پر چڑھا اور اگلے ہی لمحے اندر کود گیا تھا۔

میرے لیے اس انداز میں آبیرہ کے کمرے تک پہنچنا کوئی نئی یا انوکھی بات بھی نہ تھی۔ اکثر عید کا تحفہ اسے میں اسی انداز میں آ کر دیا کرتا تھا لیکن اندر کودتے ہی یکا یک جو مجھے اس کے گھر میں موجود سربین ڈاگ کا خیال آیا تو جیسے میرے وجود میں سنسنی سی دوڑ گئی تھی۔ میں وقت ضائع کیے بغیر ہی جھٹ سے اس پائپ تک جا پہنچا جس کے سہارے مجھے بالکونی تک پہنچنا تھا۔ اوپر پہنچ کر میں نے دیکھا کہ آبیرہ کے کمرے کی لائٹ آف تھی۔ میں نے بالکونی میں کھلنے والے دروازے کو ذرا سا دبایا' وہ اندر سے بند تھا' لیکن مجھے اندر سے مدھم سی آواز سنائی دی۔ میں اس آواز کو پہچان گیا تھا۔ وہ آبیرہ کی ہی آواز تھی۔ وہ فون پر کسی سے بات کر رہی تھی۔ میں دروازے سے ہٹ کر کھڑکی کے پاس جا کھڑا ہوا۔ یہاں مجھے اس کی آواز واضح سنائی دے رہی تھی۔ وہ ابھی تک فون پر کسی سے باتیں کر رہی تھی۔ جب میں نے اپنے کان کھڑکی سے لگا دیئے۔ ''طٰہٰ پاگل ہو چکا ہے۔ داؤد مجھے اس بات کی سمجھ نہیں آتی ایسے پاگل شخص کو کسی نے یوں کھلا کیوں چھوڑ رکھا ہے۔ آج

پھر آیا تھا‘ میرے گھر وہ تو اچھا ہوا جو میں نے پہلے سے ہی ملازم سے کہہ رکھا تھا کہ وہ موقع محل دیکھ کر اسے مناسب جواب دے دیا کرے۔ نہیں تو آج مجھے اس کی ابنارمل باتیں برداشت کرنا پڑتیں۔“

داؤد کو تو میں جانتا تھا‘ لیکن آبیرہ...... تم ایسی نکلوگی یہ میں نہیں جانتا تھا۔ نہ جانے کیوں میری آنکھیں برس پڑیں یارب...... اور میں اگلے چند لمحوں تک گھٹنوں میں سر دیئے دیوار کا سہارا لے کر وہیں بیٹھا رہا۔

جہاں ایک جانب میں اس کی بے وفائی پر رنجیدہ آنسو بہار ہا تھا تو دوسری طرف آبیرہ اب قہقہے لگا لگا کر داؤد سے باتیں کر رہی تھی جب اس کے قہقہے میرے اعصاب پر بھاری ہونے لگے تو طیش میں آ کر میرا جی چاہا میں کھڑکی یا دروازہ توڑ کر اندر جاؤں اور آبیرہ کا گلا دبوچ لوں اور اس وقت چھوڑوں جب اس بے وفا کے قفس سے روح پرواز کر جائے لیکن اپنے جذبات پر قابو پاتے ہوئے میں نے ایسا کوئی قدم اٹھانے کا ارادہ ترک کر دیا تھا۔ جب میرے اپنے مجھ سے روٹھ گئے تھے۔ دوست احباب ساتھی سبھی منہ موڑ گئے تھے اور رہی سہی کسر میرے ضمیر اور دل کی آوازوں نے پوری کر دی تھیں۔ تو ایسے میں آبیرہ نے صحیح ہی تو کہا تھا کہ مجھ جیسے پاگل شخص کو بھلا یہاں کیوں ہونا چاہیے۔ میں نے بائیک اسٹارٹ کرتے ہوئے یوں دیوانوں کے سے انداز میں قہقہہ لگاتے ہوئے کہا اور بائیک واپس گھر کی جانب بڑھا دی۔

اگلے چند روز مجھے شدید بخار نے آلیا۔ اس قدر شدید بخار نے مجھ سے جیسے میری سدھ بدھ ہی چھین لی تھی اور میں کئی روز تک ایسے ہی نیم بے ہوشی کے عالم میں پڑا رہا‘ پھر مجھے چند روز بعد ذرا ہوش آیا تو میرے سرہانے مجھے بڑے ابا ہی دکھائی دیئے۔ وہ آنکھیں موندے اپنے سر کو دیوار سے ٹکائے ہاتھ میں تسبیح لیے بیٹھے تھے۔ میری وجہ سے ان کا سکون بھی غارت ہو چکا تھا۔ کتنا برا تھا میں یارب مجھے موت کیوں نہیں آجاتی۔ میں نے جو لمحہ بھر کو اپنی آنکھیں کھولی تھیں تو بڑے ابا کو یوں بے آرام پا کر مضطرب ہو کر پھر سے موندھ لیں۔

یکا یک مجھے دروازے پر دستک سنائی دی۔ جب دستک مسلسل ہوتی رہی تو میں نے ہڑبڑا کر آنکھیں کھول دیں۔ آنکھیں کھولنے پر چند لمحوں تک مجھے یونہی محسوس ہوتا رہا جیسے میرا وجود شدید بخار سے تپ رہا ہو۔ میں آنکھیں ملتے ہوئے دروازے تک پہنچا اور دروازہ کھولا تو میرے سامنے یومنہ کھڑی تھی۔ اسے دیکھتے ہی میں سمجھ گیا تھا کہ وہ مجھ سے ملنے کیوں آئی ہے۔ اس کے سلام کا جواب دیتے ہی میں نے اپنے سخت رویے کی وجہ سے اس کی دل آزاری کے لیے اس سے معذرت چاہی۔ میری بات سنتے ہی وہ میری سوچ کے برعکس فوراً بولی۔

”ارے طٰہٰ اس کی کوئی ضرورت نہیں۔ اپنوں سے بھلا کوئی معذرت کرتا ہے۔ مجھے آپ سے ایک کام تھا۔ میں اسی لیے آئی ہوں۔“ اس کی بات مکمل ہونے سے پہلے میں یہی سوچ رہا تھا کہ شاید اسے میرے سخت رویے کی وجہ سے دکھ پہنچا ہوگا لیکن اس کے رویے سے مجھے ایسا کچھ محسوس نہیں ہوا۔ بلکہ اس کی باتوں میں تو کس قدر اپنائیت تھی۔ مجھے خاموش پا کر وہ پھر سے بولی۔

”دراصل اس ویک اینڈ پر چند چھٹیاں آ رہی ہیں۔ جن میں مجھے گھر جانا ہے‘ لیکن اس سے پہلے مجھے کچھ خریداری کرنا تھی۔ اگر آپ میرے ساتھ چل

سکیں تو مجھے بہت اچھا لگے گا۔" وہ اپنی بات کہہ چکی تھی اور اب میرے جواب کی منتظر کھڑی تھی۔ اس کی بات سن کر میں گم صم سا یہ فیصلہ ہی نہیں کر پا رہا تھا کہ میں اسے کیا جواب دوں پھر لامحالا جو میں نے ہامی بھرلی تو اس کا چہرہ یوں خوشی سے کھل اٹھا تھا۔ وہ مجھے آج شام کا وقت بتا کر چلی گئی اور میں وہیں چپ چاپ سا کھڑا چند لمحوں تک سوچتا رہا کہ میرے جیسے شخص کے ساتھ وقت بیتانے میں بھی کوئی خوشی محسوس کرسکتا ہے۔ ذرا شام سے پہلے میں ایک بار پھر سے اسی قسم کی کشمکش سے دوچار ہو رہا تھا کبھی تو میرا جی چاہتا کہ میں کوئی بہانہ بنا کر اس کے ساتھ چلنے سے انکار کردوں یا کہیں باہر نکل جاؤں اور پھر جب دوبارہ اس سے ملاقات ہو تو اسے کہہ دوں کہ مجھے کسی ضروری کام سے باہر جانا پڑ گیا تھا۔ میں یونہی منصوبے بنا رہا تھا کہ جب بابا عبدالقادر یومنہ کا پیغام لے کر میرے کمرے میں پہنچے۔ وہ مجھے کہنے آئے تھے کہ یومنہ پورچ میں کھڑی میرا انتظار کر رہی ہے۔ یوں اب میرا کچھ بھی سوچنا بے کار تھا۔ میں بابا عبدالقادر کے تعاقب میں پورچ تک پہنچا تو یومنہ گاڑی کے پاس کھڑی میرا ہی انتظار کر رہی تھی۔ مجھے دیکھتے ہی اس نے سلام کیا اور میں نے جواب دیتے ہوئے ڈرائیونگ سیٹ سنبھالی تو اس کے بیٹھتے ہی میں نے گاڑی آگے بڑھادی تھی۔

گھر کے خاص دروازے سے نکل کر ایک طرف کو مڑتے ہوئے میری نظر گاڑی میں نصب میوزک سسٹم پر پڑی جسے کبھی میں گاڑی میں بیٹھتے ہی آن کرلیا کرتا تھا تو خاص قسم کے ووفر سسٹم سے پیدا ہونے والے ارتعاش سے قریبی گھروں کے دریچے اور شیشے لرز اٹھا کرتے تھے اور وقت بے وقت تنگ ہونے پر لوگ مجھے کوستے بھی ہوں گے لیکن آج مجھے ان چیزوں میں کوئی دلچسپی نہ تھی۔

گاڑی میں کافی دیر سے خاموشی تھی اور میری نظریں آگے بڑھتی شاہراہ پر ہی مرکوز تھیں۔ جب یکا یک یومنہ نے اس خاموشی کو توڑا۔

"آپ سے ایک سوال پوچھوں۔"

"آپ مجھے شرمندہ کر رہی ہیں۔ یومنہ سوال پوچھنے کے لیے آپ کو میری اجازت کی ضرورت نہیں۔" وہ کچھ پوچھنے میں خوف محسوس کر رہی تھی۔ جب میں نے اس کے خدشات دور کرنے کے لیے فوراً جواب دیا۔ میرا جواب پا کر وہ چند لمحوں کے توقف کے بعد کچھ سوچتے ہوئے دوبارہ بولی۔

"آپ ہمیشہ عبادت میں کیوں مشغول رہتے ہیں حالانکہ آپ کی عمر کے لوگ تو فرائض تک کی ادائیگی سے دور بھاگتے ہیں؟" یومنہ اپنی بات کہہ چکی تھی اور اب جواب کی منتظر تھی جب کہ میں سوچ رہا تھا کہ ایسا سوال کرنے والی وہ پہلی لڑکی تھی کبھی تو اپنے دل کی کیفیات بیان کرنے کے لیے میں کوئی رازداں ڈھونڈا کرتا تھا اور لوگ مجھ سے دور بھاگتے تھے اور آج جب میں نے چپ سادھ لی تھی تو کسی نے یوں اپنائیت سے کچھ جاننا چاہا تھا۔ جس کا جواب بھی میں پوری ایمانداری سے دینا چاہتا تھا۔

"آپ ہمیشہ عبادت میں کیوں مشغول رہتے ہیں' یہی سوال ہے ناں آپ کا؟" اسے مخاطب کرتے ہوئے میری نگاہیں آگے بڑھتی شاہراہ پر ہی مرکوز تھیں اور بے تحاشا ٹریفک کے درمیان میں مکمل چوکس ہو کر ڈرائیو کر رہا تھا۔ وہ میرے جواب کی منتظر تھی۔ جب کچھ توقف کے بعد میں نے اپنا سلسلہ کلام جوڑا۔

"اچانک سے ظاہر ہوجانے والا ایسا مرض جس

کی شناخت ہی نہ ہوسکے اور آپ کو لگنے لگے کہ اب آپ اس اذیت زدہ کیفیت سے کبھی نکل ہی نہ پائیں گے کیسی تکلیف دہ چیز ہوتی ہے۔ تب آپ کے پاس کرنے کو باقی کیا رہ جاتا ہے۔ اسپتال کے کسی وارڈ کے بوسیدہ حبس زدہ سے کمرے کے کسی بستر پر پڑے آپ کیا کر سکتے ہیں' فقط اپنی موت کا انتظار۔ قطار در قطار لوگ آپ کے سرہانے بدلتے رہیں گے' روز نئے نئے چہرے آپ کو دکھائی دیں گے بعض آپ کو دلاسہ دیں گے حوصلہ و ہمت رکھنے کی تلقین کریں گے اور جاتے ہوئے چند پیسے آپ کے سرہانے رکھ کر چلے جائیں گے۔ یا زیادہ سے زیادہ آپ کا کوئی سگا آپ کے لیے دعا کردے گا۔ ان قیمتی سانسوں کو جو رب سوہنے نے ہزار نعمت کی طرح عطا کی تھیں۔ میں نے کبھی ان کی اہمیت کو نہ جانا تھا۔ جیسے میں سمجھتا تھا کہ مجھے کیا ہوگا؟ طٰہٰ عالم کے پاس اتنا سب کچھ ہے' روپیہ پیسہ ہے' اثر و رسوخ ہے' مجھے بھلا کیا ہوسکتا ہے' کوئی ہمارے خاندان کی طرف آنکھ اٹھا کر تو دیکھے' ہمیں کچھ کہہ کر تو دیکھے اسے میں وہاں پہنچا دوں گا جہاں سے پھر وہ کبھی واپس نہ آپائے گا۔

میں ساری دنیا میں گھوم پھر سکتا ہوں' بنا روک ٹوک کہیں بھی آ جا سکتا ہوں کسی بھی بڑے سے بڑے ریستوران میں جا کر ٹھہر سکتا ہوں' میں پیسے سے دنیا جہاں کا ہر آرام و آسائش خرید سکتا ہوں' مجھے کیا ہوسکتا ہے؟

کوئی ہے جو ہماری ٹکر میں آسکے شہر بھر کے لوگ ہم سے ڈرتے ہیں۔ کبھی کسی کی ہمت نہیں ہوسکی کہ کوئی ہمارے سامنے اونچا بول سکے' کوئی ہماری برائی کرسکے۔

شہر میں گزرتے ہوئے ہمیں بڑے بڑے پروٹوکول ملتے ہیں۔ ہمارے لیے شاہراہیں بند کروادی جاتی ہیں۔ ہم بلٹ پروف گاڑیوں میں گھومتے پھرتے ہیں۔ مجھے ایسے میں بھلا کیسے کچھ ہوسکتا ہے' کیسا نادان تھا' میں کتنا غفلت میں ڈوبا ہوا تھا' پھر اس نے مجھے یہ احساس دلا ہی دیا۔

معالج نے جب جواب دے دیا تو اس کا کہنا یہ بھی تھا کہ آپ چاہے دنیا بھر کے کسی بھی اسپتال میں چلے جائیں وہاں آپ کو یہی جواب ملے گا کہ انہیں کوئی ایسی طبی بیماری نہیں جو ہماری میڈیکل رپورٹس میں ظاہر ہو رہی ہو' یہ بات جان لینے کے باوجود ملک بھر کے کونے کونے میں واقع ہر وہ جگہ جہاں اعلیٰ معالج اور لیب کی سہولیات دستیاب تھیں ۔میرے ٹیسٹ کروائے گئے لیکن کہیں کچھ ظاہر نہ ہوا۔ میں ہر گھڑی ہر ہر لمحہ موت کے منہ سے قریب تر ہوتا چلا جا رہا تھا اور میڈیکل میں میری اس بیماری کی کوئی شناخت ہی نہ تھی اور ہوتی بھی کیسے یہ بیماری جسمانی ہوتی تو رپورٹس میں اس کی کوئی شناخت ظاہر ہو پاتی۔

یہ تو مجھ سے سرزد ہوئے گناہوں کی سزا تھی جو ناسور بن کر میرے وجود میں ہی نہیں بلکہ میری روح میں اپنا گھر بنا چکی تھی اور جب روح بیمار ہوتی ہے تو دنیا کی کوئی خوردبین اس بیماری کے وجود کو ظاہر نہیں کر پاتی۔

آپ نے یہی دریافت کیا تھا ناں کہ میں ہر وقت عبادت میں کیوں مشغول رہتا ہوں' آج دوبارہ ملی تندرستی مجھے اتنی پیاری ہے کہ میں اپنا ہر لمحہ ہر گھڑی خدا کے حضور عبادت میں گزارنا چاہتا ہوں۔ میں چاہتا ہوں کہ جب میری صبح ہو تو خدا کی حمد و ثناء سے ہو۔ رات کو جب میں سونے کے لیے لیٹوں تو اپنے رب سوہنے کو ہی یاد کرتے ہوئے مجھے نیند آئے اور

نیند میں لاشعوری کیفیت میں بھی میں کسی ایسے خواب میں داخل ہوجاؤں جو مجھے میرے اللہ سے اور قریب کردے۔'' آخری بات کہتے ہوئے میں نے جو سر گھما کر ایک نظر اس کی جانب دیکھا تو وہ بے حس وحرکت حیرت زدہ سی میری جانب دیکھ رہی تھی۔

''طٰہٰ..... آپ سے وہ جرم کیسے سرزد ہوا تھا..... میں جاننا چاہتی ہوں۔'' کچھ توقف کے بعد یومنہ نے یوں ٹھہر ٹھہر کر اپنے سوال کو بیان کیا کہ جس سے مجھے یہ اندازہ کرنے میں ذرا مشکل پیش نہیں آرہی تھی کہ اب وہ میرے گزرے کل کے بارے میں جاننے کے لیے کتنا بے تاب ہورہی تھی۔

''یومنہ آپ بھول رہی ہیں کہ آپ اس وقت میرے ساتھ خریداری کرنے آئی ہیں اور میرے ماضی سے متعلق بہت کچھ تو آپ پہلے سے ہی جانتی ہیں۔'' میں نے اسے ایسا جواب اس لیے دیا کیوں کہ میں نہیں چاہتا تھا کہ میں اپنے ماضی کے تلخ باب کو کھول کر بیٹھ جاؤں اور میری وجہ سے اس کی خریداری متاثر ہو۔

''اگر میں پہلے کچھ سن چکی ہوں طٰہٰ تو اب مجھے آپ سے جاننا ہے۔'' یومنہ بضد تھی اور درحقیقت میں بھی تو یہی چاہتا تھا کہ کسی کو تو میں بیان کروں۔ اپنے وہ احساسات' کیفیات' وہ گھڑیاں جو مجھ پر قیامت بن کر بیتی تھیں۔ ''میں آپ کو وہ سب بتاؤں گا لیکن یہ ایک طویل داستان ہے۔ ابھی اسے رہنے دیں۔' میرا جواب پاتے ہی وہ فوراً بولی۔

''مجھے ان لمحوں کا انتظار رہے گا طٰہٰ۔'' یومنہ کے جواب دینے تک میں شہر کے ایک بڑے پلازہ کے پارکنگ ایریا میں گاڑی روک چکا تھا۔ یہ شہر کا ایک بڑا اور معروف ترین شاپنگ سینٹر تھا۔ یومنہ اور میں اندر داخل ہوئے کھلے کھلے چہرے میٹھے میٹھے قہقہے ..... سرگوشیاں اور موسیقی کی چھیڑی دھنیں ہم جگمگاتی رنگا رنگ دکانوں کے سامنے سے گزرتے ہوئے آگے بڑھ رہے تھے جب یومنہ ایک سن گلاسز والی دکان کے سامنے پہنچ کر رکی اور مجھے لے کر اندر داخل ہوگئی۔ وہ اندر پہنچتے ہی مختلف قسم کے گلاسز دیکھنے لگی۔ مجھے لگا اسے وہ سن گلاسز اپنے لیے لینا تھے لیکن پھر ایک دم سے اس نے ایک گلاسز میری جانب بڑھادیئے۔'' یہ آپ کے چہرے پر بہت جچے گا۔'' میں خود بھی گلاسز کا بے حد شوقین تھا لیکن اس کی پسند واقعی لاجواب تھی۔ یہ اوکلے کے سن گلاسز تھے۔ میرے چہرے پر انہیں سجاتے ہی دکان دار لڑکے نے آئینہ میرے سامنے کردیا۔

''صاحب ایک دم ڈبنگ لگ رہے ہو'' اس کی بات سن کر مجھے ہنسی آگئی اور میں نے ہلکا سا قہقہہ لگایا۔

''طٰہٰ آپ مسکراتے ہوئے بھی بہت اچھے لگتے ہیں۔'' یومنہ نے مجھے پہلی بار مسکراتے دیکھا تھا اور پھر برجستہ تعریف بھی کردی تھی۔ میرے اصرار کے باوجود اس نے گلاسز کے پیسے مجھے نہیں دینے دیئے تھے اور انہیں خریدنے کے بعد ہم وہاں سے آگے بڑھے۔

جب یومنہ نے اپنی خریداری مکمل کرلی تو پھر چلتے چلتے میں ایک دکان کے سامنے پہنچ کر ٹھہر گیا تھا اور میرے ساتھ چلتے ہوئے وہ اس دکان میں داخل ہوئی تو متعجب سی ہو کر میری جانب دیکھ رہی تھی۔ جیسا کہ دکان میں داخل ہوتے ہوئے وہ باہر کانچ کے باکس میں سجی ڈمیوں سے اندازہ لگاسکتی تھی کہ یہ حجاب' اسکارف اور اوعبایا جیسے خواتین کے اسلامی لباس کی دکان تھی۔ اندر پہنچ کر میں نے ایک عبایا خریدا' وہ ساتھ کھڑی کچھ بھی نہ سمجھ سکی۔ جب پیسے ادا

کر کے میں نے وہ عبایا اسے دیتے ہوئے کہا۔

"یومنہ آپ کو یہ میری طرف سے گفٹ ہے۔"

اسے میرا یہ تحفہ لیتے ہوئے کچھ وقت لگا۔ وہ حیرت زدہ سی جیسے اسے لیتے ہوئے ہچکچا رہی تھی۔ اس کے چہرے پر اب مسکراہٹ بھی کچھ پھیکی پھیکی سی لگ رہی تھی۔ گویا اسے کچھ بہت اچھا محسوس نہیں ہو رہا تھا۔

ہم دکان سے نکلے اور پھر اس پلازہ کے اس خاص دروازے کی جانب بڑھے جہاں سے ہمیں باہر نکلنا تھا۔ وہ اب چپ چاپ سر جھکائے جیسے کچھ سوچتی ہوئی میرے ساتھ چل رہی تھی۔ ہم دروازے تک پہنچے اور پھر میں وہی ٹھہر گیا۔ اس جگہ میرے ساتھ کوئی واقعہ بیت چکا تھا۔ میری کوئی یاد اس جگہ سے جڑی تھی' پھر کوئی جھماکا سا ہوا اور میرے گردونواح کا منظر تیزی سے بدلنے لگا اور اب میں جس منظر میں اتر چکا تھا' یہ اسی سلسلے کی اگلی کڑی تھی' جب یومنہ کے دروازہ کھٹکھٹانے پر میں خیالوں کے دائرے سے پلٹا تھا۔

چند روز تیز بخار میں مبتلا رہنے کے بعد جو میری طبیعت میں کچھ بہتری آئی تو بڑے ابا نے مجھے مائیکل کے ساتھ باہر گھوم پھر آنے کو بھیج دیا تھا اور اس روز کچھ خریدنے کی غرض سے میں اسی پلازہ میں آیا تھا۔

یہاں اسی جگہ میں نے آبیرہ کو داؤد کے ساتھ خریداری کرتے دیکھا تھا۔ انہیں ایک ساتھ دیکھ کر میرا جوان خون کھولنے لگا تو میں خود پر قابو نہ رکھ پایا تھا۔ میں دوڑا اور اس سے پہلے کہ میں ان تک پہنچتا آبیرہ نے یوں غصے سے مجھے اپنی جانب بڑھتے دیکھ لیا تھا' داؤد اس سے کچھ فاصلے پر آگے آگے چل رہا تھا۔ مجھے دیکھتے ہی وہ داؤد کی جانب دوڑی اور اسے داؤد کی طرف بڑھتے دیکھ کر مجھے لگا میں انگریزی فلم ورلڈ وار زی کا وہ وائرس زدہ انسان ہوں جس سے بچنے کے لیے وہ بھاگ رہی تھی حالانکہ میں تو فقط ایک بار اس سے ملنا چاہتا تھا۔ اس سے پوچھنا چاہتا تھا کہ آبیرہ اگر آج میں کوئی دیوانہ یا خبطی انسان ہوں تو ہمیشہ ایسا تو نہ تھا' پھر کیا ہوا جو آج تم مجھ سے یوں نگاہیں بدلنے لگی ہو۔ میری اس چاہت' پیار اور محبت کو بھلا کر آج تم مجھ سے نفرت کرنے لگی ہو۔ میرے اس تک پہنچنے سے پہلے اب داؤد میرے سامنے کھڑا تھا۔ "میرے سامنے سے ہٹ جاؤ داؤد۔" میں نے غصے سے چیختے ہوئے داؤد سے کہا اور اس نے اگلے ہی پل مجھ پر ہاتھ اٹھا دیا۔ میں تو پہلے سے ہی غصے سے پاگل ہو رہا تھا' اس کے ہاتھ اٹھاتے ہی اپنے آپے میں نہ رہا۔ میں نے آگے بڑھ کر اس کی گردن دبوچ لی۔ اب اس کی گردن میرے بازوؤں کی گرفت میں تھی اور وہ چھڑوانے کی لگاتار کوشش میں تھا۔ میں اس کی گردن کو اپنے بازوؤں کی گرفت میں لیے اس پر ایک ہاتھ سے گھونسوں کے وار کیے جا رہا تھا اور چند لمحوں میں ہی ہمارے اردگرد لوگوں کا ایک بڑا ہجوم جمع ہو گیا تھا۔ ہم پلازہ کے بیرونی دروازے کے سامنے ہی گتھم گتھا تھے۔ جہاں چند گارڈ بھی کھڑے تھے پہلے تو چند ایک لوگوں نے آگے بڑھ کر چھڑانے کی کوشش کی لیکن تب تک میں داؤد کی خوب درگت بنا چکا تھا اور خون اس کے چہرے سے رسنے لگا تھا۔ جب لوگ ہمیں الگ کرنے میں ناکام رہے تو پھر گارڈز نے مجھے داؤد سے جو الگ کیا تو میں بپھر کر ان دو گارڈز سے چھوٹ کر پھر سے داؤد کو دبوچ لیتا اور وہ پھرتی سے آگے بڑھ کر مجھے اپنے بازوؤں کے شکنجے میں جکڑنے کی کوشش کرتے رہے۔ اسی بیچ آبیرہ کا بھی برا حال ہو رہا تھا۔ وہ داؤد کو مجھ سے بچانے کے لیے لوگوں کو پکارتی رہی۔ اس سے پہلے کہ میں پھر سے

چھوٹ کر داؤد اور آبیرہ تک جا پہنچا گارڈز مجھے ان سے دور لے گئے تھے اور ساتھ ہی چند لمحوں میں پولیس کی گاڑی کے سائرن سنائی دینے لگے تھے۔ مائیکل پارکنگ میں کھڑا میرا انتظار کر رہا تھا اور پولیس مجھے گاڑی میں بٹھا کر تھانے لے جا رہی تھی۔ جب پولیس کی گاڑی میں، میں بے حس و حرکت بیٹھا جا رہا تھا۔ مجھے مائیکل پارکنگ میں گاڑی کے پاس کھڑا سگریٹ پیتا دکھائی دیا لیکن اسے چند لمحوں پہلے ہوئے اس حادثے سے آگاہ کرنے سے زیادہ مجھے فکر اس بات کی تھی کہ میری ایسی حرکت سے اب بڑے ابا کو کس قدر تکلیف پہنچے گی۔

''طہٰ...... طہٰ آپ ٹھیک تو ہیں۔'' مجھے دور کہیں فاصلے سے کوئی آواز آتی سنائی دی۔ میں نے اردگرد نگاہ دوڑائی یومنہ میرا بازو تھامے آوازیں دے رہی تھی۔ جنہیں سن کر پاس کھڑے چند ایک لوگ بھی مجھے عجیب نظروں سے دیکھ رہے تھے اور میں جیسے منوں بھاری وجود کو گھسیٹ کر یومنہ کے ساتھ چلنے لگا۔ اس گھڑی مجھے دیکھنے والے لوگ یہی سوچ رہے ہوں گے کہ میں کوئی سائیکالوجی کے کسی دماغی مرض کا شکار ہوں۔ یومنہ ایک ہاتھ میں شاپنگ بیگز پکڑے اور دوسرے ہاتھ سے میرا ایک بازو تھامے مجھے پارکنگ ایریا تک لے گئی تھی۔

⦿......●●●......⦿

گھر پہنچ کر میں سیدھا اپنے کمرے میں چلا آیا تھا۔ میرے لباس تبدیل کرنے کے تھوڑی دیر بعد ہی بابا عبدالقادر کمرے میں آئے۔ وہ مجھ سے کھانے سے متعلق دریافت کرنے آئے تھے' بھوک محسوس نہ کرنے پر میں نے انہیں کھانا لانے سے منع کر دیا تھا اور وہ مزید کسی بھی سوال و جواب کے خاموشی سے کمرے سے چلے گئے تھے۔ بڑے ابا کی طرح بابا عبدالقادر بھی مجھے خوب سمجھتے تھے۔ مجھے کچھ کچھ یاد ہے' جب میری طبیعت بگڑ جاتی تو میری ویسی حالت دیکھ کر وہ پاس کھڑے کیسے رویا کرتے تھے۔ میں جانتا تھا کہ آج جو میں اپنے پیروں پر چلنے پھرنے اور خود زندگی گزارنے کے قابل ہو پایا تھا تو اس میں بابا عبدالقادر کی وہ چھپ چھپ کر روتے ہوئے مانگی دعاؤں کا کتنا اثر شامل تھا۔

ایسے ہی سوچتے ہوئے میری نظر بابا رب نواز کی دی چادر پر پڑی' مجھے یاد آیا کہ میں کئی دنوں سے سوچ رہا تھا کہ کسی روز بڑے ابا کے ساتھ جا کر میں یہ چادر بابا جی کو لوٹا دوں لیکن بارہا چاہنے کے باوجود کوئی نہ کوئی کام آڑے آ ہی جاتا یا کبھی یہ بات میرے ذہن سے محو ہو جاتی تھی۔ ابھی رات کافی بیت چکی تھی۔ بڑے ابا اب سو چکے ہوں گے یہ سوچ کر میں نے ان کے کمرے میں جانے کا ارادہ ترک کر دیا تھا۔ پھر یونہی میرے ذہن میں ایک دم سے ایک سوال اٹھا۔ آج یومنہ کے ساتھ خریداری کرتے ہوئے میں نے اسے عبایا تحفتاً دیا تھا اور مجھے یوں محسوس ہو رہا تھا کہ اسے میرے اس تحفے سے کچھ زیادہ خوشی نہیں ملی تھی اور میرے ذہن میں اس وقت یہی چل رہا تھا کہ کیا وہ میرے اس تحفے کو اسی مقصد سے استعمال کرے گی جس مقصد کے تحت میں نے اسے وہ تحفتاً دیا تھا؟ یا پھر وہ اسے کہیں سنبھال کر رکھ دے گی۔

میں نہیں جانتا تھا کہ وہ اسے استعمال کرے گی بھی یا نہیں لیکن میں اتنا ایمانداری سے کہہ سکتا تھا کہ میں نے اسے جو تحفتاً عبایا لے کر دیا تھا ایسا میں نے بالکل درست کیا تھا اور شاید یہ مجھے اس لیے بھی درست لگنے لگا تھا کیونکہ اس سے پہلے بھی ایک لباس ہی تحفتاً دینے پر میں نے کسی کو ہمیشہ کے لیے کھو دیا تھا۔ ایک وہ بھی لباس ہی تھا اور ایک یہ بھی لباس ہی تھا لیکن

دونوں میں اتنا ہی فرق تھا جتنا اچھائی اور برائی میں جیسے کسی سیاہ اور سفید میں......!

دسمبر کی انیس تاریخ میں کبھی نہیں بھولتا تھا اور اس سال بھی دسمبر کی انیس تاریخ میں چند روز ہی باقی تھے۔ میں آبیرہ کو ہر سال مہنگے سے مہنگا تحفہ دینے کی کوشش کرتا تھا اور اس سال بھی میں اسے کوئی خوبصورت اور مہنگا ترین تحفہ دینا چاہتا تھا۔

دسمبر کی دودھیا سفید کہر سے لپٹی سرد شام میں میں بیٹھا یہی سوچ رہا تھا کہ اسے اس سال میں ایسا کیا تحفہ دوں۔ وہ کیا خاص چیز ہونی چاہیے جو پچھلے چند سالوں میں میرے دیئے تحائف سے الگ ہو' میں آبیرہ سے بے حد محبت کرنے لگا تھا۔ ویسی ہی محبت جیسی میری عمر کے نوجوان اکثر اس عمر میں کرنے لگتے تھے۔ میں ارادہ کر چکا تھا کہ اس سالگرہ کے بعد میں اسے ہمیشہ کے لیے اپنا بنا لوں گا' اور میرے ذہن میں یہ بھی چل رہا تھا کہ مجھے جلد سے جلد اپنے ماں اور ابا سے اس سلسلے میں بات کرنی چاہیے۔ آبیرہ جیسی چندے آفتاب چندے مہتاب اور ایک اونچے گھرانے کی لڑکی کے رشتے سے وہ بھلا کیونکر انکار کریں گے یہ سوچ کر میں ان کی طرف سے بھی مطمئن ہو جاتا تھا۔ دسمبر کی آخیر سیاہ راتیں ہر طرف چھائی گاڑھی دھند درختوں سے جھڑتے زرد پتے اور اس عالم اداسی میں' میں دفعتاً اچھل پڑا۔ دودھیا سفید پیرہن جسے پہن کر وہ کوئی اپسرا لگے' ایک ایسا لباس جو آبیرہ جیسی شخصیت کے شایان شان ہو' جسے وہ پہن کر جب اپنی سالگرہ کا کیک کاٹنے کے لیے سبھی کے سامنے آئے تو تقریب میں مدعو لوگ اسے دیکھ کر دنگ رہ جائیں۔ وہ طٰہٰ عالم جس پر شہر بھر کی لڑکیاں فدا تھیں۔ اس کے ساتھ دو گھڑی بتانے کو اپنے لیے باعث فخر سمجھتی تھیں۔ وہ بھی دیکھ سکیں کے خود طٰہٰ عالم کس پر فدا ہے۔

پھر جتنا میرے لیے کٹھن یہ سوچنا تھا کہ میں اسے تحفے میں کیا دوں' اس سے کئی گنا دشوار اس لباس کو کھوجنا تھا۔ اگلے دو روز میں نے وہ لباس کھوجنے میں لگا دیئے تھے۔ پھر شہر کے ایک بہترین ڈیزائنر کا ہی تیار کردہ وہ لباس تھا جو کہ ابھی تک کسی بھی ماڈل کے تن پر نہ سجا تھا اور نہ ہی کسی ماڈل نے ریمپ پر چل کر اسے لوگوں کے سامنے پیش کیا تھا۔ یہی وجہ تھی کہ ڈیزائنر نے مجھ سے اس لباس کی قیمت چار گنا کے حساب سے زیادہ وصول کی تھی۔

اسے لے کر میں گھر پہنچا اور گھر پہنچتے ہی میں نے آبیرہ کو فون لگایا۔ میں اسے کہنا چاہتا تھا' کہ وہ اپنی اس سالگرہ پر میرا تحفتاً دیا لباس پہنے اور اس لیے یہ بھی ضروری تھا کہ میں اسے یہ لباس ابھی پہنچا دیتا کیونکہ آج رات ہی اس کی سالگرہ تھی۔ چند ایک بیل جانے پر ہی اس نے کال ریسیو کی اور اس کے کال ریسیو کرتے ہی میں اسے بتانے لگا کہ کتنی ہی جدوجہد کے بعد مجھے وہ تحفہ ملا ہے جو میں تمہیں اس برتھ ڈے پر دینے والا ہوں۔

''ایسا کیا خاص گفٹ ہے طٰہٰ؟'' آبیرہ جاننے کے لیے بے تاب ہو رہی تھی۔

''خاص تو وہ تب ہوگا جب تم اسے پہنو گی۔'' جب میں نے اسے ڈیزائنر کا نام بتایا تو اب وہ اس لباس کو دیکھنے کے لیے بے تابی کا اظہار کرنے لگی اور میں نے اسے یہ کہہ کر فون بند کر دیا کہ چند ہی گھڑیوں تک میرا ڈرائیور وہ لباس لے کر تمہارے گھر پہنچ رہا ہے' اور پھر لباس کے ملتے ہی آبیرہ کی کال آ گئی۔ وہ لباس اسے بے حد پسند آیا تھا اور یہ جان کر میں اسے کہنے لگا کہ میں اس کی خوشی کے لیے ایسے کئی لباس تحفے میں دے سکتا ہوں۔ اس کے کال بند کرنے سے پہلے میں

نے اس سے دہرا کر پوچھا کہ آج شام داؤد بھی آ رہا ہے ناں اور اس کی ہاں پر میں مطمئن ہو گیا تھا۔ داؤد آبیرہ کا پرانا بوائے فرینڈ تھا لیکن میرے آبیرہ کی زندگی میں آ جانے کے بعد وہ اچھی طرح سے جانتا تھا کہ آبیرہ فقط مجھے چاہتی ہے اور میں بھی آبیرہ سے شادی کرنا چاہتا ہوں۔ آبیرہ سے بات ختم ہونے کے بعد کئی ایک اور دوستوں کو بھی میں نے کال کر کے دہرایا کہ وہ آج رات آبیرہ کی سالگرہ پر آ رہے ہیں ناں۔ میں چاہتا تھا کہ سبھی دیکھ لیں کہ طہٰ عالم جسے شادی کے لیے منتخب کر چکا ہے۔ وہ لڑکی شہر بھر میں اپنا ثانی نہیں رکھتی۔

اور اب مجھے بڑی بے تابی سے اس وقت کا انتظار تھا۔ جب آبیرہ میرا تحفتاً دیا لباس پہن کر تقریب میں مدعو لوگوں کے سامنے آئے اور میں آبیرہ کی بجائے ان لوگوں کو دیکھ رہا ہوں جب وہ مسحور ہو کر آبیرہ کو دیکھ رہے ہوں۔ جب اس کی ہم عصر لڑکیاں اسے رشک بھری نگاہوں سے دیکھ رہی ہوں اور میرے وہ دوست جن میں آبیرہ کا پرانا بوائے فرینڈ داؤد بھی شامل تھا۔ آبیرہ کو دیکھ کر میری قسمت پر رشک کریں۔ اس سالگرہ پر میں اپنے ماں' ابا اور بھائی کو بھی خصوصاً اپنے ساتھ لے جانا چاہتا تھا اور اگر میری کوئی بہن بھی ہوتی تو اسے میں یہ ضرور کہتا کہ آج وہ اپنی ہونے والی بھابی سے ملنے جا رہی ہے۔

اس روز سر شام ہی مجھے آبیرہ کی فون کالز آنا شروع ہو چکی تھیں۔ کیونکہ پچھلی ہر سالگرہ پر میں دن کے آغاز سے رات تقریب کے اختتام تک اسی کے ہمراہ رہتا تھا لیکن آج میں عین اسی وقت پہنچنا چاہتا تھا' جب وہ سج سنوری بیٹھی میرا انتظار کر رہی ہو گی۔ وہ مجھے فون پر فون کرتی رہی اور میں اسے ٹالتا رہا۔ جی۔ایم اس وقت میرے ساتھ میرے کمرے میں ہی موجود تھے۔ وہ آبیرہ کے برتھ ڈے پر میرے ساتھ چلنے کے لیے تیار ہو رہے تھے اور آبیرہ کی میرے فون پر آتی کالز کو لے کر مجھے خوب ستا رہے تھے۔ پھر ان کی تیاری کو دیکھتے ہوئے میں بھلا کیسے پیچھے رہتا۔ ''کیوں جناب میرا تو وہاں کوئی انتظار کر رہا ہے' آپ یوں پرتکلف تیاری کے ساتھ کس کے لیے جا رہے ہیں۔'' جی ایم میری بات سن کر فقط مسکراتے ہوئے آئینے کے مقابل کھڑے ٹائی کی ناٹ کو اپنی جگہ پر جماتے رہے۔ وہ صحیح معنوں میں ایک Sophisticated انسان تھے۔ آئینے کے سامنے سے ہٹ کر میرے پاس سے گزرتے ہوئے انہوں نے ہاتھ بڑھا کر میرے بالوں کو چھوا جو اب بے ترتیب ہو چکے تھے۔ میں جھٹ سے اٹھ کر ڈریسنگ کے سامنے جا کھڑا ہوا اور بال بنانے لگا تھا۔ تبھی بابا عبدالقادر ماں اور ابا کا پیغام لے کر آئے تو ان کے کمرے سے نکلتے ہی ہم ان کے تعاقب میں پورچ تک پہنچ گئے تھے۔ جہاں ماں' اور ابا پہلے سے کھڑے ہمارا انتظار کر رہے تھے۔ یوں ہمارے پہنچتے ہی سبھی گاڑی میں سوار ہوئے اور مائیکل نے گاڑی آگے بڑھا دی۔

آج شہر بھر میں دھند کا کوئی نام و نشان نہ تھا۔ ایسا دیکھ کر میرا موڈ کچھ آف ہو رہا تھا۔ مجھے دھند بے حد پسند تھی۔ دھند سے ماحول میں اک عجیب سا افسوں بھر جاتا تھا۔ جو کہ مجھے بہت بھاتا تھا۔ جاڑے میں اکثر ہر طرف چھائے گاڑھے کہر میں' میں اوورکوٹ کے کالر اوپر کانوں تک چڑھائے سگریٹ سلگائے گھر سے پیدل چلتا' کہیں دور نکل جایا کرتا تھا اور جب سے آبیرہ میری زندگی میں آئی تھی میری دسمبر کی ہر دودھیا سفید شام اسی کے سنگ گزرتی تھی اور میں

آج بھی اسے چار سو پھیلے دودھیا سفید آنچلوں کے درمیان ہی دیکھنا چاہتا تھا۔

آبیرہ کے گھر پہنچتے ہی اسے میرے آنے کی خبر ہوچکی تھی اور میری نگاہیں بھی اسے ہی ڈھونڈ رہی تھیں جب مجھے اس کا پیغام فون پر موصول ہوا۔ وہ میرے دیر سے آنے کی وجہ سے خفا تھی' پہلے تو میں نے اسے انتظار کروایا تھا اور اب وہ مجھے انتظار کی سولی پر لٹکانا چاہتی تھی یوں سبھی بیٹھے مہمانوں کے ساتھ میں بھی اس کا انتظار کرنے لگا۔ میری طرح اسے بھی دسمبر کی سردی اور دھند بہت پسند تھی یہی وجہ تھی کہ کسی پانچ ستارہ ہوٹل بک کروانے کی بجائے اسی کی خواہش پر گھر کے لان میں ہی سارے انتظامات کیے گئے تھے' ہر میز کے قریب ہی چند فٹ اونچے گیس ہیٹر نصب کردیئے گئے تھے جن سے نکلنے والی سنہری کرنیں نہ صرف ماحول کو حسین بنارہی تھیں بلکہ ان سے نکلنے والی حرارت ماحول کو گرما بھی رہی تھیں۔

انہی دنوں ماں اور ابا جی ایم کے لیے رشتہ بھی تلاش کررہے تھے اور ایسی تقریبات ہمارے اونچے گھرانوں کے لیے ایک نادر موقع ہوا کرتی تھیں۔ ماں اور ابا تقریب میں مدعو لوگوں سے بھائی کا تعارف کروارہے تھے اور بھائی بھی خوش دکھائی دے رہے تھے۔ یکا یک ہی ہلکے قہقہے اور سرگوشیاں بھی تھم گئیں اور پھر دیکھتے ہی دیکھتے سبھی اٹھ کھڑے ہوئے۔ میں جانتا تھا کہ تم ہی ہو' میں اپنی نشست سے اچھل کر اٹھ کھڑا ہوا اور آبیرہ کو دیکھتے ہی مسکاتے ہوئے میرے لبوں سے یہ الفاظ ادا ہوگئے جنہیں میرے سوا کسی نے نہ سنا ہوگا۔

دودھیا سفید پیرہن پہنے وہ کوئی سفید گلاب ہی لگ رہی تھی۔ ڈیزائنر نے تو فقط اس لباس کو

تراشا تھا۔ آبیرہ کے جسم پر آتے ہی جیسے اس میں روح پڑ گئی تھی۔ شاید ہی آبیرہ کو آج سے پہلے کسی نے یوں اس روپ میں دیکھا ہو۔ اب سبھی اپنی اپنی نشست پر بیٹھ چکے تھے۔ میں اسے وش کرنے کے لیے آگے بڑھا اور پھر کسی کو دیکھ کر میں وہیں رک گیا۔ داؤد ابھی تک کھڑا تھا اور میں بھی کیسا غیور تھا۔ آبیرہ کو لوگوں کے سامنے ننگا کھڑا کر کے اب خود کو داد دے رہا تھا۔ طٰہٰ عالم دیکھ ادھر کیسی آگ بھڑک رہی ہے' میں نے قریب پہنچ کر داؤد کے کاندھے پر ہاتھ رکھا اور پھر اسی جگہ سے کھڑے ایک بار آبیرہ کی جانب دیکھا وہ اس وقت میرے ماں' ابا اور بھائی سے ہی مل رہی تھی۔ ماں کے اردگرد نگاہیں دوڑا کر مجھے تلاش کرنے سے یونہی لگ رہا تھا کہ وہ ان سے میرے متعلق ہی دریافت کر رہی تھی۔ ادھر میں نے داؤد کے کاندھے پر جو ہاتھ رکھا تو وہ ہڑبڑا کر مڑا اس کے مڑ کر مجھے دیکھنے پر میں نے طنزاً دو ایک بار اس کے کاندھے کو تھپتھپایا لیکن ایسا کرنے سے شاید انجانے میں' میں اس کے جذبات کو ہوا دے رہا تھا۔ اس کے سینے میں لگی آگ کو بڑھا رہا تھا۔ وہ جواب تک کھڑا آبیرہ کو ٹکٹکی باندھے دیکھے جا رہا تھا' میں اسے یہ احساس دلا رہا تھا کہ وہ میری ہے۔

میرا آبیرہ کو ایک ایسا لباس تحفتاً دینا جو اس کے بدن کے برہنہ ہونے کا سبب بن رہا تھا اور پھر ڈھٹائی بے حیائی کے ساتھ یہ سوچنا کہ یوں لوگ میری قسمت پر رشک کر رہے ہوں گے' کس قدر رذیل پن تھا۔ میرے ایسے فیل کرنے کی ایسی ہی سزا ہونی چاہیے تھی۔ آبیرہ..... آبیرہ ...... میں آگے بڑھا' نہ جانے کہاں سے اس قدر شدید دھند چارسو پھیلنے لگی تھی۔ ابھی تو نا تھی' میں نے سر گھما کر دائیں بائیں دیکھا' ابھی میرے قریب ہی داؤد کھڑا تھا' تقریب میں مدعو لوگوں کی بھیڑ لگی تھی۔ روشنی اور حرارت کے لیے لگے لیمپس' کرسیاں' میز مجھے وہاں کچھ بھی تو دکھائی نہیں دے رہا تھا۔ شدید سرد دھند میں جیسے میرا وجود منجمد ہونے لگا تھا۔

میں یہ دیکھ کر بے تاب ہو کر چلانے لگا۔ آبیرہ ......آبیرہ...... کہاں ہو تم' دیکھو میں یہاں ہوں۔ میں تمہارے گھر کے صحن میں ہی تو کھڑا ہوں پھر تم کہاں چلی گئیں' باقی سب کہاں چلے گئے' میں طٰہٰ عالم ہوں جس سے تم محبت کرتی ہو۔ میں تمہارا طٰہٰ عالم ہوں' اللہ اکبر' اللہ اکبر' کہیں دور موذن نے صدا بلند کی' میں ہڑبڑا کر اٹھ بیٹھا۔ اشھد ان لا الہ الا اللہ'' میں گواہی دیتا ہوں کہ اللہ کے سوا کوئی معبود نہیں'' میں نے دونوں ہاتھوں سے اپنا چہرہ چھپا رکھا تھا۔ میں کب طٰہٰ عالم ہوں؟ میں کب اس نام کے قابل ہوں؟ میں کب طالب ہدایت ہوں۔ میں تو انسان کہلوانے کا بھی حق دار نہیں ہوں۔ کیا انسان ایسے ہوتے ہیں؟ کیا انسان اپنی عزت کو یوں سر بازار نیلام کیا کرتے ہیں؟ کیا وہ جسے محبت کرتے ہیں' اسے لوگوں کے سامنے یوں نمائش کے طور پر پیش کیا کرتے ہیں۔ ہرگز نہیں' میں نے دونوں ہاتھوں سے اپنا چہرہ چھپا رکھا تھا' اور اب زار و قطار رو رہا تھا۔

موذن فجر کی اذان دے کر خاموش ہو چکا تھا۔ دور کہیں سے کچھ دیر سے شروع ہونے والی اذان کی مدھم آوازیں بھی اب آنا بند ہو چکی تھیں اور میں بھی رو دھو کر اب یوں شانت ہو چکا تھا جیسے تالاب میں پھینکے پتھر سے پیدا ہونے والی لہریں دھیرے دھیرے کنارے تک پہنچنے سے پہلے ہی مٹ جاتی ہیں۔ فجر کی جماعت میں اب کم ہی وقت رہ گیا تھا۔ میں نے جھٹ سے اٹھ کر وضو کیا اور پھر یا رب نواز

کی دی چادر کو جو کھول کر کاندھوں کے گرد اوڑھا تو وہی لاہوتی سی مسحور کن خوشبو نے میرے ذہن سے سبھی کچھ بھلا دیا تھا۔ چند ثانیے میں اسی خوشبو کے سحر میں جکڑا وہیں کھڑا رہا اور پھر مسجد کی جانب چل پڑا۔

مسجد پہنچ کر فجر کی نماز باجماعت ادا کرنے کے بعد میں وہیں مسجد میں بیٹھ گیا تھا اور پھر اشراق کی نماز ادا کرنے کے بعد میں جو گھر لوٹا تو اپنے کمرے کی طرف بڑھتے ہوئے مجھے ماں کی آواز سنائی دی۔

''رک جاؤ طٰہٰ بیٹا'' میں وہی رک گیا لیکن پلٹا نہیں۔

''کیا ابھی تک ہم سے خفا ہو بیٹا؟'' ماں نے میرے قریب آ کر پیار سے میرے چہرے کو اپنے ہاتھوں سے چھوتے ہوئے کہا اور میں سوچنے لگا' آپ سے نہیں ماں' میں تو اپنے آپ سے ہی خفا ہوں۔ مجھے بالکل چپ چاپ کھڑا پا کر وہ خود ہی دوبارہ بولیں۔

''چلو میرے ساتھ میرے کمرے میں آؤ' مجھے آپ سے بہت سی باتیں کرنی ہیں۔'' اور پھر ماں میرا بازو تھامے یوں آگے بڑھی اور میں ان کے ہمراہ یوں چلنے لگا جیسے کوئی ننھا بچہ ماں کی انگلی تھامے ساتھ ساتھ چل رہا ہو۔

اپنے کمرے کی جانب بڑھتے ہوئے ماں مجھ سے کئی باتیں کرتی رہی اور میں ان کی باتوں کا فقط ہاں ناں میں ہی جواب دیتے ہوئے یہ سوچ رہا تھا کہ اس وقت کمرے میں ابا بھی ہوں گے اور ماں مجھے ابا سے ہی ملوانے لے جا رہی تھیں۔ اول تو ابا کے پاس کبھی میرے لیے کوئی وقت ہی نہ ہوتا تھا' اور کبھی جو وہ میرے پاس بھولے سے آ بھی جاتے تو چند سوال پوچھتے جن کے میری طرف سے مناسب جواب نہ ملنے پر الٹے پیروں لوٹ جاتے تھے۔

یکایک دروازے سے باہر پہنچ کر میں رک گیا۔ ''چلو بیٹا رک کیوں گئے؟'' ماں نے میرے رک جانے پر حیرت سے میری جانب دیکھتے ہوئے کہا۔ ماں کو یونہی ششدر کھڑا چھوڑ کر میں پلٹا مجھے آگے بڑھتا دیکھ کر ماں مجھے روکنے کے لیے چند قدم پیچھے آئی اور پھر مضمحل سی وہی کھڑی مجھے جاتا ہوا دیکھتی رہی۔

⦿......●●●......⦿

اپنے کمرے کی جانب بڑھتے ہوئے میرے ذہن میں یہی چل رہا تھا کہ اگر میں ماں کے ساتھ اندر کمرے میں چلا جاتا تو ابا مجھ سے کیسے پیش آتے۔ ضرور وہ مجھے حسرت بھری نگاہوں سے دیکھ کر رہ جاتے۔ آخر کو ان کا جواں سالہ بیٹا یوں دنیا جہان سے کٹ کر رہ گیا تھا۔ جوان کی سیاست میں ان کا ایک بازو بنا ساتھ کھڑا رہتا تھا۔ اب خود کو ہی سنبھالنے کے قابل نہ رہا تھا۔

وہ مجھ سے کئی طرح کے سوال کرتے اگر میں انہیں ان سوالوں کے تسلی بخش جواب دیتا چلا جاتا تو پھر وہ مجھے کہتے برخوردار کل فلاں جگہ جلسہ ہے' پرسوں فلاں شہر جانا ہے' اور ترسوں فلاں مجمعے کے سامنے تقریر کرنی ہے۔ یہ سب سنتے ہی مجھے نعروں کا بلند ہوتا شور سنائی دیتا۔ اسپیکروں سے نکلتی میری ہی آواز مجھے بازگشت کی طرح سنائی دینے لگتی۔ میرے اطراف میں دیجور آندھی چلنے لگتی۔ اخبارات کے صفحات ہوا میں گرد کی طرح اڑنے لگتے۔ میرا حلق خشک ہونے لگتا اور کبھی میں اپنا سر تھام لیتا۔

دفعتاً میں چلتے چلتے رک گیا تھا۔ یہ بڑے ابا کے کمرے کا دروازہ تھا۔ میں نے دروازہ دھیرے سے کھولا اور اندر داخل ہو گیا تھا۔ بڑے ابا اس وقت ذرا استراحت کو لیٹے ہوئے تھے۔ ان کے چہرے کی

جانب مسکراتے ہوئے دیکھ کر میں ان کے پیروں میں بیٹھ گیا تھا۔ پھر جیسے ہی میں نے ان کے پیر دبانے کے لیے ہاتھ بڑھایا وہ فوراً ہی جاگ گئے۔

''طٰہٰ میاں آج صبح صبح کیسے آنا ہوا؟'' انہوں نے آنکھیں بند ہی رکھی اور مجھے پیر دابنے سے منع کیے بغیر سوال کیا۔ وہ جانتے تھے کہ میں ان کے منع کرنے کے باوجود پیر دابنے سے رکنے والا نہ تھا۔ میں ان کا سوال سن کر بھی چند لمحے خاموش رہا اور وہ بھی آنکھیں بند کیے میرے جواب کے انتظار میں خاموش رہے۔ درحقیقت میں سوچ رہا تھا کہ میں اپنی بات کا آغاز کہاں سے کروں۔

''بابا رب نواز تو یاد ہوں گے بڑے ابا آپ کو۔'' میں فقط اتنا کہہ کر پھر سے خاموش ہو چکا تھا اور بڑے ابا میری یہ بات سنتے ہی فوراً اٹھ بیٹھے۔ وہ چادر کو اپنے کاندھوں کے گرد اوڑھتے ہوئے بولے۔

''ایسی برگزیدہ ہستی کو بھلا کون بھلا سکتا ہے۔ دنیا ہر در سے مایوس ہو کر جب ان کے در پر پہنچتی ہے وہی تو پھر امید کی کرن دکھاتے ہیں۔ ایک نظر کا کرشمہ ہم نے وہیں پہنچ کر دیکھا تھا۔ ایسے اللہ کے نیک برگزیدہ بندے بھی اللہ ہی کے کرم سے ملتے ہیں۔ شاید میاں تمہارا اپنا ہی کوئی نیک عمل تھا جو ہمیں اللہ نے بابا رب نواز سے ملوا دیا۔ تمہیں چارپائی پر ڈال کر ہر طرف سے مایوس ہو کر ان تک جو لے گئے تو نہیں جانتے تھے کہ یہ کرشمہ بھی ہو جائے گا اور آج دیکھو تو وہی پہلے سے طٰہٰ عالم میاں ہمیں اللہ نے لوٹا دیئے۔ بڑے ابا بابا رب نواز کی عقیدت میں سرشار جیسے بھیگ رہے تھے اور میری حالت' ان کی یہ بات سن کر کہ پہلے سے طٰہٰ عالم میاں ہمیں اللہ نے لوٹا دیئے بے قرار ہو رہی تھی اور میں سوچ رہا تھا کہ پہلے سے طٰہٰ عالم میاں نہیں بڑے ابا بلکہ بابا رب نواز کی دعا سے ملنے والے طٰہٰ عالم میاں۔'' طٰہٰ میاں آج عرصے بعد اچانک سے بابا جی کیسے یاد آ گئے؟'' مجھے چپ پا کر بڑے ابا نے سوال پوچھا تو میں جیسے کچھ سوچتے ہوئے بولا۔

''آپ کو یاد ہوگا بڑے ابا کہ بابا جی نے بڑی محبت سے اپنی ایک نشانی مجھے سونپی تھی اور پھر کہا تھا کہ جب اچھے ہو جاؤ تو اسے لوٹانے کے بہانے ہی اپنی شکل دکھا جانا۔''

''اور مجھے یاد ہے میاں کہ تم کوئی نشانی لئے بغیر وہاں سے پلٹنے والے کب تھے۔ وہیں ان کے پیروں میں پڑے رہتے اگر بابا رب نواز تمہیں اپنی چادر نشانی کے طور پر رکھنے کو نہ دیتے۔'' بڑے ابا نے میری بات ختم ہوتے ہی جو بات کا آغاز کیا تو گویا میری ہی بات کو جیسے فصاحت سے بیان کر دیا تھا' پھر اس سے پہلے کہ میں انہیں چلنے کے لیے اصرار کرتا انہوں نے خود ہی اپنی خواہش کا اظہار کر ڈالا۔

''میاں میرا بھی بڑا دل چاہ رہا تھا ان سے ملاقات کو۔'' ان کے منہ سے اتنا سننے کی دیر تھی کہ میں بھی جھٹ سے بولا۔

''پھر بڑے ابا انتظار کس بات کا ہے۔'' میری یہ بات سنتے ہی بڑے ابا سرعت سے بولے۔

''میاں اٹھو ابھی جاؤ مائیکل کو گاڑی تیار کرنے کو بولو' ہم ناشتہ بھی راستے میں ہی کریں گے۔''

''یہ ہوئی ناں بات بڑے ابا۔'' میں نے ان کی بات سن کر خوشی سے کہا تو انہوں نے مسکراتے ہوئے میری پیشانی پر پیار کیا اور میرے کاندھے کو تھپکایا۔ پھر بڑے ابا چلنے کی تیاری میں لگ گئے اور میں نے کمرے سے نکل کر خوشی خوشی مائیکل کو بابا رب نواز کی طرف چلنے کی خبر دی تو وہ بھی خوشی سے جیسے کھل اٹھا اور کاندھے پر رکھے رومال سے جھٹ سے گاڑی

صاف کرنے لگا۔

مائیکل کو گاڑی صاف کرتے دیکھ کر میں اپنے کمرے کی جانب بڑھا' مجھے بھی لباس تبدیل کرنا تھا۔ لباس تبدیل کرنے کے بعد میں کمرے سے نکلنے لگا تو مجھے یاد آیا میں کچھ بھول رہا تھا۔ میں پلٹا مجھے یاد آ گیا کہ میں نے بابا جی کے لیے کافی سارے عطر خرید رکھے تھے' جو مجھے انہیں تحفتاً دینا تھے۔ الماری میں رکھے ایک بقچہ میں سارے عطر اچھے سے رکھ کر میں بقچہ اٹھا کر باہر آ گیا۔ باہر پہنچ کر میں نے دیکھا بڑے ابا اور مائیکل میرے ہی انتظار میں کھڑے تھے۔ ہم سبھی کے چہرے خوشی سے تمتما رہے تھے۔ یہ اللہ والوں سے ملنے کی خوشی تھی۔ ان سے ملنے کی خواہش ہی ہمیں یوں خوشی سے سرشار کیے جا رہی تھی۔

میں اور بڑے ابا گاڑی میں سوار ہوئے تو مائیکل نے گاڑی آگے بڑھا دی۔ بڑے ابا نے ہاتھ میں تسبیح لیے اللہ کا ذکر کرنا شروع کر دیا تھا اور میں ابھی سے جیسے مسجد سے ملحقہ اس صحن میں جا پہنچا تھا جہاں بابا رب نواز اپنے ننھے شاگردوں کو تعلیم دیتے تھے اور ساتھ ہی میرے کانوں سے وہ آوازیں ٹکرانے لگی تھیں۔

''ایک ڈیوڑھا..... ڈیوڑھا''

''دو ڈیوڑھا..... تین''

تین ڈیوڑھا..... چار ڈیوڑھا''

''چار ڈیوڑھا.....؟''

میں اس گھڑی بابا رب نواز کے قریب فرش پر ہی بیٹھا تھا۔ جب وہ سامنے قطار میں بیٹھے اپنے کسی ایک شاگرد کو کھڑے ہو کر ڈیوڑھا کا پہاڑا پڑھنے کو کہہ رہے تھے۔

''ایک ڈیوڑھا..... ڈیوڑھا''

دو ڈیوڑھا..... تین''

''تین ڈیوڑھا.....؟''

جونہی وہ شاگرد رک کر سوچنے لگا' بابا جی نے اسے جا کر بیٹھنے کو کہا اور بابا جی کا اشارہ پاتے ہی اب ایک اور شاگرد بچوں کے سامنے کھڑے ہو کر ڈیوڑھا کا پہاڑا سنانے لگا۔

ایک ڈیوڑھا..... ڈیوڑھا

دو ڈیوڑھا..... تین

تین ڈیوڑھا..... چار ڈیوڑھا

چار ڈیوڑھا..... چھ

پانچ ڈیوڑھا..... سات ڈیوڑھا

سات ڈیوڑھا.....؟

وہ شاگرد بھی جب سات ڈیوڑھا پر رک کر حساب لگانے لگا تو اس کے عقب میں بیٹھے چند شریر قسم کے بچوں کی ہنسی چھوٹ گئی اور میں سوچنے لگا یارب یہ کیا ماجرا ہے؟ ایک ڈیوڑھا..... ڈیوڑھا' دو ڈیوڑھا..... تین' میں حیرت زدہ سا بیٹھا پھر سے متوجہ ہو کر بابا جی اور ان کے شاگردوں کے درمیان چل رہا تعلیم کا یہ دلچسپ سلسلہ دیکھنے لگا' لیکن اب کی بار بابا جی نے کسی بھی شاگرد کو کھڑا ہو کر ڈیوڑھا کا پہاڑا پڑھنے کا اشارہ نہ کیا۔ چند لمحے خاموش رہ کر وہ اپنے شاگردوں سے مخاطب ہوئے۔

''میرے بچوں! ڈیوڑھا کا پہاڑا تو تم لوگ سیکھ ہی جاؤ گے پھر اسے رٹا لگا کر یوں فرفر سے پڑھنے بھی لگو گے۔ آپ کے چند ساتھی ایسے بھی ہیں جنہیں اگر میں کہوں تو وہ ابھی سارا پہاڑا سنا دیں لیکن جو اصل بھید تھا اس پہاڑے کے پیچھے وہ کچھ اور تھا۔

آپ اس پہاڑے کو پڑھنے میں ذہن سے کتنا سوچتے ہیں۔ اس قدر محو ہو کر آپ ایک مقدار کو دوسری مقدار میں جمع کرتے ہوئے آگے بڑھتے

ہیں اور اسی پل وقت کے کسی لمحہ میں آپ اردگرد کے ماحول سے بے نیاز ہو جاتے ہیں۔ آپ کو یہ دھیان ہی کب رہتا ہے کہ آپ کے عقب میں آپ کے اپنے ہی ساتھی آپ پر ہنس رہے ہیں۔ اسی پل میں اس برگد کے پھیلے بڑے سے پیڑ پر دیکھو تو کتنے ہی پرندے چہچہا رہے تھے لیکن آپ فقط ڈیوڑھا کے پہاڑے میں مگن ایک مقدار کو دوسری مقدار میں جمع کرنے میں لگے تھے۔ پھر ہماری نمازوں سے تو یہ ڈیوڑھا کا پہاڑا اچھا۔ ہم نماز میں کھڑے اپنے رب سوہنے کی حمد و ثناء بیان کر رہے ہوتے ہیں تو ساتھ ہی ہمارے ذہن میں دنیا جہان کا حساب کتاب چل رہا ہوتا ہے' کوئی خیال یہاں سے آرہا ہے' کوئی خیال وہاں سے آرہا ہے' اور نماز فقط اٹھک بیٹھک کی مشق بن کر رہ جاتی ہے۔ نماز میں حضوری نہ ہو تو وہ نماز نہیں رہتی اور حضوری پیدا ہوتی ہے توجہ سے' خشوع وخضوع سے۔ ایک ایک آیت کو سمجھ سمجھ کر پڑھنے سے' جیسے آپ بچوں میں سے چند بچوں نے ابھی ڈیوڑھا کے پہاڑے کی مشق کی۔ اب نماز ادا کرنے جائیں تو اس بات کو ذہن میں رکھیے گا۔'' سبھی بچے تو انہماک سے باباجی کی نادر باتیں سن ہی رہے تھے مجھے میرے سوال کا جواب بنا پوچھے ہی مل چکا تھا۔ باباجی نے مسکرا کر میری جانب دیکھا تو مجھے لگا جیسے وہ کہہ رہے ہوں میاں پھر کب سنا رہے ہو بنا رکے ڈیوڑھا کا پہاڑا۔

مجھے چپ چاپ خیالوں میں گم پا کر پھر وہ مجھ سے مخاطب ہوئے۔

''طٰہٰ میاں ہم لوگوں نے اپنے لیے کئی مرکز منتخب کر رکھے ہیں اور ہم انہی کے گرد گھومتے چلے جا رہے ہیں۔ جیسے مال' اولاد' حسن' شباب' عزت' شہرت' دفعتاً میں اپنی نشست سے یوں اچھلا اور بوکھلا کر میں نے اپنے اردگرد نگاہ دوڑائی تب مجھے ہوش آیا کہ میں کہیں بہت دور نکل چکا تھا۔ مائیکل کو بے دھیانی میں کہیں روڈ بریکر دکھائی نہ پڑا تھا' ادھر گاڑی ایک جھٹکے کے ساتھ ہوا میں تیرنے لگی تھی' مائیکل نے گاڑی کی رفتار کم کرنے کے بعد ایک بار پھر سے اپنی رفتار سے آگے بڑھا دی تھی۔ ہمارا اب تقریباً نصف سے زیادہ کا سفر طے ہو چکا تھا۔ جب ایک بارونق بازار میں سے گزرتے ہوئے بڑے ابا کہنے لگے کہ ہمیں یہیں رک کر ناشتہ کر لینا چاہیے۔ تب مائیکل نے بڑے ابا کی بات سنتے ہی ایک ریستوران کے پاس گاڑی روک دی تھی۔

ناشتہ کرنے کے بعد تازہ دم ہو کر ہم لوگ پھر سے اپنے سفر پر روانہ ہو چکے تھے۔ بڑے ابا پھر سے ہاتھ میں تسبیح تھامے سیٹ سے ٹیک لگائے آنکھیں موندے ذکر میں مصروف ہو چکے تھے اور میں ونڈ اسکرین سے باہر دیکھ رہا تھا۔ سمندر کی بیقرار موجوں کی طرح انسان دکھائی پڑ رہے تھے۔

''ہم لوگوں نے اپنے لیے کئی مرکز منتخب کر رکھے ہیں' اصل مرکز کو چھوڑ کر ہم فقط انہی کے گرد گھومتے چلے جا رہے ہیں۔'' مجھے بابا رب نواز کے کہے یہ الفاظ یاد آرہے تھے۔ سچ ہی تو کہا تھا بابا رب نواز نے ہم اصل کو چھوڑ کر لاحاصل کے پیچھے بھاگیں گے تو حاصل فقط پچھتاوا ہی رہ جائے گا۔ جیسے آج پچھتاوا میرا مقدر بن چکا تھا لیکن کسی فورس آف اٹریکشن نے مجھے اپنے مدار سے بالکل خارج نہیں ہونے دیا تھا۔ وقتی طور پر میری رفتار سست کر دی تھی۔ میرے ضمیر کو مردہ ہونے سے پہلے ہی جگا دیا تھا اور یہ سیلف ایکسایٹنڈ کا کام میرے احساس ندامت نے کیا تھا۔

ایسا ہی سوچتے ہوئے ونڈ اسکرین سے باہر دیکھتے ہوئے مجھے اندازہ ہوا کہ اب ہم اپنی منزل

مقصود تک پہنچنے ہی والے تھے۔ مائیکل نے مسجد کے قریب پہنچ کر گاڑی روک دی اور ساتھ ہی گاڑی کا انجن بھی بند کر دیا تھا۔ میں اور بڑے ابا گاڑی سے اترے آج دھوپ خاصی چمکیلی اور تیز تھی لیکن جنوری کی سرد ہوا میں دھوپ کی کیا چلتی۔ میں اور بڑے ابا آگے بڑھے مائیکل بھی ہمارے ساتھ پیچھے پیچھے آرہا تھا۔ جب مجھے یاد آیا کہ اصل چیز تو ہم گاڑی میں ہی بھول آئے تھے۔ وہ بقچہ جس میں عطر رکھے تھے اور ایک چادر یہ دونوں چیزیں میں نے مائیکل کو گاڑی سے لانے کے لیے واپس بھیج دیا تھا اور خود بڑے ابا کے ہمراہ میں اس اونچی مسجد کی سیڑھیاں چڑھنے لگا جو اس شہر کی خاصی پرانی جامع مسجد تھی ۔شہر کے بیچ و بیچ ہونے کے باوجود مسجد کے اطراف میں کچھ اس قدر پیڑ پودے موجود تھے کہ یہ جگہ کچھ الگ تھلگ سی ہی دکھائی پڑتی تھی۔

مسجد کے وسیع صحن میں اترتے ہی میری ناک کے نتھنوں سے وہی لاہوتی سی مسحور کن خوشبو ٹکرائی اور میرا ذہن جیسے اس جہاں کی ہر چیز سے بے نیاز کسی اور جہاں کی سیر کو نکل گیا تھا۔ جب مجھے بڑے ابا نے ٹوکا' میاں وہاں کہاں جا رہے ہو' راستہ اس طرف ہے۔ مسجد کی عمارت کے بائیں طرف ہی وہ راستہ تھا جو مسجد کے عقب میں جا نکلتا تھا' ہم اس راستے سے ہوتے ہوئے اس دوسرے صحن میں جا اترے جو پہلے صحن سے ذرا چھوٹا تھا' لیکن ایک اور فرق بھی تھا اور وہ یہ تھا کہ ابتدائی حصے میں فقط نماز کے اوقات میں ہی رونق دکھائی پڑتی تھی لیکن عقبی جانب مسجد کے اس حصے میں جہاں بابا رب نواز رونق افروز تھے دن' رات لوگوں کے آنے جانے کا سلسلہ جاری رہتا تھا۔

اس صحن کو بھی دو حصوں میں تقسیم کیا گیا تھا' ایک جانب بچے تعلیم کے لیے بیٹھتے تھے جبکہ دوسرے حصے میں وہ مصیبت زدہ لوگ بیٹھا کرتے تھے جو نہ جانے کتنے ہی میلوں کا سفر طے کر کے بابا جی سے ملاقات کو آتے تھے اور پھر اپنی باری آنے کے انتظار میں وہ یہیں اس حصے میں ڈیرہ جما لیتے تھے۔ بڑے ابا کو میں نے ذرا دیر کو اسی جگہ رکنے کو کہا میں چاہتا تھا کہ مائیکل گاڑی میں سے سامان لے کر آجائے تو ہم اندر چلیں لیکن پھر نہ جانے کس سمت سے ایک ننھے سے بچے نے آکر میرے ہاتھ کو جھنجوڑا' میں نے جو سر کو گھما کر اس کی جانب دیکھا تو وہ جھٹ سے بولا۔

''بابا جی' آپ کو اس طرف یاد فرما رہے ہیں۔'' یہ سن کر میں نے مسکرا کر اس بچے کے گال کو تھپکایا تو وہ ہمارے دیکھتے ہی دیکھتے پھر سے کسی سمت کو غائب ہو گیا تھا۔

''لو میاں بابا جی کو ہمارے آنے کی خبر ہو گئی۔'' بڑے ابا نے میری جانب دیکھتے ہوئے کہا اور ہم جو پہلے سے ہی شوق دیدار کو بے قرار تھے' اب ہماری بے تابی اور بڑھ گئی تھی۔ ہم بھی کچھ بھلا کر آگے بڑھے اور اس نشیبی کمرے کی سیڑھیاں اترنے لگے جو پہلے صحن سے ذرا گہرائی میں تھا۔ آخری سیڑھی سے نیچے قدم رکھنے سے پہلے ہی میری نظر مجمعے میں بیٹھے بابا رب نواز پر پڑی۔ ایک سیکنڈ کے کسی ہزارویں حصے میں مجھے لگا سینکڑوں طرح کی روشنیاں میری قوت بصارت سے ٹکرائی اور اگلے ہی لمحے میں ہوش و حواس سے بیگانہ فرش پر جا گرا۔

بابا جی کی سحر بھری آواز میرے کانوں سے ٹکرائی نہ جانے میں کتنی دیر تک بے ہوشی میں رہا تھا۔ بابا جی کی آواز سن کر میں نے دھیرے دھیرے آنکھیں کھولیں۔ ''ایک تو بھلے آئے ہو میاں اور دوسرا تم اس عمر میں اپنے بڑے ابا کو بڑا پریشان کیے ہوئے ہو۔''

بابا رب نواز کی یہ بات سن کر میں نے سر کو جو گھما کر دیکھا تو بڑے ابا مجھے واقعی مضطرب دکھائی پڑے۔ یہ دیکھ کر میں فوراً ہی اٹھ بیٹھا اور بابا رب نواز کے ہاتھوں کو بوسہ دیتے ہوئے میں نے اپنی آنکھوں سے لگالیا۔ اس وقت چند اور بھی عقیدت مند بابا جی کے گرد موجود تھے۔ جب چند لمحوں کی خاموشی پاتے ہی میں نے اپنے دل میں اٹھتے سوال کو بابا جی کے سامنے کہہ ہی ڈالا۔

''آخر کو ایسا کیا ہوا جو میں یوں اپنے ہوش و حواس سے ہی بیگانہ ہو گیا تھا؟'' میرا سوال سن کر بابا جی مسکرائے اور بولے۔ ''کچھ ایسے انسان بھی ہوتے ہیں جن کہ نامہ اعمال میں کوئی طویل ریاضتیں شامل نہیں ہوتیں چاروں طرف سے دنیاداری کے گورکھ دھندوں اور شیطانی پانسوں میں پھنسے کسی روز جو رب تعالیٰ کی طرف سے آئی کسی آزمائش پر پورے اترتے چلے جاتے ہیں' صبر' ہمت' حوصلہ اور سب سے بڑی بات جو تقویٰ رکھتے ہیں پھر وہ بارگاہ خداوندی میں ان اللہ والوں سا مقام پالیتے ہیں جنہوں نے ساری زندگی عبادتوں ریاضتوں میں بیتائی ہوتی ہے۔'' بابا جی پھر فقط اتنا ہی بول کر خاموش ہو گئے تو میں سوچ رہا تھا کہ یہ میرے سوال کا جواب تو نہ تھا' شاید میں اپنی ناقص عقل و فہم سے بابا جی کی یہ پیچیدہ باتیں سمجھنے سے قاصر تھا۔ یونہی بابا جی کے پاس بیٹھے ہوئے ایک دم سے میرے ذہن میں خیال آیا کہ مائیکل ابھی تک گاڑی میں رکھی چیزیں لے کر نہیں پہنچا تھا حالانکہ ہمیں بابا جی کے پاس بیٹھے کافی وقت بیت چکا تھا۔ پھر میری بے چینی کو جیسے بابا جی نے بھانپ لیا تھا۔ میں ان سے اجازت لے کر اٹھا اور سیڑھیاں چڑھتے ہوئے میں سوچ رہا تھا کہ ہوسکتا ہے مائیکل اس کمرے سے باہر ہی موجود ہو اور کمرے میں داخل ہونے سے ہچکچا رہا ہو لیکن باہر صحن میں پہنچنے پر وہ مجھے کہیں دکھائی نہ دیا' یونہی دائیں بائیں دیکھتے ہوئے میں مسجد کے بیرونی دروازے تک جا پہنچا اور بیرونی دروازے کی سیڑھیاں اترتے ہوئے جو میری نظر مائیکل پر پڑی تو وہ وہیں مسجد سے باہر سیڑھیوں کے پاس سامان لئے کھڑا تھا۔ مجھے دیکھتے ہی وہ جلدی سے میری جانب بڑھا۔

''مائیکل تم ابھی تک یہیں کھڑے ہو' میں اور بڑے ابا کب سے تمہارا انتظار کر رہے تھے۔'' میری بات سن کر مائیکل معذرت خواہ انداز میں ہچکچاتے ہوئے بولا۔

''صاحب میں مسجد...... میں.......... میں نے سوچا آپ کہیں......'' وہ جھجکتے ہوئے کھل کر بات نہیں کر پا رہا تھا لیکن میں اس کی بات کا مفہوم سمجھ چکا تھا۔

''مائیکل یہ اللہ میاں کا گھر ہے جس کے دروازے تو ہر کسی کے لیے کھلے ہیں تمہیں اندر آجانا چاہیے تھا۔ چلو اب آؤ میرے ساتھ۔'' وہ ابھی بھی ہچکچا رہا تھا اور مجھے سامان وہیں سے پکڑا دینا چاہتا تھا لیکن اب میں اسے خود اندر لے جانا چاہتا تھا اور اسے ساتھ لے کر سیڑھیاں چڑھتے ہوئے میں سوچ رہا تھا کہ مائیکل تو مسیحی تھا۔ ہمارے ہاں تو فرقے واریت کی کچھ ایسی فضا قائم ہو چکی ہے کہ کسی ایک فرقے کے مسلمان کسی دوسرے فرقے کی مسجد میں جا کر نماز پڑھنا پسند نہیں کرتے۔ مجھے افسوس ہو رہا تھا کہ آج ہم کس قدر بٹ چکے ہیں۔ ہم سیڑھیاں چڑھ کر مسجد کے صحن میں پہنچے تو ایک جانب لوگوں کو وضو کرتا دیکھ کر مائیکل رک گیا۔

''صاحب اللہ میاں کے گھر آ ہی گیا ہوں تو منہ

ہاتھ دھولوں۔'' مائیکل کی بات سن کر میں مسکرایا اللہ میاں کے گھر داخل ہوتے ہی سب سے پہلے اس کے ذہن میں طہارت کا خیال ہی پیدا ہوا تھا پھر مائیکل وضوخانہ کی جانب بڑھ گیا تھا اور میں ایک بغچہ جس میں وہ عطر تھے جو میں بابا جی کو تحفتاً دینے کے لیے لایا تھا اور ایک چادر جوان کی امانت تھی اور خصوصاً جو میں انہیں شکریہ کے ساتھ لوٹانے آیا تھا۔ یہ سامان لے کر میں مسجد کے عقبی حصے کی جانب بڑھا پھر عقبی حصے کی سیڑھیاں اتر کر میں بابا جی اور بڑے ابا کے پاس پہنچا اور پھر سے سلام کرنے کے بعد بابا جی کے پہلو میں بیٹھ گیا تھا۔

بابا جی بڑے ابا سے گفتگو میں محو تھے۔ جب ان کا سلسلہ کلام ختم ہوا تو میں نے نہایت محبت سے انہیں عطر سے بھرا بغچہ تحفتاً پیش کیا جسے انہوں نے خوش دلی سے قبول فرمالیا۔ میں نے پھر ان کی دی چادر ان کی جانب بڑھائی جسے دیکھ کر وہ مسکرادیئے کچھ دیر ایسے ہی چادر کو دیکھتے رہے اور پھر بولے۔

''طٰہٰ میاں چادر تو ہمیں لوٹانے آہی گئے' اب کی بار ہمارے پاس ہی ٹھہر جاؤ۔'' بابا جی کی بات سنتے ہی جیسے میں بھونچکا سا ہو کر رہ گیا تھا۔ یارب میں اس قابل کہاں' مجھے جیسے اپنی سماعت پر یقین ہی نہیں آرہا تھا۔ بابا جی مجھے اپنے ساتھ اللہ کی راہ میں لے جانا چاہتے تھے۔ وہ میرا بخت چمکانا چاہتے تھے اور میں اپنے ہی آپ میں پہیلی بنا تغافل میں پڑا رہا' وہ مجھے کہتے رہے اور میں فقط سنتا رہا۔

''کہاں تک بھاگو گے میاں کسی نہ کسی روز تو ہمارے ساتھ چلنا ہی ہے تمہیں۔'' ان کی یہ بات سن کر میں نے بڑے ابا کی جانب دیکھا۔ مجھے لگا جیسے وہ بھی تیار بیٹھے تھے اٹھنے کے لیے' میں نے سر گھما کر بابا جی کی جانب دیکھا اب کی بار وہ مسکرادیئے' انہوں نے اپنا ایک ہاتھ میرے دائیں کاندھے پر رکھا اور نہایت شفقت سے بولے۔

''جیسی تمہاری مرضی میاں یہاں زور زبردستی نہیں چلتی۔'' وہ میری حالت کو بھانپ گئے تھے۔ بڑے ابا نے بابا جی سے اجازت طلب کی اور میں جیسے بھاری ہوتے قدموں کے ساتھ ان کے ہمراہ چل دیا۔ جیسے میرے وجود میں کوئی گھمسان کی جنگ چھڑ چکی تھی۔ دونوں طرف کی فوجیں توپیں گاڑھے ایک دوسرے پر گولے برسا رہی تھیں اور دونوں ہی قوتیں ہم پلہ تھیں فقط کمزور تھا تو میرا وجود جسے میں گھسیٹتا ہوا بڑے ابا کے ساتھ چل رہا تھا۔ میں کوئی فیصلہ نہ کر پایا تھا' شاید ابھی آزمائش طویل تھی یا میں خود ہی اپنے آپ کو آزمائشوں میں ڈالنے کے لیے آمادہ ہو چکا تھا۔

◉......●●●......◉

بابا رب نواز کی طرف سے ہو کر آنے کے کئی دن بعد تک بھی میں مضطرب سا جیسے کسی کشمکش میں مبتلا رہا۔ ہر گھڑی یہی سوچتا رہا کہ آخر کو ایسا کیا بچا تھا اب میری زندگی میں جس کی خاطر میں نے بابا جی کی بات سنی ان سنی کردی۔ اور بڑے ابا کے ساتھ پھر سے گھر چلا آیا۔ بہت سوچتا رہا لیکن مجھے اس سوال کا جواب نہ ملا۔ اب میرے پاس بابا جی کی نشانی وہ کالی چادر بھی نہ تھی جس سے اٹھنے والی سحر زدہ سی خوشبو مجھے غموں سے وقتی نجات دلا کر راحت اور سکون کی ایسی اتھاہ گہرائیوں میں لے جاتی تھی جہاں میں غوطہ زن نہ جانے کس جہاں جا نکلتا تھا۔

اگلے پل ہی میں نے ارادہ کرلیا کہ میں پہلی فرصت میں ہی بازار جا کر ویسی ہی کالی چادر خرید لاؤں گا' اب مجھے چادر اوڑھنے کی عادت ہو چکی تھی اور پھر شام کو بازار جا کر میں ایک کالی چادر لے ہی

آیا۔ اسے اپنی پسند کا عطر لگایا لیکن نہ جانے کیوں پھر بھی وہ مجھے پسند نہ آئی اور میں سوچنے لگا کہ بابا جی نے اپنی چادر مجھے ہمیشہ کے لیے کیوں نہ دے دی۔ جانے اس میں بھی کیا بھید چھپا تھا اپنے کمرے میں بیٹھا اس وقت میں یہی کچھ سوچ رہا تھا جب بابا عبدالقادر میرے کمرے میں آئے وہ بڑے ابا کا پیغام لے کر آئے تھے۔ وہ چاہتے تھے کہ یومنہ کو اسٹیشن تک چھوڑ آنے کے لیے میں جاؤں۔ وہ بڑے ابا کا یہ پیغام دے کر چلے گئے تو ان کے جانے کے کچھ دیر بعد ہی میں اپنے کمرے سے نکل کر پورچ کی جانب بڑھا تو وہاں پہنچ کر یومنہ کو دیکھتے ہی مجھے یاد آیا میں نے اسے چند روز پہلے ایک عبایا تحفتاً دیا تھا لیکن اب اسے عبایا کے بغیر دیکھ کر میں سوچ رہا تھا کہ میں فقط اتنا ہی کر سکتا تھا' وہ اب سبھی سے الوداعی ملاقات کر رہی تھی۔ جب بابا عبدالقادر اس کا سامان اٹھا کر گاڑی میں رکھ رہے تھے۔ وہ سامان گاڑی میں رکھ چکے تو میں نے ڈرائیونگ سیٹ سنبھالی اور یومنہ کے میرے مدمقابل سیٹ پر بیٹھتے ہی میں نے گاڑی دھیرے سے آگے بڑھا دی تھی' راستہ بھر یومنہ کو چپ چاپ دیکھ کر میں سوچ رہا تھا کہ میں نے اسے عبایا فقط اس لیے لے کر دیا تھا کیونکہ ایسا کرنے کو میرا من چاہا تھا' میرا دل چاہتا تھا کہ میں اسے وہ ہی عزت دوں جس عزت کی وہ عورت ہونے کی وجہ سے حقدار تھی' میں جو اس کے ساتھ ایک غیر محرم تھا' اگر کبھی انجانے میں ساتھ چلتے ہوئے اس کی جانب نگاہ اٹھ جائے تو میری نگاہ اس کے وجود تک نہ پہنچ پائے اور میں ہی کیا اس کے اردگرد موجود کوئی بھی شخص اس کی جانب دیکھے تو اس کی نگاہ خود ہی پلٹ جائے کہ یہ ایک باحیا باوقار مسلم عورت ہے۔

معمولی علیک سلیک کے بعد راستہ بھر ہم دونوں خاموش ہی رہے اسٹیشن پہنچ کر جو میں نے معلومات حاصل کیں تو ٹرین کی روانگی ابھی پونے دو گھنٹے تاخیر سے ہونا تھی۔ ہم لوگ کافی پہلے اسٹیشن پہنچ چکے تھے۔ میں جو یہ معلومات لے کر واپس گاڑی کے پاس پہنچا تو یومنہ گاڑی سے نکل کر پلیٹ فارم پر موجود بھیڑ میں میرا ہی انتظار کر رہی تھی۔ قریب پہنچ کر میں نے اسے بتایا کہ ابھی ٹرین کی روانگی میں پونے دو گھنٹے پڑے ہیں۔ جسے سن کر وہ کچھ سوچنے لگی تھی اور میں قریب کھڑا سمجھ گیا تھا کہ میری بات سن کر وہ شش و پنج میں پڑی یہی سوچ رہی ہوگی کہ اب اتنا وقت جو وہ مجھے پہلے ہی اسٹیشن لے آئی تھی' تو مجھے اس کے ہمراہ خواہ مخواہ میں ہی انتظار کرنا پڑے گا۔ اسے تاحال خاموش دیکھ کر میں خود ہی بول پڑا کہ میں اسے گاڑی میں بٹھا کر گاڑی روانہ ہونے تک یہاں سے کہیں نہیں جانے والا' میری یہ بات سن کر جیسے وہ کچھ اچھا محسوس کرنے لگی تھی پھر ہم دونوں ہی پلیٹ فارم پر انتظار کرنے والوں کے لیے لگے بینچ کی جانب بڑھے اور پھر جس بینچ پر ہم بیٹھے تھے وہاں پہلے سے ہی ایک معمر شخص بیٹھا کسی کا انتظار کر رہا تھا۔ بینچ پر پانچ' چھ لوگوں کے بیٹھنے کی گنجائش تھی۔ اب ہم تینوں ہی یوں بیٹھے تھے جیسے امتحان کے وقت استاد بچوں کے درمیان فاصلہ چھوڑ کر بٹھاتے ہیں۔ مسافروں کی بھیڑ بھاڑ میں سامان کی ایک جگہ سے دوسری جگہ منتقلی کرتے قلی بھی میری توجہ کا مرکز بنے ہوئے تھے اور میرے ساتھ بیٹھی یومنہ بھی شاید اسی بھیڑ کا مشاہدہ کر رہی تھی جب پھر کسی جانب سے ایک عبایا پہنے ہوئے لڑکی ہمارے پاس آئی' اور وہ معمر شخص جو ہمارے قریب چپ چاپ بیٹھا تھا' وہ اس کا ایک ہاتھ تھامے اسے اپنے ساتھ لے گئی اور میں انہیں دور تک جاتا دیکھتا رہا۔ جب یومنہ کی آواز میرے

کانوں سے ٹکرائی۔

"طٰہٰ آپ یہی سوچ رہے ہوں گے ناں کہ میں نے آپ کا تحفتاً دیا عبایا نہیں پہنا۔" میں اس کی بات پر جس قدر حیران ہو کر اس کی جانب متوجہ ہوا تھا۔ اب اسی قدر متجسس ہو کر اس کی اگلی بات سن رہا تھا۔

"دراصل میں اب تک زندگی کو جیسے جیتی آئی ہوں میں نے کبھی ایسے کچھ سوچا ہی نہیں، زندگی میں ٹھہر نے کا ایسا سوچنے کا کبھی موقع ہی نہیں ملا۔" اتنا کہہ کر وہ خاموش ہو گئی اور میں دعا کرنے لگا کہ یومنہ اللہ آپ کو کبھی کسی آزمائش میں نہ ڈالے کہ آپ کو زندگی میں ٹھہر جانا پڑے، وہ رب العزت آپ کو سبھی کچھ عطا کر دے بن مانگے۔" میں اس کے لیے دعائیں مانگ رہا تھا اور وہ پھر سے مجھ سے مخاطب تھی۔

"طٰہٰ میں آپ سے جاننا چاہتی ہوں کہ ایسا آپ کی زندگی میں کیا ہوا تھا؟ جس نے آپ کی زندگی کا رخ ہی بدل دیا۔ آپ ہمیشہ سے تو ایسے نہ تھے، آپ سے کوئی شخص بھی ایک بار مل لینے کے بعد یہ ضرور سوچے گا کہ آپ بہت الگ ہیں۔" یومنہ بولتی رہی اور اس کی باتیں سن کر مجھے یوں محسوس ہو رہا تھا جیسے میرے اردگرد کوئی تیز آندھی چلنے لگی تھی۔ جس میں اڑ رہے اوراق میرے ماضی کے مختلف ادوار تھے اور پھر میرے لب ہلنے لگے جن سے نکلتی مدھم آواز کو سننے کے لیے یومنہ مجھ سے ذرا اور قریب آ چکی تھی۔

مجھے یاد آ رہا تھا کہ اس روز خوب بارش ہو رہی تھی۔ ایسی موسلا دھار بارش کہ تھمنے کا نام ہی نہ لے رہی تھی اور کہنے والے کہہ رہے تھے کہ ہمارے خاندان کی ہر شادی پہ موسم ایسا ہی ہو جاتا تھا۔ غلام مصطفیٰ عالم کی شادی ہونے جا رہی تھی۔ عبیرہ کی سالگرہ پہ ماں اور ابا کی ملاقات ایک ایسے خاندان سے ہوئی تھی جو انہیں ہر لحاظ سے اپنے شایان شان لگا تھا۔ لڑکی کسی غیر ملکی یونیورسٹی سے اپنی تعلیم مکمل کر کے لوٹی تھی اور ماں کو ایسی ہی بہو کی تلاش تھی جو انگریزی خوب جانتی ہو اور جب وہ اپنی ہم عصر خواتین سے اسے ملائیں تو وہ اپنی انگریزی سے انہیں خوب مرعوب کر سکیں۔

ہم لوگ جو بے موقع اپنے لیے جشن کا سامان ڈھونڈ لیا کرتے تھے۔ اب ایسے ہی موقعوں پر ایسی ہی راتوں میں تو ہمارے خزانوں کے بند منہ کھلتے تھے۔ پیٹیاں بھر بھر کے پیسہ صرف آج کی رات رقص پیش کرنے والیوں پر نچھاور کرنے کو لایا گیا تھا۔ آتش بازی، دیسی ولایتی سبھی کے لیے سبھی قسم کے انتظامات پورے تھے۔

لیکن ان سبھی قسم کی فضولیات سے اگر کوئی واحد نہ خوش تھا تو وہ فقط بڑے ابا تھے۔ وہ میرے ابا کو بلا کر ایک طرف لے گئے اور انہیں سمجھانے لگے کہ یہ سبھی قسم کی بیہودگی ہمارے رسم و رواج نہیں، لیکن ابا کہاں ان کی بات سننے والے تھے۔ الٹا انہیں سمجھانے لگے کہ اب ان کا زمانہ نہیں رہا۔ عین اسی وقت رقص و سرور کی محفل اپنے عروج پر تھی۔ میں نے جو مست ہو کر کسی رقص پیش کرنے والی کا بازو تھاما تو دوسرے ہاتھ سے نوٹوں کی ایک گڈی ہوا میں اچھال دی۔ روپوں کی برسات ہونے لگی تھی۔ ایک برسات باہر تھمنے کا نام نہ لے رہی تھی تو دوسری برسات ہم لوگوں نے روپوں کی کر رکھی تھی۔ دفعتاً میری نظر ایک طرف کھڑے بڑے ابا پر پڑی وہ میرے ابا کو ابھی تک مسلسل سمجھانے کی کوشش کر رہے تھے کیونکہ انہیں یہ فضولیات بالکل پسند نہ تھیں۔ وہ چاہتے تھے کہ خورشید عالم میرے ابا یہ سب ناچ گانا بند کروا دیں۔ میں ایسے ہی مست ماحول میں جھومتا وہاں پہنچا اور بڑے ابا جو برابر میرے ابا کو سمجھانے کی کوشش

کررہے تھے اور اس بات سے بے خبر تھے کہ میں کب وہاں پہنچا اور پھر میں نے جو انہیں عقب سے اپنی بانہوں کے گھیرے میں لے لیا تو اب وہ چھڑانے کی کوشش میں مجھے سنانے لگے تھے۔ یہ دیکھ کر پاس کھڑے میرے ابا زوردار قہقہے لگانے لگے تھے پھر میں بڑے ابا کو اپنی بانہوں کے حصار سے آزاد کرکے اب انہیں اپنے ساتھ جھومنے گانے کی دعوت دے رہا تھا۔

میں جانتا تھا کہ وہ بھی اپنے بڑے پوتے کی شادی پر کس قدر خوش تھے' ان کا سارا غصہ' ساری خفگی ظاہراً ہی تھی لیکن پھر وہ مجھے بھی سمجھانے لگے تو میں انہیں اپنے ساتھ لے جاکر گھر کے اس خاص حصے میں چھوڑ آیا جہاں انہی کی ٹائپ کے سنجیدہ حضرات بیٹھے ہم آج کی نسلوں پر گفتگو فرمارہے تھے۔ میں فوراً ہی وہاں سے پلٹا میرے سبھی دوست احباب اس طوفانی موسم کی پروا کیے بغیر پہنچ چکے تھے لیکن ان سبھی کے بیچ میں خود کو تنہا محسوس کررہا تھا' اس کی وجہ یہ تھی کہ عبیرہ ابھی تک نہ پہنچی تھی اور پھر مجھے کسی سے معلوم پڑا کہ داؤد بھی ابھی تک نہ پہنچا تھا۔ یہ جان کر مجھے کچھ عجیب بے چینی کا احساس ہونے لگا کچھ دیر پہلے ہی عبیرہ سے میری بات ہوئی تھی' اس کا کہنا تھا کہ بارش کے تھمتے ہی وہ چلی آئے گی اور جب میں نے اس سے داؤد کے بارے میں پوچھا تو اس نے لاعلمی کا اظہار کیا کہ وہ نہیں جانتی کہ داؤد ابھی تک کیوں نہیں پہنچا پھر میں نے جو داؤد کا نمبر لگایا تو وہ بھی مسلسل آف جارہا تھا۔ اب میں نے سبھی قسم کے غلط خیالات کو ذہن سے جھٹکنے کی کوشش کی اور پھر سوچا کہ بہت ہوگیا اب یہ سب میں عبیرہ کو خود لینے جاؤں گا' اور یہ سوچتے ہوئے میں گاڑی بھی اسٹارٹ کرچکا تھا اور گھر سے نکلنے ہی والا تھا جب عبیرہ کی کال آگئی۔ میں نے جھٹ کال ریسیو کی اور پھر ساتھ ہی میں نے گاڑی کا انجن بند کردیا۔ اس کی طبیعت اچانک بگڑ گئی تھی اور وہ کہہ رہی تھی کہ وہ آج نہیں آپائے گی' یہ سنتے ہی میں گاڑی سے اترا تو ایک لات رکھ کے گاڑی کو رسید کی تو جیسے میں اس طرح سے اپنا غصہ قابو میں لانے کی کوشش کررہا تھا۔ اب پھر سے غلط قسم کے وسوسے میرے ذہن میں یلغار مچانے لگے تھے۔ عین اسی لمحے اندر ہال میں گلوکارہ نے جو نیا شوخ سا گانا شروع کیا تو وہاں لگی بھیڑ کی اونچی سیٹیوں اور شور کی آوازیں باہر پورچ تک سنائی دے رہی تھیں۔ میں وہاں سے تیز تیز قدم اٹھاتا ہال میں پہنچا اور پھر مست منچلوں کی بھیڑ میں نہ جانے کہاں سے کیسے ایک بوتل میرے ہاتھ لگ گئی اور پھر میں نے اسے منہ سے لگالیا۔ ہوش میں تو میں پہلے ہی نہ تھا اور میرے ابا بھی نہ تھے' ورنہ بڑے ابا کو بھلا ہمیں یوں سمجھانے بجھانے کی ضرورت کیوں پیش آتی۔ ہوش میں ہوتے تو کیا یوں لاکھوں روپیہ ناچنے والیوں پر نچھاور کرتے اگر حواس قائم ہوتے تو کیا گھر جیسے پاکیزہ ماحول میں ننگے سر اور بدن والی عورتوں کو نچاتے اور اب پی لینے کے بعد ہوش سے ہی نہیں ہوش وحواس سے بے گانہ ہوکر میں کبھی کسی رقاصہ کا بازو تھام لیتا تو کبھی کسی کے ہمراہ رقص کرنے لگتا تو کبھی مجھے اپنے ساتھ ناچ رہی رقاصہ عبیرہ دکھائی دینے لگتی اور میں یوں کھل اٹھتا جیسے عبیرہ آگئی ہو اسے یہ احساس ہوگیا کہ طٰہٰ عالم اسے کتنا مس کررہا ہے اور وہ بھری برسات میں اپنی طبیعت کی خرابی کے باوجود میری خوشی کی خاطر چلی آئی ہو اور اب ناچ ناچ کر مجھ پر فدا ہوئی جارہی ہو نشے نے بری طرح سے مجھ سے میرے ہوش وحواس سلب کررکھے تھے۔

اب میں جو سامنے ناچ رہی رقاصہ کو عبیرہ سمجھ

رہا تھا تو اسی خوش فہمی میں لڑکھڑاتے ڈگمگاتے قدموں کے ساتھ جھوم رہا تھا پھر جیسے ہی وہ میرے وجود سے آ لگی میں نے اس کا بازو تھام لیا اور بھیڑ کو چیرتا ہوا آگے بڑھا' ہال سے نکلتے ہی کمروں کی لمبی قطار شروع ہو چکی تھی۔ یہ ہال اور ملحقہ کمرے ہمارے محل نما گھر کا مہمان خانہ تھا۔ میں اسے ساتھ لیے راہداری میں لڑکھڑاتے قدموں کے ساتھ آگے بڑھا' ایک کمرے کے ہینڈل لاک کو گھمایا وہ بند تھا۔ میں اگلے کمرے کی جانب بڑھا ہینڈل گھمایا اور وہ یوں کھلا کہ میں گرتے گرتے سنبھلا۔ کسی عقبی روشندان سے کمرے میں روشنی آ رہی تھی اور ویسے بھی اب میں ہوش میں ہی کہاں تھا کہ لائٹ آن کرتا۔

صبح جو میری آنکھ کھلی تو بستر پر میں فقط تنہا ہی تھا۔ نشہ اتر چکا تھا' لیکن لباس پہنتے ہوئے میں یہی سوچ رہا تھا کہ عبیرہ اگر میرے ساتھ تھی تو پھر وہ ابھی کہاں ہے؟ لیکن میرا یہ خیال غلط ثابت ہوا وہ رات ہماری طرف آئی ہی کب تھی' یہ بات مجھے گھر کے ملازم سے پتہ چلی تو اب میں اپنا سر تھامے بیٹھا تھا۔ رات بھر میرے ساتھ میرے بستر پر جو تھی وہ عبیرہ نہیں تھی۔ مجھے اپنے آپ پر ہی نہیں عبیرہ پر بھی غصہ آ رہا تھا۔ یہی وجہ تھی کہ اگلے کئی روز تک میں نے اس سے بات کرنا ترک کر دیا تھا اور جب شادی کی سبھی رسومات اختتام پذیر ہو چکی تھیں' ایک روز داؤد اپنی جیپ پر میرے گھر آ پہنچا۔ عبیرہ اس کے ساتھ ہی تھی۔ وہ میری عبیرہ کے ساتھ چل رہی ناراضگی کو لے کر ہمارے درمیان صلح کروانا چاہتا تھا۔ مجھے داؤد سے کسی بھلے کی امید تو نہ تھی لیکن آج جب وہ میرے اور عبیرہ کے درمیان صلح کروانے کی غرض سے آیا تھا تو مجھے وہ بے حد پیارا لگ رہا تھا۔ میں جو ایک پل بھی عبیرہ کے بغیر رہ نہیں سکتا تھا آج تین' چار روز سے میں نے اس سے بات تک نہ کی تھی' مجھے بھی بس ذرا بہانے کی تلاش تھی۔ داؤد جیسے پہلے سے ہی پروگرام بنا کر آیا تھا۔ ہم تینوں گھر سے نکلے راستے میں دو ایک اور دوستوں کو ساتھ لیا اور ہمارے فارم ہاؤس جا پہنچے۔

فارم ہاؤس پہنچتے ہی سبھی نے پول میں چھلانگیں لگا دیں اور میں عبیرہ کو لے کر ایک طرف کو چل پڑا۔ آج کتنے ہی دنوں بعد ہم ایک ساتھ تھے اور بالکل خاموشی سے ایک ساتھ چل رہے تھے۔

''عبیرہ''

''ہوں'' وہ میرے آواز دینے پر چونکی۔

''کیا سوچ رہی ہو تم عبیرہ؟'' اس کے یوں چونکنے پر میں نے سوال کیا۔

''نہیں تو...... کچھ بھی تو نہیں۔'' وہ پھیکی سی مسکراہٹ کے ساتھ فقط اتنا ہی جواب دے پائی تھی۔

''بھائی کی شادی تو اب ہو گئی' اب بچا ہوں میں تو کس روز لینے آؤں تمہیں بینڈ باجے کے ساتھ۔'' میں نے ایک دم سے رکتے ہوئے اس کے بالکل سامنے آ کر پوچھا۔ وہ میری بات سن کر نہ تو خوش ہوئی اور نہ ہی اس نے کوئی جواب دیا۔ وہ مجھے یونہی کھڑا چھوڑ کر ایک قدم آگے بڑھ گئی اور میں بھی پلٹ کر اس کے ساتھ ہو لیا۔ ہم لوگ اب چلتے چلتے کافی آگے نکل چکے تھے۔ تب اس کی خاموشی اور بے اعتنائی پر مجھے ایک دم سے غصہ آ گیا اور میں پھٹ پڑا۔ ''عبیرہ'' میں نے بلند آواز سے اسے پکارا۔ وہ ششدر سی ہو کر مجھے دیکھنے لگی۔ جب میں نے اپنی بات مکمل کی ''تمہیں آخر ہوا کیا ہے؟''

''طہٰ یہ تم کس لہجے میں مجھ سے بات کر رہے ہو۔'' میرے غصے سے چلانے پر اس نے حیرت کا اظہار کیا۔

میں آگے بڑھا اور اپنے غصے پر قدرے قابو پاتے ہوئے میں نے اس کے کاندھوں پر ہاتھ رکھتے ہوئے اس کی نگاہوں میں جھانکنے کی کوششیں کی۔

"عبیرہ میں فقط یہ چاہتا ہوں کہ جب ہم دونوں ہی راضی ہیں تو پھر شادی میں دیر کیسی؟" وہ میری بات سن کر مجھ سے نگاہیں چرا گئی اور مجھ سے قدرے پیچھے ہٹتے ہوئے بولی۔

"طہٰ میں ابھی شادی نہیں کرنا چاہتی۔"

"تم جھوٹ بول رہی ہو تمہیں وجہ بتانا پڑے گی عبیرہ۔"

"آخر کو کیا وجہ ہو سکتی ہے۔ بولو......" میں نے ایسا گرج دار آواز سے کہا اس پل مجھے نہ جانے کیا ہو رہا تھا جیسے آسمان ٹوٹ پڑا تھا یا زمین میرے پیروں تلے سے کھسکنے لگی تھی جب اس نے اپنا کھرا سا جواب بھی سنا دیا۔

"میں وجہ بتانا ضروری نہیں سمجھتی۔" وہ فقط اتنا کہہ کر واپسی کے لیے پلٹ گئی اور میں وہیں ساکت کھڑا حیرت زدہ سا اپنے ذہن میں اٹھ رہے اس سوال کا جواب کھوج رہا تھا کہ آخر کو وہ ایسا کیوں کر رہی تھی؟ میرے ذہن میں اٹھ رہے اس سوال کا جواب بھی فقط وہی دے سکتی تھی، جو یہ کہہ کر پلٹ گئی تھی کہ وہ جواب دینا ضروری نہیں سمجھتی۔ میں کچھ دیر وہیں حیرت سے مجسمہ بنا کھڑا رہا اور پھر اسے کافی آگے نکلتا دیکھ کر میں بھی پیچھے چل پڑا۔

جب میں سبھی کے پاس پہنچا تو وہ اس وقت شرارتوں میں مگن تھے۔ میں چپ چاپ اس کے پاس سے گزر جانا چاہتا تھا جب داؤد نے مجھے آواز دی۔ وہ مجھے اپنے ساتھ پول میں فٹ بال کھیلنے کی دعوت دے رہا تھا اور عبیرہ بھی پیروں کو پول میں لٹکائے وہیں کنارے پر بیٹھی تھی۔ میں داؤد کو کوئی بھی جواب دیئے بغیر آگے بڑھ گیا تھا۔ جب کبھی میں بے حد پریشان یا مایوس ہونے لگتا تھا یہیں اسی فارم ہاؤس آ کر ولایتی کی جگہ برانڈی پیا کرتا تھا، پول کے پاس ہی فارم ہاؤس کے ریسٹ رومز تھے میں نے اندر پہنچ کر برانڈی کی ایک بوتل نکالی اور اسے گھونٹ گھونٹ پینے لگا۔

"تمہیں وجہ بتانا پڑے گی...... عبیرہ؟"

"آخر کو کیا وجہ ہے بولو......؟"

میرا ہر گھونٹ پھر سے اس سے وہی سوال دہرا رہا تھا اور اس کا بھی وہی کھرا سا جواب میرے ذہن میں کسی ہتھوڑے کی ضرب بن کے برس رہا تھا۔

"میں وجہ بتانا ضروری نہیں سمجھتی۔" میں اس کے اس کھرے سے جواب کے بدلے خود ہی وجہ کھوجنے لگا تھا۔ ساتھ ہی ساتھ برانڈی کا تیز نشہ میرے اعصاب پر چڑھنے لگا تھا لیکن میں کسی نتیجے پر پہنچ نہیں پایا کہ اس کے ایسے رویے کی کیا وجہ ہو سکتی تھی۔ وہ جو میرے بن ایک پل نہیں رہ سکتی تھی۔ میری خواہش جاننے کے بعد خوشی سے پاگل ہوئی جاتی تھی۔ سبھی کو بتاتی پھرتی تھی کہ طہٰ عالم اس سے شادی کرنا چاہتا ہے۔ اب یوں چند دنوں میں ہی ایسی کیا وجہ بن گئی تھی کہ وہ مجھ سے یوں متنفر ہو رہی تھی۔

داؤد مجھے اور عبیرہ کو یوں ایک ساتھ اس جگہ صلح کروانے کی غرض سے لایا تھا لیکن اسے کیا پتہ تھا کہ یہاں آ کر ہمارے بیچ نازک سا بندھن ہی ٹوٹ پھوٹ کا شکار ہونے لگے گا۔ میں اسی رنج میں گھلتا کافی دیر سے اندر بیٹھا پی رہا تھا۔ جب داؤد میرے پاس آیا، وہ مجھے اب جلد یہاں سے واپس چلنے کا کہہ رہا تھا۔ سورج غروب ہو رہا تھا اور اب ہمیں یہاں سے نکلنا تھا۔ میں نے اسے کہا کہ وہ گاڑی اسٹارٹ کرے میں پہنچ رہا ہوں۔ وہ میری بات سن کر چلا گیا

لیکن اس نے مجھ سے یہ تک دریافت نہیں کیا کہ آخر میں جو یہاں عبیرہ سے صلح کرنے آیا تھا اب یوں مجنوں بنا پی کیوں رہا ہوں۔ کاش! اس وقت میں نے اس بات پر ہی غور کرلیا ہوتا تو مجھے میرے سوال کا جواب مل گیا ہوتا۔

میں اپنی جگہ سے اٹھا لیکن خود کو سنبھال نہیں پایا اور لڑکھڑاتے ہوئے گرتے گرتے بچا۔ کمرے میں بکھری میز اور کرسیوں کا سہارا لے کر میں ایک طرف موجود الماری کی جانب بڑھا' الماری کے پاس پہنچ کر میں نے ایک ناگوار سا ڈکار لیا اور جیب سے چابی نکال کر لگائی پھر الماری کا دروازہ کھلتے ہی اس میں بنے ایک چھوٹے دراز میں سے میں نے پھر چابی لگا کر ایک ریوالور نکالا' اس میں گولیاں چیک کیں اور پھر اسے اپنی پینٹ کی جیب میں رکھ لیا۔ بسا اوقات فارم ہاؤس سے نکلنے میں مجھے دیر ہوجاتی تو میں یہاں اپنی حفاظت کے لیے رکھے ریوالور کو واپسی کے لیے اپنے ساتھ رکھ لیا کرتا تھا۔ اب اس کام سے فارغ ہوتے ہی میں جو باہر نکلا تو ٹھیک سے چل بھی نہیں پا رہا تھا۔ میں نے دور سے ہی دیکھا داؤد ڈرائیونگ سیٹ پر موجود تھا اس کے مقابل سیٹ پر عبیرہ بیٹھی تھی۔ پچھلی جانب دو دوست بیٹھے تھے جن میں سے ایک مجھ پر نظر پڑتے ہی جیپ سے کود کر میری جانب بڑھا تو اس کا ایک بازو تھامے میں آگے بڑھا' میرے جیپ میں بیٹھتے ہی داؤد نے جیپ آگے بڑھا دی تھی۔ راستہ بھر بھی آج فارم ہاؤس میں بتائے دن پر تبصرہ کرتے رہے داؤد کے قہقہے سب سے زیادہ بلند تھے اور میں نشے میں دھت ابھی تک اسی وجہ کو تلاش کرنے میں مگن تھا جو عبیرہ مجھے بتانا ضروری نہیں سمجھتی تھی۔

میں اکثر اس کی جانب نگاہ اٹھا کر دیکھ لیتا تھا وہ بھی مجھے میری طرح چپ چاپ کھوئی کھوئی سی بیٹھی دکھائی دی۔ اب جیپ چھوٹے چھوٹے قصبوں سے ہو کر گزر رہی تھی۔ ہم لوگ نصف سے زائد سفر طے کرچکے تھے۔ رات کے سوا دس ہو رہے تھے اور ان چھوٹے چھوٹے قصبوں کی سبھی دکانیں تقریباً بند ہوچکی تھیں۔

میں اب تک کئی سگریٹ پھونک چکا تھا۔ آخری سگریٹ کو پھینکتے ہوئے میں نے ایک اور سگریٹ ہونٹوں میں دبایا اور جو لائٹر کو جلانے لگا تو اب اس کا کمزور سا شعلہ سگریٹ کو سلگانے کے لیے نہ کافی ثابت ہوا۔ میں نے غصے سے لائٹر ایک جانب ہوا میں اچھال دیا لیکن کسی اور کے پاس بھی اس وقت کوئی ماچس یا لائٹر نہ تھا۔ میں نے اردگرد نگاہ دوڑائی اور پھر ایک جگہ روشنی دیکھ کر میں نے داؤد کے کاندھے پر ہاتھ رکھا' میں اس کی عقبی جانب اس کے قریب ہی بیٹھا تھا۔ وہ سمجھ گیا تھا' اس نے جیپ دکان کے بالکل قریب سامنے لے جا کر کھڑی کردی۔

میں جیپ کے رکتے ہی نیچے اترا ایک دوست مجھے سہارا دینے کے لیے اترنے لگا تو میں نے اسے روک دیا۔ میں دکان کی جانب بڑھا دکانوں کی لمبی قطار میں فقط وہ پہلی دکان ہی کھلی پڑی تھی۔ دکان کے سامنے بنے برآمدے کی ملگجی روشنی میں جو میں آگے بڑھا تو مجھے دیکھ کر دکان میں موجود شخص اپنی نشست سے اٹھ کھڑا ہوا۔ سر پر سفید جالی دار ٹوپی چہرے پر سنت کے مطابق داڑھی' سفید لباس پہنے وہ چوبیس پچیس سالہ جوان شخص تھا' اور اس وقت اس کے ہاتھ میں قرآن تھا' جسے میرے سامنے ہی اس نے چوم کر آنکھوں سے لگا کر ایک جانب رکھا اور میری جانب متوجہ ہو کر دیکھنے لگا۔ میں کاؤنٹر کے

قریب پہنچا اور جیسے ہی میں نے بولنے کے لیے لب کھولے اس نے میرے منہ سے آتی شراب کی ناگوار بو کو محسوس کرتے ہوئے اپنی ناک پر ہاتھ رکھ لیا۔ اس کی اس حرکت کی پروا کیے بغیر میں نے اسے کہا کہ مجھے ماچس یا لائٹر چاہیے یہ سن کر اس نے ہاتھ اپنے چہرے سے ہٹایا اور یوں غصے اور حقارت سے ایک ہاتھ آگے بڑھا کر جیسے اس نے مجھے دھتکارتے ہوئے وہاں سے ہٹ جانے کو کہا۔ اس کا وہ ہاتھ آگے بڑھا کر مجھے ایسا کہنے کی دیر تھی کہ میں پھر اپنے آپے میں نہ رہا' میری دماغی حالت جو پہلے ہی ابتر تھی اس کی اس حرکت نے مجھے جیسے پاگل بنا کے رکھ دیا اور میں نے اگلے ہی پل جیب میں رکھے ریوالور کو نکالا اور اس پر گولی چلادی۔

گولی کے چلتے ہی وہ اپنے سینے پر ہاتھ رکھے کاؤنٹر کے دوسری جانب فرش پر جا گرا اور میرا ہاتھ جیسے ابھی تک وہیں ہوا میں ہی معلق تھا۔ جب عبیرہ کی چیخ میرے کانوں سے ٹکرائی میں نے پلٹ کر دیکھا داؤد جیپ اسٹارٹ کرچکا تھا' میں تیزی سے لڑکھڑاتے قدموں کے ساتھ جیپ کی جانب بڑھا۔ ابھی میں نے بامشکل چند قدم ہی اٹھائے ہوں گے کہ داؤد جیپ لے کر آگے بڑھ چکا تھا۔ میں نے انہیں آواز دینا چاہی لیکن آواز جیسے میرے حلق میں ہی دب کر رہ گئی تھی۔ میں جیپ کے پیچھے دوڑا وہ چند لمحوں میں ہی مجھ سے بہت آگے دور نکل چکے تھے۔ میں کچھ آگے جا کر وہیں ٹھہر گیا اور ریوالور میرے ہاتھ سے چھوٹ کر نیچے جا گرا۔ میں نے اپنے اردگرد نگاہ دوڑائی گولی کی آواز سننے کے باوجود ابھی تک وہاں کوئی نہیں پہنچا تھا۔ چار سو پھیلی چاند کی چاندنی میں' میں نے سر گھما کر دکان کی جانب دیکھا وہاں کاؤنٹر کے دوسری جانب فرش پر ڈھیر وہ اجنبی جوان پڑا تڑپ رہا ہوگا یا مر چکا ہوگا' ایسا میں نے فقط سوچا' وہ مجھے دکھائی نہیں دے رہا تھا۔ میں سٹپٹا کر رہ گیا۔ گھٹنوں پر ہاتھ ٹکائے آگے بڑھتی شاہراہ کی جانب سر کو اٹھائے ہوئے گھٹی گھٹی آواز میں انہیں آوازیں دے رہا تھا۔

''داؤد...... عبیرہ...... واپس آ جاؤ......'' وہ جو مجھے تنہا چھوڑ کر چلے گئے تھے۔ انہیں واپس کب آنا تھا اور میں تاحال اسی دکان سے چند گز کے فاصلے پر ہی کھڑا تھا۔ اس سے پہلے کہ کوئی اس دکان تک پہنچتا مجھے اب یہاں سے بھاگنا تھا۔ پہلے جس نشے نے میرے حواس سلب کر رکھے تھے' میرے ہاتھ سے یوں گولی کے چل جانے اور داؤد اور عبیرہ کے مجھے بے یارومددگار چھوڑ کر بھاگ جانے کے بعد گویا میرے چودہ طبق روشن ہو چکے تھے۔ میرا نشہ ٹوٹ چکا تھا۔ میں اٹھ کر وہاں سے سرپٹ بھاگنے لگا لیکن مجھے جانا کہاں تھا یہ سوچ کر کچھ آگے جا کر میں پھر سے ٹھہر گیا تھا۔ اب دکان کافی پیچھے رہ گئی تھی۔ ایسے قصبے سرِ شام ہی ویران ہو جاتے تھے۔ یہاں سے کسی قسم کی کوئی سواری نہیں مل سکتی تھی اور شہر یہاں سے میلوں دور تھا۔ گھر جانا بھی مناسب نہ تھا۔ یہ کون سی جگہ تھی میں نے یہ سوچ کر اردگرد نگاہ دوڑائی پاس ہی ایک دیوار پر کسی اشتہار کے ساتھ وسن پورہ لکھا تھا۔ وسن پورہ میرے ذہن میں ایک دم سے جھماکا سا ہوا۔ مائیکل ہمارا ڈرائیور بھی تو اسی قصبے وسن پورہ کا رہائشی تھا۔ میں کئی بار اسے یہاں اس کے گھر سے لینے آیا تھا۔ یعنی آج رات میں مائیکل کے گھر گزار سکتا ہوں ایسا سوچتے ہی میں دائیں بائیں مڑ کر اس جگہ کی شناخت کرنے لگا۔ مائیکل کے گھر اس کی گلی میں داخل ہونے سے پہلے بجلی کا ایک بڑا کھمبا آتا تھا' یہ یاد آتے ہی میں بجلی کے تاروں کے ساتھ ساتھ

چلنے لگا۔ دور الیون کے ڈی کے بڑے سے کھمبے کے ساتھ ایک برقی قمقمہ روشن دکھائی دے رہا تھا۔ میں تھوڑی ہی دیر میں اس برقی قمقمے کے عین نیچے جا پہنچا تھا۔ میں نے اک نظر سر اٹھا کر دیکھا اس پر ایک عبارت کندہ تھی۔ ''خورشید عالم ایم این اے''، یعنی میں ابا کے حلقہ کی حدود میں ہی تھا۔ میں نے سامنے نگاہ اٹھا کر دیکھا سامنے وہی گلی دکھائی دے رہی تھی جس میں مائیکل کا گھر تھا۔ گلی میں داخل ہونے سے پہلے میں نے ایک بار گردن گھما کر دائیں بائیں دیکھا' چار سو ویرانی سی ویرانی چھائی تھی۔ کوئی بندہ بشر دکھائی نہیں دے رہا تھا۔ فقط چند گز کے فاصلے پر کنٹونمنٹ بورڈ کے رکھے بڑے کچرادان کے پاس چند کتے بھونک رہے تھے۔ میں آہستہ سے چلتا ہوا تنگ وتاریک سی گلی میں اتر گیا۔

لیکن اندر گلی میں موجود گھروں میں سے مائیکل کا گھر کونسا تھا؟ اب اس بات نے مجھے شش و پنج میں مبتلا کر رکھا تھا۔ میں فقط دو ایک بار ہی اسے چھوڑنے یا لینے آیا تھا اور ایک بار اس کے ضد کرنے پر میں اس کے گھر چائے پینے آیا تھا۔ اس وقت دن تھا اور اب رات' اور میں کسی کا قتل کر کے پناہ ڈھونڈنے آیا تھا۔ گھبراہٹ میں' میں کچھ سمجھ نہیں پا رہا تھا' دو چار گھر چھوڑ کر ایک گھر کے دروازے کے سامنے میں رک گیا۔ گھر کھوجنے میں مجھے جس قدر دشواری پیش آ رہی تھی' اب اس سے کئی گنا کٹھن مجھے دروازے پر دستک دینا محسوس ہو رہا تھا۔ میں دروازہ کھٹکھٹانے کے لیے اپنا ہاتھ اٹھاتا اور ہاتھ مجھے یوں منوں بھاری ہوتا محسوس ہوتا اور پھر دروازے پر دستک دیئے بغیر ہی میں ہاتھ نیچے لے جاتا' اسی کشمکش میں کچھ وقت مزید گزر گیا۔ پھر ہمت جتا کر میں نے دستک دے ہی دی اور میری سوچ کے برعکس میری پہلی ہی دستک پر مجھے اندر سے کئی قسم کی ملی جلی آوازیں آتی محسوس ہوئیں۔ میں نے دوسری بار دستک نہ دی' میں وہیں کھڑا انتظار کر رہا تھا کہ مائیکل ابھی آ کر دروازہ کھولے گا' جب دروازے کی کنڈی کھلتے ہوئے مجھے اندر سے آواز سنائی دی۔ ''ذرا رکنا اجمل پتر...... کئی بار کہا ہے اسے گریس دے دؤ کتنا دشوار ہو گیا ہے اسے کھولنا۔'' کنڈی کے کھلتے ہی سامنے کھڑے بزرگ شخص نے جیسے مجھے حیرت سے دیکھا۔ میں سمجھ چکا تھا کہ میں نے غلط گھر کے دروازے پر دستک دے دی تھی۔ میں جیسے اپنی غلطی سدھارنے کے لیے جھٹ سے بولا۔ ''بابا جی کیا یہ مائیکل کا گھر ہے؟''

''نہیں بیٹا' مائیکل کے گھر کا دروازہ تو یہ ساتھ والا ہے۔'' بابا جی نے گھر کی دہلیز سے چند قدم آگے آتے ہوئے کہا۔

''معذرت بیٹا' میں سمجھا میرا بیٹا اجمل آیا ہے۔'' میں آگے بڑھ چکا تھا جب میرے عقب سے بابا جی کی آواز مجھے سنائی دی۔ معذرت تو مجھے کرنا چاہیے تھی جو یوں رات کے اس پہر دروازے پر دستک دے کر انہیں تکلیف دی' لیکن میں اس وقت جیسی کشمکش میں مبتلا تھا میں ان باتوں کا بھلا کیا لحاظ کرتا اب میں مائیکل کے گھر کے دروازے سے باہر کھڑا تھا' میں نے جھٹ سے دروازے پر دستک دی اور پھر دوسری تیسری چوتھی دستک کے بعد جو مائیکل نے دروازہ کھولا تو میں دروازہ کھلتے ہی اندر داخل ہو گیا۔ عین اسی لمحے جب میں فوراً اندر داخل ہوا تھا وہ مجھے پہچان نہیں پایا اور گھبرا کر وہ میری طرف مڑا۔ دروازہ ابھی کھلا ہی تھا' یہ دیکھ کر میں نے پلٹ کر دروازہ خود ہی بند کر کے اسے کنڈی لگا دی۔

''چھوٹے صاحب آپ؟ اس وقت؟ اتنی رات کو؟'' وہ مجھے پہچان گیا تھا اور اب حیران ہو کر اس

نے مجھ پر سوالوں کی بوچھاڑ کردی تھی۔ اسی دوران اندر سے اس کی بیوی کی آواز آئی۔
''کون ہے مائیکل؟'' رات کے اس پہر دروازے پر ہونے والی دستک سن کر مائیکل کے بیوی بچے بھی جاگ گئے تھے۔ میں نے اک نظر اندرونی دروازے کو دیکھ کر مائیکل کو کاندھوں سے پکڑ ے اسے اپنے سے ذرا قریب کرلیا تھا۔
''مائیکل مجھ سے خون ہوگیا ہے۔''
''کیا بولا صاحب۔'' مائیکل کو جیسے میری بات پر یقین ہی نہیں آیا۔ وہ میری بات سن کر اب کچھ خوف زدہ دکھائی دے رہا تھا۔ ''صاحب کیسے ہوا یہ سب؟'' اس سے پہلے کہ میں اسے مزید کچھ کہتا وہ کانپتا ہوا اردگرد دیکھنے لگا اور بولا چلو صاحب اوپر چلو۔'' وہ مجھے ایک طرف لگی تنگ سی سیڑھی کی طرف لے گیا۔ سیڑھی اوپر ایک کھلی چھت سے جڑی تھی اور اس سے آگے ایک کمرہ بنا ہوا تھا۔ مائیکل مجھے بنا رکے اس کمرے میں لے گیا' اندر پہنچتے ہی اس نے کمرے کی لائٹ آن کی اندر ایک بیڈ پڑا تھا۔ مائیکل کے کہنے سے بھی پہلے میں بیڈ دیکھ کر یوں اس پر جا ڈھیر ہوا گویا میلوں کی مسافت سے ابھی لوٹا تھا۔ پھر مائیکل بھی جیسے میری ذہنی حالت کو سمجھ چکا تھا۔ میرے لیٹتے ہی وہ میری ٹانگیں دابنے لگا' لیکن مجھے اس کے ایسا کرنے سے راحت کہاں ملنے والی تھی۔ میں نے اسے منع کردیا۔ وہ جھٹ سے اٹھا۔
''صاحب آپ کو بھوک لگی ہوگی میں ابھی کھانا تیار کرواتا ہوں۔ صاحب اب آپ ادھر محفوظ ہیں۔ مائیکل ہے ناں آپ کو کسی قسم کی فکر نہیں کرنا۔'' وہ مجھے تسلی دے کر چلا گیا لیکن مجھے اس کے کہے چند بول بھی میری دلجوئی کے لیے بہت بڑے محسوس ہوئے۔ ہاں میں بہت برا تھا' ہر طرح ہر قسم کے گناہوں کا عادی تھا لیکن میں نے آج سے پہلے کسی انسان کا قتل نہیں کیا تھا۔ کسی کی جان نہیں لی تھی اور اب میں ایک بے گناہ معصوم انسان کو یوں موت کے گھاٹ اتار کر یہاں سکون سے بیٹھا تھا۔ یہ خیال آتے ہی میں بے تاب ہوکر اٹھ بیٹھا۔ داؤد نے جو میرے ساتھ کیا تھا وہ بھی میرے لیے کس قدر اذیت ناک تھا۔ میرے ہاتھ سے گولی چل جانے کے بعد بجائے اس کے وہ مجھے خود وہاں سے گاڑی میں اپنے ساتھ کسی محفوظ جگہ لے جاتے داؤد نے گاڑی اسٹارٹ کی اور مجھے وہیں بے یارومددگار چھوڑ کر فرار ہوگیا۔ عبیرہ بھی تو اس کے ساتھ ہی موجود تھی۔ گولی چلتے ہی عبیرہ کے منہ سے نکلنے والی چیخ میں نے سنی تھی۔ شاید وہ میرے یوں اچانک گولی چلانے پر اور سامنے موجود آدمی کے سینے سے پھوٹتے خون کے فوارے کو دیکھ کر خوفزدہ ہوگئی تھی۔ داؤد کے گاڑی آگے بڑھاتے ہی میں ان کے تعاقب میں دوڑا بھی تھا کہ ہوسکتا ہے داؤد آگے جا کر گاڑی روک دے یا عبیرہ' داؤد کو واپس چلنے کو کہے اسے کہے کہ ہمیں طٰہ کو یوں بے یارومددگار چھوڑ کر نہیں جانا چاہیے اس کی مدد کو چلنا چاہیے لیکن ایسا نہیں تھا' اگر ایسا ہوتا تو میں وہاں کافی دیر تک کھڑا رہا تھا' جس سمت وہ جیپ لے کر گئے تھے اسی راستے پر چل کے میں مائیکل کے گھر تک آیا تھا لیکن داؤد جیپ لے کر واپس نہیں آیا تھا لیکن میرا دل یہ بات بھی ماننے کے لیے تیار نہ تھا کہ عبیرہ بھی داؤد کے ساتھ مل چکی ہوگی۔ ایسے ہی کئی طرح کے خیالات میرے ذہن میں ابھر رہے تھے جب مائیکل اندر داخل ہوا اس نے پانی کا گلاس میری جانب بڑھایا میں نے چند گھونٹ پی کر اسے ایک طرف رکھ دیا اور وہ یہ کہہ کر کہ وہ کھانا لے کر آتا ہے پھر سے واپس چلا گیا۔

مائیکل کے جانے کے بعد اور پانی پی لینے کے باوجود مجھے کمرے میں گھٹن کا احساس ہو رہا تھا۔ بے چینی اور گھبراہٹ محسوس کرتے ہوئے میں کمرے سے نکلا کمرے کے سامنے کا کھلا حصہ اس گھر کی چھت تھا اور کمرے کے سامنے جیسے چھوٹا سا صحن نما حصہ تھا۔ جس میں ایک جانب چند گملے پڑے تھے۔ کمرے کی مخالف سمت سامنے اونچی جالی دار سیمنٹ کی دیوار تھی۔ شاید اس دیوار کو بھی چھت ڈالنے کے لیے اوپر تک تعمیر کر دیا گیا تھا اور اس دیوار کے عین نصف حصے میں سیمنٹ کی بنی جالی ہوا کی آمد و رفت کے لیے لگا دی گئی تھی۔

جالی دار دیوار میں سے چاند کی چاندنی کا عکس چھت پر بھی ایک جالی کی دیوار بنا رہا تھا۔ میں آگے بڑھا اور جالی دار دیوار کے پاس ہی نیچے بیٹھا سوچنے لگا کہ وہاں اس دکان پر کوئی شخص آیا ہوگا اسے کوئی چیز خریدنا ہوگی لیکن جب اس نے خون سے لت پت لاش پڑی دیکھی ہوگی تو فوراً پولیس کو اطلاع کر دی ہوگی یا ہوسکتا ہے وہ اس دکان والے شخص کو پہچانتا ہو اور فوراً وہ ان کے گھر تک پہنچا ہو اور پھر اس گھر کے مقیم لوگوں کو وہ منحوس خبر سنائی ہو کہ ان کا بیٹا اب نہیں رہا اور جب نئے دن کا سورج طلوع ہوگا تو سبھی نیوز چینل پر یہ پٹی چل رہی ہوگی کہ ایک سیاسی رہنما کے بیٹے نے ایک جواں سالہ شخص کو موت کے گھاٹ اتار دیا یوں ابا کا سیاسی کیریئر میری وجہ سے داغ دار ہو جائے گا اور پھر صرف پولیس ہی نہیں بلکہ میرے ابا بھی میری تلاش شروع کر دیں گے۔ وہ جو اپنے ہر عیب اور جرم پر یوں پردہ ڈال لیتے تھے کہ دنیا کو کانوں کان خبر نہ ہوتی تھی وہ میرے سر عام قتل پر مجھے بھی معاف کرنے والے نہ تھے۔

لیکن مجھے تو وہاں گولی چلاتے کسی نے نہیں دیکھا تھا اور یہ طے تھا کہ داؤد عبیرہ یا میرے دوستوں میں سے کوئی بھی اس حادثے کے بارے میں کہیں کچھ بتانے والا نہ تھا پھر پولیس کو مجھ تک پہنچنے کے لیے کوئی ثبوت بھی تو درکار ہوگا۔ یہ خیال ذہن میں آتے ہی میں اگلے ہی پل ایک دم سے اچھل پڑا اور کھڑے ہو کر اپنی پینٹ کی ساری جیبیں کھنگالنے لگا لیکن ریوالور جہاں گرا تھا میں اسے وہاں سے اٹھانا بھول گیا تھا اور اب بے بسی اور حیرت کی تصویر بنا میں پھر سے پاؤں پسار کر دیوار سے ٹیک لگا کر بیٹھ گیا تھا۔ میں نے اپنے جسم کو جیسے بے جان سا ڈھیلا چھوڑ دیا جب عین اسی وقت میرے کانوں سے ایک نسوانی آواز ٹکرائی۔

''امی! آج اجمل بھائی کہاں رہ گئے اتنی دیر تو انہیں کبھی نہیں ہوئی۔'' یہ بات سن کر میں نے بیٹھے بیٹھے سر کو گھما کر دیکھا' سیمنٹ کی جالی دار دیوار سے بالکل نیچے ساتھ والے گھر کا آنگن چاند کی مدھم روشنی میں دھندلا سا دکھائی دے رہا تھا۔ میں نے مائیکل کے گھر آنے سے پہلے غلطی سے اسی گھر کے دروازے پر دستک دی تھی اور اس وقت بھی ایک کمزور بوڑھے بابا جی مجھے اجمل سمجھ رہے تھے پھر میری نظریں ابھی اس صحن سے ہٹی ہی تھیں کہ مجھے زور زور سے اسی جانب دروازہ پیٹنے کی آواز سنائی دینے لگی۔ کوئی زور زور سے ان کا دروازہ کھٹکھٹا رہا تھا۔ میں نے اسی جانب پھر دیکھتے ہوئے سوچا کہ لگتا ہے اب اجمل ہی ہوگا جس کا اس گھر بھر کو انتظار ہے۔ میں نے دیکھا وہی کمزور سا بوڑھا شخص دروازے کی جانب بڑھا پھر کوئی لڑکی پیچھے سے دوڑی آئی۔

''ابا آپ دروازہ کھولنے میں بہت دیر کر دیتے ہیں' بھیا ہوگا میں کھولتی ہوں۔'' لڑکی کی بات سن کر بوڑھا شخص وہیں صحن کے وسط میں رک گیا۔ لڑکی دروازے کی جانب بڑھی' وہ کچھ بڑبڑا رہی تھی۔

''ایک تو اتنی دیر کر دی آنے میں اوپر سے ذرا صبر نہیں ہو رہا' اچھا بھئی صبر کھولتی ہوں۔'' لڑکی نے دروازہ کھولتے ہوئے کہا۔ دروازہ کھلتے ہی وہ اپنے سر پر آنچل سنبھالتی پیچھے ہٹ گئی۔

''کوئی سیانا گھر پر ہو تو بیٹی اسے بلاؤ۔'' کوئی ادھیڑ عمر آدمی تھا' صحن میں کھڑے بوڑھے شخص نے باہر کھڑے شخص کی آواز سن لی تھی۔ وہ دھیرے دھیرے چلتا آگے بڑھا' باہر کھڑا شخص انہیں آگے بڑھتا دیکھ کر چند قدم آگے چلا آیا۔

''چاچا آپ ہی اجمل کے ابا ہیں...... چاچا...... حوصلہ رکھنا بڑی بری خبر ہے۔ چاچا تیرا اجمل...... وہ جیسے کہتے کہتے رک گیا۔ فاصلہ کچھ اتنا کم تھا کہ ان کے درمیان ہو رہی ساری باتیں مجھے واضح سنائی دے رہی تھیں۔ چاچا حوصلہ رکھنا بڑی بری خبر ہے' باہر کھڑے شخص کے یہ الفاظ سن کر جیسے میرے نیچے اوپر کا سانس وہی رک گیا تھا۔ پھر باہر کھڑے شخص نے اپنی بات مکمل کی۔ ''چاچا تیرا اجمل قتل ہو گیا ہے۔'' پاس کھڑی لڑکی نے یہ بات سنتے ہی اس زور کی چیخ لگائی کہ میرا دل دہل گیا۔

''اجمل پتر......'' اجمل کے ابا جو یہ خبر سن کر اک لمحے کو ساکت کھڑے رہ گئے تھے انہوں نے دلخراش آواز سے اپنے اجمل کو پکارا' ایک لمحے کے کچھ حصے میں اسی آنگن میں جہاں جیتے جاگتے اجمل کا انتظار ہو رہا تھا۔ کہرام مچ گیا۔ اندرونی کمروں سے چند اور خواتین صحن میں آ گئیں۔

''اماں......''

''کیا ہوا میرے اجمل پتر کو......؟''

''اماں بھائی......'' کسی پر غشی کا دورہ پڑا' صحن کے وسط میں ماں بے ہوش ہو کر گر پڑی۔ بوڑھا باپ اور ایک لڑکی اس شخص کے ساتھ باہر کو دوڑے' گلی میں جہاں سے وہ گزر کر جا رہے تھے ان کے رونے اور چیخنے کی آوازیں دور سے بھی آتی سنائی دے رہی تھیں پھر مجھے کسی کے تیز تیز قدموں سے سیڑھی چڑھنے کی آواز سنائی دی۔ میں جھٹ سے ذرا ایک طرف دیوار کے ساتھ چمٹ گیا۔

''مائیکل چاچا...... جلدی آئیں' مائیکل چاچا...... اجمل بھائی'' ایک لڑکی ساتھ والے صحن سے سیڑھیاں چڑھ کر جالیوں والی دیوار سے لگی زور زور سے مائیکل کو پکار رہی تھی۔ شاید مائیکل نے گلی میں رونے چیخنے کی آواز سن لی تھی اسی لیے وہ چھت پر نہیں آیا وہ دروازہ کھول کر اجمل کے ابا کے ساتھ ہی چلا گیا تھا۔ وہ لڑکی چند ایک لمحے ہی وہاں کھڑی روتی مائیکل کو پکارتی رہی اور پھر مائیکل کے نہ آنے پر وہ الٹے پیروں نیچے کو دوڑی۔

''اماں...... اماں ہوش کر......''

''میرا پتر اجمل نہیں' ایسا نہیں ہو سکتا' میرا اجمل نہیں۔''

''اماں...... بھائی...... میرے بھائی کو کچھ نہیں ہوا...... اماں...... اماں اجمل کو کچھ نہیں ہوا ابا بھائی کو لینے گئے ہیں' دیکھنا...... اماں وہ ابھی بھائی کو لے کر آ جائیں گے۔''

یارب یہ اجمل کا ہی گھر تھا۔ میں سر تھامے قدرے جھک گیا۔ رات کی تاریکی میں گونجنے والی دردناک آوازیں میری قوت برداشت سے باہر تھیں۔ پھر دیکھتے ہی دیکھتے اجمل کے گھر کا چھوٹا سا آنگن لوگوں سے بھر گیا۔ اب تو گھر والوں کے ساتھ ساتھ محلے دار عورتوں کے رونے کی بلند آوازیں بھی آ شامل ہوئی تھیں۔

(باقی ان شاء اللہ آئندہ ماہ)

نایافت

راحیلہ ناز

کچھ رشتے اعتبار اور محبت سے مل کر بنتے ہوتے ہیں لیکن شک کی ذرا سی آہٹ بھی انسان کو یقین کھوجنے پر مجبور کر دیتی ہے۔
ایک ایسے ہی مصور کی کہانی جس نے اپنی بیوی سے اندھی محبت اور اعتبار کیا لیکن اس کے ہاتھ آئی تو صرف رسوائی۔

اپنی عاشق پر اندھا اعتماد کرنے والے ایک شخص کا احوال' مغربی ادب سے خوبصورت انتخاب

وہ ابھی تک گھر نہیں آئی تھی حالانکہ کھانے کا وقت ہو گیا تھا۔ میں نے گھڑی میں وقت دیکھا رات کے آٹھ بج رہے تھے کچھ دیر بعد میں نے ریفریجریٹر سے گوشت نکالا اور اپنے لیے سینڈوچ تیار کیا میں پریشان نہیں تھا البتہ کچھ بے چینی ضرور تھی۔ میں بار بار کھڑکی کے قریب جاتا اور پہاڑی کے نیچے قصبے کی طرف دیکھنے لگتا لیکن وہ مجھے آتی ہوئی دکھائی نہ دیتی۔

وہ صاف شفاف بھرپور چاندنی رات تھی قصبے کی روشنیاں بہت بھلی لگ رہی تھیں۔ چاند کی زرد روشنی میں پہاڑی کے خم کبھی سیاہ کبھی نیلے لگ رہے تھے۔ میں نے سوچا کہ اس منظر کو ضرور پینٹ کروں گا مگر اس میں چاند نہیں ہوگا اگرچہ اس قسم کی منظر کشی میں چاند، تصویر کی خوب صورتی اور دل کشی میں اضافہ کرتا ہے لیکن اب یہ بات فرسودہ ہو گئی ہے اور خاصی احمقانہ لگتی ہے وان گوگ نے اپنی تصویر ''تاروں بھری رات'' میں یہی حرکت کی تھی وہ تصویر دل کش نہیں تھی بلکہ اسے دیکھ کر خوف آتا تھا خیر وہ وان گوگ تھا لیکن ایک صحیح الدماغ آدمی ایسی حرکتیں نہیں کر سکتا۔

میں نے رنگ کی تختی اٹھائی اور گزشتہ روز شروع کی ہوئی تصویر پر کام کرنے لگا۔ رات کو قدرتی روشنی نہیں ہوتی۔ رات کو میں لائن ورک اور اسی نوع کے دوسرے کام تو کر سکتا ہوں مگر رنگوں کا معاملہ ذرا ٹیڑھا ہے۔ مجھ سے ان کی صحیح آمیزش نہیں ہو پاتی۔ رنگ گویا اپنا رنگ نہیں دکھا پاتے۔ رنگوں سے کھیلنے کے لیے دن کی روشنی ہی صحیح رہتی ہے میں نے کام آئندہ روز پر ملتوی کرتے ہوئے تختی صاف کر کے ایک طرف رکھ دی اور برش دھو ڈالے نو بجنے والے تھے اور وہ ابھی تک نہیں آئی تھی۔

نہیں، اس میں پریشانی کی کوئی بات نہیں تھی وہ کہیں دوستوں کے ساتھ ہوگی اور ٹھیک ٹھاک ہوگی۔ میرا اسٹوڈیو قصبے سے تقریباً ایک میل دور پہاڑوں پر ہے اور یہیں میری سکونت ہے ایسی کوئی صورت نہیں جو وہ مجھے اپنے بارے میں مطلع کر سکے۔ میرے اسٹوڈیو میں ٹیلی فون بھی نہیں ہے وہ یقیناً ویور لی سرائے میں دوستوں کے درمیان بیٹھی پی پلا رہی ہوگی کوئی ایسی خاص وجہ بھی نہیں کہ وہ سوچے میں اس کے لیے پریشان نہ ہوں گا۔

ہم میں سے کوئی وقت کا پابند نہیں تھا ہمارے درمیان یہ مفاہمت بہت دن سے تھی۔

وہ جلد ہی واپس آجائے گی۔

جگ میں نصف کے قریب شراب بچ رہی تھی میں نے اپنے لیے شراب انڈیلی اور کھڑکی کے قریب کھڑا ہو کر قصبے کی جانب نگاہ جمائے ہوئے آہستہ آہستہ چسکی لینے لگا۔ میں نے گھر کی روشنی بجھادی تھی

تا کہ کھڑکی سے روشن رات کا زیادہ بہتر نظارہ کر سکوں ایک میل دور وادی میں ویورلی سرائے کی روشنیاں صاف دکھائی دے رہی تھیں۔ روشنی تیز اور بھڑک دار تھی بالکل جیوک باکس کے شور کی مانند محض اسی وجہ سے میں اکثر وہاں جانے سے کتراتا تھا۔ عجیب بات تھی کہ لیمپ نے جیوک باکس پر کبھی ناگواری کا اظہار نہیں کیا حالانکہ وہ اچھی موسیقی کی دل دادہ تھی۔

سرائے کے اطراف روشنی کے چھوٹے بڑے مزید دائرے بھی نظر آ رہے تھے۔ سرائے کے گرد کچھ چھوٹے چھوٹے فارم تھے اور دوسرے اسٹوڈیوز، ہاکس ویگز کا اسٹوڈیو میرے اسٹوڈیو سے چوتھائی میل پرایک ڈھلوان پر تھا اس کا اسٹوڈیو خاصا بڑا تھا اور اس میں ایک روشن دان بھی تھا اس روشن دان کے سبب میں اس سے حسد سا محسوس کرتا تھا وہ اچھا مصور نہیں تھا اس نے کبھی رنگین فوٹو گراف سے زیادہ بہتر کوئی چیز نہیں بنائی تھی سچی بات تو یہ ہے کہ اس نے چیزوں کو ہمیشہ کیمرے کی آنکھ سے دیکھا اور اپنے وجدان سے کام نہیں لیا۔ وہ بہترین ڈرافٹس مین تھا۔ اس سے زیادہ کچھ نہیں مگر اس کی تمام تصویریں بک جاتی تھیں اسی لیے اس کے پاس اتنا بڑا اسٹوڈیو تھا جس میں روشن دان بنایا جا سکے۔

میں نے گلاس کا آخری قطرہ حلق میں انڈیلا اور میرے پیٹ میں کوئی سخت گرہ سی پھنسنے لگی۔، نامعلوم کیوں لیمپ اکثر ہی دیر سے آتی تھی بلکہ بہت دیر سے پریشانی کی کوئی خاص وجہ نہیں تھی۔

میں نے گلاس کھڑکی کی سل پر رکھ دیا اور دروازہ کھولا لیکن باہر جانے سے پہلے گھر کی تمام بتیاں روشن کر دیں تا کہ لیمپ کو معلوم ہو جائے کہ میں گھر ہی پر ہوں۔ اگر اس نے پہاڑ کی طرف دیکھا اور گھر کی روشنیاں بجھی پائیں تو سمجھے گی کہ میں گھر پر نہیں ہوں پھر وہ جہاں ہوگی مزید رک جائے گی۔ اسے معلوم تھا کہ اس کے گھر آئے بغیر میں روشنی نہیں بجھاتا خواہ وہ کتنی ہی دیر سے آئے۔

میں بھی کتنا احمق ہوں۔ ابھی کچھ اتنی دیر تو نہیں ہوئی ابھی وقت ہے ابھی تو صرف نو بجے ہیں میں قصبے کی طرف جانے کے لیے پہاڑی سے اترنے لگا میرے پیٹ میں گرہ سخت ہوتی گئی اور میں خود کو لعن طعن کرنے لگا اس قدر پریشان ہونے کی کوئی خاص وجہ نہیں تھی۔

میں جب اس راستے سے گزرا جہاں ہاکس کا اسٹوڈیو تھا تو میری رفتار اس خیال سے سست پڑ گئی کہ شاید لیمپ وہاں ہو، ہاکس تنہا رہتا تھا اور لیمپ کی وہاں موجودگی صرف اسی صورت میں ممکن تھی۔ جب لیمپ کے دوست، ویورلی سرائے یا کہیں اور سے اٹھ کر وہاں آ گئے ہوں میں کسی آواز کی توقع پر رک گیا مگر کوئی آواز سنائی نہیں دی تو وہاں کوئی نہیں آیا تھا۔ یہ سوچ کر میں آگے چلنے لگا۔ آگے راستہ کئی چھوٹے راستوں میں تقسیم ہو گیا تھا ہم ایک دوسرے کی لاعلمی میں وہاں سے گزر سکتے تھے۔ اس خیال کے تحت میں نے مختصر ترین راستہ اختیار کیا۔ یہ وہ راستہ تھا کہ اگر وہ قصبے سے براہ راست گھر کی طرف جاتا تھا مگر کارٹر کا گھر تاریکی میں ڈوبا ہوا تھا البتہ سلوی کے گھر میں روشنی ہو رہی تھی اور گٹار کی آواز آ رہی تھی۔ میں نے دروازے پر دستک دی اور انتظار کے لمحوں میں موسیقی سننے لگا۔ چند لمحے بعد ہی مجھے احساس ہو گیا کہ اندر بذات خود کوئی گٹار بجانے والا نہیں تھا بلکہ گٹار کی وہ آواز فونوگراف سے ابھر رہی تھی یہ کلاسیکی دھن میری محبوب فن کارہ سیگو ویا کی تخلیق تھی۔ سیگو ویا مجھے بے حد پسند تھی۔ وہ بہت خوب صورت تھی۔ چھریرا اور نازک بدن بالکل لیمپ کی مانند۔

سلویا دروازے پر نہیں آئی، اس نے لیمب کو نہیں دیکھا تھا، وہ سرائے بھی نہیں گئی تھی وہ کہیں نہیں گئی تھی سہ پہر سے گھر پر تھی۔ اس نے کہا کہ اگر میں چاہوں تو حلق تر کرنے کے لیے اندر آ سکتا ہوں۔ خیال برا نہیں تھا شراب تو نہیں البتہ سیگو ویا کی آواز مجھے مسحور کیے دے رہی تھی لیکن میں نے اس کا شکریہ ادا کیا اور وہاں سے چل دیا۔

مجھے وہیں سے پلٹ کر سیدھے گھر چلا جانا چاہیے تھا۔ میں بے وجہ تلخ مزاج ہو رہا تھا۔ میری تلخ مزاجی کی وجہ شاید یہ تھی کہ مجھے نہیں معلوم تھا لیمب کہاں ہے اگر وہ مجھے مل گئی تو شاید میں اس سے لڑ پڑوں جبکہ مجھے لڑائی سے نفرت تھی ہم بہت کم جھگڑتے تھے کم از کم چھوٹی موٹی باتوں پر ہم تحمل اور مفاہمت ہی کا ثبوت دیا کرتے تھے اور لیمب جو اس وقت تک گھر نہیں لوٹی تھی تو یہ بھی ایک معمولی بات تھی۔

میں سرائے سے خاصی دور تھا لیکن جیوک باکس کی تیز آواز میرے کانوں تک پہنچ رہی تھی اس سے بھی میرے موڈ میں کوئی تبدیلی نہیں ہوئی۔ اب میں کھڑکی سے اندر دیکھ سکتا تھا بار میں دو جوڑے موجود تھے۔ میں انہیں جانتا تھا چارلی اور ایوڈک اور اس کی محبوبہ جس کا نام مجھے یاد نہیں رہا تھا ان کے علاوہ ایک اداکار نما شخص بھی وہاں موجود تھا جو یہ ظاہر کرنے کی کوشش کر رہا تھا جیسے سیدھا ہالی ووڈ سے چلا آ رہا ہو کیا پتا وہ اداکار ہی ہو۔

میں اندر گیا اور جیسے ہی دروازے سے داخل ہوا جیوک باکس رک گیا۔ میں بار کے سامنے سے گزر کر بوتھ کی قطار کو دیکھتا چلا گیا۔ لیمب وہاں بھی نہیں تھا۔

میں نے ان چاروں کو جنہیں اچھی طرح جانتا تھا اور اس اداکار کو اگر وہ خود کو اداکار ہی کہلوانے پر مصر تھا۔ ''ہائی'' کہا اور بار کے پیچھے کھڑے ہوئے ہیری کو مخاطب کیا۔

''ہیری کیا لیمب یہاں آئی تھی؟''

''میں نے تو اسے نہیں دیکھا۔ میں چھ بجے یہاں آیا تھا اس عرصہ میں وہ نہیں دکھائی دی۔ اس سے پہلے وہ یہاں آئی ہو تو کہہ نہیں سکتا، تم کچھ پیو گے؟''

مجھے شراب کی طلب بالکل نہیں ہو رہی تھی لیکن میں یہ تاثر نہیں دینا چاہتا تھا کہ لیمب ہی کی تلاش میں وہاں آیا تھا چنانچہ میں نے مارٹینی کا آرڈر دے دیا۔

''تمہاری پینٹنگ کیسی جا رہی ہے؟'' چارلی نے مجھ سے پوچھا۔

چارلی کتب فروش تھا وہ پینٹنگ کے بارے میں اتنا ہی جانتا تھا جتنا کوئی کتب فروش جان سکتا تھا۔

میں نے اس بے معنی اور احمقانہ سوال کے جواب میں ''عمدہ'' کہا اور ہیری کا لایا ہوا مارٹینی کا گلاس اٹھا لیا۔ گلاس خالی کرنے کے بعد میں نے قیمت ادا کی اور سوچنے لگا یہ ظاہر کرنے کے لیے کہ میں خاص طور پر لیمب کے لیے وہاں نہیں آیا تھا مجھے اور کتنی دیر ٹھہرنا پڑے گا۔

جانے کیوں ان لوگوں نے بات چیت بند کر دی تھی میرے آنے سے پہلے اگر وہاں کوئی گفتگو جاری تھی تو اب وہ یکلخت موقوف ہو گئی تھی میں نے ایو کی طرف دیکھا وہ بھی اپنے سامنے مارٹینی کا گلاس لیے بیٹھی تھی، گلاس کی تہہ میں انجیر پڑا ہوا تھا انجیر اور مارٹینی کے امتزاج سے ایک عجیب سا رنگ پیدا ہو رہا تھا میں نے غور سے اس رنگ کا جائزہ لیا شاید یہی وہ رنگ تھا جس پر میں گھنٹے دو گھنٹے قبل طبع آزمائی کی کوشش کر رہا تھا مگر ناکام رہا تھا کل میں دوبارہ اس پر کام کروں گا یا شاید واپس جاتے ہی کام شروع کر دوں دن کی روشنی نہیں تھی تو نہ سہی میں کوشش تو کروں گا میرا موڈ خود بہ خود ٹھیک ہونے لگا۔

لیکن یہ لیمب کہاں رہ گئی تھی؟ اگر میری واپسی پر بھی وہ گھر پر نہ ملی تو کیا میں پینٹنگ کر سکوں گا؟ یا پھر میں بے وجہ اس کے بارے میں پریشان ہونا شروع کردوں گا؟ کیا میرے پیٹ میں پھر پہلے جیسی اینٹھن ہونے لگے گی میں نے بہت عجلت کے عالم میں گلاس خالی کیا تھا مجھے دوسرا گلاس منگوانا چاہیے ورنہ ظاہر ہو جائے گا کہ میں وہاں کیوں آیا تھا۔ میں نہیں چاہتا تھا کہ لوگ خصوصاً اس جیسے جو وہاں بیٹھے ہوئے تھے یہ سوچیں کہ میں لیمب کے بارے میں حاسد تھا اور اس کے لیے بہت پریشان تھا میں اور لیمب ایک دوسرے پر مکمل بھروسہ کرتے تھے مجھے صرف اس بات کا تجسس تھا کہ وہ اس وقت کہاں ہوگی میں اس وقت اسے گھر پر دیکھنا چاہتا تھا بس اس سے زیادہ اور کوئی بات نہیں تھی وہ گھر پر ہوتی تو میں زیادہ بہتر طور پر کام کر سکتا تھا۔

ہمارے درجنوں ملنے جلنے والے تھے۔ وثوق سے نہیں کہا جا سکتا تھا کہ وہ اس وقت کہاں ہوگی میں ہر جگہ جا کر اسے پوچھتے پھرنا مناسب نہیں سمجھتا تھا تاہم سرائے کے بعد ایک جگہ ایسی تھی جہاں اس کی موجودگی کا امکان تھا اور وہ مانک کلب تھا جو قصبے سے ایک میل کے فاصلے پر تھا وہ وہاں کسی سے لفٹ لیے بغیر نہیں جا سکتی تھی۔ خیر یہ معلوم کرنا کوئی مشکل بات نہیں تھی وہاں فون کیا جا سکتا تھا۔

میں نے مارٹینی کا دوسرا جام ختم کیا اور اٹھ کھڑا ہوا۔ میرا رخ ٹیلی فون بوتھ کی طرف تھا۔

میں ٹیلی فون کی طرف بڑھتے ہوئے ایو اور چارلی کے قریب سے گزرا وہ دونوں کسی مسئلے پر گفتگو کر رہے تھے۔ جب میں ان کے قریب سے گزر رہا تھا تو ایو کچھ کہہ رہی تھی۔ اس کی آواز دھیمی تھی لیکن اس کے جملے کا آخری لفظ میرے کانوں میں پڑ گیا۔

''ہالس کے گھر ہو سکتی ہے۔'' معاً اس کی نگاہ میری طرف اٹھی میں نے دیکھا کہ اس کی آنکھوں سے خوف جھانک رہا تھا۔

میں ٹیلی فون بوتھ میں گیا اور دروازہ مضبوطی سے بند کر لیا

''کیا وہاں لیمب ہے؟'' میں نے نمبر ملاتے ہی پوچھا۔

''کون یہاں ہے؟'' میرے سوال کے جواب میں سوال ہی کیا گیا۔

''میں وین گرے بول رہا ہوں۔'' میں نے ضبط سے کام لیتے ہوئے کہا ''کیا وہاں لیمبتھ گرے ہے؟''

''اوہ۔'' دوسری سمت سے آواز ابھری۔ اس بار میں نے آواز کو پہچان لیا تھا وہ مانک ہی تھا۔

''میں تمہیں پہچان نہیں سکا تھا مسٹر گرے، نہیں تمہاری بیوی یہاں نہیں آئی۔''

میں نے اس کا شکریہ ادا کیا اور ریسور ہک سے لٹکا دیا۔ میں بوتھ سے باہر آیا تو چارلی اور ایو جا چکے تھے۔ باہر کار اسٹارٹ ہونے کی آواز سنائی دی تھی۔

میں نے ہاتھ ہلا کر ہیری کو خدا حافظ کہا اور سرائے سے نکل آیا۔ ایک کار کی عقبی روشنی دور ہوتی جا رہی تھی اور وہ کار چارلی ہی کی ہو سکتی تھی چارلی کی کار جس سمت جا رہی تھی اس طرف ہالس کا مکان تھا۔ شاید وہ لیمب کو آگاہ کریں کہ میں نے ان کے منہ سے وہ بات سن لی ہے جو مجھے نہیں سننا چاہیے تھی اور یہ کہ میں وہاں آ سکتا ہوں۔

مگر یہ سوچنا احمقانہ بات تھی ایو نے لیمب کے بارے میں ہالس کے تعلق سے جو کچھ کہا سراسر غلط تھا لیمب ایسی کوئی حرکت نہیں کر سکتی تھی ایو نے اسے ہالس کے ساتھ کبھی کسی جگہ ایک ہی میز پر دیکھا ہوگا اور غلط رائے قائم کر لی ہوگی۔ سرے

سے غلط اور بالفرض لیمب اس قسم کی ہوتی تو بہتر ذوق کا مظاہرہ کرتی ہانس وجیہہ تھا اور عورتوں میں مقبول تھا جو میں نہیں تھا لیکن ہانس احمق تھا وہ پینٹنگ کی روح سے ناواقف تھا لیمب' ہانس جیسے شخص سے ملوث نہیں ہو سکتی تھی۔

میں نے سوچا کہ اب مجھے گھر ہی چلا جانا چاہیے میں قصبے بھر سے لیمب کے بارے میں پوچھ کر یہ ظاہر نہیں کرنا چاہتا تھا کہ اس کے لیے بہت پریشان یا بدگمان ہوں۔

میں روپہلی چاندنی میں اس رستے پر چل پڑا جدھر چارلی کی کار گئی تھی میں ایک بار پھر اس راستے پر پہنچ گیا جہاں ہانس کا گھر تھا مجھے وہاں چارلی کی کار کھڑی ہوئی نہیں ملی۔ اگر چارلی اور ایو وہاں رکے بھی تھے تو فوراً چلے گئے تھے حالات ہی ایسے تھے کہ انہوں نے وہاں رکنا مناسب نہیں سمجھا ہو گا وہ نہیں چاہتے ہوں گے کہ میں ان کی کار وہاں کھڑی ہوئی دیکھوں، میرے گھر کی روشنی دور سے دکھائی دے رہی تھی ممکن تھا کہ لیمب گھر پہنچ گئی ہو میں بہرحال ہانس کے گھر نہیں جانا چاہتا تھا چاہے چارلی وہاں رکا ہو یا نہ رکا ہو۔

لیمب ہانس اور میرے گھر کے درمیانی راستے پر کہیں دکھائی نہ دی لیکن اگر چارلی اور ایو وہاں رکے تھے اور انہوں نے ہانس کے گھر میں موجود لیمب کو خبردار کر دیا تھا تو وہ یقیناً میرے وہاں پہنچنے سے پہلے نکل گئی ہو گی سرائے سے ہانس کے گھر کا فاصلہ تین چوتھائی میل تھا اور ہانس کے گھر سے میرے گھر کا فاصلہ چوتھائی میل لیمب اس عرصہ میں دوڑ کر گھر تک جا سکتی تھی جبکہ میں آہستہ آہستہ چلتا ہوا آ رہا تھا اور میرا فاصلہ لیمب کے فاصلے سے زیادہ تھا۔

میں نے دوبارہ قدم بڑھا دیے گھر کے دروازے پر پہنچ کر میں نے لیمب کو آواز دی مگر اس نے جواب نہیں دیا میں گھر میں داخل ہو گیا لیمب گھر پر نہیں تھا۔

گھر خالی خالی معلوم ہو رہا تھا میں نے گلاس میں شراب انڈیلی اور اپنی نامکمل تصویر کو گھورنے لگا کیا یہ تصویر آج رات مکمل ہو سکے گی؟ اس وقت دیوار گیر گھڑی نے پونے گیارہ کا اعلان کیا مگر ابھی زیادہ دیر نہیں ہوئی تھی۔ کام کا موڈ نہیں تھا چنانچہ میں نے کچھ پڑھنا مناسب سمجھا بلیک میرا محبوب شاعر اس کی سادہ ترین اور بہترین نظم "لیمب" یعنی میمنہ مجھے بہت پسند تھی یہ نظم مجھے لیمب کی یاد دلاتی تھی ننھے میمنے تجھے کس نے بنایا؟ میں نے بلیک کی نظموں کا مجموعہ نکالا مگر کوئی نظم پڑھنے کا موڈ بن نہ سکا میں آج رات اپنی پسندیدہ نظم بھی نہیں پڑھنا چاہتا تھا۔ میں نے نظموں کا مجموعہ ایک طرف ڈال دیا اور صندوق سے اپنا چار پانچ کیلیبر کا آٹومیٹک نکالا چیمبر میں کارتوس ڈال کر اسے جیب میں رکھا اور گھر سے نکل آیا گھر کا دروازہ بند کرنے کے بعد میں پہاڑی سے اترنے لگا میرا رخ ہانس کے گھر کی طرف تھا بھرپور چاندنی تھی کائنات

ایک آدمی (دوسرے آدمی سے) "تمہارے گھر میں آگ لگ گئی ہے۔ جلدی چلو بھاگو۔"

دوسرا آدمی: اطمینان سے بولا۔ "مذاق نہ کرو چابیاں تو میری جیب میں ہیں۔ گھر میں آگ کیسے لگ سکتی ہے۔"

......☆☆☆......

استاد: "بھینس کی کتنی ٹانگیں ہوتی ہیں؟"

شاگرد: "سر! یہ تو کوئی بے وقوف بھی بتا دے گا۔"

استاد: "اسی لیے تو تم سے پوچھ رہا ہوں۔"

......☆☆☆......

ماں: "منے! یہ دروازے پر گندے ہاتھوں کے نشانات تمہارے ہیں؟"

بیٹا: جی نہیں امی جان! میں تو لات مار کر دروازہ کھولتا ہوں۔"

محمد عمران اعجاز......اسلام آباد

پر افسردہ سا سکون طاری تھا ایک رات تھی جو نصف سفر طے کر کے ہانپ رہی تھی۔ ''ننھے میمنے تجھے کس نے بنایا۔'' میرے ذہن میں بلیک کی نظم کا مصرعہ گونجنے لگا اور اس کے ساتھ ہی لیمب میرے چشم تصور میں ابھر آئی گہرے سیاہ بال، سفید چہرے پر گہری سیاہ آنکھیں نازک خوب صورت اور مرمریں جسم آواز کی نزاکت، نغمگی اور ہاتھوں کا گداز لمس۔

میں نے دروازے دستک دی بہت آہستہ اور معمولی دستک کیا ہانس نے دروازہ کھولنے میں دیر لگائی تھی کیا وہ خوف زدہ نظر آتا تھا میں قطعیت کے ساتھ کوئی فیصلہ نہ کر سکا تھا

''ہائی وین تم، آؤ، اندر آجاؤ۔'' وہ بولا۔

میں اندر گیا مگر لیمب وہاں نہیں تھی۔ وہاں اور بھی کمرے تھے۔ بیڈ روم، کچن، باتھ روم وغیرہ ان کمروں کو فوراً دیکھنا چاہتا تھا مگر یہ بے تکی بات ہوتی تو انہیں دیکھے بغیر جا بھی نہیں سکتا تھا۔

''میں لیمب کے لیے پریشان ہوں وہ اتنی دیر کبھی باہر نہیں رہی کیا تم نے اسے دیکھا ہے؟'' میں نے پوچھا۔

جواب میں ہانس نے اپنا سنہرا خوب صورت سر انکار میں ہلایا۔

''میرا خیال تھا کہ شاید وہ گھر جاتے ہوئے یہاں ذرا دیر کے لیے رک گئی ہوگی۔'' میں نے رواداری میں کہا پھر مسکراتے ہوئے بولا۔ ''میں تنہائی اور بے چینی محسوس کر رہا ہوں میرے گھر چل کر کچھ پینے پلانے کے بارے میں کیا خیال ہے؟''

میں جو توقع کر رہا تھا وہی ہوا اور وہی ہونا چاہیے تھا ہانس نے کہا۔ ''یہیں بیٹھ جاتے ہیں۔'' پھر اس نے مجھ سے پوچھا کہ میں کیا پینا پسند کروں گا؟

میں نے مارٹینی کے لیے کہا۔ شراب کی بوتل فریج میں سے نکال کر لانے کے لیے اسے بہر حال کچن میں جانا تھا اس دوران میں میرے لیے یہ موقع تھا کہ دوسرے کمروں میں جھانک لوں۔

''او کے وین میں بھی اپنے لیے مارٹینی ہی پسند کروں گا۔'' وہ بولا۔

''ذرا دیر کے لیے معذرت چاہوں گا۔''

وہ کچن میں چلا گیا میں نے جلدی سے باتھ روم پھر بیڈ روم کا گہری نظر سے جائزہ لیا حتیٰ کہ بستر کے نیچے تک دیکھ ڈالا مگر لیمب کہیں نہیں تھی پھر میں کچن میں گیا اور بولا۔ ''میں یہ کہنا بھول گیا تھا کہ زیادہ نہیں پیوں گا بس دو ایک جام کافی ہوں گے۔ میں پینٹنگ کروں گا۔''

''اچھی بات ہے۔'' وہ بولا۔

لیمب کچن میں بھی نہیں تھی یہ بھی ممکن نہیں تھا کہ جب میں دستک دے رہا تھا تو وہ کچن کے دروازے سے نکل گئی ہو مجھے معلوم تھا کہ ہانس کے کچن کا دروازہ پر شور آواز کے ساتھ کھلتا اور بند ہوتا تھا۔

مجھے ایسی کوئی آواز سنائی نہیں دی تھی اس مکان سے باہر جانے کے لیے صرف بیرونی دروازہ اور کچن کا دروازہ استعمال کیا جا سکتا تھا۔

میں اس کمرے میں واپس آ گیا جسے ہانس نے اسٹوڈیو بنا لیا تھا۔ میں وہاں موجود اشیا کو گھورنے لگا ہانس بھی چند منٹ بعد وہاں آ گیا اس نے مجھے شراب کا جام دیا اور میں نے اس کا شکریہ ادا کیا میں چھوٹے چھوٹے گھونٹ لے رہا تھا اور ہانس مجھے سر پرستانہ نظر سے دیکھ رہا تھا میں نے برا نہیں مانا وہ بہر حال خاصی رقم پیٹ لیتا تھا جبکہ میں رقم بٹورنے کے فن سے ناواقف تھا اس کے باوجود یہ حقیقت ہے کہ میں اسے ایک پست درجہ مصور ہی سمجھتا تھا میں اسے جتنا گھٹیا سمجھتا تھا اور اس کے بارے میں جو خیالات رکھتا تھا شاید وہ

میرے متعلق ایسے خیالات نہ رکھتا ہو۔

''تمہارا کام کیسا جا رہا ہے دین؟'' اس نے مربیانہ لہجے میں پوچھا۔

''بہت عمدہ۔'' میں نے جواب دیا۔

''تمہارا اسٹوڈیو بہت شاندار ہے ہانس۔'' میں بولا۔ ''کاش میرے پاس بھی اتنا بڑا اسٹوڈیو ہوتا۔''

''مشکل یہ ہے کہ تم اپنے کام کے لیے ماڈل استعمال نہیں کرتے پھر یہ کہ آؤٹ ڈور پر بھی توجہ نہیں دیتے۔'' ہانس نے شانے اچکاتے ہوئے کہا۔

''کیا فرق پڑتا ہے۔'' میں بے پروائی سے بولا۔ مجھے خیال آیا کہ میں یہ کیا بکواس کیے جا رہا ہوں میں اس لیے تو وہاں نہیں آیا تھا میں نے کھڑکی سے باہر دیکھا وہ کھڑکی، میرے مکان کے رخ پر کھلتی تھی مجھے امید تھی کہ شاید لیمب جاتی ہوئی دکھائی دے جائے مگر وہ نظر نہ آئی آخر وہ کہاں تھی اگر وہ دروازے پر دستک سن کر بھی وہاں سے نکلی تھی تو اسے راستے میں ہونا چاہیے تھا اور دکھائی دے جاتی مگر وہ نظر نہ آئی آخر وہ کہاں تھی؟ اگر وہ دروازے پر دستک سن کر بھی وہاں سے نکلی تھی تو اسے راستے میں ہونا چاہیے تھا اور دکھائی دینا چاہیے تھا میں ہانس کی طرف مڑا۔

''کیا آج رات چارلی اور ایوآئے تھے؟'' میں نے اس سے پوچھا میرا خیال تھا کہ شاید لیمب انہی کے ساتھ چلی گئی تھی میں ہانس سے اس کی وہاں موجودگی کے بارے میں براہ راست سوال نہیں پوچھنا چاہتا تھا۔

''چارلی اور ایو؟ میں نے انہیں کئی دن سے نہیں دیکھا۔'' اس نے اپنا گلاس خالی کیا اور مجھ سے پوچھا۔ ''دوسرا گلاس بناؤں؟''

میں 'نہیں' کہنے والا تھا مگر نہ کہہ سکا میری نگاہ دیوار گیر الماری پر پڑ گئی میں نے اس الماری کو ایک بار اندر سے دیکھا تھا وہ زیادہ گہری نہیں تھی مگر اتنی گہری ضرور تھی کہ اس میں ایک آدمی چھپ سکتا تھا۔

''شکریہ ہانس، ہاں میں ایک گلاس اور پیوں گا۔'' میں نے اپنا خالی گلاس اس کی طرف بڑھایا۔ وہ گلاس لیے ہوئے دوبارہ کچن میں چلا گیا میں تیزی سے الماری کی طرف بڑھا اور اسے کھولنے کے لیے زور لگا مگر الماری مقفل تھی۔

الماری مقفل تھی اور دروازے میں چابی نہیں تھی یہ بڑی بے تکی بات تھی وہ شخص جو باہر جاتے ہوئے تمام دروازے اور کھڑکیاں مقفل کر جاتا ہو اسے بھلا الماری مقفل کرنے کی کیا ضرورت تھی جبکہ مجھے علم تھا کہ اس الماری میں کوئی قیمتی سامان بھی نہیں رکھا جاتا تھا۔

''ننھے میمنے تجھے کس نے بنایا؟''

ہانس کچن سے واپس آ گیا اس کے دونوں ہاتھوں میں شراب کے گلاس تھے۔ اس نے مجھے الماری کے ہینڈل پر ہاتھ رکھے ہوئے دیکھا ایک لمحے کو ساکت ہو کر رہ گیا اس کے دونوں ہاتھ کانپنے لگے دونوں گلاسوں سے شراب چھلک کر فرش پر گرنے لگی۔

''ہانس کیا تم یہ الماری مقفل رکھتے ہو؟'' میں نے بظاہر خوش دلی سے پوچھا۔

''کیا یہ مقفل ہے، نہیں عموماً ایسا نہیں ہوتا۔'' پھر وہ قدرے جرأت کا مظاہرہ کرتے ہوئے بولا۔ ''آخر قصہ کیا ہے دین؟''

''کچھ نہیں۔'' میں نے کہا۔ ''کچھ بھی نہیں۔'' میں نے جیب سے چار پانچ کلیبر کا آٹو میٹک نکالا ہانس مجھ سے خاصی دور تھا اور پھر جسیم بھی اس قدر تھا کہ فوراً جست لگا کر مجھ تک نہیں پہنچ سکتا تھا۔ میں مسکراتے ہوئے بولا۔ ''مجھے چابی دینے کے بارے میں کیا خیال ہے؟''

مزید شراب چھلکی اور ٹائیلوں پر بہنے لگی یہ قد آور

جسیم خوب صورت اور سنہرے بالوں والے ذرا بھی جرأت مند نہیں ہوتے۔ وہ اپنی جگہ ساکت و جامد سہما ہوا کھڑا رہا۔ میں نے محسوس کیا کہ وہ اپنے حواس پر قابو پانے کی کوشش کر رہا ہے۔ اس کا اظہار اس کے چہرے سے ہو رہا تھا چند لمحے بعد وہ کسی قدر ٹھہرے ہوئے لہجے میں بولا۔

"مجھے یاد نہیں کہ چابی کہاں ہے، مگر قصہ کیا ہے؟"

"کچھ نہیں، کچھ بھی نہیں۔" میں بولا۔ "لیکن تم جہاں ہو وہیں کھڑے رہو ذرا بھی حرکت نہ کرنا۔"

اس نے حرکت نہیں کی گلاس اس کے ہاتھ میں کانپتے رہے۔ اس پر نگاہ جمائے ہوئے میں نے آٹو میٹک کی نال قفل کے سوراخ پر رکھ دی میں نے نال کو دروازے کے وسط میں اس طرح رکھا تھا کہ اندر کوئی چھپا ہو تو زندہ بچ سکے۔ میں نے ہانس پر نظر رکھتے ہوئے ٹریگر دبایا۔ فائر کی آواز کان پھاڑ دینے والی تھی مگر میں نے ایک ثانیے کے لیے بھی ہانس پر سے نظر نہیں ہٹائی۔

دروازہ کھلتے ہی میں پیچھے ہٹا اور نال کا رخ ہانس کے سینے کی طرف کر دیا۔ ہانس کی طرف سے ہوشیار رہتے ہوئے میں نے کھلی ہوئی الماری کی طرف دیکھا۔

لیمب وہاں موجود تھی عریاں!

میرے ذہن میں وہ فقرہ گونج اٹھا جو ہانس نے کچھ دیر قبل کہا تھا۔

"مشکل یہ ہے کہ تم اپنے کام کے لیے ماڈل استعمال نہیں کرتے اور!"

میں نے ہانس کو شوٹ کیا تو میرا ہاتھ ذرا بھی نہیں کانپا، ایک ہی گولی کافی تھی وہ اپنا ہاتھ دل کی طرف لے جاتے ہوئے گر پڑا۔ اس کا سر زوردار آواز کے ساتھ ٹائیلوں سے ٹکرایا۔ وہ آواز موت کی آواز تھی۔

میں نے آٹو میٹک جیب میں رکھا اور اس کے ساتھ ہی میرا ہاتھ کانپنا شروع ہو گیا ہانس کا ایزل سامنے ہی الماری میں رکھا ہوا تھا اور اس کے قریب رنگ کھرچنے کا چاقو پڑا تھا۔ میں نے چاقو اٹھایا اور اپنی لیمب کو اپنی عریاں لیمب کو اس کے فریم سے کاٹ لیا پھر اسے تہ کر کے مضبوطی سے پکڑ لیا تا کہ کوئی اسے اس عالم میں نہ دیکھ سکے۔

میں ہانس کے گھر سے نکل کر اپنے گھر کی طرف بڑھ رہا تھا کہ اچانک چونک اٹھا بڑھتے بڑھتے میرے قدم رک گئے مجھے کہیں قریب ہی سے لیمب کے ہنسنے کی آواز سنائی دی لیکن اس کی ہنسی ایسی تھی جیسے خشک ٹہنیوں سے خزاں رسیدہ پتے گر رہے ہوں یا وسیع بیابانوں میں آوارہ ہوائیں نوحہ کناں ہوں۔

اور پھر وہ ہنسی وہ سفاک ہنسی سن کر ایک بچھڑا ہوا بے رحم لمحہ جیسے میرے وجود میں واپس آ گیا ایک بھولا ہوا بھیانک خواب یاد دلانے کے لیے اب کسے آنا ہے اب کون آئے گا، وہ...... وہ اب کبھی نہیں آئے گی لیمب اب کبھی گھر نہیں آئے گی۔ اب مجھے اس کا انتظار نہیں کرنا چاہیے اب میں اس کا انتظار نہیں کروں گا۔

آج سہ پہر ہی تو اس نے مجھے سب کچھ بتا دیا تھا وہ ہانس کے لیے ماڈلنگ کرنے لگی ہے وہ ہانس کے بہت قریب ہو گئی ہے اور اس نے کچھ اور بھی کہا تھا جو میں نہیں سن سکا تھا یا سننا نہیں چاہتا تھا۔ میں نے اسے قتل کر دیا تھا پھر میرے کانوں میں بلیک کی نظم کا یہ مصرعہ گونجنے لگا تھا۔

"ننھے میمنے تجھے کس نے بنایا؟"

نوآموز

اسرار احمد

وہ ایک جریدے کا ایڈیٹر تھا اس کا کام اپنے قارئین کے لیے خوب سے خوب تر کہانیاں تلاش کرنا تھا۔ ایک روز اس کی ملاقات ایک نئے لکھنے والے سے ہوگئی۔ جس نے اس کے جریدے کو شہرت کی بلندیوں تک پہنچا دیا مگر......

انگریزی ادب سے انتخاب ایک دلچسپ کہانی' تراجم پسند کرنے والوں کے لیے بطور خاص

جی، بندہ ایک ایڈیٹر ہے اور آپ کی خدمت میں نت نئے ہنگامے پیش کرتا رہتا ہے مجھے معلوم ہے کہ آپ ہمارے رسالے کو بہت پسند کرتے ہیں یہی وجہ ہے ہمارے رسالے کی اشاعت بہتوں سے زیادہ ہے۔ میں جب پہلے دن اس کرسی پر بیٹھا تھا تو ہمارے ادارے کے مینجنگ ایڈیٹر نے بڑے کام کی بات بتائی تھی۔ اس نے کہا تھا

''نک سامر (یہ اس حقیر کا نام ہے) ہم نے یہ سارا کھڑاگ کاروبار کے لیے پھیلا رکھا ہے ہمارا کام لوگوں کی اصلاح کرنا نہیں ہے اس لیے ہم صرف وہی چیزیں شائع کرتے ہیں جنہیں لوگ پسند کرتے ہیں اور جو شخص اس کرسی پر بیٹھتا ہے اس کے لیے یہ بات یاد رکھنا بہت ضروری ہے۔ دوسری بات یہ یاد رکھو کہ کبھی کسی نئے لکھنے والے سے تلخ لہجے میں بات نہ کرو۔ ان کا مسودہ واپس کرتے وقت (جو کہ اکثر ہی کرنا پڑتا ہے) ان کی تحریر کی تعریف ضرور کیا کرو، مثلاً آپ کی کہانی تو بہت عمدہ ہے لیکن ہمارے رسالے کا مزاج ذرا مختلف ہے وغیرہ وغیرہ، انہی لوگوں میں سے کوئی نہ کوئی شیکسپیئر اور سر آرتھر کانن ڈائل بھی بن سکتا ہے۔

میں نے ان زریں اصولوں کی روشنی میں کام کیا اور آپ دیکھ رہے ہیں کہ میں ایک کامیاب ایڈیٹر ہوں۔ میں نے کئی اچھے اچھے لکھنے والوں کو متعارف کرایا ہے اور اب وہ مارکیٹ میں خوب قدم جما چکے ہیں یعنی مالی اور مادی اعتبار سے خوش حال ہیں نام بھی کما رہے ہیں اور دام بھی ذرا ایک منٹ ٹھہریے ٹیلیفون کی گھنٹی بج رہی ہے۔

''نک سامر۔'' سوئچ بورڈ آپریٹر نے کہا۔ ''ایک صاحب تم سے بات کرنا چاہتے ہیں۔''

''ملادو۔'' میں نے کہا۔ ''کوئی نیا رائٹر ہوگا۔''

لمحے بھر کے بعد میرے کانوں میں ایک دبی دبی آواز آئی۔

''کیا تم ایڈیٹر ہو؟''

لہجہ کچھ اس قسم کا تھا کہ تم ایڈیٹر ہو یا حجام؟''

''ابھی تک تو ایڈیٹر ہی ہوں۔'' میں نے جواب دیا۔ ''میرے لائق کوئی خدمت؟''

''میں باربر ہوں۔'' اس نے کہا۔

فوری طور پر میری سمجھ میں کچھ نہیں آیا میں اس سے کہنے والا تھا کہ ہمارے ہاں باربر کی کوئی اسامی خالی نہیں ہے کیونکہ ہم لوگوں کی حجامتیں نہیں بناتے رسالہ چھاپتے ہیں لیکن دوسرے ہی لمحے میرے بدن میں خوف کی سرد لہر سرایت کر گئی میں اس شخص سے مخاطب تھا جو پولیس کی فراہم کردہ اطلاعات کے مطابق گزشتہ چھ ماہ کے دوران پورے بارہ انسانوں کو قتل کر چکا تھا۔ مجھے یقین ہے کہ آپ نے اس شخص کے بارے میں ضرور

پڑھا ہوگا اور ابھی تک پڑھ رہے ہوں گے۔ کیونکہ گزشتہ چھ ماہ سے اس کا نام صفحہ اول کی زینت بنا ہوا ہے اس کا اصل نام ہنوز پردہ راز میں ہے لیکن چونکہ یہ شخص بارہ بے گناہ انسانوں کو خنجر سے گلا کاٹ کا ہلاک کر چکا ہے اس لیے اخباروں میں باربر کے نام سے اس کا ذکر کیا جاتا ہے۔ یہ نام اسے ڈیلی نیوز کے کرائم رپورٹر نے دیا تھا۔ غالباً اسے اس ''کارنامے'' پر ترقی بھی ملی تھی بہرحال سردست یہ نیویارک کی سب سے سنسنی خیز اور خوفناک کہانی ہے لیکن چھ ماہ گزرنے کے باوجود پولیس، مجرم کا کوئی سراغ نہیں لگا سکی۔ اس ضمن میں کئی ماہرین جرائم کے انٹرویو نشر ہو چکے ہیں۔ ان میں ہمارے مینجنگ ایڈ جیک میکنمارا کا انٹرویو بھی شامل ہے۔ اس نے کہا تھا کہ وہ باربر کی سچی کہانی حاصل کرنے کے لیے ایک لاکھ ڈالر تک معاوضہ دینے کو تیار ہے۔

''ہیلو مر تو نہیں گئے مسٹر ایڈیٹر؟''

''نن......نہیں......ز......زندہ ہوں۔'' میں نے کہا۔ ''کک......کیا تم میرا بھی گلا کاٹنا چاہتے ہو؟''

''کاش ٹیلیفون کے ذریعے گلے کاٹے جا سکتے؟''

دراصل بات یہ ہے کہ میز کرسی پر بیٹھ کر کام کرنے والے لوگ عموماً کمزور دل ہو جاتے ہیں اور میں بھی انہی لوگوں میں سے ہوں۔

''مم...... میں تمہاری کیا خدمت کر سکتا ہوں؟'' میں نے اپنے دل ناتواں کو سنبھالا دیتے ہوئے کہا۔

''میں اپنی آپ بیتی شائع کرانا چاہتا ہوں۔'' اس نے کہا۔

میں اپنی کرسی سے اچھل پڑا اس کے ساتھ ہی مجھے اپنے باس کا انٹرویو یاد آ گیا۔ اگر یہ شخص واقعی باربر ہے اور میں اس کی آپ بیتی حاصل کرنے میں کامیاب ہو گیا تو ایک لاکھ ڈالر میں سے معقول کمیشن میرے حصے میں آئے گا رسالے کی اشاعت بڑھے گی اور میری بھی ترقی ہوگی۔

''ضرور، ضرور۔'' میں نے کہا۔ ''کیا تمہاری آپ بیتی تیار ہے؟''

''میں نے تمہارے باس کا انٹرویو پڑھا تھا۔'' اس نے کہا۔ ''اس نے ایک لاکھ ڈالر کی بات کی تھی۔''

''ہاں ہم ایک لاکھ ڈالر سے بھی زیادہ دے سکتے ہیں کیا مسودہ تیار ہے؟''

''میں تمہارے باس سے بات کرنا چاہتا ہوں۔''

''ایک ہی بات ہے تم مجھ سے بھی بات کر سکتے ہو ویسے باس پیر سے پہلے نہیں مل سکتا۔ وہ شہر سے باہر گیا ہوا ہے۔''

''تو میں پھر پیر کو بات کروں گا۔'' اس نے بات ختم کرتے ہوئے کہا۔

''بات سنو، باس صرف ایک گھنٹے کے لیے دفتر میں آئے گا۔ اس روز وہ تین ہفتے کے لیے مشرق بعید جا رہا ہے۔ اگر تم اس سے بات کرنے پر مصر ہو تو تمہیں تین ہفتے انتظار کرنا پڑے گا۔''

''کیا میں تم پر بھروسا کر سکتا ہوں؟ اس بات کی کیا ضمانت ہے کہ تم مجھے پولیس کے حوالے نہیں کرو گے۔''

''میں اپنے کاروبار کے ساتھ دھوکا نہیں کر سکتا۔ مسٹر باربر۔'' میں نے کہا۔ ''اگر ہم تمہیں ایک لاکھ ڈالر دیں گے تو چار لاکھ ڈالر کمائیں گے بھی اور میرا خیال ہے کہ کوئی احمق ہی اتنی بڑی رقم چھوڑ سکتا ہے۔''

''ٹھیک ہے۔'' اس نے کہا۔ ''لیکن سوال یہ ہے کہ رقم کی ادائیگی کی کیا صورت ہوگی؟''

''ادائیگی مسودہ پڑھنے کے بعد کی جائے گی۔''

''پہلی بات تو یہ ہے کہ میں مسودہ دس قسطوں میں دوں گا دوسری بات یہ ہے کہ بعد میں ادائیگی والی بات مجھے منظور نہیں۔ تمہیں پہلی قسط کے ساتھ پچیس فیصد، یعنی پچیس ہزار ڈالر ادا کرنا ہوں گے اگر یہ شرط منظور ہو تو بولو ورنہ میں کسی دوسرے پبلشر سے بات کروں۔''

''تو پھر تم ایسا کرو کہ سوموار کو دس اور گیارہ بجے کے

درمیان فون کرو، اس وقت جیک میکنمارا بھی موجود ہوگا۔"

"ٹھیک، لیکن ایک بات یاد رکھو اگر کوئی جال بچھانے کی کوشش کی تو تمہارا گلا بھی......!"

میرا ہاتھ لاشعوری طور پر گلے پر پہنچ گیا مجھے نہیں معلوم کہ گلا کٹتے وقت کرکی آواز آتی ہے یا شرکی لیکن یہ بات بہر حال یقینی ہے کہ میں اپنا گلا کٹوانے کا کوئی ارادہ نہیں رکھتا۔ میں نے یہ بات باربر کو بھی بتادی اور فون بند کردیا۔

پیر کے روز جب میں نے میکنمارا کو باربر کے بارے میں بتایا تو وہ بہت خوش ہوا اس نے مشرق بعید کا پروگرام ملتوی کردیا اور فوراً پچیس ہزار ڈالر دے کر پہلی قسط حاصل کرنے کا فیصلہ کرلیا۔

"جانتے ہو کیا ہوگا۔" اس نے پرجوش انداز میں کہا۔ "پہلی قسط شائع ہوتے ہی رسالے کی اشاعت میں کم از کم ایک لاکھ کا اضافہ ہوجائے گا۔ یوں سمجھ لو کہ ہم یہ رقم پبلسٹی پر خرچ کررہے ہیں۔"

"لیکن ایک بات ہے۔" میں نے کہا۔ "پولیس ہمیں پریشان کرنے لگے گی۔"

"پولیس ہم سے کچھ نہیں کہہ سکتی۔ کسی کی آپ بیتی شائع کرنا کوئی جرم نہیں۔"

دس بج کر بائیس منٹ پر فون کی گھنٹی بجی میکنمارا نے مجھے اشارہ کیا اور میں نے ریسیور اٹھا کر ہیلو کہا۔

"باربر۔" دوسری طرف سے دبی دبی آواز سنائی دی۔ غالباً اس نے ریسیور پر رومال رکھا ہوا تھا۔

"تم نے اپنے باس سے بات کرلی؟"

"ہاں ہم پچیس ہزار دینے پر تیار ہیں۔" میں نے کہا۔ "پہلی قسط کب دے رہے ہو؟"

"بہت خوب۔" اس نے کہا۔ "رقم چھوٹے نوٹوں کی صورت میں تیار رکھو، میں کل صبح تک کسی وقت بھی تم سے رابطہ قائم کرلوں گا۔ پولیس کو یا کسی پرائیویٹ جاسوس کو اپنی نگرانی پر لگانے کی حماقت نہ کرنا ورنہ میں تمہارے ساتھ سودا نہیں کروں گا اور گلا بھی کر...... اب سے لے کر کل صبح تک رقم تمہارے پاس موجود رہنا چاہیے میں کسی وقت بھی تم سے رابطہ قائم کرسکتا ہوں۔" اس کے ساتھ ہی اس نے فون بند کردیا۔

باس جو میرے سر کے ساتھ سر ملائے بات سن رہا تھا معنی خیز انداز میں سر ہلانے لگا۔

"خاصا ہوشیار آدمی معلوم ہوتا ہے۔" اس نے کہا۔ "بہر حال میں ابھی رقم کا بندوبست کرتا ہوں یہ موقع ضائع نہیں ہونا چاہیے۔" اس نے بینک سے رقم نکلوائی اور اسے پیلے رنگ کے لفافے میں بند کرکے میرے حوالے کردیا۔ دن بھر میں دفتر میں باربر کے فون کا انتظار کرتا رہا مگر مایوسی ہوئی۔ شام کو میں نے نوٹوں کا لفافہ بریف کیس میں رکھا اور کار میں بیٹھ کر گھر روانہ ہوگیا۔ میں ایک کثیر المنزلہ عمارت کی پانچویں منزل پر رہتا ہوں۔ میں نے کار پارکنگ لاٹ میں کھڑی کی اور بریف کیس اٹھائے عمارت کے صدر دروازے کی طرف چل پڑا میری نگاہ چاروں طرف کا جائزہ لے رہی تھی۔ نیویارک میں اتنی بڑی رقم ساتھ لے کر پھرنا انتہائی خطرناک ہے خصوصاً جب کہ ایک سنگ دل قاتل رقم کے بارے میں بھی علم رکھتا ہو عمارت کے اندر پہنچ کر میں نے خودکار لفٹ کا بٹن دبایا اور انتظار کرنے لگا۔ پھر جیسے ہی لفٹ کا دروازہ کھلا ایک شخص تیزی سے آیا اور مجھے دھکیلتا ہوا لفٹ میں داخل ہوگیا۔ اس کے ساتھ ہی لفٹ کا دروازہ بند ہوگیا غالباً نووارد نے بٹن دبا دیا تھا۔

"پیچھے نہیں دیکھنا مسٹر سامر۔" اس نے ہولے سے کہا۔ آواز تقریباً وہی تھی جو میں فون پر سن چکا تھا۔ "رقم میرے حوالے کردو اور یہ رہی تمہاری پہلی قسط۔"

ایک پھولا ہوا لفافہ کندھے کے اوپر سے میرے سامنے آ گیا۔ میں نے بریف کیس کھول کر نوٹوں کا لفافہ نکالا باربر نے اپنا لفافہ کھلے ہوئے بریف کیس

میں پھینک دیا اور میرا لفافہ اچک لیا۔ اس اثناء میں لفٹ دوسری منزل پر پہنچ کر رک گئی۔

''میں جا رہا ہوں۔'' اس نے کہا۔

''تم اپنا سفر جاری رکھو اور کا سفر اگر تم نیچے آئے تو مجھے دروازے کے پاس منتظر پاؤ گے اور پھر کرنٹ۔''

وہ باہر چلا گیا اس نے گرے رنگ کا ٹام کوٹ اور فلیٹ ہیٹ پہن رکھا تھا ہاتھوں میں دستانے نظر آ رہے تھے میں نے پانچویں منزل کا بٹن دبایا اور بخیریت اپنے اپارٹمنٹ میں پہنچ گیا۔

''نک یہ تمہیں کیا ہوا؟'' میری بیوی ڈورا، میری طرف دیکھتی ہوئی بولی۔ ''تمہارا رنگ کیوں سفید ہو رہا ہے یوں معلوم ہوتا ہے جیسے کوئی بھوت دیکھ کر آ رہے ہو۔''

میں نے گہرا سانس لیا۔ ''ہاں، شاید بھوت ہی دیکھ کر آ رہا ہوں۔''

میں نے کوٹ اتار کر ایک طرف پھینکا' جوتے دوسری طرف پھینکے ٹائی کی گرہ ڈھیلی کی اور بستر پر لیٹ کر مسودہ دیکھنے لگا وہ مسودہ بارہ انچ لمبے اور نو انچ چوڑے کاغذ پر صفائی سے ٹائپ کیا ہوا تھا اس پر انگلیوں کے نشانات کا کوئی امکان نہیں تھا کیونکہ بار بر خاصا محتاط آدمی نظر آتا تھا۔ شروع کے چند صفحات میں اس نے اپنی محرومیوں اور ناانصافیوں کا ذکر کیا تھا گویا اپنے قبیح افعال کا جواز پیش کرنا چاہتا تھا چھٹے صفحے کے بعد اس نے پہلے قتل کی تفصیل لکھی تھی۔ انتہائی پرہیبت اور ہولناک تفصیل تھی چند صفحے پڑھنے کے بعد میں نے مسودہ رکھ دیا کیونکہ میرا رنگ مزید سفید ہوتا جا رہا تھا اور ڈورا کافی لے کر آنے والی تھی اگرچہ میں جرائم کے بارے میں بہت کچھ لکھ اور پڑھ چکا ہوں لیکن مجھ پر ایسی ہیبت کبھی طاری نہیں ہوئی تھی شاید وجہ یہ تھی کہ وہ مسودہ میں نے تھوڑی دیر پہلے اس شخص کے ہاتھ سے لیا تھا جو اس قتل کا اقبالی مجرم تھا۔

اگلی صبح جب میں دفتر پہنچا تو جیک میکنمار کو اپنا منتظر پایا اس نے سب سے پہلا سوال مسودے کے بارے میں کیا جواب میں، میں نے مسودہ نکال کر اس کے سامنے رکھ دیا۔

''کوئی گڑبڑ تو نہیں ہوئی؟'' وہ مسودے کی تہیں کھولتا ہوا بولا۔

''کوئی نہیں، سوائے اس کے کہ میرا رنگ ضرورت سے زیادہ سفید ہو گیا تھا۔''

اس نے میری بات پر کوئی دھیان نہیں دیا اور جلدی جلدی مسودہ پڑھنے لگا اس کا سر اس بلی کی طرح ہل رہا تھا جس کے سامنے کوئی لٹکی ہوئی چیز ہلائی جا رہی ہو پڑھنے کے معاملے میں اس کی رفتار بہت تیز ہے، بظاہر یوں معلوم ہوتا ہے جیسے وہ سطریں گن رہا ہے لیکن در حقیقت وہ چھوٹی چھوٹی باتوں کو بھی نظر انداز نہیں کرتا، مسودہ پڑھنے کے بعد اس نے بڑے زور سے میز پر مکا مارا۔

''پرچے کی فوراً تیاری شروع کر دو۔'' اس نے کہا۔ ''آج دس تاریخ ہے بیس تک پرچہ مارکیٹ میں پہنچ جانا چاہیے۔''

''لیکن ہمارا پرچہ تو ہمیشہ پہلی تاریخ کو مارکیٹ میں آتا ہے۔''

''اس دفعہ بیس کو آئے گا۔'' اس نے پرجوش لہجے میں کہا۔ ''ہوسکتا ہے پہلی تک دوسرا ایڈیشن شائع کرنا پڑے ٹائٹل پر کچھ اس قسم کے جلی عنوانات ہونے چاہئیں سنگ دل قاتل کی آپ بیتی یا اس شخص کا اقبالی بیان جس نے گزشتہ چھ ماہ سے نیویارک میں دہشت پھیلا رکھی ہے خصوصی فیچر، سنسنی خیز اور ہولناک انکشافات وغیرہ وغیرہ اور ہاں جس دن پرچہ مارکیٹ میں آئے اسی دن ٹی وی اور اخبارات میں اشتہار آ جانا چاہیے، مجھے یقین ہے کہ چوبیس گھنٹے کے اندر اندر تمام کاپیاں فروخت ہو جائیں گی۔''

"انتہائی ہیبت ناک سلسلہ رہے گا۔" میں نے کہا۔

"بشرطیکہ یہ شخص پکڑا نہ گیا۔"

"پکڑا بھی گیا تو کیا ہے ہم جیل میں اس سے لکھوائیں گے۔"

"سوال ہی پیدا نہیں ہوتا وہ کبھی نہیں لکھ سکتا اس طرح تو کھلم کھلا اقبال جرم ہوگا۔"

"اقبال جرم تو اب بھی ہے۔"

"ہاں لیکن اسے قانونی شہادت کے طور پر پیش نہیں کیا جاسکتا وہ اس تحریر سے صاف انکار کرسکتا ہے۔"

"بات تو ٹھیک کہتے ہو اس کا مطلب یہ ہے کہ اگر ضرورت پڑی تو اسے تحفظ بھی فراہم کرنا پڑے گا۔"

"ایک بات پر تم نے غور نہیں کیا کہ تحریر خاصی پختہ ہے یہ شخص زندگی کی باریکیوں کو خوب جانتا ہے اور ہاں یہ بات صیغہ راز میں رہنا چاہیے۔"

بیس تاریخ کو جب پرچہ مارکیٹ میں آیا تو چاروں طرف شور مچ گیا لوگوں نے فون کرنے شروع کردیے وکلا کی انجمن نے زبردست احتجاج کیا انہوں نے یہ موقف اختیار کیا کہ اگر قاتل نے ہم سے رابطہ قائم کیا تھا تو ہمیں فوراً پولیس کو اطلاع دینا چاہیے تھی بعض لوگوں نے خیال ظاہر کیا کہ ساری داستان ہم نے خود گھڑی تھی بعض کا خیال تھا کہ قاتل ہماری پناہ میں ہے۔

دوپہر کے بعد نیویارک سٹی پولیس کا لیفٹیننٹ برنسٹائن تحقیقات کے لیے ہمارے دفتر پہنچ گیا۔

"مسٹر سامر۔" اس نے آتے ہی کہا۔ "میں جاننا چاہتا ہوں کہ یہ مضمون میرا اشارہ باربر کی خودنوشت کی طرف ہے تم نے کس طرح حاصل کیا؟"

میں نے کندھے اچکائے اور کہا۔ "ہمارے پاس مختلف طریقوں سے مضامین اور کہانیاں آتی ہیں بعض لوگ ذاتی طور پر مضامین دے جاتے ہیں بعض اپنے ایجنٹ کے ذریعے بھجواتے ہیں اور بعض ڈاک کے ذریعے بھجوادیتے ہیں میرے خیال میں ان میں سے کوئی طریقہ قابل دست اندازی پولیس نہیں۔"

"مسٹر سامر، تم اس بات سے بے خبر نہیں ہوگے کہ باربر ایک خطرناک مجرم اور عرصے سے پولیس کو مطلوب ہے۔"

"یقیناً مسٹر برنسٹائن۔"

"اس کے باوجود تم نے اس کی گرفتاری کے لیے پولیس سے رابطہ قائم نہیں کیا۔"

"لیفٹیننٹ۔" میں نے بے پروائی سے کہا۔ "غالباً اس بات کا فیصلہ نہیں ہوا کہ باربر نے مجھ سے یا ہمارے ادارے کے کسی آدمی سے رابطہ قائم کیا تھا۔"

"اوکے، پہلے اس بات کا فیصلہ ہوجائے۔"

"لیفٹیننٹ، ہم اپنے کاروباری راز افشا کرنا پسند نہیں کرتے۔" میں نے کہا۔ "اور میرا خیال ہے کہ قانون میں ایسی کوئی شق موجود نہیں جو ہمیں اس بات پر مجبور کرسکے۔"

"مسٹر سامر تمہارا رویہ افسوسناک ہے تمہیں ایک اچھے شہری کی طرح قانون کی مدد کرنی چاہیے۔"

"بات یہ ہے لیفٹیننٹ کہ باربر بارہ انسانوں کو قتل کرچکا ہے اور بارہ میں ایک کا اضافہ بھی ہوسکتا ہے میرا مطلب ہے کہ وہ مجھے بھی قتل کرسکتا ہے۔"

"ہم تمہاری حفاظت کا وعدہ کرتے ہیں۔"

"جس طرح دیگر بارہ افراد کی حفاظت کرچکے ہیں۔"

"کیا یہ مضمون کا مسودہ دیکھ سکتا ہوں۔"

میں نے مسودہ نکال کر اس کے سامنے رکھ دیا اس نے مسودے کو الٹ پلٹ کر دیکھا کاغذ کا معائنہ کیا اور کہیں کہیں سے پڑھ کر دیکھا۔

"میں انگلیوں کے نشانات کے لیے اسے ساتھ لے جارہا ہوں۔" اس نے کہا۔ "دو چار روز میں واپس کردوں گا۔"

"باربر ایک ہوشیار آدمی معلوم ہوتا ہے اول تو اس

نے انگلیوں کے نشانات نہیں چھوڑے ہوں گے تاہم اگر نشانات تھے بھی تو وہ اب تک مٹ چکے ہوں گے اس مسودے کو کم از کم نصف درجن افراد اِدھر اُدھر کر چکے ہیں۔"

لیفٹیننٹ اٹھتا ہوا بولا۔ "بہرحال چیک کر لینے میں کوئی حرج نہیں ہاں مسٹر سامرا اگر باربر دوبارہ تم سے رابطہ قائم کرے تو ہمیں ضرور مطلع کر دینا اس میں تمہاری بھی سلامتی ہے۔"

یہ بات میری سمجھ میں نہیں آئی کہ اسے مطلع کردینے میں میری سلامتی کیوں تھی اگر باربر مجھے قتل کرنا چاہتا تو لفٹ کے اندر بڑا اچھا موقع تھا لیکن میں سمجھتا ہوں چونکہ اسے میری وجہ سے مالی فائدہ ہورہا تھا اس لیے اس نے میرا گلہ نہیں کاٹا۔

تین روز بعد ایک حیرت انگیز انکشاف ہوا شام کے چھ بجے تھے اور میں دفتر سے اٹھنے کی تیاری کر رہا تھا اچانک فون کی گھنٹی بجی میں نے ریسیور اٹھایا اور حسب عادت خوش اخلاقی کے ساتھ اپنے لائق کوئی خدمت پوچھی۔

"جان کی سلامتی چاہتے ہو یا نہیں؟" دوسری طرف سے کسی نے غرا کر کہا۔

میں سمجھا کوئی ناکام رائٹر ہے جس کا مسودہ کئی دفعہ واپس جا چکا ہے۔

"میں سمجھا نہیں کون بول رہا ہے؟"

"تمہارا باپ بول رہا ہوں کیا سمجھے لوگ مجھے باربر کہتے ہیں یعنی مسٹر کٹ تھروٹ۔"

میں اپنی کرسی سے اچھل پڑا۔ "تم کون بول رہے ہو؟"

"یہ لغویات تم نے میری طرف منسوب کر کے چھاپی ہیں جانتے ہو اس کا انجام کیا ہوگا؟"

"ششش۔ شاید تمہیں کچھ غلط فہمی ہوئی ہے۔" میں نے کہا۔ "یہ ہمیں اس شخص نے دی ہیں جو اخبارات میں باربر کے نام سے مشہور ہے۔"

"بکواس مت کرو۔" وہ غرایا۔ "میں تم لوگوں کے ہتھکنڈے خوب سمجھتا ہوں دولت کمانے کا خوب طریقہ نکال لیتے ہو۔"

"یقین کرو ہم نے......!"

"شٹ اپ دھیان سے میری بات سنو اگلے شمارے میں اس جھوٹ کی تردید شائع کرو ورنہ میں تمہاری بوٹیاں کتوں اور چیلوں کے آگے ڈال دوں گا۔"

"ٹھیک ہے ٹھیک ہے میں تردید شائع کر دوں گا، لیکن مجھے نوکری سے جواب مل جائے گا۔"

"مجھے تمہاری نوکری سے کوئی سروکار نہیں اخباری چوہے! یاد رکھو میرے خنجر کی دھار بہت تیز ہے۔"

"یقیناً ہوگی مجھے کوئی شبہ نہیں میں تردید شائع کردوں گا لیکن ہم نے اس مسودے کا پچیس ہزار ڈالر معاوضہ دیا ہے۔"

"پچیس ہزار ڈالر کس کو؟"

"چند روز پہلے تمہاری طرح ایک شخص نے ہمیں فون کیا تھا کہ وہ باربر ہے اور اپنی آپ بیتی شائع کرانا چاہتا ہے ہم اس کے ساتھ ایک لاکھ ڈالر میں بات پکی کر چکے ہیں اس نے دس قسطوں میں مکمل واقعات مہیا کرنے کا وعدہ کیا ہے۔ وہ پہلی قسط کے پچیس ہزار ڈالر وصول کر چکا ہے اگر...... اگر تم چاہو تو ہم تمہارے ساتھ ایسا ہی معاہدہ کر سکتے ہیں لل...... لیکن اس بات کا کیا ثبوت ہے کہ تم ہی باربر ہو۔"

"ثبوت کے طور میں تمہاری گردن کاٹ سکتا ہوں، اخباری چوہے۔"

"نن...... نہیں، نہیں۔" میں نے کہا۔ "اتنا بڑا ثبوت نہیں چاہیے کوئی چھوٹا موٹا ثبوت چل جائے گا۔"

"تو پھر گردن کی بجائے ہاتھ پیر کاٹ دوں گا۔" اس نے کہا۔ پھر جیسے ایک دم چونک پڑا "میرا خیال ہے کہ تم جان بوجھ کر بات لمبی کر رہے ہو۔ غالباً تمہارا

کوئی ساتھی ایکسچینج والوں کی مدد سے میرے فون نمبر کا سراغ لگانے کی کوشش کر رہا ہوگا میں دوبارہ رابطہ قائم کروں گا۔"

"وہ...... وہ ایک لاکھ ڈالر والی بات ضرور یاد رکھنا۔"

"سوچوں گا۔" اس نے کہا اور فون بند کر دیا۔

میں نے ریسیور رکھ دیا اور دونوں ہاتھوں سے سر پکڑ کر بیٹھ گیا جس شخص نے پچیس ہزار ڈالر لے کر پہلی قسط دی تھی وہ یقیناً کوئی موقع شناس شخص تھا اس نے جیک میکنمار کا انٹرویو پڑھا ہوگا اور فوراً موقع سے فائدہ اٹھانے کا فیصلہ کر لیا ہوگا تعجب ہے کہ ہمیں پہلے اس بات کا خیال کیوں نہیں آیا زیادہ تر تفصیلات وہی تھیں جو اخبارات میں چھپ چکی تھیں کچھ باتیں ایسی ضرور تھیں جو نہیں چھپی تھیں مگر ان کی تصدیق نہیں کی جا سکتی تھی میں نے رسالہ نکالا اور مضمون کو دوبارہ پڑھا۔

"اگلے روز میں نے جیک میکنمار کو صورت حال سے آگاہ کیا۔

"مجھے پہلے ہی گڑبڑ کا اندیشہ تھا" اس نے کہا۔ "اگر قارئین کو پتا چل گیا کہ مضمون جعلی تھا تو رسالے کی اشاعت بری طرح متاثر ہوگی کسی طرح اس شخص کو لکھنے پر آمادہ کرو۔"

"میں یہ بات اس سے کہہ چکا ہوں امید نہیں کہ وہ راضی ہو جائے یہ تو اپنی موت کے فرمان پر دستخط کرنے والی بات ہے۔"

میکنمار نے گہرا سانس لیا پھر بولا۔ "بہر حال اس کے ساتھ کوئی سودے بازی کرنا پڑے گی ہم کسی صورت میں تردید شائع نہیں کر سکتے۔"

اس لمحے میکنمار کی سیکرٹری نے انٹر کام پر اطلاع دی کہ لیفٹیننٹ برنسٹائن ملنا چاہتے ہیں۔

"اندر بھیج دو۔" میکنمارا نے انٹر کام میں کہا' پھر میری طرف متوجہ ہوا "احتیاط سے بات کرنا۔"

"مجھے اپنی گردن زیادہ عزیز ہے اور اب چھپانے کا کوئی فائدہ بھی نہیں جس شخص کو ہم تحفظ فراہم کرنا چاہتے تھے وہ تو دھوکے باز ثابت ہوا۔"

دروازہ کھلا، برنسٹائن کمرے میں داخل ہوا اور مسودہ میز پر ڈال دیا۔

"مسٹر میکنمارا۔" برنسٹائن نے اس کی بات کاٹی۔ "سامر کی زبان کھلوانا بہت مشکل ہے ہمارے پاس معلومات حاصل کرنے کے لیے اپنے ذرائع ہیں۔"

"تمہاری معلومات غلط بھی ہو سکتی ہیں۔"

"ہم معلومات پرکھنے کا طریقہ بھی جانتے ہیں۔" برنسٹائن نے کہا پھر سنسنی خیز انداز سے میری طرف دیکھتا ہوا بولا۔ "مثلاً یہ مضمون جعلی ہے یہ اس شخص نے نہیں لکھا جو عرف عام میں باربر کے نام سے مشہور ہے۔" اس نے لمحے بھر ہمارے رد عمل کا انتظار کیا پھر بولا۔ "تمہیں کوئی تعجب نہیں ہوا؟"

"ہمیں یہ بات معلوم ہو چکی ہے۔"

"اور معلوم ہونا بھی چاہیے۔" برنسٹائن کرسی پر بیٹھتا ہوا بولا۔ "اب یہ معاملہ یقیناً دست اندازی پولیس کے قابل ہو گیا ہے کیا خیال ہے، نک سامر؟"

"کیا مطلب؟"

"مطلب بالکل واضح ہے کہ کسی کی طرف منسوب کر کے کوئی مضمون شائع کرنا جرم ہے۔"

"اس جرم کی ذمہ داری صاحب مضمون پر عائد ہوتی ہے۔"

"کیوں نہیں جب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ صاحب مضمون کون ہے اگر تم اس شخص کو پیش نہ کر سکے تو عدالت یہی سمجھے گی کہ یہ سب تم لوگوں کی ملی بھگت ہے۔"

میں نے جیک میکنمارا کی طرف دیکھا۔ "کیا خیال ہے مسٹر میکنمارا؟"

"بتا دو۔" اس نے کہا۔ "تمہیں تو پہلے ہی اپنی گردن کی فکر پڑی ہوئی ہے۔"

میں نے لیفٹیننٹ برنسٹائن کو شروع سے لے کر آخر تک ساری بات بتادی۔

''ہونہہ۔'' لیفٹیننٹ نے پرخیال مسکراہٹ سے میری طرف دیکھا۔ ''کیا اب بھی ہماری مدد کی ضرورت نہیں؟''

''شاید اب ہے۔''

''خوب۔'' لیفٹیننٹ برنسٹائن بولا۔ ''اب ہمارے سامنے دو باربر ہیں ایک اصلی اور ایک نقلی پہلے نقلی کے بارے میں کچھ بات ہوجائے۔''

''کوئی موقع پرست معلوم ہوتا ہے۔'' میکنا.. نے کہا۔ ''میرے انٹرویو سے متاثر ہوکر باربر بن گیا ہے کمبخت نے یہ نہیں سوچا کہ جب اصلی باربر یہ مضمون پڑھے گا تو سارا راز فاش ہوجائے گا۔''

''مسٹر سامر لیکن یہ نقلی باربر لفٹ میں تم سے ملا تھا تو اس کے پاس کوئی ہتھیار وغیرہ بھی تھا؟''

''کچھ نہیں کہہ سکتا اس نے مجھے کوئی ہتھیار نہیں دکھایا مگر ہوسکتا ہے جیب میں ہو۔''

''اور تم کہتے ہو کہ اس کی شکل وغیرہ نہیں دیکھ سکے کم از کم تم نے اس کا قد و قامت تو ضرور دیکھا ہوگا۔''

''میرے خیال میں اس کا قد چھ فٹ کے لگ بھگ تھا درمیانہ جسم تھا نہ زیادہ موٹا نہ پتلا وہ گرے رنگ کے ٹاپ کوٹ میں ملبوس تھا اس کے سر پر ہیٹ تھا جو آنکھوں پر جھکا ہوا تھا اور ہاتھوں میں دستانے پہن رکھے تھے۔''

''جیسا کہ تم نے بتایا ہے وہ دس قسطوں میں پورا قصہ فراہم کرے گا تو کیا تم بتا سکتے ہو کہ وہ اگلی قسط کب پہنچائے گا؟''

''فی الحال کچھ نہیں کہا جاسکتا ممکن ہے ایک آدھ ہفتے بعد وہ ہم سے رابطہ قائم کرے۔''

لیفٹیننٹ برنسٹائن جانے کے لیے کھڑا ہوگیا۔ ''اگر نقلی باربر دوبارہ رابطہ قائم کرے تو اس پر ہرگز یہ ظاہر نہ ہونے دینا کہ تم اس کی اصلیت سے آگاہ ہوچکے ہو بلکہ حسب معمول بات کرنا اگر وہ اگلی قسط دینے کی بات کرے تو اس سے وقت اور جگہ طے کرلینا ساتھ ہی ہمیں بھی خبر کردینا پھر ہم جانیں اور ہمارا کام۔''

اس کے بعد ایک ہفتہ خیریت سے گزر گیا نہ ہی اصلی باربر کی طرف سے کوئی کال آئی نہ ہی نقلی باربر نے فون کیا آٹھویں دن دوپہر کو نقلی باربر کا فون آگیا میں نے فوراً ہی اس کی آواز پہچان لی۔

''دوست قسط تیار ہے۔'' اس نے دبی دبی آواز میں کہا۔

''ہم بھی تیار ہیں۔'' میں نے کہا۔ ''کہاں ملاقات ہوگی؟''

''کیا مطلب، ہم بھی تیار ہیں؟'' اس نے چونک کر پوچھا۔

چونکہ وہ اصلی باربر نہیں تھا اس لیے میرے لہجے میں پہلے جیسا خوف نہیں تھا غالباً اسی بات نے اسے چونکنے پر مجبور کردیا تھا۔

''میرا مطلب ہے ہمیں بڑی شدت سے دوسری قسط کا انتظار تھا۔''

''رقم تیار ہے کہ نہیں؟''

''رقم پہلی قسط کے ساتھ تمہیں پچیس ہزار ڈالر دیے جاچکے ہیں اب تیسری قسط کے ساتھ رقم کی بات ہوگی۔''

''دیکھو مسٹر، پچیس ہزار میں سے دس ہزار تو پہلی قسط کے کٹ گئے باقی پندرہ ہزار پیشگی سمجھو اس کا حساب آخر میں کیا جائے گا دوسری قسط کے دس ہزار ڈالر بینک سے نکلوالو۔''

''ٹھیک ہے۔'' میں نے کہا۔ ''جیسے تمہاری مرضی آج بھی لفٹ میں ملاقات ہوگی؟''

''آج سینٹرل پیلس میں بیلویڈیر پیلس کے اندر ملاقات ہوگی۔'' اس نے کہا ''رات کے ساڑھے بارہ

بجے۔“
بیلویڈیر پیلس ایک ویران کھنڈر تھا جہاں رات کے وقت جانا خودکشی کے مترادف تھا وہ ہپیوں اور چرسیوں کی آماجگاہ تھی۔
”وہ تو خاصی خطرناک جگہ ہے۔“ میں نے کہا۔
”ہپی بن کر آ جانا کوئی تمہاری طرف نظر اٹھا کر بھی نہیں دیکھے گا شریف لوگوں کے لیے واقعی یہ خطرناک جگہ ہے ایک بار پھر یاد دلا دوں کوئی جال بچھانے کی کوشش نہ کرنا ورنہ کرے۔ جہاں بارہ گئے وہاں تم بھی جاؤ گے۔“
”کاروباری لوگ حماقت نہیں کیا کرتے ایک دفعہ دیکھ چکے ہو۔“
”احتیاطاً بتا دیا ہے۔“ اس نے کہا اور سلسلہ منقطع کر دیا۔
میں نے دس ہزار ڈالر منگوا کر ایک لفافے میں بند کیے اور لیفٹیننٹ کو بلا کر صورت حال سے آگاہ کر دیا اس نے کہا کہ مجھے فکر کرنے کی کوئی ضرورت نہیں...... وہ اپنے چند آدمیوں کو ہپیوں کے بھیس میں بیلویڈیر پیلس کے آس پاس پھیلا دے گا اور خود بھی وہاں موجود رہے گا۔
لیکن نقلی بار بر خاصا ہوشیار نکلا۔
میں نے چھ بجے دفتر سے چھٹی کی اور گھر روانہ ہو گیا پارکنگ لاٹ میں گاڑی پارک کرنے کے بعد جب میں وہاں سے نکلا تو چاروں طرف شام کا دھندلکا پھیلا ہوا تھا میں نے گاڑی لاک کی اور ابھی چند قدم ہی اٹھائے تھے کہ ایک آواز نے میرے قدم پکڑ لیے وہ نقلی باربر کی آواز تھی۔
”رک جاؤ مسٹر سامر۔ تم میرے ریوالور کی زد میں ہو۔“
میں جہاں تھا وہیں رک گیا اور اس کے بولنے کا انتظار کرنے لگا غالباً وہ میرے قریب کھڑی ہوئی کار میں چھپا بیٹھا تھا۔
”الٹے پاؤں پیچھے آؤ اور اپنا مسودہ وصول کر لو پیچھے دیکھنے کی زحمت نہ کرنا۔“
میں نے ذرا سا تامل کیا پھر چند قدم پیچھے ہٹا اور قریب کھڑی ہوئی کار کے ساتھ لگ کر رک گیا۔
”لاؤ مسودہ۔“ میں نے ہاتھ پیچھے کر کے کہا۔
”پہلے رقم۔“ اس نے کہا میں نے سوچا بڑی حماقت ہوگئی لیفٹیننٹ برنسٹائن سنٹرل پارک جانے کی تیاری کر رہا ہوگا جبکہ میں یہیں دھر لیا گیا۔ اب کوئی جائے مفر نہیں تھی میں نے بریف کیس کھولا اور نوٹوں کا لفافہ پیچھے کر دیا۔ جسے فوراً جھپٹ لیا گیا اور ایک دوسرا لفافہ ہاتھ میں تھما دیا گیا۔
”اب تم جا سکتے ہو۔“ اس نے کہا۔ ”پیچھے مڑ کر دیکھنے کی غلطی نہ کرنا میری انگلی ٹریگر پر ہے۔“
میرے بدن پر کپکپی طاری ہوگئی اس کی انگلی ٹریگر پر تھی اور نال کا رخ میری پشت کی طرف تھا اگر ٹریگر غلطی سے بھی دب گیا تو گولی میری پسلیوں میں سوراخ کرتی ہوئی آر پار ہو جائے گی۔ یہی وہ بات تھی جس سے میرے بدن پر کپکپی طاری ہوگئی تھی میں لڑکھڑاتے قدموں سے آگے روانہ ہو گیا۔ ابھی میں چند قدم ہی چلا تھا کہ میرے کانوں میں شور کی آواز آئی پہلے کار چلنے کی آواز پھر فائر کی آواز اور اس کے ساتھ ہی ٹائر پھٹنے اور کار رکنے کی آواز پہلے تو میں نے سوچا بھاگ لو پیارے لیکن پھر ایک جانی پہچانی آواز سن کر میں رک گیا میں نے مڑ کر دیکھا لیفٹیننٹ برنسٹائن ریوالور ہاتھ میں پکڑے کھڑا تھا اور اس کے دو نائبین کار کے اندر سے ایک شخص کو گھسیٹ کر نکال رہے تھے۔
تب میرا خوف کچھ کم ہوا اور میں تیز قدم اٹھاتا ہوا کار کے قریب پہنچ گیا جس شخص کو کار سے نکالا جا رہا تھا اس کی شکل مجھے جانی پہچانی معلوم ہوئی ذرا ذہن پر زور دیا تو یاد آیا اس کا نام آسٹن اینڈرسن تھا اور وہ ایک ناکام

رائٹر تھا مجھے یاد آیا کہ گزشتہ ایک سال کے دوران میں اس کی کم از کم ایک درجن کہانیاں واپس کر چکا تھا۔

"یہ رہا تمہارا دوست نقلی باربر۔" لیفٹیننٹ نے کہا۔

اتنے میں اس کے نائبین نے اینڈرسن کی تلاشی لی اور اس کے ہاتھوں میں آہنی کڑیاں ڈال دیں۔

"لیکن یہ تو آسٹن اینڈرسن ہے۔" میں نے کہا۔ "اسے تو میں اچھی طرح جانتا ہوں۔" پھر میں آسٹن سے مخاطب ہوا۔ "آسٹن یہ کیا چکر ہے؟"

"میرا نام آسٹن اینڈرسن نہیں، آسٹن باربر ہے۔" اس نے کہا۔ "اور میں باربر کے قلمی نام سے کہانیاں لکھتا ہوں۔"

"میں تمہارا مطلب نہیں سمجھا۔"

"مطلب سمجھنے کے لیے کسی انسائیکلو پیڈیا کی ضرورت نہیں ہے۔ میں نے تمہارے ساتھ جو معاہدہ کیا وہ اب بھی قائم ہے دو قسطیں تمہیں مل چکی ہیں باقی آٹھ قسطیں بھی مل جائیں گی۔"

میری آنکھیں حیرت سے پھیل گئیں میں نے کہا "تم نے ہمارے ساتھ فراڈ کیا ہے۔"

"نہیں میرے دوست فراڈ تم نے کیا ہے۔" اس نے کہا۔ "تم نے میرے ناول کو کسی دوسرے باربر کی طرف منسوب کر کے شائع کیا ہے جو سراسر فریب ہے میں نے کہیں یہ نہیں لکھا کہ یہ سچی کہانی ہے یعنی بقول شخصے اس کہانی کے واقعات، کردار اور مقامات سب فرضی ہیں کسی سے مطابقت محض اتفاقیہ ہوگی وغیرہ وغیرہ۔" پھر وہ لیفٹیننٹ کی طرف مڑا۔ "لیفٹیننٹ تم ایک امن پسند اور بے گناہ شہری کو گرفتار کر رہے ہو تمہیں یہ حرکت بہت مہنگی پڑے گی میرے پاس نہ تو کوئی ہتھیار ہے اور نہ ہی میں نے کوئی جرم کیا ہے۔ میں ایک رائٹر ہوں اور کافی عرصے سے کہانیاں لکھ رہا ہوں۔"

لیفٹیننٹ نے آنکھیں جھپکائیں اور میری طرف دیکھنے لگا۔

"کیا خیال ہے مسٹر سامر۔"

"میں کیا کہہ سکتا ہوں تم مجھ سے زیادہ قانون جانتے ہو۔"

"میں بتاتا ہوں کہ قانون کیا ہے۔" اینڈرسن ہتھکڑی کھڑکھڑاتا ہوا بولا۔ "میرے اور مسٹر سامر کے درمیان شریفانہ معاہدہ طے پا چکا ہے یہ میری ایک قسط بھی شائع کر چکے ہیں تاہم اگر انہیں معاہدے کے کسی پہلو پر کوئی اعتراض ہے تو عدالت کا دروازہ کھٹکھٹایا جا سکتا ہے لیکن یہ معاملہ کسی طور پر دست اندازی پولیس کے لائق نہیں۔ قانون کی زبان میں اسے دیوانی کیس کہا جاتا ہے۔ کیا میں غلط کہہ رہا ہوں لیفٹیننٹ؟"

"تم بالکل ٹھیک کہہ رہے ہو۔" لیفٹیننٹ نے کہا پھر اپنے نائبوں کی طرف دیکھتا بولا۔ "اس کی ہتھکڑی کھول دو خواہ مخواہ وقت ضائع ہوا۔"

"شکریہ لیفٹیننٹ۔" اینڈرسن نے کہا اور اپنی کلائیاں سہلانے لگا۔

"لل..... لیکن وہ ہمارے دس ہزار ڈالر۔"

"او کے مسٹر سامر۔" اینڈرسن مڑتا ہوا بولا۔ "باقی باتیں پھر ہوں گی تمہارے پاس میرا فون نمبر تو ضرور ہو گا آنے سے پہلے فون کر لینا اور مسٹر میکنمارا کو میرا اسلام کہنا۔"

لیفٹیننٹ برنسٹائن اپنے ساتھیوں کے ساتھ ایک طرف چل دیا، اینڈرسن دوسری طرف چل دیا اور میں احمقوں کی طرح کھڑا آنکھیں جھپکاتا رہ گیا میرے ایک ہاتھ میں بریک کیس اور دوسرے ہاتھ میں مسودہ تھا اب مجھے جیک میکنمارا کی یہ بات یاد آ رہی تھی کہ کبھی کسی نئے لکھنے والے سے تلخ بات نہ کرو۔

مار گزیدہ

اسد علی

لالچ انسان کو ذہنی طور پر مفلوج کر دیتی ہے اور اس حالت میں وہ ایک سانپ کی مانند ہو جاتا ہے' کسی کو بھی ڈس لیتا ہے۔دولت حاصل کرنے پر سانپ کو مارنے والے ایک شخص کا انجام۔

مراداں والی بستی میں آج پھر ایک شخص کی لاش ملی تھی جس کا سارا جسم نیلا ہو رہا تھا' اس شخص کے بارے میں بھی یہی خیال کیا گیا کہ اس کی موت بھی ایک نہایت زہریلے سانپ کے ڈسنے کی وہ سے ہوئی ہے۔

یہ ایک پُر سکون بستی تھی یہاں کے رہنے والے لوگ محبت کرنے والے اور ایک دوسرے کا خیال رکھنے والے' ان کے دکھ درد میں شریک ہونے والے تھے۔ اس بستی میں ایک درگاہ تھی جس کو مراداں والی سرکار کی درگاہ کہتے تھے اور اسی درگاہ کی نسبت سے اس بستی کا نام مراداں والی پڑ گیا تھا۔

پچھلے دو ماہ سے یہاں پہ اندوہناک سلسلہ چل پڑا تھا ہر ہفتے یہاں صبح ایک شخص کی لاش ملتی تھی جسے کسی زہریلے سانپ نے ڈسا ہوتا تھا۔

آج یہ آٹھواں شخص تھا جس کی موت ہوئی تھی مرنے والے سارے مرد ہی تھے ابھی تک کسی عورت کو سانپ نے نہیں ڈسا تھا۔ خیال یہ ظاہر کیا جا رہا تھا کہ مرد چوں کہ گھر سے زیادہ تر باہر نکلتے ہیں وہ بھی رات میں' اسی لیے ان کی اموات ہو رہی تھیں۔ زیادہ تر اموات بستی سے باہر کھیتوں کے بیچوں بیچ یا پھر ''کچی باؤلی'' (کنواں) کے پاس ہوتی تھیں۔

دن کے اجالے میں گاؤں کے جیالے ڈنڈے اور لاٹھیاں لے کر نکلے اور کھیتوں میں دور دور پھیل کر اسی موذی سانپ کو تلاش کرتے رہے لیکن انہیں بُری طرح ناکامی کا سامنا کرنا پڑا۔ وہ فکر مند اس لیے بھی تھے کہ اس گاؤں میں سانپ پہلے نہیں تھے اب نہ جانے کہاں سے آ گئے۔ تقریباً آٹھ ماہ قبل پہلی مرتبہ ایک واقعہ ہوا تھا جس میں مائی بخشاں اور اس کے بیٹے کو سانپ نے ڈس لیا تھا۔

گاؤں میں ہونے والا یہ واقعہ بھی بہت دردناک تھا' مائی بخشاں ایک بہت غریب اور مسکین عورت تھی' اس کا شوہر اس وقت اسے بھری دنیا میں تنہا چھوڑ گیا جب اس کا بیٹا شہباز صرف دو ماہ کا تھا۔

وہ اس وقت جوان تھی چاہتی تو دوسرا نکاح کر سکتی تھی لیکن اس نے اپنے بچے کے ساتھ زندگی گزارنے کا فیصلہ کیا' وہ اپنے بیٹے پر ایک محبت بھری نگاہ ڈال کر کہتی۔

''میرا شہباز پتر کوئی اتنا چھوٹا تھوڑی نہ رہے گا جب یہ جوان ہوگا تو اپنی بوڑھی ماں کی خوب خدمت کرے گا۔ میرا خیال رکھے گا پھر میں اس کو دُلہا بناؤں گی' اس کی بیوی گھر میں آئے گی تو پھر بچے بھی ہوں گے' میری ساری تنہائی دور ہو جائے گی' سارے دکھ دور ہو جائیں گے۔''

لیکن یہ مائی بخشاں کی قسمت کی خرابی ہی تھی کہ اس کا شہباز پُتر جوان ہو کر نکھٹو نکلا' وہ دن بھر پڑا چارپائی توڑتا رہتا یا پھر سارا دن اپنے آوارہ

دوستوں کے ساتھ ہاتھ میں غلیل لیے معصوم پرندوں کا شکار کیا کرتا۔

مائی بخشاں نے لوگوں سے مانگ مانگ کر اس کو روٹی کھلائی اور کپڑا پہنایا' کبھی مائی بخشاں لوگوں کے کام کر دیا کرتی' کسی کا اناج صاف کر دیتی' چکی سے آٹا پیس دیتی' کسی کے برتن تو کسی کے کپڑے دھو دیتی۔

محنت کر کر کے اس کی ہڈیاں گھس گئی تھیں لیکن شہباز نے اپنی ماں کی فکر نہ کی وہ بھی دن رات اسے کام کرنے کا کہتی تو وہ منہ بنا کر کہتا۔

''ماں مجھ سے کام نہیں ہوتا۔'' اور مائی بخشاں جو شہباز کے جوان ہونے پر اچھے دنوں کی آس لگائے بیٹھی تھی' ایک گہری اور ٹھنڈی سانس لے کر رونے بیٹھ جاتی۔ بیٹے کی اس بے حسی پر اس کا دل روتا تھا اب تو وہ شہباز سے عاجز آ چکی تھی اس نے اچھے دنوں کے خواب اپنی آنکھوں سے نوچ پھینکے تھے۔ کبھی کبھار گاؤں کا کوئی فرد اسے اس کی کہی ہوئی بات یاد دلاتا تو وہ غصے میں شہباز کو گالیاں دینے لگتی' کبھی کہتی۔

''باپ کے ساتھ خود بھی مر جاتا تو میں دوسرا مرد کر لیتی۔''

ایک رات مائی بخشاں سو رہی تھی گھر میں کھانے کے لیے کچھ بھی نہیں تھا اس لیے وہ بھوکی ہی سو گئی تھی البتہ شہباز اپنے دوستوں کے ساتھ کھا پی کے گھر آیا تھا اور آ کر سو گیا تھا۔ مائی بخشاں کی پیٹ میں بھوک کے مارے اینٹھن ہو رہی تھی اس لیے وہ بار بار کروٹیں بدل رہی تھی اس کی ابھی ذرا آنکھ ہی لگی تھی تب اس نے خواب میں دیکھا' کوئی شخص اسے بار بار ایک ہی بات کہہ رہا تھا۔

''مائی بخشاں اٹھ اور اپنے کمرے کا فرش اکھاڑ کے دیکھ' یہاں کتنا بڑا خزانہ چھپا ہوا ہے لیکن غور سے سن...... تجھے یہ سارا خزانہ صرف اسی صورت میں ملے گا جب تو اس کو بھینٹ دے گی' خزانے پر سانپ کا پہرا ہے اور سانپ خزانہ یوں ہی کسی کو نہیں دیا کرتا۔ تجھے اتنا بڑا خزانہ حاصل کرنے کے لیے دو پہلوٹی کے انسانوں کی بھینٹ دینی ہوگی' یاد رکھ اس میں ایک مرد دوسری عورت ہونی چاہیے۔ تو جس دن بھینٹ دے گی اسی دن زمین کی تہہ میں چھپا خزانہ ابل کر باہر نکل آئے گا' اس خزانے میں ہیرے جواہرات اور سونا ہے۔''

آواز اتنی بلند ہوگئی اور مائی بخشاں ہڑبڑا کر اٹھ کے بیٹھ گئی' وہ پوری پسینے پسینے ہو رہی تھی اس نے سوچا کہ یہ اس نے کیسا خواب دیکھا ہے کاش یہ سچ ہوتا ہے کہ اس کے گھر میں کوئی خزانہ ہوتا اور وہ اسے مل جاتا۔ فی الحال تو اسے ایک روٹی کی شدید ضرورت تھی' وہ بھوک سے بے تاب ہو کر اٹھ کھڑی ہوئی اس نے سوچا کہ باورچی خانے میں جا کر دیکھتی ہوں کہ ہوسکتا ہے کوئی سوکھا روٹی کا ٹکڑا پڑا ہو وہ اسے ہی پانی میں بھگو کر بھوک مٹا لے گی۔

وہ چارپائی سے اترنے لگی اس نے جیسے ہی صحن کے چکنے فرش پر پاؤں رکھے اس کے پیروں نے زمین میں تھرتھراہٹ محسوس کی پھر اندر سے چھن چھن چھن کی آوازیں آنے لگیں' جیسے لوہے یا پیتل کے برتن میں بہت سارے سکے ہوں پھر زمین میں ہلکی سی گڑگڑاہٹ محسوس ہوئی' اس نے گھبرا کر پاؤں واپس چارپائی پر رکھ دیئے۔ وہ تھر تھر کانپ رہی تھی اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا کہ یہ سب کیا ہے۔ اس نے سوچا کہ کیا واقعی اس کے گھر کی زمین کے نیچے خزانہ دفن ہے' کہتے ہیں خزانہ زمین کے اندر چلتا ہے اپنی جگہ بدلتا ہے۔

بقیہ رات اس نے جاگ کر گزاری' سارا دن اس کی عجیب سی کیفیت رہی۔ صبح ہی صبح وہ زمیندار

نورالہی کے گھر پہنچ گئی اس کے گھر والی پہلے بھی کئی مرتبہ ایسے موقعوں پراس کی مدد کر چکی تھی۔

ناشتا کرنے کے بعد مائی بخشاں اس کے برتن دھونے بیٹھ گئی' برتن دھونے کے ساتھ ساتھ اس کے دماغ میں رات کو دیکھا جانے والا خواب اور زمین کے اندر سے آنے والی آوازیں گونجتی رہیں۔ وہ سوچنے لگی کہ وہ اس بات کا ذکر زمیندارنی سے کرے یا نہ کرے پھراس کے دماغ نے سرزش کی کہ پاگل نہ بن بخشاں ایسی باتیں کسی کو بتانے والی تھوڑی ہوتی ہیں پھر بھی اس نے فیصلہ کیا کہ وہ اپنی معلومات. کے لیے زمیندارنی سے اپنا حوالہ دیئے بغیر بات پوچھے گی' کام سے فارغ ہوکر وہ آئی تو زمیندارنی نے خود ہی اسے بلایا اور کہا۔

''ذرا میرے سر میں تیل ڈال کر مالش تو کردے۔'' بخشاں نے زمیندارنی کے سر میں تیل کی مالش کرتے ہوئے سوال کیا۔

''زمیندارنی جی کیا یہ سچ ہے کہ زمین کے اندر خزانہ ہوتا ہے اور وہ باہر آنے کے لیے بھینٹ مانگتا ہے؟''

''آہو نی..... ایسا ہوتا ہے ہم تو پرکھوں اور سے آئے ہیں کہ زمین میں مایا ہوتی ہے' سونے اور ہیرے جواہرات سے بھری دیگیں زمین کے اندر لڑھک لڑھک کر اپنی جگہ بدلتی رہتی ہیں۔ اگر کوئی وہ مایا زمین سے نہ نکالے تو مایا چلی جاتی ہے لیکن جانے سے پہلے وہ بھینٹ لیتی ہے مگر تو یہ سب کیوں پوچھ رہی ہے؟ مجھے تو یہ سوچ کر ہی بہت ڈر لگتا ہے۔'' زمیندارنی نے ایک جھرجھری لیتے ہوئے کہا۔

اور پھر گاؤں والوں نے دیکھا کہ مائی بخشاں اپنے بیٹے کی شادی کررہی ہے سب لوگوں نے بخشاں کی مدد کی۔ زمیندار نے بخشاں کی جانب سے گاؤں والوں کا کھانا کیا' شادی والے دن بخشاں کی خوشی دیکھنے کے لائق تھی۔ دلہن کو رخصت کروا کر لوگ بخشاں کے گھر چھوڑ کر اپنے اپنے گھروں کو لوٹ گئے' بخشاں نے ایک بڑے پیالے میں دودھ بھر کر کمرے میں رکھ دیا' اپنے بیٹے کو اندر بھیج کر خود باہر صحن میں بچھی چارپائی پر لیٹ گئی وہ بہت خوش تھی۔

لیکن اگلی صبح جب دلہن کے گھر دلہن کا ناشتا لے کر بخشاں کے گھر پہنچے تو وہاں عجیب ہی منظر دکھائی دیا' گھر کا دروازہ بخشاں کی بہو راحیلہ نے کھولا اس کی بہت بُری حالت تھی' دوپٹے سے بے نیاز سر کے بال بکھرے ہوئے اور آنکھیں رو رو کر سرخ ہورہی تھیں۔

اس نے روتے ہوئے بتایا کہ رات کو نہ جانے کس پہر ان کے کمرے میں ایک سانپ آ گیا اور اس نے اس کے شوہر کو ڈس لیا' شہباز کو پانی مانگنے کی بھی مہلت نہ مل سکی۔ وہ تیزی سے کمرے کا دروازہ کھول کر اندر گئی تو اس نے دیکھا کہ اس کی ساس بخشاں بھی اپنی چارپائی پر مردہ پڑی ہے اور اس کا جسم بھی شہباز کی طرح نیلا ہورہا ہے۔

گھر کا ہر فرد مائی بخشاں کے گھر موجود تھا' ہر عورت بخشاں کی بہو راحیلہ کو سینے سے لگا لگا کر رو رہی تھی۔ راحیلہ کے گھر والوں نے راحیلہ کو اپنے ساتھ گھر لے جانا چاہا لیکن اس نے جانے سے صاف انکار کردیا کہ میں اس گھر میں دلہن بن کر آئی تھی اب میرا جنازہ بھی اس گھر سے اٹھے گا۔ اس درد ناک واقعے کے چھ ماہ کے بعد گاؤں میں ایک بار پھر سانپ کے ڈسنے سے اموات ہونے لگی تھیں۔

لوگ جوق در جوق مراداں والی سرکار کے مزار پر حاضری دے رہے تھے' دعائیں مانگ رہے تھے' چادریں اور دیگیں چڑھا رہے تھے سب ہی اپنے گھر

والوں اور اپنی خیریت کی دعائیں اور منتیں مانگ رہے تھے۔

ہر ایک کا یہی کہنا تھا کہ اس گاؤں میں کوئی بلا نازل ہوگئی ہے جو یہاں کے جوانوں کو موت کے گھاٹ اتار رہی ہے۔ مرنے والے آٹھوں افراد نوجوان تھے سب سے آخری موت تو پہلوان وسیم کی ہوئی تھی جو اکھاڑے کا بے تاج بادشاہ مانا جاتا تھا۔

راحیلہ بھی گاؤں والوں کے اس درد میں برابر کی شریک تھی وہ وسیم کی ماں کے گلے لگ کر دیر تک روتی رہی۔ وہ جتنی حسین تھی اتنی ہی اچھے اخلاق کی مالک تھی گھر کے باہر بستی کے مرد اکٹھے تھے تھوڑی ہی دیر میں جنازہ اٹھنے والا تھا پھر مرد اندر آنے لگے عورتوں نے ایک طرف ہٹ کر مردوں کو اندر آنے کا راستہ دے دیا یہیں پر راحیلہ بھی کھڑی تھی۔

اندر آنے والے مردوں میں اسی محلے کا ایک جوان اور وجیہہ لڑکا غیور بھی تھا راحیلہ کی نگاہیں جیسے اس پر ٹک کر رہ گئیں وہ سر جھکائے کھڑا تھا تب ہی اسے اپنے چہرے پر کسی کی نظروں کی تپش کا غیر معمولی احساس ہوا اس نے بے ساختہ اپنا چہرہ اوپر اٹھایا اور ان نگاہوں کی جانب دیکھا جن کی تپش اسے اپنے جسم کے پار محسوس ہو رہی تھی۔

وہ پُرتپش نگاہیں راحیلہ کی تھیں غیور کی نگاہیں راحیلہ کی جانب اٹھیں تو اٹھی کی اٹھی رہ گئیں۔ راحیلہ کی آنکھیں اور لب مسکرا رہے تھے یہ کیفیت چند لمحوں کی تھی راحیلہ نے اپنی نگاہیں دوسری جانب پھیر لیں اور چہرے کو غمگین بنا دیا۔

دو دن کے بعد سوئم تھا راحیلہ سوئم میں شرکت کے لیے میت والے گھر میں گئی لیکن وہ صحن کی جانب نکل گئی جہاں سوئم میں آنے والوں کے لیے کھانے کا انتظام کیا جا رہا تھا اندر کمروں میں قرآن خوانی ہو رہی تھی وہ وہاں نہ گئی تھوڑا سا کام میں ہاتھ بٹایا پھر اِدھر اُدھر ٹہلنے لگی ایسا محسوس ہو رہا تھا جیسے اسے کسی کا انتظار ہو۔

باہر مردوں میں غیور بیٹھا تھا اچانک ہی اسے اپنے جسم میں غیر معمولی تپش کا احساس ہوا وہ بے چین ہو کر کھڑا ہوا اور اس کے قدم خود بخود گھر کے اندر کی جانب بڑھ گئے اسے خود نہیں پتا تھا کہ وہ اس بے چینی میں گھر کے اندر کیوں جا رہا ہے جیسے وہ صحن میں پہنچا اس کی نگاہ سامنے کھڑی راحیلہ پر پڑی تو وہ وہیں کھڑا کا کھڑا رہ گیا۔ راحیلہ اور وہ ایک دوسرے کو ٹکٹکی باندھے دیکھ رہے تھے راحیلہ کی آنکھوں میں کچھ ایسی مقناطیسی کشش اور سحر تھا کہ وہ اس کی نگاہوں سے اپنی نظر ہٹا نہیں پا رہا تھا تب ہی راحیلہ کے لب مسکرانے لگے اس نے ہلکے سے اشارے سے غیور کو اپنے قریب بلایا تو وہ سحر زدہ سا آگے بڑھ گیا۔ راحیلہ نے مسکرا کر مترنم لہجے میں پوچھا۔

"کسی کام سے آئے ہو؟"

"نن...... نہیں...... پتا نہیں؟" غیور نے گڑبڑا کر جواب دیا۔

"تم مجھے دیکھنے کے لیے آئے تھے ناں......" اس نے سرگوشی میں سرسراتے ہوئے لہجے میں پوچھا تو غیور نے ہاں میں سر ہلا دیا۔

"شام کو پلیہ والے کھیتوں میں ملنا میں تمہارا انتظار کروں گی۔" راحیلہ نے سرگوشی میں کہا اور تیزی سے وہاں سے ہٹ گئی اور غیور سر ہلاتا ہوا باہر آ گیا۔

دوپہر سے شام تک کا وقت غیور سے گزارنا مشکل ہو گیا اس کا شدت سے دل چاہ رہا تھا کہ کب دن ڈھلنا شروع ہو اور کب وہ اس حسین نازنین سے ملنے کھیتوں میں جائے۔

یہاں سے فارغ ہوتے ہی راحیلہ اپنے گھر پہنچی

اور کمرے میں بچھی چارپائی پر لیٹ گئی جہاں سرخ رنگ کا ریشمی بستر بچھا تھا' نرم ریشمی تکیے تھے' سارے کمرے میں ایک مہک پھیلی ہوئی تھی۔ سامنے چھت سے دو سیاہ ناگ لٹکے ہوئے تھے' راحیلہ نے انہیں اشارہ کیا تو وہ نیچے اتر آئے اور پھر دیکھتے ہی دیکھتے وہ ناگ ایک مرد اور ایک عورت کی شکل میں آ گئے' راحیلہ نے کسی ملکہ کے لہجے میں رعب اور دبدبے والے لہجے میں انہیں مخاطب کیا اور بولی۔

''شام کو میری ملاقات ہے اس کے لیے انتظامات کیے جائیں۔''

مرد یہ حکم سنتے ہی گھر سے باہر چلا گیا اور عورت راحیلہ کے قریب آ گئی' اب اس کے ہاتھوں میں ایک تھالی تھی جس میں مختلف قسم کی چیزیں اور خوشبو جات تھیں' اس نے راحیلہ کو بے لباس کیا اور اس کے جسم پر مالش کرنے لگی ذرا ہی دیر میں کمرا خوشبو سے مہکنے لگا۔ مالش سے راحیلہ کا جسم مکھن ملائی کی طرح ہو گیا اور اسکن دمکنے لگی اس نے راحیلہ کا بناؤ سنگھار کیا۔

''ایسا کوئی مرد ابھی تک کسی ماں نے نہیں جنا جو آپ کے حسن کو نظر انداز کر سکے' آپ کی تو ایک نگاہ ہی ان مردوں کو پگھلا کر ڈھیر کر دیتی ہے۔'' اس عورت نے حسن و جمال کی پیکر راحیلہ کی جانب دیکھتے ہوئے کہا تو احساس تفاخر سے راحیلہ کے لب مسکرانے لگے۔

اچانک ہی دروازے پر دستخط ہوئی راحیلہ کی آنکھوں سے تیز روشنی کی شعاعیں نکلیں اور دروازے کے پار چلی گئیں' لمحے بھر بعد ہی اس کے چہرے پر ناگواری کے تاثرات ابھر آئے' اس نے منہ بنا کر کہا۔

''اس پڑوسن کا بھی مجھے انتظام کرنا پڑے گا' میرا جینا حرام کر رکھا ہے آئی بڑی میری سہیلی بن کر.....''

اس نے اپنے قریب کھڑی لڑکی کو ہاتھ کا اشارہ کیا وہ لمحہ بھر میں غائب ہو گئی' اس کے ساتھ ہی سب کچھ بدل گیا۔ راحیلہ کے کمرے کا نقشہ خود راحیلہ کا حلیہ.....وہ کمرا گھر کے مکیں کی خستہ حالی منہ سے بول رہا تھا اور راحیلہ پھر سے وہی معصوم اور سیدھی سادی شہباز کی بیوہ دکھائی دینے لگی جس کے دلکش چہرے پر ہر وقت حزن و ملال چھایا رہتا تھا۔

راحیلہ نے جا کر دروازہ کھولا تو جواں سالہ روزینہ دروازے پر کھڑی تھی' اس کے ہاتھ میں ڈھکی ہوئی پلیٹ تھی جسے وہ راحیلہ کی جانب بڑھاتے ہوئے بولی۔

''میں تیرے لیے زردہ لائی تھی' پتا ہے آج میں بہت خوش ہوں میرے انور نے آج کلام پاک حفظ کیا ہے' اسی خوشی میں میں نے زردہ پکا کر محلے میں بانٹا ہے۔''

''اندر آ جا.....ادھر رکھ دے یہ پلیٹ۔'' راحیلہ نے بےزار کن لہجے میں کہا۔

''تجھے خوشی نہیں ہوئی میرے انور کے کلام پاک حفظ کرنے کی۔'' روزینہ نے دکھ بھرے لہجے میں حیرت سے کہا پھر خود ہی بولی۔ ''تیری کوئی اولاد نہیں ہے ناں اس لیے تجھے اولاد سے ملنے والی خوشی کا کیا پتا ہوگا۔''

یہ سنتے ہی راحیلہ کا چہرہ دھواں دھواں ہو گیا' اس کی آنکھیں بھر آئیں اور وہ گلوگیر لہجے میں بولی۔

''اولاد ہونا تو دور کی بات ہے مجھے تو سہاگ رات بھی نصیب نہیں ہوئی' اوپر سے تُو میرے زخموں پر نمک چھڑکنے کے لیے آ گئی۔''

''مجھے معاف کر دے راحیلہ! مجھے ایسا نہیں کہنا چاہیے تھا' میں نے تیرا دل دکھایا ہے تُو مجھے معاف کر دے۔'' روزینہ نے خفت آمیز لہجے میں راحیلہ

کو جھٹ گلے سے لگاتے ہوئے کہا۔
راحیلہ کی آنکھوں سے چنگاریاں نکل رہی تھیں' اسے بہت کچھ یاد آنے لگا۔ اس کا جسم آگ کی مانند ہو گیا اس کے جسم میں تپش کو روزینہ نے محسوس کیا اور اس سے تیزی سے الگ ہو کر بولی۔
''نی تیرا پنڈا تو آگ ہو رہا ہے تُو آرام کر رات کا کھانا مت بنانا' میں انور کے ہاتھ بھیج دوں گی۔''
''نہیں۔'' راحیلہ نے تیزی سے کہا۔''تو انور کے ہاتھ کھانا نہ بھیجنا' میرے سر میں درد ہے کچھ کھانے کو دل نہیں کر رہا میں سونے جا رہی ہوں اٹھوں گی تو ٹھیک ہو جاؤں گی۔'' راحیلہ نہیں چاہتی تھی کہ حافظ قرآن انور اس کے اس گھر کی چار دیواری میں قدم بھی رکھے۔
''چل ٹھیک ہے جیسی تیری مرضی' تُو آرام کر لیکن ہاں ایک بات سچ سچ بتا کیا تیرا جی نہیں چاہتا کہ تیرا بھی ایک پیار کرنے والا شوہر ہو' تیرے بھی بچے ہوں تُو دوسری شادی کیوں نہیں کر لیتی' کیسی اجاڑ زندگی گزار رہی ہے۔'' روزینہ نے کہا۔
''دیکھ میں پہلے بھی کئی مرتبہ کہہ چکی ہوں مجھ سے دوسری شادی کی بات نہ کیا کر ورنہ میری اور تیری لڑائی ہو جائے گی۔'' راحیلہ نے غصے میں جواب دیا۔
''کیا تجھے شہباز سے اتنی محبت تھی۔'' روزینہ نے آنکھیں پھیلاتے ہوئے حیرانی سے پوچھا۔
''مجھے اپنے شوہر سے محبت نہیں عشق تھا'' راحیلہ نے کھوئے کھوئے لہجے میں کہا۔
''ایک ہی رات میں......؟'' اس نے پہلے سے زیادہ حیرانی سے پوچھا۔
''ایک رات کا نہیں' ہمارا صدیوں پرانا ساتھ تھا' ہم تو جنم جنم کے ساتھی تھے لیکن اس ظالم نے اسے مار ڈالا۔'' راحیلہ کی حسین آنکھوں سے آنسوؤں کا سیلاب بہہ نکلا۔
''کس نے......؟'' روزینہ کے منہ سے بے ساختہ نکلا۔
''اسی نے......''
''کس......''
''وہ سا...... سانپ نے...... اور کس نے...... اچھا تُو اب جا' میرا سر نہ کھا۔'' راحیلہ نے ایک دم جیسے ہوش میں آتے ہوئے کہا تو روزینہ حیرتوں کے سمندر میں غوطے کھاتی وہاں سے چلی گئی۔
اور راحیلہ دوبارہ اپنے کمرے میں لوٹ آئی' اس کا کمرا اپنی پہلے والی حالت میں آ چکا تھا' وہ ریشمی اور نرم و ملائم بستر...... اور وہی حسن کے تمام جاں لیوا ہتھیاروں سے لیس راحیلہ۔ وہ بستر پر جیسے گر گئی اس کی آنکھوں سے آنسو پانی کی طرح بہہ رہے تھے' اسے وہ بہت شدت سے یاد آ رہا تھا۔
خوب رونے کے بعد اس کی آنکھوں میں ڈھیروں وحشت اتر آئی' حسین آنکھیں خون برسانے لگیں اس نے خونخوار لہجے میں سنتاتے ہوئے لہجے میں کہا۔
''میں اس بستی کے تمام جوانوں کو اسی طرح تڑپا تڑپا کے ماروں گی جس طرح انہوں نے میرے پیارے کو مارا تھا۔'' اور سارے کمرے میں سرسراہٹیں سی گونجنے لگیں' جیسے یہاں ڈھیروں سانپ سرسراتے پھر رہے ہوں اور ان کی سرخ زبانیں لپلپاتے ہوئے کسی جوان کا خون چاٹنے کو بے تاب ہوں۔
وہ آرام سے تکیے پر سر رکھ کر لیٹ گئی اسے وہ دردناک واقعہ یاد آنے لگا۔

❀......❀......❀

وہ کتنی پرسکون زندگی اپنے شوہر کے ساتھ گزار

رہی تھی جب اسے شاہ نے حکم دیا کہ تم دونوں کو اس عظیم خزانے کی حفاظت کرنی ہے جب اس کا ٹائم پورا ہوجائے گا تو اسے دنیا کے حوالے کردینا اور واپس لوٹ آنا لیکن یاد رہے کہ اس کی پوری پوری قیمت لینی ہے' دو نوجوان اور کنوارے جسموں کی......ایک مرد اور ایک عورت......

وہ دونوں ''شاہ'' کے ایک حکم سے خوش نہیں تھے لیکن انہیں شاہ کے آگے انکار کی جرأت نہیں تھی کیوں کہ شاہ ان کا سردار تھا' بادشاہوں کا یہ خزانہ جو زمین میں دفن کیا جاتا ہے شاہ کو اس کی حفاظت کی ذمہ داری دے دی جاتی تھی اور شاہ جس کسی کو چاہتا اس خزانے کی حفاظت کی ذمہ داری سونپ دیتا تھا۔

وہ خزانہ جس کو صدیاں گزر چکی تھیں' انتظار کی جاں لیوا گھڑیاں ختم ہوتیں اور اس کو دنیا میں بھیجنے کا وقت آن پہنچا۔

یہاں اس کے ساتھ سو کے قریب اور محافظیں تھے ان میں سے ایک محافظ نے اطلاع دی کہ زمین کے اوپر جہاں تہہ در تہہ خزانہ موجود تھا ایک بیوہ اور غریب بڑھیا رہتی ہے' جس کا ایک ہی نالائق بیٹا ہے کیوں نہ خزانہ اس بڑھیا کے حوالے کردیں۔

''لیکن اس سے پہلے اس بڑھیا سے خزانے کی قیمت (بھینٹ) بھی تو لینی ہے پہلے اس کو تیار کیا جائے گا اگر وہ راضی ہوئی تو ہم اس قید سے آزاد ہوسکیں گے ورنہ آگے بڑھ جائیں گے۔'' دوسرے محافظ نے کہا۔

''پھر ٹھیک ہے تم ہی اس بڑھیا سے بات کرو۔''

یہ ذمہ داری اس کو سونپی گئی اور اس رات اس محافظ نے بڑھیا کو مخاطب کرکے خزانہ حاصل کرنے کی خبر سنائی جب وہ بھوک سے بے تاب اپنی چارپائی پر کروٹیں بدل رہی تھی۔

عجیب مبارکباد

ہم یتیم تھے نانانانی کے پاس رہتے تھے اور تمام پڑھائی وغیرہ بڑے گاؤں کی اس حویلی میں ہی ہوئی تھی یہ پرانی حویلی تھی اور غیر مسلم ہی چھوڑ کر انڈیا چلے گئے تھے اور بعد میں ہمارے نانا کے نام کردی گئی جب یہ ہجرت کرکے آئے۔ میں بچپن اور جوانی تک حویلی میں رہا۔ سنا تھا کہ حویلی کی تیسری منزل کے کمرے ٹھیک نہیں ہیں ہم جاتے تھے گرمیوں میں ان کے سامنے کے صحن میں سوتے تھے عجیب وغریب آوازیں، گانے، ڈھول بجنے کی آواز، نانا بتاتے تھے کہ یہ اچھے لوگ ہیں تنگ نہ کرو، یہ بھی تنگ نہیں کریں گے۔

میں چونکہ رات کے وقت حویلی کے بڑے دروازے سے باہر نکل کر دوستوں کے ساتھ گپ شپ لگانے چلا جایا کرتا تھا اور اکثر رات کو بارہ، ایک بجے تک واپسی ہوتی تھی۔ گھر والے کبھی کبھی غلطی سے کنڈی وغیرہ لگادیا کرتے تھے اکثر یہ ہوا کہ میں ایک بجے آیا اور دروازے کو ذرا زور لگایا تو فوراً کھل گیا۔ صبح کے وقت نانی کبھی کبھی پوچھ لیا کرتی تھی کہ میرے لیے کس نے بڑا دروازہ کھولا تھا سب کا جواب نفی میں ہوتا تھا اور میں حیران رہ جاتا تھا۔ خیر اسی طرح چھوٹی موٹی بے شمار باتیں ہوا کرتی تھیں چونکہ ہم عادی تھے اور نڈر بھی بے حد، اب دلچسپ واقعہ سنیں۔ میری شادی اس حویلی میں ہوئی۔ برأت لے کر ہم لوگ گیارہ بجے رات لاہور سے پہنچے تھے۔ پھر دنیا جہان کی رسمیں پوری کرتے کرتے بجے سجائے کمرے میں تقریباً ڈیڑھ بجے آئے یاد رہے کہ حجلہ عروسی تیسری منزل پر وہی سحر زدہ کمرہ ہی تھا ہم ٹھہرے نڈر، ہر طرف سے سکون ہوا اور میں نے کمرے کی اندر سے کنڈی لگالی۔ جیسے دروازہ سے بیڈ کی طرف بڑھا تو دیکھتا ہوں کہ ایک سائڈ پر گندم اور چاول کی بوریاں تھیں۔ ان کے پیچھے سے دو دو فٹ کے بونے میری طرف قطار در قطار بڑھتے آرہے ہیں اور باقاعدہ مبارکباد دیتے ہیں اور ہاتھ بھی ملاتے جاتے ہیں۔ پہلے تو گھبرایا مگر بے ضرر تھے۔ ان کی قطاریں ڈھائی بجے جاکر ختم ہوئیں اور آخر میں بزرگ تشریف لائے ہاتھ ملایا مبارکباد دی اور دعائیں دیتے ہوئے غائب ہوگئے۔ ولیمہ کی صبح جب میں نے اپنی بیگم سے اس کا ذکر کیا تو بے حد خوفزدہ ہوگئیں اور پھر اس کمرے میں ہم نہ سوئے۔ اب بھی یہ واقعہ فلم کی طرح یاد آتا رہتا ہے۔

جاوید احمد صدیقی......راولپنڈی

اور پھر اسی طرح روزانہ ہونے لگا اس خزانہ کے محافظ نے بار بار خزانے کا لالچ دے کر بالآخر اس بڑھیا سے ایک بھیانک فیصلہ کروالیا۔

وہ بڑھیا جو اپنے لالچ کے سبب ماری گئی وہ بخشاں تھی؛ بخشاں کا نکھٹو بیٹا دن رات چارپائی پر پڑا رہتا یا اپنے آوارہ دوستوں کے ساتھ آوارہ گردی کرتا۔ اس نے ایک دن بھی دکھوں کی ماری اپنی ماں کے بارے میں نہیں سوچا اسے کبھی ماں کے سکھ کا خیال نہیں آیا اسی نے ایک روپیہ بھی کما کر اپنی ماں کو نہیں دیا۔

تھک کر بخشاں نے سوچا کہ یہ میرا بیٹا جس کی محبت اور چاہت میں میں نے اپنی جوانی مٹا دی کہ کہیں سوتیلا باپ میرے بچے پر ظلم و ستم نہ کرے اسے ایک آس ایک امید تھی کہ ایک دن یہی بیٹا جوان ہو کر اس پر ناز کرے گا اور فخر سے لوگوں کو بتائے گا کہ دنیا والوں اسے دیکھو یہ ہے میری عظیم ماں جس نے میری خاطر اپنی دنیا تباہ کر دی۔

ایسی اولاد سے تو اللہ مجھے بے اولاد رکھتا' اس نے جل کر سوچا وہ دن رات اپنے خواب کے بارے میں سوچتی رہتی۔ اسے ایک بات کی پریشانی تھی اور وہ یہ کہ خزانے کے مالک نے دو جوان اور کنوارے لڑکے اور لڑکی کی قربانی مانگی ہے لیکن اس کے ساتھ ایک اور شرط رکھی ہے اور وہ یہ کہ دو پہلوٹی کی اولاد ہوں۔

مرد جو جوان اور کنوارہ ہے اور پہلوٹی کی اولاد بھی تو اس کا شہباز ہے لیکن ایک جوان اور کنواری لڑکی جو پہلوٹی کی ہو اسے کہاں سے لاؤں۔

اس نے اپنی ممتا پر پتھر کی سل رکھلی تھی اس نے سوچا کہ شہباز تو سات جنم تک اسے اتنا کما کر نہیں دے سکتا' جتنا اس کے دنیا سے چلے جانے کے بعد مال و دولت اسے ملے گی' وہ بھی اچھی اور شاہانہ زندگی بسر کر سکے گی۔

سوچتے سوچتے اس کا دماغ شل ہونے لگا آخر اسے ایسا خیال آیا کہ وہ حقیقتاً خوشی سے ناچ اٹھی۔ اسے ایک جوان کنواری اور پہلوٹی کی لڑکی مل گئی تھی اس کے مرحوم بھائی کی بیٹی راحیلہ......

راحیلہ بن باپ کی لڑکی تھی اور وہ بھی شہباز ہی کی طرح پہلوٹی کی تھی اس نے سوچا کہ وہ راحیلہ کا رشتہ اپنے شہباز کے ساتھ کر دیتی ہے۔ بھابی پر زور دے گی کہ ہم دونوں ہی غریب ہیں نہ تو جہیز بنا سکتی ہے اور نہ بری...... تو کیا ہی اچھا ہو کہ ہم ان دونوں کا نکاح کر دیتے ہیں اور میں راحیلہ کو رخصت کر کے اپنے گھر لے جاؤں گی۔ تیرا بوجھ بھی ہلکا ہو جائے گا اور میرے شہباز کا گھر بھی بس جائے گا۔

بخشاں کی بھابی خوشی خوشی مان گئی' وہ تو ایسا دل سے چاہ رہی تھی بخشاں نے جب بستی میں بتایا کہ وہ شہباز کی شادی کر رہی ہے لیکن اس کے پہلے ایک پھوٹی کوڑی بھی نہیں تو بستی کے سارے لوگ اس کی مدد کے لیے تیار ہو گئے۔

بری کا سرخ جوڑا تو زمیندارنی نے دیا' دو تین جوڑے اور دوسرے لوگوں نے دیئے' کھانے کا انتظام بھی ہو گیا۔

بخشاں کے چہرے کی خوشی دیدنی تھی' اسے خوش دیکھ کر بستی والے بھی خوش ہو رہے تھے اس لیے کہ انہوں نے بخشاں کو ہمیشہ دکھوں کی چکی میں پستے ہوئے دیکھا اور ویسے بھی وہ ایک نہایت شریف اور باکردار عورت تھی۔

اس روز خواب میں بخشاں نے کہہ دیا کہ اس نے بھینٹ کی تیاری کر لی ہے' کل کی رات بھینٹ تیار ملے گی' لڑکا اور لڑکی اس کمرے میں ہوں گی' تم انہیں لے جانا اور خزانہ دے جانا۔

دلہن کو رخصت کروا کر بخشاں نے اسے اندر کمرے میں بٹھادیا تھوڑی دیر کے بعد اپنے بیٹے کو بھی اندر بھیج دیا۔ ایسا کرتے وقت اس کا دل کانپ ضرور رہا تھا لیکن پھر ڈھیر ساری دولت کا لالچ بیٹے کی محبت پر غالب آ گیا۔ وہ پاؤں پسارے صحن میں چارپائی پر لیٹی تھی، نیند اس کی آنکھوں سے کوسوں دور تھی، اس کی آنکھوں میں ڈھیروں خواب تھے وہ کان سکوں کی کھن گرج کی آوازوں کے منتظر تھے۔

اچانک ہی اسے اپنے قریب سرسراہٹیں سنائی دیں وہ چونک کر تیزی سے اٹھ کر بیٹھ گئی اب جو سامنے اس کی نگاہ پڑی اس کی گھگھی بندگی۔ ایک دو میٹر لمبا سیاہ ناگ اپنا چوڑا سا پھن پھیلائے اس کے قریب موجودہ تھا۔ سیاہ ناگ نے اپنی سرخ دوشاخہ زبان باہر نکالی پھر ایک زور کی پھنکار ماری۔ بخشاں زرد پتے کی مانند کانپنے لگی، کالے ناگ کے منہ سے ایک سیٹی کی سی آواز آئی اور اس نے اپنا پھن زور سے بخشاں کی چارپائی کی پٹی پر مارا اور اپنی رعب دار آواز میں بولا۔

”بڑھیا تو نے ہمارے ساتھ دھوک کیا ہے، لڑکی پہلوٹی کی نہیں ہے۔ اس کی ماں کی کوکھ سے ایک کچا بچہ ضائع ہوگیا تھا اب چوں کہ تو ہمارا راز جان چکی ہے اس لیے تیری جان بخشی نہیں جاسکتی ہے۔“

”نن...... نہیں...... مجھ...... مجھے معاف کردو...... مم...... مجھ...... مجھے یہ...... با...... بات...... نہ...... نہیں...... ما...... معلوم...... تھی......“

بخشاں کے جسم سے پسینہ دھاروں کی صورت بہہ رہا تھا اور خوف اور دہشت کی وجہ سے اس کے منہ سے الفاظ ہی نہیں نکل رہے تھے۔ باقی الفاظ اس کے منہ میں ہی رہ گئے اور سانپ نے اچھل کر بخشاں کی پیشانی کے بیچوں بیچ ڈنک مارا۔

بخشاں کے منہ سے آہ یا چیخ بھی نہ نکل سکی اور وہ وہیں ڈھیر ہوگئی۔ دیکھتے ہی دیکھتے اس کا جسم نیلا ہوگیا اور منہ سے سفید جھاگ نکلنے لگے۔

اندر کمرے میں شہباز نے اپنی دلہن کا گھونگھٹ اٹھایا ہی تھا وہ اس کی دل بھر کر تعریف بھی نہ کرسکا تھا کہ کمرے میں ایک تیز پھنکار کی آواز سنائی دی۔ پیار بھری باتوں میں مصروف نوبیاہتا اس جوڑے نے اس آواز پر چونک کر دیکھا تو ان کے بھی ہوش اڑ گئے۔

ایک بہت بڑا کالا ناگ اس کے کمرے کے اندر داخل ہوکر ان کی چارپائی کے گرد تیزی سے چکر کاٹ رہا ہے۔ شہباز کی نگاہ کمرے کے کونے پر رکھی لاٹھی پر پڑی، اس نے تیزی سے بھاگ کر لاٹھی ہاتھ میں اٹھالی اور کالے ناگ کے قریب آنے پر اس کے سر کا نشانہ لے کر لاٹھی اس کے سر پر زور سے ماری۔ شہباز کا نشانہ بہت اچھا تھا بلکہ غلیل سے نشانہ تو اس کا محبوب مشغلہ تھا۔ کالا ناگ سر کی چوٹ برداشت نہ کرسکا اور بُری طرح بل کھانے لگا وہ زمین پر پڑا تڑپ رہا تھا۔ شہباز مسلسل اس پر لاٹھی برسا رہا تھا پھر اس نے حیرت انگیز منظر دیکھا کہ کالے ناگ کے منہ سے عجیب سی آوازیں نکل رہی تھیں، وہ بُری طرح تڑپ رہا تھا اور شہباز اس کے قریب کھڑا یہ عجیب و غریب آوازیں سن رہا تھا اس نے کبھی کسی سانپ کے منہ سے ایسی آوازیں نہیں سنی تھیں۔

اور پھر جیسے اس کمرے میں ایک بھونچال سا آ گیا، کچے کمرے کے ایک کونے میں ایک بل تھا اور اس میں سے ایسا ہی ایک اور سیاہ ناگ برآمد ہوا۔ وہ ناگ نہیں ناگن تھی، اس مرنے والے ناگ کی ناگن، وہ تیزی سے رینگتی ہوئی مرتے ہوئے ناگ کے قریب پہنچی جیسے ہی وہ ناگ کے قریب آئی ناگ کا تڑپنا ختم ہوگیا اور آوزیں آنا بھی بند ہوگئیں۔

ناگن غصے میں بل کھا کر شہباز کی جانب پلٹی' وہ ڈیڑھ فٹ اونچی ہوکر اپنا پھن پھیلائے شہباز کے سامنے تن گئی۔ شہباز ڈر کے چند قدم پیچھے ہٹا لیکن یہ دیکھ کر اس کے اوسان مزید خطا ہوگئے کہ اس بل میں سے ایک کے بعد ایک سانپ باہر آرہا ہے۔

اب سارے سانپوں نے شہباز کے گرد گھیرا ڈال دیا' سب سانپوں کی گول گول آنکھیں شہباز کے اوپر جمی ہوئی تھیں لیکن ناگن کی آنکھوں سے شعلے نکل رہے تھے۔ اچانک ان آنکھوں کی تپش شہباز کو اپنے جسم میں محسوس ہوئی' اتنی تپش تھی کہ اس کی جلد جھلسنے لگی۔

اس کی آنکھوں کو ناگن کی آنکھوں نے اپنے سحر میں جکڑ لیا تھا اور کوشش کے باوجود وہ خود کو اس سحر سے آزاد نہیں کر پارہا تھا اس کے قدموں کو جیسے زمین نے جکڑ لیا تھا وہ ایک قدم ادھر اُدھر نہیں کرسکتا تھا اور پھر وہ سیاہ ناگن پوری کی پوری سیدھی کھڑی ہوگئی اس طرح کہ اس کی دُم زمین پر ٹکی ہوئی تھی۔

اس نے ایک زور کی پھنکاری ماری اور تیزی سے شہباز کی جانب لپکی اور بجلی کی سی تیزی سے اس نے شہباز کی گردن میں ڈس لیا۔

اگلے ہی لمحے شہباز بھی منہ سے کوئی بھی آواز نکالے بغیر زمین پر ڈھیر ہوگیا' شہباز کو ڈسنے کے بعد ناگن تیزی سے مردہ ناگ کے پاس پہنچی اور اس کے کچلے ہوئے پھن پر اپنا پھن رکھ دیا۔ کمرے میں آنے والے ڈھیروں سیاہ سانپ راحیلہ کی چارپائی کے گرد گھومنے لگے وہ چارپائی پر چڑھ نہیں سکتے تھے اس لیے بے تابی سے اس کے گرد چکر کاٹ رہے تھے اور پھنکاریں مار رہے تھے۔

راحیلہ نے کبھی کسی سے یہ سن رکھا تھا کہ اگر سانپ کو کوئی بھی چیز دے دی جائے تو وہ اسے لے کر چلے جاتے ہیں۔ اس نے اپنی چارپائی پر نگاہ ڈالی تو اسے کوئی چیز دکھائی نہ دی اچانک اس کی نگاہ گلاب کے پھولوں کے ان ہاروں پر پڑی جو شہباز کے اور اس کے گلے میں پڑے تھے اور ابھی تھوڑی دیر پہلے ہی دونوں نے وہ ہار اپنے گلے سے اتار کر چارپائی کے سرہانے رکھے تھے۔ راحیلہ نے لپک کر وہ ہار اٹھائے اور اس میں سے ایک پھول توڑ کر نیچے پھینک دیا۔

راحیلہ نے دیکھا کہ وہ پھول جس سانپ کے قریب گرا تھا اس نے پھنکارنا بند کیا اور اپنا پھن نیچے کرکے پھول کو منہ میں دبایا اور بل کی جانب بڑھ گیا اور پھر وہ بل سے زمین کے اندر چلا گیا۔

یہ دیکھ کر راحیلہ کی ہمت بڑھی اس نے اپنے ہاتھوں میں موجود پھولوں کے ہار کو دیکھا اور سامنے کمرے میں موجود سانپوں کو...... پھول تعداد میں کم تھے اور سانپ زیادہ تھے' اس نے ایک عقل مندی کی اور پھولوں کی پتیاں توڑ توڑ کر نیچے پھینکنے لگی۔

ہر سانپ ایک گلاب کی پتی منہ میں دباتا اور بل کے اندر چلا جاتا' آہستہ آہستہ سارے پھول ختم ہوگئے اور مردہ ناگ کی ناگن کمرے میں باقی رہ گئی۔

سارے سانپوں کے جانے کے بعد وہ راحیلہ کی جانب متوجہ ہوئی' راحیلہ کو اس سے بے حد خوف آرہا تھا وہ اپنے شوہر کا انجام دیکھ چکی تھی۔ حالات کچھ اس طرح کے تھے کہ وہ اپنے شوہر کی ناگہانی موت پر ایک آنسو بھی نہ بہاسکی' وہ ناگن کو خوف زدہ نگاہوں سے دیکھ رہی تھی اور پھر اس کی کیفیت بھی وہی ہوئی جو اس کے شوہر کی ہوئی تھی' اس کی آنکھوں کو بھی ناگن کی آنکھوں کے سحر نے جکڑ لیا تھا یکا یک ناگن نے ایک زور کی پھنکاری ماری اور ایک باریک سی آواز اس کے منہ سے نکلی۔

''نیچے اتر کر آؤ...... اپنے شوہر کے پاس بیٹھ

کے دو آنسو تو بہالو جیسے میں نے بہائے ہیں۔"

راحیلہ سحر زدہ سی چارپائی سے نیچے اتر آئی اس کی نگاہیں ناگن کی آنکھوں کی گرفت میں تھیں اور قدم آہستہ آہستہ شہباز کی جانب بڑھ رہے تھے۔

تب ہی ناگن نے غصے میں تیزی سے بل کھایا اور راحیلہ پر ایک زوردار حملہ کیا' وہ پوری کی پوری راحیلہ کی دونوں ٹانگوں سے لپٹ گئی پھر آہستہ آہستہ اس نے راحیلہ کے سارے جسم کے گرد بل ڈال دیئے پھر اس کے چہرے کے قریب اپنا پھن لاکر اپنی دوشاخہ زبان لپلپانے لگی۔ خوف کے مارے راحیلہ کی آنکھیں پھٹی ہوئی تھیں' ناگن نے باریک سی آواز میں کہا۔

"تیرے شوہر نے میرے پیار کو مار دیا اب میں تنہا رہ گئی ہوں۔ میں اب تنہا کیسے جیوں گی؟ لیکن ایک ترکیب ہے میرے پاس کیوں کہ میں اپنے کام میں ناکام ہونے کی بعد واپس اپنی دنیا میں نہیں لوٹ سکتی' اس لیے مجھے تیری دنیا ہی میں رہنا ہوگا مگر کیسے......؟ مجھے تیرا یہ جوان اور حسین جسم لینا ہوگا پھر میں راحیلہ بن کر اس گھر میں رہوں گی۔" اتنا کہہ کر ناگن نے اپنے بل کھولنے شروع کر دیئے اور نیچے آتے آتے راحیلہ کی ٹانگ میں ڈس لیا۔

راحیلہ تیورا کر نیچے گرنے لگی' ناگن نے چند لمحے اس کے جسم کی جانب دیکھا' اس کی آنکھوں سے روشنی کی تیز شعاعیں نکال رہی تھیں۔ سر سے پاؤں تک روشنی کی شعاعیں گردش کر رہی تھیں اور پھر ناگن منظر سے غائب ہوگئی' راحیلہ تھوڑی سی کسمسائی پھر اس کے جسم نے مزید حرکت کی اور اس نے آنکھیں کھول دیں۔ آنکھیں کھولتے ہی اس نے دونوں ہاتھ اٹھا کر ایک بھرپور انگڑائی لی۔

کھڑے ہوکر اپنے پیروں کو جھٹکا پھر جھک کر اپنی ٹانگ پر ہاتھ پھیرا ڈسنے کی جگہ ناگن کے دانتوں کے نشان غائب ہو چکے تھے۔ اس نے انتہائی نفرت سے زمین پر پڑے شہباز کے مردہ اور نیلے جسم پر ایک لات ماری اور کمرے کا دروازہ کھول دیا پھر وہ صحن میں کھڑی ہوکر زور زور سے شور مچانے لگی۔

"سانپ نے ڈس لیا...... سانپ نے مار ڈالا۔" آدھی رات کو راحیلہ کی دردناک اور فلک شگاف چیخوں سے سارا محلہ جاگ گیا اور اس کے دروازے پر جمع ہوگیا۔

راحیلہ نے بڑھ کر دروازہ کھول دیا اور صحن میں ٹانگیں پھیلا کر بیٹھ کر سینہ کوبی کرنے لگی' کبھی وہ روتے ہوئے اپنا سر اور منہ پیٹتی کبھی سینہ......

مرد اور خواتین گھر میں اندر آ گئے' انہوں نے مردہ سانپ بھی دیکھ لیا جس کے بارے میں راحیلہ نے بتایا کہ اسے اس نے خود مارا ہے۔

آج ساری بستی کے لوگوں کی ہمدردیاں راحیلہ کے ساتھ تھیں' راحیلہ کی ماں بھی روتی پیٹتی بیٹی کے پاس آئی۔ راحیلہ حزن و ملال کی تصویر بنی بیٹھی تھی' یہ دکھ اور ملال محض دکھاوا نہیں تھا حقیقت میں اس کا پیار اس کی محبت اس سے جدا ہوگیا تھا وہ جتنا بھی دکھ کا اظہار کرتی کم تھا۔

عدت کے دن گزارنے کے بعد اس کی ماں نے اسے اپنے ساتھ اپنے گھر لے جانے کی بہت ضد کی لیکن راحیلہ نے انکار کر دیا پھر گاؤں میں بہت سے رشتے اس کے لیے آئے کیوں کہ وہ مکمل طور پر حسن و جمال کا پیکر تھی۔ بعض لوگ اس ترحم آمیز نگاہوں سے دیکھتے تو بعض لوگ اسے منحوس اور بستر قدم رکھتے لیکن اسے کسی کی باتوں کی کوئی پرا نہیں تھی' وہ کھیتوں میں کام کرتی اور اس کے معاوضے سے اپنا گزر بسر کرتی۔

اس کا سب سے پہلا شکار ان زمینوں کا مالک تھا جہاں وہ کام کرتی تھی وہ بہانے بہانے سے اس کے قریب آتا ایک دن بہت محبت سے بولا۔

"اری کیوں اپنی جوانی اور اپنا حسن اس مٹی میں کام کر کے مٹی میں ملا رہی ہے۔ میری مان تو گھر میں آرام سے بیٹھ میں تجھے ضرورت کی ہر چیز گھر بیٹھے ہی پہنچا دیا کروں گا' بس کبھی کبھار رات کے اندھیرے میں گاؤں والوں سے چھپ کر میرا دل بہلانے کے لیے آجایا کرنا۔"

راحیلہ نے اس کی بات کا کوئی جواب نہیں دیا اس کا حسن اور جوانی تو صرف اس کے پیار کے لیے تھی' کسی اور نے اس پر کیسے بُری نگاہ ڈالی وہ اٹھی اور خاموشی سے چل دی۔

"اری بات تو سن...... کیا تُو میری بات سے ناراض ہوگئی ہے؟" اس نے کھسیا کر اسے پیچھے سے آواز دی لیکن راحیلہ کھیتوں کے بیچوں بیچ جا کر غائب ہو چکی تھی اور صرف ایک منٹ کے وقفے کے بعد اسے ایک سانپ کی تیز پھنکار سنائی دی وہ جو راحیلہ کے حسن کے تصور میں ڈوبا ہوا تھا' بُری طرح چونک پڑا۔ اس نے اپنے سامنے ایک سیاہ رنگ کے سانپ کو پھن پھیلائے ہوئے دیکھا۔

سانپ کی آنکھوں سے روشنی کی شعاعیں سیدھی اس کی آنکھوں میں گھسی جا رہی تھیں' اس کے قدم زمین میں گڑھ گئے اور نہ ہی وہ سانپ کی آنکھوں سے اپنی آنکھیں ہٹا سکا۔ سانپ نے تیزی سے اپنا چوڑا پھن اس کے سینے پر مارا اور دوسرے ہی لمحے وہ بے دم ہو کر نیچے گر پڑا۔

سانپ تیزی سے پلٹا اور کھیتوں میں رینگتا ہوا کنارے تک آ گیا پھر وہاں سے راحیلہ نمودار ہوئی' اس کی آنکھیں سرخ ہو رہی تھیں اور چال میں مستی تھی۔ وہ تیز تیز قدموں سے اپنے گھر کی جانب جا رہی تھی۔

بخشاں اور اس کے بیٹے کی موت کے بعد یہ گاؤں میں دوسرا واقعہ تھا' قیاس کیا جا رہا تھا کہ یہ کوئی بہت ہی زہریلا سانپ ہے۔ جس کے کاٹنے کے بعد اس مرنے والے کا سارا جسم نیلا ہو گیا تھا۔

اور پھر پے در پے یہ واقعات ہونے لگے مہینے میں ایک بار سانپ کے ڈسنے کی واردات ہوتی تھی۔

اب نواں نمبر غیور کا تھا اس روز پورے چاند کی چاندنی زمین پر پھیلی ہوئی تھی۔ راحیلہ غم کی شدت سے نڈھال تھی اسے اپنا پیار شدت سے یاد آ رہا تھا' ایسے وقت میں جب چاند اپنے پورے جوبن پر ہوتا تھا اور اس کی ٹھنڈی چاندنی زمین پر اپنے جلوے بکھیرتی تھی تب وہ اور اس کا پیار مستی میں ایک دوسرے میں پیوست ہو کر خوب رقص کیا کرتے تھے لیکن آج...... آج وہ اس کے پاس نہیں تھی۔

اس نے ناگن کا روپ دھارا اور تیزی سے کھیتوں کی جانب چل دی' چاندنی کی ٹھنڈک اور مٹی کی مہک اسے اپنی جانب بلا رہی تھی۔ سبک چلتی ہوئی ٹھنڈی نم دار ہوا اس کی مشامِ جاں کو تر کر رہی تھی وہ بے خودی میں کھیتوں کی جانب جا رہی تھی۔

کھیتوں کے بیچ میں جا کر وہ رک گئی اور پھر بے خودی میں رقص کرنے لگی' وہ لچک رہی تھی بل کھا رہی تھی' زمین پر لوٹ رہی تھی۔ ناچتے ناچتے وہ تھک گئی اس کا سانس تیز تیز چل رہا تھا۔ اچانک ہی ہوا کے دوش پر تیرتی ہوئی ایک بہت ہی خوب صورت آواز اس کے کانوں میں آئی۔

ناچتے ناچتے وہ تھم گئی اس کا جسم ساکت ہو گیا' یہ کیسی آواز تھی کوئی شخص یہ کیا پڑھ رہا ہے شاید کوئی منتر ہے۔ اس منتر کے الفاظ جیسے اس کے جسم کی طاقت

نچوڑ رہے ہیں وہ بے دم سی زمین پر پڑی تھی پھر جیسے وہ آواز اسے اپنی جانب بلا رہی تھی اس نے آہستہ آہستہ رینگنا شروع کیا وہ آواز کی سمت بڑھنے لگی۔

ہر جانب سناٹا تھا' بستی میں ہر شخص اپنے گھر میں سویا ہوا تھا لیکن ان میں سے بعض اللہ کے نیک بندے اس وقت بھی اپنے گرم بستروں سے علیحدہ اپنے ربّ کے حضور ہاتھ باندھے کھڑے تھے' ربّ سے باتیں کررہے تھے اس کی حمد و ثناء بیان کررہے تھے۔

وہ بستی میں داخل ہوگئی گلی کے کونے میں دو کتے ایک ہڈی کو حاصل کرنے کے لیے جنگ میں مصروف تھے غرا رہے تھے' جیسے ہی وہ رینگتی ہوئی ان کے قریب سے گزری ان کا غرانا ختم ہوگیا اور وہ منہ سے کاؤں کاؤں کی آوازیں نکالتے ہوئے اپنا منہ زمین میں دے کر دبک کر بیٹھ گئے۔

اس گلی میں آ کر وہ لمحہ بھر کو رک گئی' وہ آواز کے بہت قریب آ چکی تھی اس نے اپنا پھن اٹھا کر دیکھا دروازہ بند تھا۔ البتہ کھڑکی کھلی ہوئی تھی مٹی کی اس چار دیواری کے اندر سے وہ آواز اسے بلا رہی تھی۔ وہ مزید بے دم سی ہوئی اس کی طاقت ختم ہوتی جا رہی تھی' وہ بمشکل کھڑکی تک پہنچی اور اندر جھانکا اس نے دیکھا ایک سفید باریش انسان زمین پر چٹائی بچھائے بیٹھے ہیں' ان کے سامنے رحل میں قرآن پاک رکھا ہے اور وہ اس کی تلاوت خوشی الحانی کے ساتھ کررہے ہیں۔

وہ کھڑکی سے اندر پھسل گئی اور دھپ کی آواز کے ساتھ ان کے قریب جا کر گرگئی۔ بزرگ نے صرف ایک نگاہ اس پر ڈالی اور بناء کسی خوف اور ڈر کے اپنی تلاوت جاری رکھی' اب اس میں اتنی طاقت بھی نہیں تھی کہ وہ اپنا پھن اٹھا کر کھڑی ہوسکے اس لیے کنڈلی مارے زمین پر پڑی رہی۔

بزرگ جو کچھ بھی پڑھ رہے تھے اس کا ہر لفظ اس کے جسم پر چھری کی مانند چل رہا تھا' تقریباً آدھے گھنٹے کے بعد بزرگ نے تلاوت ختم کی اور کلام پاک بند کردیا پھر اس کی جانب رخ کر کے اس کے اوپر پھونک ماردی' وہ جیسے تڑپ اٹھی' بلبلا اٹھی۔ درد و اذیت نے اسے نڈھال کردیا تھا بزرگ نے اس سے کہا۔

''آ ہی گئی تو...... تُو انسانوں پر ظلم کررہی ہے' ہمارے جوانوں کی جانیں لے رہی ہے' جو تیرا قصور وار تھا تُو نے اس سے اپنا بدلہ لے لیا' اب جا یہاں سے چلی جا...... نہیں تو تُو سمجھ سکتی ہے کہ میں کیا کرسکتا ہوں۔'' جواب میں وہ خاموش رہی تو بزرگ نے غصے سے کہا۔ ''تُو خاموش کیوں ہے جواب کیوں نہیں دے رہی ہے کہ تیرا کیا ارادہ ہے' تُو جائے گی یا نہیں۔''

''آپ کے منتر نے میری ساری طاقت ختم کردی ہے اتنی عنایت کیجیے کہ میں کچھ بات کرسکوں۔'' اس نے درد میں ڈوبی ہوئی آواز میں بمشکل یہ جملہ ادا کیا۔ بزرگ نے مسکرا کر آہستہ سے سر ہلایا اور زیر لب سورۃ الفاتحہ پڑھ کر اس پر پھونکا تو وہ پھن اٹھا کر کھڑی ہوگئی اور بولی۔

''میرا کوئی نہیں ہے' میرا ساتھی مرچکا ہے میں اب کہاں جاؤں۔ مہربانی کر کے مجھے یہیں پڑا رہنے دیں۔''

''نہیں......'' بزرگ نے قطعی لہجے میں کہا۔ ''تجھے اس کا جسم چھوڑ کر واپس جانا ہوگا' وہ خزانہ جو زمین میں دفن ہے اس پر جا کر بیٹھ جا۔ اسے دنیا میں نہیں آنا چاہیے اس لیے کہ یہ دھن و دولت دنیا میں سب سے بڑی فساد کی جڑ ہے اگر زمین نے

اسے اگل دیا تو یہاں بہت خون خرابا ہوگا' لوگوں سے اخوت اور بھائی چارہ ختم ہوجائے گا۔ قتل و غارت گری ہوگی۔ اسی دولت کے بل پر انسان اور بہت سی ذلیل برائیوں میں مبتلا ہوجاتا ہے' تو اس خزانے پر واپس جا اور اسے بجائے زمین کے اوپر لانے کے اور مزید نیچے تہہ در تہہ لے جا۔''

''لیکن میں......'' اس نے کچھ کہنا چاہا تو بزرگ نے اسے درمیان میں ٹوک دیا۔

''تو گئی نہیں' مجھے تجھ سے مزید کچھ نہیں سنا۔''

''اچھا اگر میں وہ خزانہ آپ کے حوالے کردوں تو......''

''مردود...... خبیث کی بیٹی...... تو مجسم شیطان ہے' مجھے تیرا خاتمہ کرنا ہی ہوگا۔'' اس کی بات سن کر بزرگ غصے سے سرخ ہوگئے اور انہوں نے منہ میں جلدی جلدی کچھ پڑھنا شروع کیا' پڑھ کر ایک بار پھر اس پر پھونک ماری اور بولے۔

''تیرے پاس صرف آدھا گھنٹہ ہے اگر تو اس آدھے گھنٹے میں اس کا جسم چھوڑ کر اپنے خزانے پر واپس چلی گئی تو تیری بچت ہوجائے گی ورنہ تو راحیلہ کے روپ میں ہمیشہ ہمیشہ کے لیے اپاہج بن کر زندگی گزارے گی۔ ناگن بننے کی تیری صلاحیت بھی ختم ہوجائے گی' میں نے تو اپنا کام کردیا ہے آگے تیری مرضی جیسا تو چاہے۔'' اتنا کہہ کر بزرگ اٹھ کھڑے ہوئے۔

وہ وہاں سے باہر نکلی تو اس نے دیکھا کہ درگاہ مراداں والی سرکار سے باہر آرہی تھی۔ اس نے ایک گہری سانس لی اور بولی۔

''مروا دیا مراداں والی سرکار نے۔''

وہ بزرگ اس درگاہ کے سجادہ نشین تھے' بستی کے کتنے ہی لوگ ان کے پاس بار بار یہ درخواست لے کر آتے رہے کہ وہ دعا کریں کہ یہ بلا جو ہماری بستی پر نازل ہوگئی ہے' اللہ پاک اس کو دور کرے۔ ہمارے جوان بیٹے ایک ایک کرکے فوت ہورہے ہیں اور ہم کچھ بھی نہیں کر پارہے اور پھر دوسرے دن راحیلہ کی پڑوسن روزینہ راحیلہ کے گھر گئی اور وہاں سے چیخیں مارتی ہوئی باہر نکل آئی' اس نے چیخ چیخ کر سارے بستی والوں کو اکٹھا کرلیا پھر کچھ عورتیں اندر گئیں اور وہ بھی کانوں کو ہاتھ لگاتی ہوئی باہر نکل آئیں۔

بقول ان کے راحیلہ کی موت واقع ہوچکی تھی اور اس کا سارا جسم نیلاہٹ کا شکار تھا' اس کے صحت مند جسم سے نیلا نیلا پانی بہہ رہا تھا اور تیز اثر زہر کے سبب تیزی سے اس کا جسم گل رہا تھا اور اس میں سے ناقابل برداشت بُو آرہی تھی۔

ناگن نے راحیلہ کا جسم حاصل کر رکھا تھا جب کہ اس کی موت واقع ہوچکی تھی اب جب ناگن اس کا جسم چھوڑ کر گئی تو راحیلہ کی موجودہ حالت سب کی نگاہوں میں آگئی۔

اس دن کے بعد سے اس بستی میں سانپ کے کاٹنے سے ہونے والی اموات کا سلسلہ رک گیا' رحمان بابا درگاہ کے سجادہ نشین نے لوگوں کو نصیحت کی کہ وہ اللہ سے اپنے گناہوں کی توبہ کریں تاکہ آئندہ ایسی کسی مصیبت کا انہیں سامنا نہ کرنا پڑے۔

یہ بات ہمیشہ یاد رکھنی چاہیے کہ اللہ کسی متنفس پر ظلم نہیں کرتا' ہم اگر کسی پریشانی میں مبتلا ہوتے ہیں تو اپنے بداعمالوں کی وجہ سے۔

کھلاڑی اناڑی

محمد اعظم خان

وہ اپنے تیں خود کو بڑا کھلاڑی سمجھ رہا تھا لیکن وہ قدرت کے اس نظام کو فراموش کر بیٹھا تھا کہ دنیا میں ہر سیر کے لیے سوا سیر ہوتا ہے۔
ایک اناڑی کا قصہ دلچسپ' وہ کھلاڑی بننے کے چکر میں مار کھا گیا تھا۔

امیر علی نے آنکھوں میں بہت سے خواب سجا رکھے تھے، جو ملازمت سے ملنے والی ماہانہ تنخواہ سے کسی صورت پورے ہوتے دکھائی نہیں دیتے تھے، ایک کے بعد دوسری ملازمت تبدیل کرنا اس کے لئے عام سی بات تھی، وہ غریب والدین کی اکلوتی اولاد تھا اور بمشکل بی۔اے کی ڈگری حاصل کر پایا تھا، اس کے والدین ایک بس ایکسیڈنٹ میں مارے گئے تھے، وہ کرائے کے مکان میں رہتا تھا، کوئی اور ذمہ داری نہ ہونے کی وجہ سے وہ ساری کی ساری کمائی کھانے پینے اور اپنے لباس پر خرچ کر ڈالتا تھا، اس لئے اس کے پاس کوئی جمع پونجی نہ تھی مگر اس کا پہناوا، رکھ رکھاؤ اور انداز گفتگو کسی کو بھی اپنی گرفت میں لینے کے لئے کافی تھا۔

شاہین کے والدین نے بیٹی کے لئے مناسب رشتے کی تلاش میں بہت ہاتھ پاؤں مارے تھے مگر انہیں کامیابی حاصل نہیں ہوئی تھی، شاہین قابل قبول سی شکل وصورت کی مالک، پولیس میں سب انسپکٹر کے عہدے پر فائز تھی، کچھ لوگ اس کی شکل وصورت اور کچھ لوگ اس کے پولیس میں ملازمت کرنے کی وجہ سے انکار کر جاتے تھے، جیسے جیسے شاہین کی عمر گزرتی جاتی تھی، اس کے والدین کی پریشانی بڑھتی جاتی تھی، کسی نے ان سے امیر علی کے متعلق ذکر کیا تھا، جب ان کی ملاقات امیر علی سے ہوئی تو اس نے اپنی چکنی چپڑی باتوں سے شاہین کے والدین کے دل موہ لئے تھے، کرائے کے مکان میں رہنے اور مناسب ملازمت نہ ہونے کے باوجود انہیں امیر علی کے روپ میں ایک اچھا داماد دکھائی دیا تھا، یوں باہمی رضامندی سے شاہین اور امیر علی کی شادی طے پا گئی تھی۔

داماد کا کرائے کے مکان میں رہنا ان کے لئے کوئی تکلیف دہ نہ تھا، کیونکہ شاہین کے والدین نے اسی کی کمائی سے بیٹی کے لئے چھوٹا سا گھر پہلے سے خرید رکھا تھا، یہی وجہ تھی کہ شادی کے دن ہی شاہین کرائے کے مکان میں خاوند کے پاس جانے کی بجائے اسے اپنے ذاتی گھر میں لے آئی تھی، شاہین سے کہیں زیادہ امیر علی خوش تھا، کیونکہ اسے کماؤ بیوی کے ساتھ ساتھ رہائش کے لئے اپنا گھر بھی مل گیا تھا اور کرائے کے مکان سے جان چھوٹ گئی تھی۔

شاہین نے شادی کے لئے کچھ روز کی چھٹی لے رکھی تھی، جبکہ امیر علی نے شادی سے قبل ہی چپکے سے ملازمت کو خیر باد کہہ دیا تھا، اس لئے اپنی مرضی سے دن بھر گھومنا پھرنا اور دیر تک سوئے رہنا ان کا معمول تھا، برسوں بعد امیر علی نے اپنے اندر خوشگوار تبدیلی محسوس کی تھی، اب اسے زندگی کا صحیح لطف آنے لگا تھا، لیکن کسی روز اس کی نظر شاہین کے چہرے پر جا ٹھہرتی تو اس کے اندر سے ہوک سی اٹھتی تھی اور وہ ایک لمبی سانس چھوڑتے ہوئے سوچنے لگتا تھا کہ کاش اس کی شادی کسی خوبصورت لڑکی سے ہوئی ہوتی مگر پھر فوراً ہی وہ یہ سوچ کر دل کو تسلی دے لیتا کہ شاہین کے روپ میں

اسے خوبصورت بیوی نہیں ملی تو کیا ہوا، کم از کم اس کی وجہ سے تنخواہ کی شکل میں پیسہ تو گھر میں آئے گا۔

امیر علی کے پاس اتنی رقم موجود تھی، جس سے چند روز با آسانی گزارے جا سکتے تھے، اس لئے بیوی پر رعب ڈالنے کے لئے ناشتے کے علاوہ دوپہر اور پھر رات کا کھانا بھی ہوٹل سے آتا تھا، امیر علی اپنی خوشی سے تینوں وقت کا کھانا بازار سے منگواتا تھا، اس کے باوجود شاہین کو اچھا نہیں لگتا تھا کہ اس کے ہوتے ہوئے کھانا باہر سے آئے، اس نے کئی بار ناشتہ اور کھانا بنانے کی کوشش کی تھی مگر امیر علی نے اسے سختی سے منع کر دیا تھا۔

کچھ روز انہی چونچلوں میں گزر گئے تھے، آخر ایک روز امیر علی کو سوتے دیکھ کر شاہین قریب کی دکان سے ہی کچھ ضروری سامان خرید لائی اور ناشتہ تیار کرنے کے لئے کچن میں جا کھڑی ہوئی تھی، امیر علی بھی اس کے پیچھے پیچھے وہیں چلا آیا تھا اور آتے ہی بولا...... "یہ کیا ہو رہا ہے......؟"

"ناشتہ تیار ہو رہا ہے......" شاہین نے پیار سے خاوند کی طرف دیکھتے ہوئے جواب دیا تھا۔

"نئی نویلی دلہن کچن میں کام کرتی ہوئی اچھی لگتی ہے بھلا......؟"

"مگر یہ بھی تو اچھا نہیں لگتا کہ بیوی کے ہوتے ہوئے روز روز کھانا باہر سے آئے......"

"ارے پگلی، عمر پڑی ہے یہ کام کرنے کی...... یہی کچھ دن ہیں موج مستی کے، پھر یہ وقت لوٹ کر کہاں آئے گا......" امیر علی نے اپنی بات سے شاہین کو لاجواب کر ڈالا تھا، اس لئے وہ کسی احتجاج کے بغیر سامان وہیں چھوڑ کر امیر علی کے ساتھ واپس بیڈ روم میں آ بیٹھی تھی۔

دن گزرے اور محکمے سے شادی کے لئے لی ہوئی چھٹیاں ختم ہو گئیں، اس لئے شاہین کو ڈیوٹی پر جانے کے لئے گھر سے جانا تھا، اس لئے اس روز وہ صبح جلدی ہی اٹھ گئی تھی، اس نے اپنے اور امیر علی کے لئے ناشتہ تیار کیا اور پھر یونیفارم پہن کر جانے کے لئے تیار ہو گئی۔

"آج اٹھنا نہیں ہے کیا......؟" شاہین نے امیر علی کے قریب ہوتے ہوئے آہستہ سے کہا تھا۔

"تم کہاں جا رہی ہو......؟" امیر علی نے شاہین کو یونیفارم پہنے بیڈ کے پاس کھڑے دیکھ کر آنکھیں ملتے ہوئے سوال کیا تھا۔

"تمہیں بتایا تو تھا کہ میں کل سے ڈیوٹی پر جاؤں گی......"

"کاش وقت تھم جاتا اور تم ہمیشہ میرے پاس بیٹھی رہتی......"

"اچھا اچھا...... صبح صبح زیادہ رومانٹک ہونے کی ضرورت نہیں، مجھے ڈیوٹی پر جانا ہے...... میں نے تمہارے لئے ناشتہ تیار کر کے ٹیبل پر رکھ دیا ہے، برش وغیرہ کر کے ناشتہ کر لینا......" شاہین کو ڈیوٹی پر پہنچنے میں دیر ہو رہی تھی اس لئے وہ یہ کہتے ہوئے جلدی سے وہاں سے نکل گئی تھی، کیونکہ اس کا ریکارڈ تھا کہ وہ ہمیشہ وقت پر پولیس اسٹیشن پہنچ جاتی تھی اور وہ پہلے ہی دن لیٹ جا کر اپنا ریکارڈ خراب کرنا نہیں چاہتی تھی، شاہین چلی گئی تھی، اس کے جاتے ہی امیر علی نے ایک بھرپور انگڑائی لی تھی اور مسکراتے ہوئے پھر سے خود کو بیڈ پر گرا دیا تھا۔

......☆☆☆......

شادی کے بعد امیر علی نے اپنی ملازمت کے بارے میں جھوٹ سچ بول کر کئی دن گزار دیے تھے، لیکن اس کا جھوٹ زیادہ عرصے تک بیوی سے چھپا نہیں رہ سکا تھا، شاہین جلد ہی جان گئی تھی کہ اس کا شوہر دن بھر گھر میں بے کار پڑے رہنے کے علاوہ کچھ نہیں کرتا، اس نے کئی بار دبے لفظوں میں امیر علی کو سمجھانے کی کوشش کی تھی مگر وہ انتہائی ڈھٹائی سے بات گول کر دیتا تھا۔

امیر علی شلوار قمیض پہنے، بیڈ کی پشت گاہ سے ٹیک

لگائے کسی گہری سوچ میں ڈوبا ہوا تھا، اس کے چہرے کے تاثرات سے صاف دکھائی دے رہا تھا کہ اس کا ذہن کسی معاملے میں الجھا ہوا ہے، وہ کبھی اپنا چہرہ دونوں ہاتھوں میں لے لیتا، کبھی ایک ہاتھ چہرے پر رکھ کر چہرے پر انگلیاں نچانے لگتا تھا، اس کے پاس ہی بیڈ پر موبائل پڑا تھا، جس کی گھنٹی اچانک بج اٹھی تھی، موبائل کی آواز سن کر وہ چونک اٹھا تھا، پھر بے دلی سے موبائل کان سے لگاتے ہوئے سست انداز میں بولا ......"اچھا......جی......جی......تو آپ آنا چاہتے ہیں، مگر ایسا نہیں ہوسکتا......آپ پھر کبھی آجائیں......"

"میں اکیلا نہیں......میرے ساتھ میری بیوی بھی آپ سے ملنا چاہتی ہے......" ادھر سے کہا گیا تھا۔

"کیا کہا......؟ آپ کے ساتھ خاتون بھی آرہی ہیں" بات کرتے ہوئے امیر علی سیدھا ہوکر بیٹھ گیا تھا، اس کی آواز میں مٹھاس بھر گئی تھی، جبکہ چہرہ خوشی سے کھل اٹھا تھا۔

"جی......" ادھر سے مختصر جواب دیا گیا تھا۔

"پھر پوچھ کیوں رہے ہیں......ابھی آجائیں ناں......" امیر علی نے انتہائی پیار سے مسکراتے ہوئے بات کی تھی۔

فون بند ہوتے ہی، امیر علی کی ساری سستی ختم ہوگئی تھی، وہ جمپ لگا کر بیڈ سے نیچے اتر آیا تھا اور جلدی سے کپڑوں کی الماری کھول کر اپنے لئے بہترین ڈریس پسند کرنے لگا تھا، پھر کچھ دیر بعد وہ پینٹ کوٹ پہنے ڈریسنگ ٹیبل کے سامنے جا کھڑا ہوا تھا اور ٹائی کی ناٹ سیٹ کرنے کے بعد اپنے منہ کے مختلف انداز بنا کر ہر زاویے سے خود کو چیک کیا تھا، اسی دوران ڈور بیل کی آواز اس کے کانوں میں پڑی تھی، وہ ایک بار پھر خود کو آئینے میں دیکھتا ہوا دروازے کی طرف بڑھ گیا تھا۔

امیر علی بیڈ روم سے نکل کر ٹی وی لاؤنج سے ہوتا ہوا بیرونی دروازے کی طرف بڑھا تھا، وہاں سے گزرتے ہوئے اس کی نگاہ وال کلاک پر پڑی تھی، جس پر چار بج کر بیس منٹ دکھائی دے رہے تھے، اس نے دروازہ کھولا تو وہاں ایک اجنبی جوڑا کھڑا تھا، دروازہ کھلنے پر اجنبی نوجوان نے اپنا اور اپنے ساتھ کھڑی لڑکی کا تعارف کروادیا تھا، ان میں پینٹ شرٹ پہنے واجبی سی شکل کا نوجوان لڑکا جواد اور اس کی خوبصورت نوجوان بیوی، نادیہ تھی۔

وہ دونوں امیر علی کی اجازت سے اس کے ساتھ ساتھ چلتے ہوئے ٹی وی لاؤنج میں صوفے پر آبیٹھے تھے، جبکہ دوسرے صوفے پر امیر علی خود بیٹھ گیا تھا۔

"میں آپ کی کیا خدمت کرسکتا ہوں؟" بیٹھتے ہی امیر علی نے نادیہ کی آنکھوں میں آنکھیں ڈالتے ہوئے چہرے پر مسکراہٹ سجائے پوچھا تھا۔

"آپ مجھ سے بات کیجئے ناں......" جواد جھٹ سے بول پڑا تھا۔

"آپ ہی سے تو بات کر رہا ہوں...... بولیں ناں......میں آپ کے لئے کیا کرسکتا ہوں" امیر علی نے جواد کی بات سننے کے باوجود، مسلسل نادیہ کے چہرے پر ٹکٹکی باندھے پیار سے بات کی تھی۔

"امیر بھائی، میں ادھر بیٹھا ہوں" جواد نے قدرے اکتاہٹ کا اظہار کرتے ہوئے کہا تھا۔

"بیٹھے ہو تو بیٹھے رہو......میں کیا کروں؟" امیر علی، جواد کی طرف غصے سے دیکھتے ہوئے تلخ لہجے میں بولا تھا۔

"بھائی میں آپ کے پاس اس لئے آیا تھا کہ میری موٹر سائیکل تھانے میں بند ہے"

"کون سے تھانے میں؟"

"جس تھانے میں میری بھابھی سب انسپکٹر ہیں"

"اچھا......ماشاءاللہ......ماشاءاللہ ......تو آپ کی بھابھی سب انسپکٹر ہیں"

"جی......"

"کون سے تھانے میں ہیں وہ؟"

"تھانہ حبیب ٹاؤن"

"نام کیا ہے آپ کی بھابھی کا......؟؟" تھانہ حبیب ٹاؤن کا نام سن کر امیر علی نے حیران ہو کر پوچھا تھا۔

"شاہین......"

"ویسے کیا عجیب اتفاق ہے، میری بیوی بھی تھانہ حبیب ٹاؤن میں سب انسپکٹر ہے اور اس کا نام بھی شاہین ہے......"

"جی میں انہی کی بات کر رہا ہوں"

جواد کی بات سن کر امیر علی کو زبردست جھٹکا لگا تھا اور وہ صوفے پر سیدھا ہو کر بیٹھتے ہوئے سپاٹ لہجے میں بولا تھا......"یعنی کہ میری بیوی کو آپ نے اپنی بھابھی بنا لیا......"

"جی...... وہ......" جواد نے کھسیانی ہنسی ہنستے ہوئے بات کرنے کی کوشش کی تھی۔

"یعنی اگر میں آپ کی بیوی کو اپنی بیوی بنا لوں، تو آپ کو کوئی اعتراض نہیں ہوگا......؟"

"sorry امیر بھائی...... میرا یہ مطلب نہیں تھا" چہرے پر شرمندگی سجائے جواد نے کہا تھا۔

"اچھا آپ ان باتوں کو چھوڑیں اور کام کی بات کریں......"

"امیر بھائی...... میں یہ کہہ رہا تھا کہ میری موٹر سائیکل تھانے میں بند ہے...... آپ کسی طرح وہ نکلوا دیں......"

"دس ہزار روپے لگیں گے" امیر علی نے سپاٹ لہجے میں کہا تھا۔

"بھائی اس کے کاغذات بھی نہیں ہیں"

"تو پھر بیس ہزار......"

"اس کی ہیڈ لائٹ بھی نہیں ہے"

"تیس ہزار......"

"اس کا ہارن اور اشارے بھی نہیں ہیں"

"چالیس ہزار......"

"بھائی اس کی دونوں بریکیں بھی نہیں ہیں" واجد نے شرمندہ سا ہو کر بتایا تھا۔

"پچاس ہزار......"

"مجھے منظور ہے"

جواد کی ہاں سن کر امیر علی اس کے قریب ہوتے ہوئے ادھر اُدھر دیکھ کر رازداری کے انداز میں بولا......"موٹر سائیکل کی کوئی چیز بھی سلامت نہیں...... یعنی وہ صرف نام کی موٹر سائیکل ہے...... پھر بھی آپ اسے چھڑوانے کے لئے پچاس ہزار روپے دینے کے لئے تیار ہیں...... آخر ایسا کیا ہے اس کھٹارہ موٹر سائیکل میں...... جبکہ اتنے میں تو نئی بھی آسکتی ہے"۔

"دراصل وہ ہماری خاندانی موٹر سائیکل ہے...... پہلے میرے دادا کے پاس تھی...... دادا کی وفات کے بعد ابا چلاتے رہے...... اور اب میری ملکیت ہے......" واجد نے انتہائی فخریہ انداز میں بتایا تھا۔

"تو ٹھیک ہے...... آپ مجھے پچاس ہزار دے دیں، میں آپ کی خاندانی موٹر سائیکل تھانے سے چھڑوا دوں گا"

"میں پچاس ہزار دینے کو تیار ہوں...... مگر رقم کی ادائیگی میری شرائط پر ہوگی"

"کیسی شرائط......؟" امیر علی نے حیران ہو کر دریافت کیا تھا۔

"فی الحال میں کچھ رقم ایڈوانس کے طور پر دوں گا...... باقی کی رقم موٹر سائیکل ملنے پر ادا ہوگی"

"مجھے منظور ہے"

"یہ لیں ایڈوانس......" یہ کہتے ہوئے واجد نے جیب سے سو روپے کا نوٹ نکال کر امیر علی کے ہاتھ میں تھما دیا تھا۔

امیر علی نے سو روپے کا نوٹ پکڑ کر اسے الٹ پلٹ کر دیکھتے ہوئے جواد کی طرف مصنوعی غصے سے دیکھا اور بولا......" آپ نے مجھے پاگل سمجھ رکھا ہے کیا...... پچاس ہزار کی ڈیل کا ایڈوانس صرف سو روپے لے لوں...... چلیں زیادہ نہیں تو کم از کم...... ڈیڑھ سو تو

کریں" امیر علی بات کرتے ہوئے رکا، پھر کچھ یاد کرتے ہوئے جواد کی طرف دیکھ کر بولا...... "اوہاں ......آپ کو واش روم میں جانا تھا"

"نہیں تو......!!!"

"کیوں......آپ واش روم میں نہیں جاتے؟"

"جی......میں واش روم میں نہیں جاتا"

"یہ بیماری کب سے ہے آپ کو؟"

"نہیں نہیں مجھے کوئی بیماری نہیں...... میں جاتا ہوں واش روم میں"

"تو پھر جائیں......" امیر علی نے جھٹ سے کہا تھا، ساتھ ہی ایک طرف انگلی سے اشارہ کرتے ہوئے بولا...... "واش روم اس طرف ہے"

امیر علی کی بات سن کر جواد مجبوراً اٹھ کھڑا ہوا تھا اور واش روم کی طرف چل پڑا تھا، لیکن جاتے ہوئے بار بار بے بسی سے پیچھے مڑ مڑ کر بھی دیکھتا جاتا تھا۔ امیر علی، جواد کو جاتے ہوئے دیکھتا رہا، پھر جیسے ہی واش روم کا دروازہ بند ہوا تو وہ نادیہ کے قریب ہوتے ہوئے بولا...... "ویسے کبھی کبھی آپ بھی سوچتی تو ہوں گی ......کس مفلس سے آپ کی شادی ہوگئی"

"جی......وہ......نہیں......نہیں ایسی تو کوئی بات نہیں" نادیہ نے جھجکتے ہوئے بات کی تھی۔

"جواد تو مجھے شکل سے ہی غریب غریب سا لگتا ہے"

"ہاں......وہ تو ہے......مگر......"

"مجھے پورا یقین ہے کہ وہ موٹر سائیکل میں کبھی پچاس روپے سے زیادہ کا پٹرول نہیں ڈلواتا ہوگا"

"جی......ایسا ہی ہے"

"کبھی آپ کو آئس کریم کھلانے باہر بھی نہیں لے جاتا ہوگا......؟"

"جج......جج......جی"

"آپ کبھی شیمپو لانے کے لئے کہتی ہوں گی تو یقیناً شاشے لاکر آپ کے ہاتھ میں تھما دیتا ہوگا اور ساتھ ہی یہ بھی کہتا ہوگا کہ اسے دوبار استعمال کرنا؟"

"ایسا ہی ہوتا ہے" نادیہ نے نظر جھکا کر جواب دیا تھا۔

"اسی لئے تو میں کہہ رہا ہوں کہ آپ جیسی خوبصورت اور نازک سی لڑکی کی شادی مجھ جیسے......اوہ ......میرا مطلب ہے......کسی خوبصورت اور امیر نوجوان سے ہونی چاہئے تھی......"

"بات تو آپ ٹھیک کہہ رہے ہیں......لیکن......"

"آپ......" امیر علی بات کر رہا تھا کہ اسی دوران اسے جواد واش روم سے نکل کر آتا ہوا دکھائی دیا تھا، اسے دیکھتے ہی امیر علی، نادیہ کو ڈانٹتے ہوئے بولا...... "آپ......سیدھی ہوکر بیٹھیں"

جواد واش روم سے نکل کر واپس اپنی جگہ صوفے پر آبیٹھا تھا، امیر علی اس سے بات کرنے کے لئے لب کھولنے ہی والا تھا کہ گاڑی کے ہارن کی آواز اس کے کانوں میں پڑی تھی، ہارن کی آواز سن کر امیر علی ایک جھٹکے کے ساتھ صوفے سے اٹھتے ہوئے بولا...... "وہ آگئی......"

"کون آگئی......؟" جواد نے حیران ہوکر پوچھا تھا۔

"میری بیوی......یعنی شاہین......" امیر علی بات کرتے ہوئے رکا تھا، پھر کچھ سوچ کر فوراً ہی صوفے پر بیٹھتے ہوئے ان دونوں کو سمجھانے کے انداز میں بولا...... "اب آپ دونوں اپنی اپنی جگہ خاموشی سے بیٹھے رہو گے اور جب تک وہ کوئی بات نہ کرے، آپ کچھ نہیں بولو گے......" امیر علی نے جلدی سے بات کی، پھر جواد کی طرف دیکھتے ہوئے بولا...... "وہ پوچھے تو میں کہہ دوں گا کہ ہم دونوں بچپن کے دوست ہیں"

"لیکن......ہماری عمروں میں کافی فرق ہے"

"تو ٹھیک ہے......میں کہہ دوں گا......کہ میں جوانی میں تمہارے ساتھ کھیلتا رہا ہوں"

"کچھ اور نہیں کہہ سکتے امیر بھائی......؟"

جواد کی بات سن کر امیر علی ذہن پر زور دے کر سوچتے ہوئے ان کی طرف دیکھ کر بولا...... "بس آپ کہہ دینا کہ آپ دونوں میاں بیوی ہیں اور کرائے کے لئے گھر کا پتہ کرنے آئے تھے...... مگر ایک بات کا خیال رکھنا...... جب تک وہ کوئی سوال نہ کرے، آپ بالکل خاموش رہو گے......"

اب ان تینوں کی نگاہیں دروازے پر لگی ہوئی تھیں، شاہین پولیس یونیفارم میں ٹی وی لاؤنج میں داخل ہوئی تو امیر علی نے جواد اور نادیہ کی طرف دیکھتے ہوئے اپنے ہونٹوں پر انگلی رکھ کر انہیں خاموش رہنے کا اشارہ کر دیا تھا، لیکن شاہین نے موبائل کان سے لگا رکھا تھا، اس لئے وہاں رکے اور کوئی بات کئے بغیر ہی وہاں سے نکل کر بیڈ روم کی طرف بڑھ گئی تھی، جواد، امیر علی سے کچھ کہنا چاہتا تھا، لیکن امیر علی نے اپنے ہونٹوں پر انگلی رکھ کر اسے خاموش کروا دیا تھا۔

شاہین فون سننے کے بعد واپس ٹی وی لاؤنج میں آئی تو اس کے موبائل کی بیل پھر سے بجنے لگی تھی، اس لئے وہ پھر سے موبائل پر بات کرنے لگی تھی...... "ہاں بولو ...... ٹھیک ہے ...... تم فوراً ایک حولدار اور دو سپاہی وہاں بھجوا دو...... اوکے" فون بند ہوتے ہی وہ صوفے پر آ بیٹھی اور ٹیبل پر پڑے جگ سے گلاس میں پانی ڈال کر پینے لگی تھی۔

جب سے شاہین گھر آئی تھی، اس نے کسی سے کوئی بات نہیں کی تھی، امیر علی کو اس کی خاموشی سے خوف آنے لگا تھا، اس لئے بار بار نیچے جھک کر شاہین کی آنکھوں میں دیکھنے کی کوشش کرنے لگا تھا۔

"یہ کیا بدتمیزی ہے؟" شاہین نے پانی پی کر خالی گلاس میز پر رکھتے ہوئے امیر علی سے کہا تھا" پھر جواد اور نادیہ کی طرف اشارہ کرتے ہوئے بولی...... "اور یہ لوگ کون ہیں؟

"یہ میرے بچپن کا دوست سلیم ہے اور اس کے ساتھ اس کی بیوی نادیہ ہے" امیر علی نے بیوی کو ٹالنے کے لئے بات بنائی تھی، پھر جواد کی طرف دیکھتے ہوئے بولا...... "کیوں عمران...... میں نے ٹھیک کہا ناں؟"

"تم تو ابھی اس کا نام سلیم بتا رہے تھے" شاہین نے امیر علی کو گھورتے ہوئے کہا تھا۔

شاہین کی بات سن کر امیر علی گھبراہٹ چھپاتے ہوئے جلدی سے بولا...... "ہاں ...... ہاں ...... میں یہ کہہ رہا تھا کہ ان کا والد، سلیم میرے بچپن کا دوست ہے...... یہاں یہ کرائے کے لئے گھر دیکھنے آئے ہیں......"

"اس علاقے میں تو کرائے پر گھر ملنا بہت مشکل ہے...... تقریباً سبھی لوگ اپنے گھروں میں خود ہی رہ رہے ہیں، پھر بھی آپ کے لئے کوشش کر کے دیکھ لیں گے" شاہین نے انہیں ٹالنے کی کوشش کی تھی۔

"چلیں کوئی بات نہیں...... پھر بھی آپ لوگوں کا بہت شکریہ...... ورنہ کسی انجان کو اپنے گھر میں کون گھسنے دیتا ہے"

"تم تو ابھی کہہ رہے تھے کہ...... یہ تمہارے بچپن کے دوست کا بیٹا ہے اور وہ خود کو انجان کہہ رہا ہے......" جواد کی بات سنتے ہی شاہین نے امیر علی سے پوچھا تھا۔

"اس کا باپ بھی ایسے ہی ہر بات کو مذاق بنا دیتا تھا...... وہی عادت اس کی ہے"

"اور تم آج کس خوشی میں اتنے تیار ہوئے بیٹھے ہو؟ شاہین نے امیر حسین کو نیچے سے اوپر تک غور سے دیکھتے ہوئے سوال کیا تھا۔

"آج ٹی وی والے میرا انٹرویو لینے آ رہے ہیں"

"تمہارا انٹرویو!!......؟"

"دراصل ٹی وی والے ساتھ والے گھر میں ان کا انٹرویو لینے آئے ہوئے ہیں...... میں بھی تیار ہو کر بیٹھ گیا کہ شاید ادھر بھی آ جائیں"

"تم کبھی نہیں سدھرو گے" شاہین یہ کہتے ہی وہاں سے نکل گئی تھی، اس کے جانے پر امیر علی کی جان میں

جان آئی تھی اور اس سے پہلے کہ وہ وہاں پھر سے آٹپکتی، امیر علی نے وقت ضائع کئے بغیر جواد اور نادیہ کو وہاں سے بھگا دیا تھا۔

......☆☆☆......

شاہین شلوار قمیض پہنے، بیڈ پر نیم دراز کوئی کتاب پڑھ رہی تھی، بات کرنے کا اچھا موقع تھا، اس لئے امیر علی اس کے قریب جا بیٹھا اور انتہائی پیار سے بولا...... ''تم سے ایک چھوٹا سا کام تھا......''

''مگر اس وقت میں تمہارا کوئی بھی کام کرنے کے موڈ میں نہیں ہوں'' شاہین نے اکتاہٹ کا اظہار کرتے ہوئے کہا تھا۔

''سنو تو سہی''

''بولو...... میں سن رہی ہوں'' شاہین کتاب پر نظریں جمائے ہوئے بولی تھی۔

''میں اینٹیک شاپ کھولنا چاہتا ہوں''

''تو کھول لو'' شاہین نے بے پروائی سے جواب دیا تھا۔

''تمہارے تھانے میں کوئی ایسی موٹر سائیکل ہے، جس کی نہ ہیڈ لائٹ ہو، نہ اشارے، نہ ہارن اور نہ بریکیں......''

''کوئی نہ کوئی ایسی موٹر سائیکل تو ہو گی''

''وہ موٹر سائیکل جس کے کاغذات بھی نہ ہوں اور کل دس بجے پکڑی گئی ہو''

''ہاں ہے تو سہی...... مگر تم یہ سب کیوں پوچھ رہے ہو؟''

''اخبار میں پڑھا تھا ناں...... اس لئے...... اور میں چاہتا ہوں، جہاں دکان میں دوسری پرانی چیزیں رکھی ہوں گی، وہیں وہ پرانی موٹر سائیکل بھی رکھ لوں......بس کچھ دن کے لئے ادھار کے طور پر دے دینا، پھر میں واپس کر دوں گا''

''مجھ سے ایسی کوئی امید نہ رکھنا...... فی الحال میں بہت تھکی ہوئی ہوں...... میرے پاؤں دباؤ اور مجھے سونے دو......''

''تم کہو تو تمہارا گلا بھی دبا دوں......'' بیوی کی بات سن کر امیر علی نے دل ہی دل میں بات کی تھی مگر اسے کہنے کا حوصلہ نہیں ہوا تھا۔

شاہین بے پروائی سے کتاب ایک طرف رکھتے ہوئے آنکھیں بند کر کے لیٹ گئی تھی اور امیر علی ناک منہ چڑھاتے ہوئے اس کے پاؤں دبانے لگا تھا۔

......☆☆☆......

اس بات سے اکثر لوگ آگاہ تھے کہ خوبصورت لڑکیاں امیر علی کی کمزوری ہیں، شاہین جیسی قبول صورت لڑکی سے شادی کے بعد اس کی یہ کمزوری

وحدانیت

لوگوں کی اکثریہ رائے ہے کہ اللہ تعالیٰ ہماری دعائیں نہیں سنتا کیا کبھی ہم نے یہ غور کیا ہے کہ ہم دعائیں کیا مانگتے ہیں۔ ان کی نیت کیا ہوتی ہے کیا ہم کامل یقین سے دعائیں مانگتے ہیں۔ نہیں قطعی نہیں مانگتے اگر ہم دعا مانگ بھی رہے ہوتے ہیں تو اس میں ہماری بھلائی اور دوسرے کا نقصان ہوتا ہے۔ مثلاً اے اللہ! تو آج اتنی بارش دے کہ دل بھر جائے اس دعا سے ہمارا دل تو بھر جاتا ہے مگر دوسروں کا حال برا ہوتا ہے۔ دعا میں کاملیت نہیں ہوتی۔ اللہ مجھے فلاں چیز دے میں اس سے یہ وہ کر دوں گا بھلا رب العزت کیسے وہ دعا قبول کر سکتا ہے جس میں ایک انسان کا بھلا ہو رہا ہو اور دس کا نقصان۔ میرا ایمان ہے کہ جب بھی سچے دل سے نفع نقصان سوچے بغیر دعا مانگی جائے قبول ہوتی ہے۔ کہتے ہیں انسان سخت مشکل میں ہو تو اگر وہ کوئی دعا مانگے تو وہ قبول ہو جاتی ہے۔ اس وقت کی دعا کسی بھی نفع نقصان سے پاک ہو کر دل میں ایمان پختہ رکھ کر قبول ہونے کے یقین سے مانگی جاتی ہے اور قبول ہوتی ہے۔

غلام عباس......نواب شاہ

حسرت بن کر رہ گئی تھی، یہی وجہ تھی کہ جب کبھی اس کی ملاقات کسی خوبصورت لڑکی سے ہوتی تو وہ مچل اٹھتا تھا اور پھر اسے خود کا بھی ہوش نہیں رہتا تھا، اس کی اسی کمزوری کا فائدہ اٹھاتے ہوئے بہت سے لوگ اس سے اپنا کوئی بھی کام باآسانی نکلوا لیتے تھے۔

جواد موٹر سائیکل کے سلسلے میں فائنل بات کرنے کے سلسلے میں امیر علی سے ملنا چاہتا تھا، جواد سے ملاقات کا وقت طے ہوتے ہی امیر علی نے اپنی تیاری شروع کر دی تھی، کیونکہ وہ جانتا تھا کہ جواد کے ساتھ نادیہ بھی ضرور ہوگی اور لڑکیوں کو امپریس کرنے کا کوئی بھی موقع وہ ضائع کرنا نہیں چاہتا تھا، اس نے ان کے آنے سے پہلے ہی چائے بھی تیار کر لی تھی اور اب ٹی وی لاؤنج میں صوفے پر بیٹھا بے صبری سے ان کا انتظار کر رہا تھا۔

امیر علی کو زیادہ دیر انتظار نہیں کرنا پڑا تھا کہ ڈور بیل بج اٹھی تھی، ڈور بیل بجی تو وہ تیزی سے دروازے کی طرف بڑھا اور جلدی سے دروازہ کھول دیا، اس کا اندازہ درست ثابت ہوا تھا، پہلے کی طرح اس روز بھی جواد کے ساتھ نادیہ آئی تھی، نادیہ پر نگاہ پڑتے ہی اس کے پورے بدن میں خوشی کی لہر دوڑ گئی تھی اور یہ جانتے ہوئے بھی کہ نادیہ کے ساتھ اس کا شوہر بھی کھڑا ہے، اس کی تمام تر توجہ نادیہ پر ہی تھی، امیر علی نے ان کے بیٹھتے ہی چائے پیش کر دی تھی اور خود بھی ایک صوفے پر بیٹھا چائے پینے لگا تھا۔

"ہمارے کام کا کیا بنا......؟" جواد نے بیٹھتے ہی کام کی بات شروع کر دی تھی۔

"تمہارا کام بھی ہو جائے گا...... پہلے تمام معاملات تو طے ہو جائیں......" امیر علی نے نادیہ کی آنکھوں میں جھانکتے ہوئے کہا تھا۔

"کیسے معاملات......؟" جواد نے جھٹ سے سوال کیا تھا۔

"بھئی کیا لینا ہے...... کیا دینا ہے...... آخر تم لوگوں کی خاندانی موٹر سائیکل تھانے سے لا کر تمہارے حوالے کرنی ہے...... یہ اتنا آسان کام تو نہیں...... مجھے بھی تو معلوم ہو کہ بدلے میں مجھے کیا ملے گا......"

"اگر اجازت ہو تو میں واش روم سے ہو آؤں...... پھر سکون سے بیٹھ کر تمام معاملات کو آخری شکل بھی دے لیں گے......" جواد نے اجازت طلب نظروں سے امیر علی کی طرف دیکھتے ہوئے کہا تھا اور پھر واش روم جانے کے لئے اٹھ کھڑا ہوا تھا۔

جواد کا واش روم میں جانا امیر علی کی بھی شدید ترین خواہش تھی تاکہ وہ اس موقع سے فائدہ اٹھاتے ہوئے نادیہ سے دو گھڑی باتیں کر سکے۔

"تم ابھی تک اس مکروہ صورت شخص کے ساتھ جڑی ہوئی ہو......؟" جواد کے جاتے ہی امیر علی نے نادیہ کے قریب ہوتے ہوئے بات کی تھی۔

"کیا کروں اس کے ساتھ بندھن ہی ایسا ہے کہ میں اسے چھوڑنا بھی چاہوں تو چھوڑ نہیں سکتی......" نادیہ نے معصومیت سے جواب دیا تھا۔

"یہ کنجوس مکھی چوس کسی بھی طرح تمہارے قابل نہیں...... تمہیں تو کسی ہینڈسم، اسمارٹ اور خوبرو نوجوان کی جیون ساتھی ہونا چاہئے......"

"جو نصیب میں لکھا تھا، وہ تو ہو گیا...... اب پچھتانے سے کیا حاصل......"

"نصیبوں کا رونا رونے کی بجائے اپنے اردگرد نگاہ دوڑاؤ...... تمہیں بہت سے چاہنے والے مل جائیں گے......"

"پہلے ہماری بائیک والا معاملہ تو حل ہو جائے...... پھر ہی کچھ سوچ پاؤں گی......"

"امیر علی کے ہوتے ہوئے اس معمولی موٹر سائیکل کے لئے پریشان ہونے کی ہرگز ضرورت نہیں...... یہ معاملہ تو میں ایسے چٹکیوں میں حل کر دوں گا......" امیر علی نے اپنے دائیں ہاتھ سے چٹکی بجاتے ہوئے کہا تھا۔

''اگر ہزار دو ہزار زیادہ چاہئیں تو ہم وہ بھی دینے کو تیار ہیں...... بس کسی طرح ہمیں وہ بائیک مل جائے ورنہ خاندان کے لوگ ہم پر ہنسیں گے......''

''کیوں شرمندہ کرتی ہو...... تم کہو تو جو رقم طے ہوئی ہے، وہ بھی نہ لوں...... بس مجھے ایک دن کی مہلت دے دو...... میں ہر حال میں موٹر سائیکل تمہارے حوالے کردوں گا......''

ابھی ان دونوں کے درمیان بات چل رہی تھی کہ جواد واش روم سے نکل کر وہاں آ بیٹھا تھا۔

''اب بتائیں کیا حکم ہے......؟'' جواد نے بیٹھتے ہی بات کی تھی۔

''میں نے کیا حکم کرنا ہے...... بس جو رقم اس روز طے ہوئی تھی وہی دے دیں اور ایک دن بعد اپنی موٹر سائیکل لے لیں......''

''رقم تو میں دے دیتا ہوں...... مگر اب مزید تاخیر نہیں ہونی چاہیے......''

''تم لوگ بے فکر ہو کر جاؤ...... بس اتنا یاد رکھنا ...... امیر علی جو کہتا ہے وہ کر کے دکھاتا ہے......''

امیر علی کی بات سن کر جواد نے جیب سے رقم نکال کر امیر علی کے حوالے کر دی تھی، جسے گن کر اس نے احتیاط سے اپنی جیب میں رکھ لیا تھا، تمام معاملات طے ہو چکے تھے، اب جواد اور نادیہ کا وہاں بیٹھے رہنا فضول تھا، اس لئے وہ دونوں ایک ساتھ اٹھ کھڑے ہوئے تھے۔

امیر علی انہیں چھوڑنے کے لئے باہر دروازے تک جانا چاہتا تھا، مگر اسی لمحے ڈرائنگ روم کا دروازہ کھلا تھا اور پولیس یونیفارم پہنے شاہین اندر داخل ہوئی تھی، بیوی کو اچانک اور بے وقت سامنے پا کر امیر علی کی حالت غیر ہو گئی تھی، گھبراہٹ کی وجہ سے اس کے ماتھے پر پسینے کی بوندیں چمکنے لگی تھیں اور وہ بری طرح بوکھلا گیا تھا۔ امیر علی نے خود پر قابو پانے کی بھرپور کوشش کی تھی مگر اس کی حالت بیوی سے چھپی نہیں رہ سکی تھی، شاہین نے خاوند کے ساتھ کھڑے اجنبی جوڑے کو گھورتے ہوئے دیکھا تھا لیکن وہ کوئی بھی بات کئے بغیر تیزی سے وہاں سے نکل گئے تھے، اس لئے شاہین انہیں پہچان نہیں پائی تھی۔

''یہ کون لوگ تھے......؟ اور میرے آتے ہی یہاں سے کھسک کیوں گئے......؟؟'' شاہین نے قریب ہی سر جھکائے کھڑے شوہر سے بارعب آواز میں دریافت کیا تھا۔

''وہ...... وہ...... وہ تو ساتھ والوں کے مہمان تھے...... بے چارے غلطی سے ہمارے ہاں آ گئے تھے......'' امیر علی نے بیوی کو ٹالنے کے لئے بہانہ گھڑتے ہوئے کہا تھا، مگر شاہین اتنی جلدی کہاں ٹلنے والی تھی۔

''ساتھ والوں کے مہمان غلطی سے ادھر آئے لیکن تم نے انہیں چائے پیئے بغیر جانے نہیں دیا......'' شاہین نے میز پر پڑے چائے کے برتن دیکھ کر طنزیہ بات کی تھی۔

''غلطی سے ہی سہی، گھر آئے مہمان کی خاطر تواضع کرنا ہمارا اخلاقی فرض ہے......''

''اس کے علاوہ بھی بہت سے فرائض ہوتے ہیں......''

''اب چھوڑو بھی ناں...... تم نے تو گھر میں بھی تھانے کی طرح تفتیش شروع کر دی ہے......''

''اس لئے کہ کسی بھی مشکوک شخص کے بارے میں مکمل تفتیش کرنا میرے فرائض میں شامل ہے......''

''اچھا اب گھر آ گئی ہو تو پولیس افسر سے بیوی بن جاؤ اور یہ بتاؤ کہ آج اتنی جلدی کیسے آ گئیں......''

''میں یہاں سے گزر رہی تھی...... سوچا جاتے جاتے تمہیں کھانے کا پوچھ لوں......''

''دیکھا...... یہ ہوتی ہے اچھی بیوی کی نشانی...... وہ جہاں کہیں بھی ہو، اسے شوہر کی فکر لگی ہوتی ہے......''

''اب زیادہ مکھن لگانے کی کوشش نہ کرو...... میں

تمہارے لئے کھانا گرم کر دیتی ہوں، آرام سے بیٹھ کر کھالینا......"

"تم میرے ساتھ نہیں کھاؤ گی......؟"

"نہیں......"

"نہیں کھاتی تو نہ کھاؤ، مجھے بھی کوئی خاص شوق نہیں تمہارے ساتھ بیٹھ کر کھانا کھانے کا" امیر علی کے دل سے آواز اٹھی تھی، مگر لب خاموش رہے تھے۔

"میرے پاس اتنا وقت نہیں...... مجھے واپس تھانے پہنچنا ہے......" شاہین نے بات کی اور تیزی سے کچن کی طرف بڑھ گئی تھی، کچھ ہی دیر میں اس نے کھانا گرم کر کے امیر علی کے سامنے رکھ دیا تھا اور خود وہاں سے نکل گئی تھی۔

بیوی کے جانے پر امیر علی نے سکھ کا سانس لیا تھا اور جلدی سے کھانا زہر مار کر کے کسی گہری سوچ میں ڈوبتا چلا گیا تھا، اس نے ایک دن بعد تھانے میں کھڑی موٹر سائیکل ان کے حوالے کرنے کے وعدے پر رقم لے کر جیب میں تو ڈال لی تھی لیکن اس شش و پنج میں پڑ گیا تھا کہ اس معاملے کو کس طرح سلجھا پائے گا، اس نے اس سلسلے میں شاہین کو ہر طرح سے منانے کی کوشش کر کے دیکھ لی تھی مگر وہ اس کی بات سننے کے لئے ہرگز تیار نہ تھی، اس لئے اسے خود ہی کچھ کرنا تھا، پھر کافی سوچ بچار کے بعد اس نے تمام تر منصوبہ بندی کر لی تھی اور بے پروائی سے وہیں صوفے پر لیٹ گیا تھا۔

......☆☆☆......

ان کی کوشش تھی کہ تھانے سے موٹر سائیکل غائب ہونے کی بات تھانے کی حدود سے باہر نہ نکلے، مگر ایسا نہیں ہو سکا تھا۔ تھانے میں ڈی ایس پی صاحب کے خاص کارندوں نے فوراً سے پہلے یہ خبر ان کے کانوں میں ڈال دی تھی، لیکن اس سے بھی پہلے ڈی ایس پی صاحب کو یہ اطلاع مل چکی تھی کہ جو مشکوک موٹر سائیکل تھانے میں بند کی گئی تھی، اس میں ہیروئن چھپا کر لے جائی جا رہی تھی، جسے ان لوگوں نے کمال ہوشیاری سے تھانے کے عملے کی آنکھوں میں دھول جھونک کر غائب کروا دیا تھا۔

ڈی ایس پی صاحب نے تھانیدار اور سب انسپکٹر کو فوری طور پر اپنے پاس بلایا تھا، ڈی ایس پی صاحب کا پیغام ملتے ہی وہ سمجھ گئے تھے کہ صاحب کا انہیں اچانک بلانا کسی خطرے سے خالی نہیں تھا، وہ دونوں ہی بلا تاخیر ڈی ایس پی صاحب کے آفس پہنچ گئے تھے، کمرے میں داخل ہوتے ہی ڈی ایس پی صاحب نے ان پر چڑھائی کر دی تھی۔

"میں حیران ہوں...... تم کیسے محافظ ہو کہ وہ لوگ تمہاری نظروں کے سامنے تھانے سے بائیک لے گئے اور تمہیں خبر تک نہ ہوئی......" ڈی ایس صاحب نے تلخ لہجے میں بات کی تھی۔

"سر آپ فکر نہ کریں...... ہم اس معاملے کی انکوائری کر رہے ہیں اور علاقے کی ناکہ بندی بھی کر دی گئی ہے...... وہ لوگ کہیں جا نہیں پائیں گے......" تھانیدار نے ڈرتے ڈرتے جواب دیا تھا۔

"لیکن تم لوگ اتنا یاد رکھنا، اگر وہ لوگ بائیک لے کر علاقے سے نکل گئے تو یہ تم سب کے لئے اچھا نہیں ہوگا......" ڈی ایس پی صاحب سانس لینے کے لئے رکے اور پھر اپنی بات جاری رکھتے ہوئے بولے......" اور تمہاری اطلاع کے لئے یہ بھی بتا دوں کہ اس بائیک کو کسی بھی حالت میں پکڑنا اس لئے بھی بہت ضروری ہے کہ اس میں ہیروئن چھپا کر لے جائی جا رہی ہے......" صاحب کے منہ سے نیا انکشاف سن کر تھانیدار اور سب انسپکٹر کے منہ کھلے کے کھلے رہ گئے تھے اور وہ کچھ پل کے لئے آنکھیں جھپکنا بھی بھول گئے تھے۔

"تم تو بہت فرض شناس پولیس آفیسر ہو، پھر تمہاری موجودگی میں یہ سب کیسے ہو گیا......؟؟" اس بار صاحب کی توپوں کا رخ سب انسپکٹر شاہین کی طرف تھا، جو اپنی کوتاہی پر گردن جھکائے خاموش کھڑی تھی،

تھانیدار کی حالت بھی اس سے مختلف نہیں تھی، اس لئے اس نے بھی زبان بندی کر رکھی تھی۔

"اب اس طرح خاموش کھڑے رہنے سے کچھ حاصل ہونے والا نہیں...... جاؤ اور کسی بھی طرح چوبیس گھنٹے کے اندر ہیروئن سمیت وہ موٹر سائیکل پکڑ کر تھانے میں لاؤ، ورنہ تم لوگوں کی پیٹی اترتے دیکھ کر مجھے ذرا بھی تکلیف نہیں ہوگی......" ڈی ایس پی صاحب نے انہیں خاموش کھڑے دیکھ کر چیختے ہوئے وارننگ دی تھی، یہ سب سن کر ان کا مزید وہاں رکے رہنا خطرے کو دعوت دینے کے مترادف تھا، اس لئے وہ خاموشی سے ایک دوسرے کے پیچھے چلتے ہوئے وہاں سے نکل گئے تھے۔

صاحب کی جھاڑ سننے کے بعد اب تھانیدار کو اپنا غصہ نکالنا تھا، وہ تھانے سے نکلتے ہی گاڑی میں پیچھے بیٹھی سب انسپکٹر کی طرف گھورتے ہوئے سخت لہجے میں بولا تھا...... "غلطیاں تم لوگ کرتے ہو اور سننی مجھے پڑتی ہیں......"

"سر ایسا لگتا ہے جیسے ہمارے درمیان کوئی کالی بھیڑ ہے، جس نے تھانے سے موٹر سائیکل غائب کروانے میں ان لوگوں کی مدد کی......" مسلسل جھاڑیں سننے سے تھوڑی ہی دیر میں شاہین کا چہرہ اتر گیا تھا لیکن اس کے باوجود اس نے ہمت سے کام لیتے ہوئے بات کی تھی۔

"اب مجھے کچھ نہیں سننا...... وقت بہت کم ہے، مجھے صرف رزلٹ چاہئے......" شاہین کی بات کا جواب دینے کی بجائے تھانیدار نے اسے ڈانٹ پلا دی تھی، اس لئے وہ خاموش رہی تھی، اس کے بعد پولیس اسٹیشن پہنچنے تک ان کے درمیان کوئی بات نہیں ہوئی تھی۔ وہ تھانے پہنچے تو ان دونوں کے اترے ہوئے چہرے دیکھ کر تھانے کے عملے نے اس بات کا بخوبی اندازہ لگا لیا تھا کہ انہیں صاحب نے خوب سنائی ہیں۔ پولیس اسٹیشن میں داخل ہوتے ہی شاہین کسی سے بات کئے بغیر اپنی کرسی پر جا بیٹھی اور اپنا سر دونوں ہاتھ میں لے کر تھوڑا تھوڑا دبانے لگی تھی، اس نے بیٹھتے ہی اپنے لئے چائے لانے کو کہا تھا اور کرسی سے ٹیک لگا کر آنکھیں بند کر لی تھیں، تھوڑی ہی دیر میں چائے والا چائے کا کپ اس کے سامنے رکھ گیا تھا، وہ چائے پیتے ہوئے موٹر سائیکل کے متعلق کڑیاں ملانے لگی تھی، لیکن اس کے ہاتھ کوئی سرا نہیں لگ رہا تھا، مگر جب کڑی سے کڑی ملی تو اس کی آنکھیں پھیلتی چلی گئی تھیں اور اسے یہ سمجھنے میں ذرا سی بھی دیر نہیں لگی تھی کہ اس سارے معاملے کے پیچھے امیر علی کا ہاتھ ہے۔

ایسا بہت کم ہوا تھا جب شاہین کو اس کی نااہلی کی وجہ سے اپنے کسی بڑے آفیسر سے ڈانٹ پڑی تھی، لیکن اس روز ایک ہی دن میں اسے ڈی ایس پی صاحب اور تھانیدار کی باتیں سننا پڑی تھیں، اس لئے بہت ڈسٹرب تھی۔ اس کی کوشش ہوتی تھی کہ اگر اسے کوئی زیادہ ضروری کام نہ ہو تو وقت پر گھر پہنچ جائے، اس روز اس نے دن بھر کچھ زیادہ کام نہیں کیا تھا، لیکن درد کی شدت سے سر پھٹا جا رہا تھا، اس کا دل چاہ رہا تھا کہ گھر جا کر آرام کرے مگر خاوند کا سامنا کرنے سے کترا رہی تھی، اس لئے خیالوں میں گم اپنی سیٹ پر بیٹھی تھی، وہ دیر تک اسی حالت میں اپنی سیٹ پر بیٹھی رہی، لیکن بلاوجہ وہاں بیٹھے رہنا بھی مناسب نہیں تھا، اس لئے مجبوراً بے دلی سے اٹھی اور گھر کی طرف چل پڑی تھی۔

وہ گھر پہنچی تو روز کی طرح امیر علی گھر میں موجود تھا، مگر اس روز اس نے چہرے پر مسکراہٹ سجائے اس کا استقبال کیا تھا نہ دیر سے آنے کی بابت ہی کوئی سوال کیا تھا، وہ اس کے پاس رکے بغیر خاموشی سے بیڈروم میں گھس گئی تھی۔ وہ چاہتی تو گھر پہنچتے ہی اس پر برس پڑتی مگر وہ اس انتظار میں تھی کہ شاید امیر علی اپنی غلطی پر شرمندہ ہو کر خود بات کا آغاز کرے، لیکن ایسا نہیں ہوا تھا، شاہین غصے میں بھری بیٹھی تھی، اس لئے اگلے ہی

لمحے بیوی سے پولیس آفیسر بن کر اس کے سامنے آ کھڑی ہوئی تھی۔

"یہ پہلا موقع نہیں...... اس سے قبل بھی مجھے تمہارے بارے میں کئی بار شکایات ملی تھیں، لیکن میں نے کبھی ان پر کان نہیں دھرا تھا اور ہمیشہ سنی ان سنی کر دی تھی...... مگر اب سب کچھ جانتے بوجھتے ہوئے بھی میں خود کو کیسے سمجھاؤں...... کیونکہ وہ موٹر سائیکل جسے حاصل کرنے کے لئے دو روز قبل تم میرے سامنے جھوٹی سچی کہانیاں بنا رہے تھے اور میں نے انکار کر دیا تھا...... میرے انکار پر تم نے دوسرا راستہ اپنا کر وہی موٹر سائیکل تھانے سے غائب کروا دی...... ویسے تمہاری اطلاع کے لئے بتا دوں کہ اس موٹر سائیکل میں ہیروئن لے جائی جا رہی تھی......" شاہین نے چیختے ہوئے امیر علی سے کہا تھا۔

بیوی کی بات سن کر امیر علی نے کوئی جواب نہیں دیا تھا، اسے بت بنے کھڑے دیکھ کر شاہین چلا اٹھی تھی...... "میں تو یہ سوچ کر پریشان ہو رہی ہوں کہ تم نے محض چند روپوں کی خاطر موٹر سائیکل ان کے حوالے کر کے میری عزت اور ملازمت داؤ پر لگا دی ...... لیکن آج یہ احساس بھی ہوا کہ وہ تم جیسے لوگ ہی ہوتے ہیں جو تھوڑے سے فائدے کے لئے اپنا ایمان تک بیچنے کو تیار ہو جاتے ہیں......"

"جیسا تم سوچ رہی ہو، میں نے ایسا کچھ بھی نہیں کیا......" امیر علی نے انتہائی ڈھٹائی سے کہا تھا۔

"جھوٹ مت بولو امیر علی...... مجھے تو تمہاری بیوقوفی اور گھٹیا سوچ پر ہی رونا آ رہا ہے......"

"تو رو لو...... کس نے منع کیا ہے......" امیر علی نے دل ہی دل میں کہا تھا، مگر یہ الفاظ ادا کرنے کی ہمت نہیں ہوئی تھی۔

غصے کی حالت میں مسلسل چلانے کی وجہ سے اس کی سانس اکھڑ گئی تھی، اس لئے وہ سانس لینے کے لئے رکی تھی، پھر ایک لمبی سانس لے کر چھوڑتے ہوئے بولی...... "یہ مت بھولنا کہ میں تمہاری بیوی ہی نہیں، قانون کی محافظ بھی ہوں اور کل کسی بھی وقت تھانے کی حدود سے موٹر سائیکل چوری کرنے اور ہیروئن سمگل کرنے کے الزام میں اپنے ہاتھوں سے تمہیں سلاخوں کے پیچھے دھکیل دوں گی......"

اتنا کچھ سننے کے بعد بھی امیر علی خاموش کھڑا تھا، اس کی خاموشی شاہین کے غصے میں مزید اضافہ کر رہی تھی، اس سے پہلے کہ وہ غصے کی حالت میں کچھ الٹا سیدھا کر بیٹھتی، وہاں سے نکل کر بیڈ پر جا لیٹی تھی، جبکہ امیر علی وہیں صوفے پر ہی ڈھیر ہو گیا تھا۔

......☆☆☆......

شاہین کو زندگی میں کبھی اس طرح کے حالات سے گزرنا نہیں پڑا تھا، اس لئے اسے انتہائی دکھ ہو رہا تھا، وہ نہیں جانتی تھی کہ اگلی صبح اس کے ساتھ کیا ہونے والا تھا، اس لئے بار بار کروٹیں بدل رہی تھی، مگر اسے یہ خبر نہ تھی کہ ٹی وی لاؤنج میں صوفے پر لیٹا اس کا شوہر بھی اسی کیفیت سے گزر رہا تھا۔

امیر علی بیوی کے غصے سے اچھی طرح واقف تھا، وہ جو کہتی تھی وہ کر گزرتی تھی، اس لئے امیر علی ڈر کے مارے رات بھر کانپتا رہا اور اسے اس خوف سے نیند بھی نہیں آئی تھی کہ آئندہ اسے کن حالات سے گزرنا تھا، دوسری طرف اس نے جب سے شاہین کے منہ سے موٹر سائیکل میں ہیروئن چھپائی جانے والی بات سنی تھی، تب سے وہ یہ سوچ کر خود کو لعنت ملامت کر رہا تھا کہ اس کے ذہن میں یہ بات کیوں نہ آئی کہ وہ لوگ ایک پھٹیچر اور بے کار موٹر سائیکل کے لئے اتنی بڑی رقم کیوں دے رہے تھے، جبکہ ان سے آدھے پیسوں کے عوض اس سے اچھی حالت میں موٹر سائیکل با آسانی خریدی جا سکتی تھی۔

اس نے رات بھر صبح ہونے کا انتظار کیا تھا، پھر جیسے ہی صبح ہوئی وہ خاموشی سے اٹھ کر باہر نکل گیا تھا، وہ بیوی کے اٹھنے سے پہلے واپس اپنی جگہ پر آ کر لیٹ جانا چاہتا

تھا تا کہ شاہین کو اس کے اٹھ کر جانے کی خبر نہ ہو، امیر علی نے چپکے سے اپنی موٹر سائیکل نکالی اور اسے اسٹارٹ کئے بغیر گھسیٹتا ہوا دور تک لے گیا تھا، اس نے اس خوف سے موٹر سائیکل اسٹارٹ نہیں کی تھی کہ کہیں شاہین کی آنکھ نہ کھل جائے، اسے جب اس بات کی تسلی ہو گئی کہ وہ گھر سے کافی دور نکل آیا ہے اور اب موٹر سائیکل کی آواز شاہین کے کانوں تک نہیں پہنچے گی، تو اس نے موٹر سائیکل اسٹارٹ کی اور تیزی سے اس دوست کے گھر کی طرف بڑھنے لگا جہاں اس نے چند سو روپے تھانے کے گیٹ پر کھڑے سپاہی کی مٹھی میں رکھنے اور تھوڑی سی خوشامد کے عوض پچھلے روز ہی تھانے سے موٹر سائیکل لا کر کھڑی کی تھی۔

دوست کے ہاں پہنچتے ہی اس نے ڈور بیل بجا دی تھی، بیل کی آواز سنتے ہی اس کا دوست آنکھیں ملتا ہوا باہر نکلا تھا اور امیر علی کو دروازے پر کھڑے دیکھ کر پریشان ہوئے بغیر نہیں رہ سکا تھا" اتنی صبح صبح آئے ہو...... خیر تو ہے......؟" دوست نے امیر علی کو حیران کن نظروں سے دیکھتے ہوئے پوچھا تھا۔

امیر علی نے پہلے سے ہی اس طرح کے سوالات کا جواب سوچ رکھا تھا، اس لئے جھٹ سے بولا....." دراصل موٹر سائیکل کے کاغذات موٹر سائیکل میں ہی تھے...... ان کاغذات کی فوری ضرورت تھی، اس لئے مجھے اتنی صبح آنا پڑا، ورنہ میں اس وقت تمہیں ڈسٹرب نہ کرتا......"

"کوئی بات نہیں، تم کاغذات لے لو...... میں یہیں کھڑا ہوں"

موٹر سائیکل اسی جگہ دیوار کے ساتھ لگی دکھائی دے رہی تھی، جہاں وہ پچھلے روز کھڑی کر گیا تھا، وہ جلدی سے آگے بڑھا اور موٹر سائیکل میں سے اپنی مطلوبہ چیز تلاش کرنے لگا، اس کا دوست ابھی تک وہیں کھڑا اس پر نگاہ رکھے ہوئے تھا، اس لئے امیر علی بوکھلاہٹ کا شکار تھا، کیونکہ اسے معلوم نہ تھا کہ ان لوگوں نے ہیروئن کہاں چھپا رکھی تھی۔ دوست کچھ دیر تک وہاں کھڑا امیر علی کی حرکات دیکھتا رہا، پھر واش روم جانے کا کہہ کر وہاں سے چلا گیا تھا، دوست کے جانے پر امیر علی نے سکھ کا سانس لیا تھا اور تیزی سے ادھر ادھر ہاتھ مارنے لگا تھا، اس نے موٹر سائیکل کے چاروں طرف گھوم کر سیٹ اور پیٹرول ٹینکی کے نیچے بغور دیکھا تھا لیکن اسے مایوسی ہوئی تھی۔

سیٹ اور پیٹرول ٹینکی کے نیچے ہیروئن کہیں دکھائی نہیں دی تھی، اس لئے اس نے بیٹری کی جگہ نگاہ دوڑائی تھی، جہاں انتہائی احتیاط سے ہیروئن چھپائی گئی تھی، اس نے ادھر اُدھر دیکھ کر جلدی سے ہیروئن والا لفافہ اپنی جیب میں ٹھونس لیا تھا، دوست ابھی تک واش روم سے واپس نہیں آیا تھا، اس سے پہلے کہ وہ آ کر طرح طرح کے سوال کرتا امیر علی تیزی سے وہاں سے نکل گیا تھا اور باہر نکلتے ہی جلدی سے اپنی موٹر سائیکل اسٹارٹ کر کے وہاں سے دوڑ لگا دی تھی اور پھر پیچھے مڑ کر بھی نہیں دیکھا تھا۔

امیر علی نے بیوی کے ڈر سے گھر سے دور ہی موٹر سائیکل بند کر دی تھی اور اسے دھکیلتا ہوا گھر پہنچا تھا، گھر پہنچتے ہی اس نے ہیروئن ٹھکانے لگائی تھی، موسم کافی خوشگوار تھا لیکن موٹر سائیکل دھکیلنے اور بیوی کے خوف سے اس کا سارا بدن پسینے سے بھیگا ہوا تھا، وہ جیسے ہی کمرے میں داخل ہوا تو وہی ہوا تھا جس کا اسے ڈر تھا، شاہین بیدار ہو چکی تھی اور اب بیڈ پر بیٹھی اس کا انتظار کر رہی تھی۔

"تم اتنی صبح کہاں گئے تھے......؟" شاہین نے امیر علی کو دیکھتے ہی بارعب آواز میں دریافت کیا تھا۔

"مم...... مم...... میں...... میں تو قریب ہی پارک میں واک کرنے گیا تھا" امیر علی نے بیوی کے اچانک سوال پر بمشکل جواب دیا تھا۔

"واک اور تم......؟؟" شاہین نے امیر علی کو گھورتے ہوئے کہا تھا۔

''بس آج آنکھ کھل گئی تھی، سوچا صبح کی تازہ ہوا سے لطف اندوز ہونا چاہئے..... اس لئے پارک میں چلا گیا تھا''

''تمہاری بات پر یقین کرنے کو دل تو نہیں مانتا، مگر تم کہہ رہے ہو تو مان لیتی ہوں..... ورنہ اس وقت تو تم میرے بار بار جگانے پر بھی کبھی نہیں اٹھتے ....." شاہین نے دل کی بات کہہ ڈالی تھی۔

''آج بھی تمہاری وجہ سے ہی اٹھا ہوں..... الو کی پٹھی.....'' امیر علی نے ہونٹوں کو جنبش دیے بغیر کہا تھا۔

بیڈروم میں داخل ہونے سے قبل امیر علی کی آنکھوں میں نیند بھری ہوئی تھی، مگر وہاں پہنچتے ہی بیوی کی جلی کٹی سن کر اس کی نیند اڑ گئی تھی، اس لئے وہ لیٹنے کی بجائے واش روم میں گھس گیا تھا۔

......☆☆☆......

وہ رات کو کچھ دیر کے لئے ہی سو پائی تھی، لیکن اس کے باوجود معمول سے کچھ پہلے ہی ڈیوٹی پر جانے کے لئے گھر سے نکل پڑی تھی اور تھانے میں پہنچتے ہی تھانے میں ڈیوٹی انجام دینے والے تمام ملازمین سے باری باری موٹر سائیکل کے متعلق معلومات حاصل کرنے لگی تھی، لیکن ابھی تک اسے کام کی کوئی بات سننے کو نہیں ملی تھی۔

ایک ہی جھٹکے میں موٹی رقم ہاتھ لگی تھی، جس کی وجہ سے وہ بہت خوش تھا، مگر اسے کیا معلوم تھا کہ اس موٹر سائیکل میں ہیروئن لے جائی جا رہی تھی، شاہین کی زبانی ہیروئن کے بارے میں پتہ چلنے پر اس نے ہیروئن تولا کر چھپا دی تھی، لیکن اب وہ مسلسل یہی سوچ رہا تھا کہ موٹر سائیکل بھی انہیں نہ دے تا کہ کسی پریشانی کا سامنا نہ کرنا پڑے، مگر اس صورت میں ان سے لی ہوئی رقم ہاتھ سے جاتی تھی، اس لئے وہ فیصلہ نہیں کر پا رہا تھا کہ ان حالات میں کیا کرے، اسی دوران اس کے موبائل کی بیل بج اٹھی تھی، جس کی وجہ سے اس کی سوچ کا سلسلہ ٹوٹ گیا تھا۔

''سر..... کیسے ہیں آپ.....؟'' فون کان کو لگاتے ہی ایک مترنم آواز امیر علی کے کانوں میں رس گھول گئی تھی۔

''حکم کیجئے میں آپ کی کیا خدمت کر سکتا ہوں.....؟'' امیر علی نے انتہائی نرم لہجے میں بات کی تھی۔

''میں نادیہ بول رہی ہوں..... اور موٹر سائیکل کے لئے فون کیا تھا''

''آپ کچھ مانگیں تو کوئی پاگل ہی ہو گا جو انکار کرے گا.....''

''تو ہم موٹر سائیکل لینے آجائیں.....؟''

''آپ کا حکم ہو تو جہاں آپ کہیں، وہاں میں خود پہنچا دیتا ہوں''

''نہیں نہیں..... آپ تکلیف نہ کریں، جہاں آپ کہتے ہیں، ہم خود وہاں پہنچ جاتے ہیں''

''چلیں اسی بہانے آپ سے دو پیار بھری باتیں بھی ہو جائیں گی''

''آپ بھی بڑے وہ ہیں..... شرارتوں سے باز نہیں آتے.....''

''اچھا میں آپ کو ایڈریس سمجھا دیتا ہوں..... آپ ابھی وہاں پہنچ جائیں، میں بھی وہیں ہوں گا، وہیں آپ لوگوں کو موٹر سائیکل مل جائے گی.....'' امیر علی نے بات کی اور ایڈریس بھی سمجھا دیا تھا، ساتھ ہی کال کاٹ دی گئی تھی، مگر اس کے باوجود وہ کچھ دیر تک یونہی موبائل کان سے لگائے کھڑا رہا تھا۔

امیر علی کو نادیہ کے سحر سے نکلنے میں کچھ دیر لگی تھی، اسے خیال آیا کہ کچھ پل قبل ہی اس نے موٹر سائیکل ان کے حوالے نہ کرنے کا پروگرام بنایا تھا، پھر فون آنے پر وہ انکار کیوں نہیں کر پایا تھا، اب اسے وعدے کے مطابق فوری طور پر اس دوست کے گھر پہنچنا تھا، جہاں آنے کے لئے نادیہ سے کہا تھا، لیکن اس نے سوچ لیا تھا کہ وہ کوئی نہ کوئی بہانہ بنا کر انہیں ٹال دے گا۔ وہ

مطلوبہ جگہ پہنچا تو جواد اور نادیہ وہاں کھڑے اس کا انتظار کر رہے تھے، امیر علی پر نظر پڑتے ہی نادیہ نے مسکراتے ہوئے اس کی طرف دیکھا تھا، اس کی ایک ہی مسکراہٹ نے امیر علی کے ارادوں کو پاش پاش کر ڈالا تھا، دوست کے گھر کا دروازہ کھلنے پر وہ اندر گیا اور فوراً ہی موٹر سائیکل لے کر باہر آ گیا، اسے دیکھتے ہی جواد نے تیزی سے آگے بڑھ کر موٹر سائیکل پکڑ لی تھی اور امیر علی کو دھکا لگانے کو کہا تھا، ذرا سا دھکا لگانے سے موٹر سائیکل اسٹارٹ ہو گئی تھی، موٹر سائیکل اسٹارٹ ہوتے ہی نادیہ جواد کے پیچھے بیٹھ گئی تھی، پھر وہ وہاں رکے بغیر تیزی سے وہاں سے نکل گئے تھے اور امیر علی ان کو جاتے ہوئے دیکھتا رہ گیا تھا، ان کے چلے جانے کے بعد امیر علی خود کو کوسنے لگا تھا کہ وہ موٹر سائیکل ان کے حوالے نہ کرنے کا سوچ کر وہاں آیا تھا مگر پھر موٹر سائیکل ان کے حوالے کیوں کر دی تھی۔

......☆☆☆......

شاہین نے اپنے طور پر بھرپور کوشش کر کے دیکھ لی تھی مگر ابھی تک وہ کالی بھیڑ اس کے ہاتھ نہیں لگی تھی، جس کی وجہ سے اسے ٹوٹ کر بکھر جانے والے حالات کا سامنا کرنا پڑ رہا تھا، جیسے جیسے وقت گزرتا جا رہا تھا، اس کا پارہ چڑھتا جا رہا تھا، اسی لمحے موبائل کی گھنٹی بج اٹھی تھی۔

"ہاں بولو......" موبائل پر حولدار کی آواز سنتے ہی شاہین نے کہا تھا۔

"مبارک ہو میڈم......"

"کس بات کی مبارک دے رہے ہو......؟"

شاہین نے جھنجلا کر پوچھا تھا۔

"میڈم ہم نے تھانے سے چوری ہونے والی موٹر سائیکل پکڑ لی ہے...... ساتھ ہی ایک نوجوان جوڑے کو بھی گرفتار کیا ہے......"

"شاباش...... مجھے اپنے چیتوں سے یہی امید تھی...... میں تھوڑی ہی دیر میں خود وہاں پہنچتی ہوں...... تب تک ان دونوں پر کڑی نظر رکھنا......"

شاہین نے بات کرتے ہی فون بند کر دیا تھا اور دو سپاہیوں کے ہمراہ تیزی سے نکل گئی تھی، اسے شوہر کی بیچ حرکت کے بارے میں جان کر دلی تکلیف ہوئی تھی مگر وہ اس کامیابی پر مسکرائے بغیر نہیں رہ سکی تھی۔

وہ پولیس ناکے پر پہنچی تو جواد اور نادیہ، حولدار کے حکم پر سڑک کے ایک طرف گھاس پر بیٹھے تھے اور دو سپاہیوں نے ان پر اسلحہ تان رکھا تھا، اسے دیکھ کر جواد اور نادیہ اپنی جگہ سے اٹھ کھڑے ہوئے تھے، شاہین کو انہیں پہچاننے میں زیادہ دیر نہیں لگی تھی، اس نے ان کے قریب جاتے ہی کوئی بات کئے بغیر دونوں کے چہروں پر زوردار تھپڑ رسید کر دیے تھے، یہ سب اس قدر اچانک ہوا تھا کہ جواد اور نادیہ کے ساتھ ساتھ حولدار اور سپاہی بھی حیران رہ گئے تھے۔

"تم لوگوں نے کیا سوچا تھا کہ تم جیسے چاہو دندناتے پھرو، کوئی تمہیں پوچھنے والا نہیں......" شاہین نے چیختے ہوئے کہا تھا، پھر حولدار کی طرف دیکھتے ہوئے بولی...... "تم ان دونوں کو گاڑی میں بٹھاؤ، وہاں تھانے میں میرے مہمان بن کر رہیں گے تو انہیں معلوم ہوگا کہ پولیس ان جیسے شیطانوں سے کیا سلوک کرتی ہے......"

"وہ تو ٹھیک ہے میڈم...... مگر......" حولدار نے اپنی بات ادھوری ہی چھوڑ دی تھی۔

"مگر کیا......؟"

"میڈم!...... موٹر سائیکل تو مل گئی...... لیکن ہیروئن نہیں ملی......" حولدار نے شاہین کے قریب ہوتے ہوئے آہستہ سے کہا تھا۔

حولدار کا اتنا کہنا تھا کہ شاہین کا پارہ مزید چڑھ گیا تھا اور اس نے ان دونوں پر چھڑیاں برسانا شروع کر دی تھیں، پولیس والوں کے ہاتھوں ایک نوجوان جوڑے کی سرِعام پٹائی ہوتے دیکھ کر وہاں بہت سے لوگ جمع ہونا شروع ہو گئے تھے، اس لئے بہتر تھا کہ اس بارے میں مکمل تفتیش تھانے میں پہنچ کر کی جائے۔ شاہین کے

حکم پر جواد اور نادیہ کو گاڑی میں بٹھا دیا گیا تھا اور موٹر سائیکل، پک اپ میں رکھوادی گئی تھی، حوالدار اور سپاہی بھی اسی پک اپ میں بیٹھے تھے مگر اس نے پک اپ کو اپنے آگے آگے چلنے کو کہا تھا تاکہ تھانے پہنچنے تک موٹر سائیکل اس کی نظر میں رہے، شاہین نے گاڑی میں بیٹھتے ہی موبائل پر تھانیدار کو موٹر سائیکل پکڑے جانے کی اطلاع دے دی تھی، لیکن جان بوجھ کر ہیروئن کے بارے میں کچھ ذکر نہیں کیا تھا۔

تھانے پہنچتے ہی شاہین نے جواد اور نادیہ پر خوب غصہ نکالا تھا اور ان پر ان گنت لاٹھیاں برسائی تھیں، لیکن ان کا بار بار یہی کہنا تھا کہ انہیں ہیروئن کے بارے میں کچھ علم نہیں، آخر کار وہ تھک ہار کر اپنی کرسی پر جا بیٹھی تھی، مگر ساتھ ہی ایک جھٹکے کے ساتھ اٹھ کھڑی ہوئی تھی اور گھر پہنچ کر ہی سانس لیا تھا، امیر علی پہلے سے ہی خوفزدہ تھا، بیوی کو اچانک سامنے پا کر اس پر کپکپی طاری ہو گئی تھی۔

"پہلے تو میں تمہیں یہ بتا دوں کہ وہ لوگ موٹر سائیکل سمیت گرفتار ہو چکے ہیں، لیکن ساتھ ہی اس بات کی سمجھ نہیں آ رہی کہ جو ہیروئن اس میں چھپا کر لے جائی جا رہی تھی، وہ کہاں غائب ہو گئی......" شاہین نے گھر پہنچنے پر امیر علی سے دریافت کیا تھا، مگر امیر علی نے اس کی بات کا کوئی جواب نہیں دیا تھا اور گردن جھکائے خاموش کھڑا تھا، اس لئے شاہین کو ہی بولنا پڑا تھا...... "امیر علی تمہاری یہ خاموشی مجھے مار ڈالے گی...... خدا کے لئے کچھ تو بتاؤ کہ تم نے اتنی بڑی بیوقوفی کیوں کی...... اور اگر وہ ہیروئن اس موٹر سائیکل میں کہیں موجود نہیں تو پھر کہاں گئی"

"میں اتنا بھی اناڑی نہیں ہوں......" امیر علی نے بیوی کی بے بسی دیکھ کر پہلی بار خاموشی کو توڑا تھا...... "جیسے ہی تمہاری زبانی مجھے معلوم ہوا کہ اس موٹر سائیکل میں ہیروئن چھپائی گئی تھی، میں نے اسی پل بیوقوف بنائے جانے پر خود کو لعنت ملامت کی اور موٹر سائیکل میں چھپائی گئی ہیروئن اپنے قبضے میں لے کر ٹوٹی پھوٹی موٹر سائیکل ان کے حوالے کر دی تھی، جسے مایوس ہو کر وہ کہیں بھی پھینک کر جا سکتے تھے......" امیر علی نے اعتراف جرم کرتے ہوئے بیوی کو ایک ہی سانس میں تمام تر تفصیلات سے آگاہ کر دیا تھا، پھر ہیروئن اور ان سے لی گئی رقم بھی لا کر شاہین کے حوالے کر دی تھی۔

"میں ان لوگوں کی گرفتاری پر اپنے رب کا جس قدر بھی شکر ادا کروں وہ کم ہو گا، اگر وہ لوگ پکڑے نہ جاتے تو میں تمہارا وہ حشر کرتی کہ دنیا توبہ توبہ کر اٹھتی......" شاہین بات کرتے ہوئے ایک پل کے لئے رکی تھی، پھر کرخت لہجے میں بولی...... "اب میری ایک بات کان کھول کر سن لو، آج کے بعد اگر تم بھی تھانے کے اندر تو کیا تھانے کے آس پاس بھی دکھائی دیے تو میں تمہاری ٹانگیں توڑ دوں گی......"

"ٹانگیں بے شک توڑ دینا...... مگر کبھی دل نہ توڑنا، کیونکہ اس دل میں تم بستی ہو......" امیر علی نے شاہین کی آنکھوں میں آنکھیں ڈالتے ہوئے شرارت بھرے انداز میں کہا تھا۔

امیر علی کا پھینکا ہوا تیر ٹھیک نشانے پر لگا تھا، شاہین جو کچھ دیر قبل خاوند پر برس رہی تھی، اس کی بات سن کر مسکرانے لگی تھی...... لیکن سب انسپکٹر شاہین کی مسکراہٹ کے پیچھے چھپی کہانی امیر علی سمجھ نہیں پایا تھا۔

اسے شاہین کی مسکراہٹ کا مطلب اس وقت سمجھ میں آیا جب آدھے گھنٹے بعد وہ پولیس کی حراست میں اسی تھانے جا رہا تھا جہاں شاہین سب انسپکٹر تھی کیونکہ جواد اور نادیہ نے دو چھتروں میں ہی ساری کہانی اگل دی تھی۔

قسط نمبر22

قلندر ذات

امجد جاوید

قلندر دو طرح کے ہوتے ہیں ایک وہ جو شکر گزاری کے اعلیٰ ترین مقام تک پہنچ کر قرب الہیٰ حاصل کرنے میں کامیاب ہو جاتے ہیں۔ رب تعالیٰ بھی ان کی خواہش کو رد نہیں کرتا۔ دوسرے وہ جو نات کے قلندر ہوتے ہیں۔ ان کا پیشہ بندر، ریچھ اور کتے نچانا ہوتا ہے۔ یہ کہانی ایک ایسے مرد آہن کی ہے جو نات کا قلندر تھا۔ اس نے ان لوگوں کو اپنی انگلیوں پر نچایا جو اپنے تئیں دنیا مسخر کرنے کی دھن میں انسانیت کے دشمن بن گئے تھے۔ انسانی صلاحیتوں کی ان رسائیوں کی داستان جہاں عقل دنگ رہ جاتی ہے اور فکر حیران۔ اس داستان کی انفرادیت کی گواہی آپ خود دیں گے۔ کیونکہ یہ محض خامہ فرسائی نہیں مقاصد کا تعین بھی کرتی ہے۔

''کیا کرنا چاہتی ہو تم؟'' جسپال نے دھیمے مگر سرد لہجے میں پوچھا۔

''انہیں بتا دینا چاہتی ہوں کہ انہوں نے ہم سے کھیلنے کی جرات کیسے کی؟'' وہ غصے کی انتہا پر تھی۔

''میں یہ نہیں کہتا کہ انہیں معاف کر دو، مگر یہ فیصلہ ایسے وقت میں کرو، جب تم غصے میں نہ ہو، کیا وہ اس انتظار میں نہیں ہوں گے کہ ہم کب ان پر ٹوٹ پڑتے ہیں اور وہ......'' جسپال نے اسے سمجھاتے ہوئے کہنا چاہا لیکن وہ اس کی بات کاٹتے ہوئے بولی۔

''جسپال! یہی وقت ہے۔ آج نہیں تو پھر کبھی نہیں۔ '' اس نے ہٹ دھرمی سے کہا تو جسپال نے فیصلہ کن لہجے میں کہا۔

''ٹھیک ہے جیسا تم چاہو۔''

''میرے خیال میں جسپال ٹھیک کہہ رہا ہے۔'' اروند سنگھ نے سوچنے والے انداز میں کہا۔

''کیا مطلب، تم کہنا کیا چاہتے ہو؟'' بانیتا نے کہا۔

''دیکھو، یہ تیواری والا معاملہ ختم ہی سمجھو۔ اب یہاں سے کچھ بھی نہیں سامنے آنے والا۔ ونود رانا نے جو کچھ کرنا تھا، وہ کر لیا۔ یہاں تک کہ وہ تم لوگوں کو کلین چٹ دے دے گا۔ تم لوگ کم از کم حکومت نگاہ میں بے گناہ ہو جاؤ گے اور آزادی سے گھوم پھر سکو گے۔ لیکن سوال یہ ہے کہ کیا واقعی تم لوگ آزادی سے گھوم پھر سکو گے؟'' اروند نے ان دونوں کی طرف دیکھتے ہوئے پوچھا۔

''نہیں اروند، ہمارے ارد گرد بہت سارے دشمن ہیں۔'' بانیتا نے کافی حد تک سکون سے جواب دیا۔

'' ہمارا دشمن بہت چالاک ہے، منافق اور خفیہ کارروائیاں کرنے والا ہے۔'' جسپال نے کہا۔

''تو پھر اسی کی چال اُس پر الٹ دو۔'' یہ کہہ کر اس نے بانیتا کے چہرے پر دیکھا، چند لمحے یونہی رہنے کے بعد وہ بولا۔

''ہم یہاں پوری طاقت میں نہیں ہیں۔ یہاں ہمارا کوئی نیٹ ورک نہیں، ہم دوسروں پر انحصار کرتے ہیں، دوسروں کا اپنا فائدہ ہے۔ اگر ہم یونہی دوسروں پر انحصار کرتے رہے تو ہم بھی استعمال ہوتے ہوئے خرچ ہو جائیں گے۔ یہ جگہ ہمارے لیے محفوظ نہیں۔ وہ جو آج ہمارے دوست ہیں، کسی وقت بھی ہمارے دشمن بن سکتے ہیں، خاص طور پر ٹی ایس کے لوگ۔ وہ کسی مقصد کے لیے نہیں صرف ''فائدے'' کے لیے لڑ رہے ہیں۔ انہیں ہماری اس جگہ کے بارے میں پوری معلومات ہے۔ اس لیے......'' اروند نے کہنا چاہا تو بانیتا اکتاتے ہوئے بولی۔

''تم کہنا کیا چاہتے ہو اروند۔''

''ہمیں وقت چاہئے، ذرا سا وقت۔ میں کہیں بھی بیٹھ جاؤں، مجھے اپنا کام کرنا ہے، لیکن میں جتنا محفوظ ہوں گا، تم لوگوں کے اتنے ہی کام آسکوں گا۔'' اس نے بتایا تو جسپال نے کہا۔

''اروند ٹھیک کہہ رہا ہے۔''

''وہ بات جو میں کہنا نہیں چاہ رہا تھا کہے دیتا ہوں کہ ہم یہاں کوئی کامیابی حاصل نہیں کر پائے ہیں، ہم ان یہودیوں کا کچھ نہیں بگاڑ سکے ہیں، جن کی پشت پر حکومت کی طاقت ہے۔'' اروند نے دھیمے لہجے میں اپنی رائے کا اظہار کیا

''کیا چاہتے ہو؟'' بانیتا نے پوچھا۔

''اگر دشمن کو اسی کے ہتھیار سے مارنا ہے تو پہلے ہمیں محفوظ ہونا ہوگا۔ ہمیں ان سے کھیلنا ہے۔'' اروند نے انہیں سمجھاتے ہوئے کہا۔

''تم جو چاہو، ہم وہی کرنے کو تیار ہیں۔ یہ جگہ بدلنا چاہتے ہو تو وہ بھی کر لیتے ہیں۔'' بانیتا نے کہا تو وہ پورے جوش سے بولا۔

''تو پھر میں دشمن کو اپنے پسندیدہ میدان میں لے آؤں گا۔ پھر جو چاہو سو کرنا۔''

اس کے یوں کہنے پر بانیتا اور جسپال نے ایک دوسرے کی طرف دیکھا۔ پھر بانیتا نے پوچھا۔

''کیا کرنا چاہتے ہو؟''

''اس وقت حکومت میں موجود یہودی لابی، شیو سینا اور یہودیوں کے درمیان یہی بات زیر بحث ہے کہ ممبئی میں یہ جو اِن کے مخالف لوگ پیدا ہوگئے ہیں یہ کون ہیں، ان کا سد باب کیسے کیا جائے اور اصل میں یہ لوگ چاہتے کیا ہیں؟ اسی کا جواب انہیں کوئی راستہ متعین کرنے میں مدد دے گا۔ وہ اس انتظار میں ہیں کہ ان کے پھیلائے ہوئے جال میں، ہم جا پھنسیں۔ ہمیں تھوڑا سا انتظار کرنا ہوگا۔ پوری پلاننگ کرنا ہوگی اور وہ پلاننگ میرے ذہن میں آچکی ہے۔'' اروند سنگھ نے کہا۔

''وہ کیا ہے؟'' جسپال نے پوچھا۔

''انہیں اس بات پر مجبور کر دیا جائے کہ ان کے بڑے سر جوڑ کر بیٹھیں۔ وہیں ان پر ایک کاری ضرب لگائی جائے۔ تاکہ یہ برس ہا برس اٹھ ہی نہ سکیں۔'' اس نے مسکراتے ہوئے کہا۔

''یہ کیسے ممکن ہوگا؟'' بانیتا نے کہا۔

''اب تم لوگوں کو میدان میں اترنے کی ضرورت نہیں ہے۔ اب وقت آ گیا ہے کہ بچھی ہوئی بساط پر مہرے اپنی ماضی سے چلو۔ کسی کی بساط پر خود مہرے نہ بنو۔'' اروند نے اعتماد سے کہا۔

''بساط اور مہرے؟ میں کچھ سمجھا نہیں اروند سنگھ جی؟'' جسپال نے اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے پوچھا۔

''اس دنیا میں بہت سا مفاد، بہت سارے لوگوں سے جڑا ہوا ہے، اگر کوئی کسی کو ٹریپ کرنے کے لیے اپنا جال بچھاتا ہے تو کیوں نہ اسی جال میں کسی دوسرے کو ٹریپ کر لیا جائے۔ جال بھی کسی دوسرے کا اور ٹریپ ہمارا دشمن ہو جائے۔'' اس نے جواب دیا۔

''تمہارا جواب مجھے پسند آیا اروند سنگھ۔ لیکن یہ خوش گمانی ہے۔ ایک تخلیقی یا غیر عملی شے اور پھر کیا اس کے لیے ہمارا ممبئی میں رہنا ضروری ہے یا نہیں؟'' بانیتا نے پوچھا۔ تو وہ تیزی سے بولا۔

''یہی لگتا ہے، ابھی یہی لگتا ہے۔ بعض اوقات تو کوئی واقعہ ہمارے سامنے ہو بھی جائے تو ہم اس پر یقین نہیں کر رہے ہوتے۔ میں یہی بات میں سمجھا رہا ہوں۔ دور کہیں سکون سے بیٹھ کر پورا کھیل کھیلیں گے۔'' اس نے سکون سے کہا۔

''کیسا کھیل؟'' جسپال نے پوچھا۔

''میں پوچھتا ہوں، اگر اس وقت اگر وہ چاروں مر جائیں گے تو کیا بھارت میں یہودی لابی اپنا کام بند کر دے گی، ایسا کبھی نہیں ہوگا۔ میں امریکہ میں رہا ہوں اور یہودی ذہنیت سے اگر پوری طرح نہیں تو کم از کم بہت حد تک تو ضرور واقف ہوں۔ سو میں نے محسوس کر لیا کہ وہ اب کیا کر سکتے ہیں۔ اس کا تھوڑا بہت خاکہ بنا

ہے، جس وقت ذرا سی بھی تصویر واضح ہو گئی، میں تفصیل سے تم دونوں کو بتا دوں گا۔ اگر مجھ پر اعتماد کرتے ہو تو۔'' اروند نے پورے اعتماد سے کہا۔ تو بانیتا نے حتمی لہجے میں کہا۔

''ہو گیا۔ تم آج ہی بلکہ ابھی، روینیت اور گرلین کو لے کر امرتسر نکل جاؤ۔ شام تک تم لوگ جالندھر پہنچ جاؤ گے میرے فارم ہاؤس پر۔ جب تک تم وہاں پہنچو گے، تمہارے مطلب کی ہر شے وہاں پہنچ جائے گی۔ میں تمہارا رابطہ دے دوں گی۔''

''او کے۔'' اروند نے کہا اور مگ میں پڑی کافی اپنے حلق میں انڈیل کر اٹھ گیا۔

وہ دونوں کچھ دیر تک یونہی خاموش بیٹھے رہے۔ پھر اٹھ کر اندر چلے گئے۔ انہیں شام تک انتظار کرنا تھا، یا پھر اگلے دن تک، جب تک ونود رانا دہلی سے واپس نہیں آ جاتا، یا پھر فون پر کوئی اطلاع نہیں دے دیتا۔

☆......☆......☆

مجھے احساس ہو رہا تھا کہ میرا نور نگر آنا کوئی اتفاق نہیں تھا بلکہ کچھ ایسے کام تھے، جن کی وجہ سے میں یہاں کھنچا چلا آیا تھا۔ تانی اندر سے کب کی بدل چکی تھی۔ اصل شے کردار ہوا کرتا ہے۔ برے سے برے ماحول میں اگر ایک بھی اچھے کردار کا مالک ہو تو اس کی شخصیت میں مقناطیسیت آ ہی جاتی ہے۔ لوگ اس کی طرف کھنچے چلے آتے ہیں۔ اچھی سوچ ہی کردار بناتی ہے۔ جو جس طرح کی سوچ رکھتا ہے اس طرح کے کردار کا اظہار ہونا فطری بات ہے۔ غلط سوچ والا بندہ چاہے جتنا مرضی تقویٰ اور پرہیزگاری والا لبادہ اپنا لے، اس کے کردار سے بدبُو آ ہی جاتی ہے۔ تانی اندر سے ایک صاف سلیٹ کی مانند تھی، اس نے باطل کو قبول نہیں کیا اور جیسے ہی حق اس کے سامنے آیا وہ اس کے اندر اتر گیا۔

دن کا پہلا پہر گذر گیا تھا اور میں ڈرائنگ روم میں اکیلا بیٹھا کچھ اور ہی سوچے چلا جا رہا تھا۔ جنید میرے ساتھ یہاں آیا تھا۔ میں نے بھیدے کے ساتھ اسے پورا علاقہ دیکھنے اور ایک خاص قسم کا سروے کرنے کی ذمہ داری دی تھی۔ وہ اسی کام میں مصروف تھا۔ وہ میرے رابطے میں رہتا تھا۔ اس وقت میرے اندر ایک خواہش سر اٹھا رہی تھی اور میں انہی سوچوں میں کھویا ہوا تھا کہ تانی آ گئی۔ اس نے سفید شلوار قمیص کے ساتھ سیاہ حجاب پہنا ہوا تھا اور سیاہ رنگ کا ہی عبایا پہنا ہوا تھا۔ چہرہ کسی بھی طرح کے میک اپ سے بے نیاز تھا، اگرچہ وہ پہلے بھی بہت کم میک اپ کیا کرتی تھی، لیکن آج اس کا چہرہ بہت زیادہ ہی شگفتہ لگ رہا تھا۔ میں اسے دیکھ کر کھڑا ہو گیا اور پورے دل سے کہا۔

''تانی زندگی کا نیا سفر مبارک ہو۔''

''تمہیں بھی مبارک، یہ سب تمہاری وجہ سے ہوا۔'' یہ کہہ کر وہ سامنے والے صوفے پر بیٹھ گئی۔ میں بھی بیٹھ گیا تو میں نے کہا۔

''تانی انسان ایک آئینہ ہے، وہ اس میں اپنے آپ کو دیکھتا ہے۔ جیسے ہی آئینے پر پڑی دھول صاف ہوتی ہے وہ اپنا آپ صاف دیکھنے لگتا ہے۔ تم نے اپنے آپ کو دیکھا ہے۔ اس میں کسی کا کوئی کریڈٹ نہیں ہے۔''

''ہاں، یہ فیصلہ میرا اپنا ہے۔'' اس نے پورے اعتماد سے کہا۔

''ایک اکیلی اینٹ کی کوئی حیثیت نہیں ہوتی، جو کوئی چاہے جیسے اس کے ساتھ سلوک کرے، اسے جہاں نہیں چاہیے رکھ دے لیکن وہی اینٹ جب دیوار میں لگتی ہے تو اسے ہلایا نہیں جا سکتا۔ وہ اینٹ پہلے اکائی میں تھی، دیوار میں لگنے کے بعد وہ یکتائی میں آ گئی۔ وہ وحدت میں ضم ہو گئی۔'' میں نے کہا۔

''مطلب، میں سمجھی نہیں۔'' اس نے سمجھنے والے انداز میں میری طرف متوجہ ہوتے ہوئے کہا۔

''اینٹ کی اپنی حیثیت محدود تھی۔ جیسے ہی وہ دیوار میں لگی تو وہ وحدت کے دائرے میں آ گئی۔ محدود جو تھی وہ لامحدود میں جا کے وحدت حاصل کر چکی۔ اسے نگاہ تو دیکھ رہی ہے لیکن عقل تسلیم نہیں کر رہی۔ یہ فقط

ایک مثال ہے، میں اصل میں تجھے بتانا یہ چاہ رہا ہوں کہ انسان بھی انتشار سے وحدت میں جا سکتا ہے۔ یہ اسی طرح ہے کہ ہر آدمی دیکھتا ہے لیکن اسے سمجھ نہیں، کیونکہ اس کا دل زندہ نہیں۔ جس کا دل زندہ ہے اسے یہ معلوم ہے کہ کائنات محدود نہیں۔ کیونکہ وہ "نظر" سے دیکھ رہا ہے۔"

"میں یہ سمجھنا چاہتی ہوں کہ دل زندہ کیسے ہوتا ہے؟" اس نے پوری توجہ سے پوچھا۔

"میں نے پہلے بھی تمہیں بتایا تھا کہ دل مردہ نہیں ہوتا، دل زندہ ہی ہوتا ہے۔ جسے "مردہ دل" کہا گیا ہے، اصل میں اسے انہی چیزوں نے فانی بنایا ہوا ہے جو اس کے اندر پڑی ہوئی ہیں۔ یہ وہ حجابات ہیں جو اسے اپنی طرف متوجہ نہیں ہونے دیتے، اس کی نگاہ کے آگے اندھیرا پیدا کر دیتے ہیں۔ عشق کی آگ جب آتی ہے تو ان سارے مادی حجابات کو جلا کر راکھ کر دیتی ہے خاشاک غیر اللہ اُڑ جاتے ہیں تو عشق حقیقی کا ظہور ہوتا ہے۔ حجابات اُڑ جاتے ہیں۔ ہر شے واضح ہو جاتی ہے اور بندہ عین حقیقت ہو جاتا ہے، یا دوسرے لفظوں میں وہ اللہ کی وحدانیت کو پوری طرح پا لیتا ہے۔ یہی محدودیت سے وحدت تک کا سفر ہے۔" میں نے پورے جذب سے کہا۔

"اور ہمیشہ کی زندگی؟" اس نے تیزی سے پوچھا۔

"جب دل میں عشق اترتا ہے تو ساری آلائشیں اُڑ جاتی ہیں۔ تو دل آئینہ بن جاتا ہے اسے پھر صاف دکھائی دینے لگتا ہے۔ کیونکہ وہ اس ذات سے جڑ جاتا ہے، جس کے قبضے میں ہر شے ہے۔ جوہرِ عشق ہی وحدت ہے۔ جو آقا ﷺ کا دیا ہوا راستہ ہے۔ زندہ دل سے وابستہ ہونے ہی سے زندہ دلی کا ظہور ہوتا ہے، یہ جو دل ہے نا یہ زندہ کو دے، تو ہمیشہ کی زندگی پا لیتا ہے۔ یہ آقا ﷺ کی سنت پر عمل کرنے والے لوگ ہیں کہ آقا ﷺ کا طرز زندگی ہی اصل حیات ہے۔ یہی اصل زندگی ہے۔" میں نے کہا تو اس نے یہ سن کر آنکھیں بند کر لیں۔ ہمارے درمیان خاموشی آن ٹھہری۔ تب میں نے کہا۔

"میری ایک خواہش ہے۔"

"وہ کیا؟" اس نے آنکھیں سکوڑتے ہوئے پوچھا۔

"یہی کہ تم انتشار سے وحدت میں چلی جاؤ۔" میں نے کہا۔

"کیسے؟" اس نے پوچھا۔

"میں پورے دل سے اعتراف کرتا ہوں کہ تمہیں مجھ سے محبت ہے۔ میں بھی تمہیں دل سے چاہتا ہوں۔" میں نے کہا تو بولی۔

"مجھے تم سے عشق ہے۔"

"میں نے مان لیا۔ عشق انسان کو ربّ تعالیٰ کی طرف سے ودیعت ہے لیکن اسے اختیار کرنے کا اور اسے چھوڑنے کا اختیار بھی ربّ تعالیٰ نے انسان ہی کو دیا ہے۔ میرا تم سے ایک سوال ہے؟" میں نے اس کے چہرے پر دیکھتے ہوئے پوچھا۔

"وہ کیا؟" اس نے کہا۔

"کیا تمہارا عشق میرے ہونے تک ہے، اگر میں کل نہ رہوں تو تمہارا عشق ختم ہو جائے گا؟" میں نے سوال کیا تو وہ ایک دم سے چونک گئی، پھر چند لمحے خاموش رہنے کے بعد بولی۔

"یہ تم کیا کہہ رہے ہو؟"

"میرے لیے تمہارا عشق فقط ظاہر تک ہے کیوں نہیں تم عشق کا بے پایاں وصف حاصل کرتی ہو۔" میں نے کہا تو اس کی آنکھیں ایک دم سے چمک اٹھیں۔ پھر سکون سے بولی۔

"کیسے؟"

"درحقیقت خدا کے سوا کسی کا وجود نہیں ہے، ظاہری عشق اور محبت اپنے دل سے نکال دو اور اللہ کے عشق کو اپنے اندر جگہ دو۔ مسلکِ عشق اختیار کرو۔ تمہارا مقصد بھی آسمانوں کی طرح بلند ہو جائیں گے۔ نفسی خاشاک کو جلانا ہوگا۔ اپنی تعمیر کرنا ہی تسخیر ہے۔" میں

نے کہا تو وہ مسکراہٹ سے بولی۔
''یہی کرنا کیا ہوگا۔''
''محدود تو محدود ہی ہوتا ہے۔ لیکن لامحدود بھی ایک حد ہے، وہ ذات جس کا عشق اختیار کرنا چاہو گی، وہ ان سے بھی ماورا ہے۔'' میں نے کہا تو وہ میری طرف یوں دیکھنے لگی جیسے اس کے اندر سکون اتر گیا ہو۔ شاید ہماری مزید بات چلتی لیکن انہی لمحات میں اشفاق اندر آیا تو میری نگاہ اس پر پڑی۔ وہ خاموشی سے آکر بیٹھ گیا۔ میں نے اس کی طرف دیکھتے ہوئے پوچھا۔ ''بولو، کیا خبر ہے؟''
''وہ جوگی بھی وہیں ہے اور ملنگ بھی۔'' اس نے دھیمے سے لہجے میں کہا۔
''آؤ چلیں۔'' میں نے تانی کو بھی چلنے کا اشارہ کیا اور اٹھ گیا۔
ہم تینوں نے پورچ سے کار لی اور مسافر شاہ کے تھڑے پر جا پہنچے۔ ملنگ سکون میں نہیں تھا۔ وہ بے سکون اور بے چین جوگی کے پاس بیٹھا ہوا تھا۔ اس کے سامنے بھنگ کا کونڈا تھا لیکن پی نہیں رہا تھا۔ تانی اور اشفاق اس چارپائی پر بیٹھ گئے، جو وہاں ان لوگوں نے رکھ دی تھی۔ میں ان دونوں کے پاس زمین پر جا بیٹھا۔ انہوں نے میری طرف دیکھا مگر بولے کچھ نہیں۔
''پی کیوں نہیں رہے ہو؟'' میں نے پوچھا تو ملنگ نے سر اٹھائے بغیر ہولے سے کہا۔
''میں اپنے آپ پر حیرت زدہ ہوں، مجھے خود پر بہت مان تھا۔ لیکن میں تو مٹی کا ڈھیر ثابت ہوا۔ شاید یہ اس لیے ہوا ہے کہ کوئی میرے مقابلے پر نہیں آیا تھا یا.....'' یہ کہتے کہتے وہ رک گیا اور بے بسی سے میری طرف دیکھنے لگا۔ میں اس کی بات سن کر مسکرا دیا۔ پھر اس بوڑھے جوگی کی طرف دیکھ کر پوچھا۔
''اور تم؟ تمہیں کوئی حیرت ہے؟''
''ہاں میں بھی حیرت زدہ ہوں لیکن میری حیرت کی نوعیت کچھ دوسری ہے۔'' اس نے اعتراف کرتے ہوئے کہا۔ میں ہنس دیا۔
''کیا ہے وہ حیرت؟'' میں نے پوچھا۔
''یہی کہ میں نے جھوٹ بولا اور یونہی بات گھڑی لیکن آپ نے اسے سچ کر دکھایا۔'' اس کے لہجے میں حیرت ٹپک رہی تھی۔
''کیا اور کیسا جھوٹ، میں سننا چاہوں گا۔'' میں نے اس کی طرف دیکھ کر پوچھا۔
''میں جوگی ضرور ہوں اور میرا تعلق بھارت کے علاقے سورت گڑھ کے پاس مناسکر گاؤں سے ہے۔ میں وہیں ایک پرانے گاؤں کا باسی ہوں، یہ بھی سچ ہے کہ مجھ پر زہر اثر نہیں کرتا اور میرا یہ پیشہ ہمارے آباو اجداد سے ہے۔ میری اسی صلاحیت کو استعمال کیا گیا۔ مجھے بھارت کی خفیہ تنظیم را نے تربیت دی ہے کہ دشمن کے علاقے سے اطلاعات کیسے اکٹھی کی جاتی ہیں۔ میں پچھلے تیرہ برس سے یہی کام کرتا آرہا ہوں۔ میں اپنے خاندان کے ساتھ ایسے ہی پھر رہا ہوں۔ یہاں بھی مجھے ایک خاص مقصد کے لیے بھیجا گیا ہے اور وہ یہی مقصد تھا کہ جب بھی جمال یہاں آئے، فوراً اطلاع کر کے اگلی ہدایات کا انتظار کیا جائے۔ میرا کام صرف اتنا ہی ہوتا ہے۔''
''مجھ سے کیا جھوٹ بولا۔'' میں نے پوچھا۔
''یہی کہ یہاں پر ایک خاص قسم کا سانپ ہے، حالانکہ یہ سانپ اس علاقے کا ہے ہی نہیں، یہ افریقی علاقوں میں پایا جاتا ہے اور میں نے آج تک اسے نہیں دیکھا تھا۔ آپ کا چمتکار ہے یہ، وہ سانپ جو یہاں ہے ہی نہیں، اسے یہاں نہ صرف حاضر کر لیا بلکہ دکھا دیا کہ وہ آپ کا مطیع بھی ہے۔ میں نے پوری زندگی ایسا چمتکار نہیں دیکھا۔'' اس نے ممنونیت بھرے لہجے میں کہا۔
''یہ ملنگ بھی تو اسی مقصد کے لیے یہاں بیٹھا ہے۔ یہ بھی تو بھارتی خفیہ کا بندہ ہے۔ اس کی صلاحیت......'' میں نے کہنا چاہا تو وہ ملنگ بولا۔

"مجھے نشے پر پوری دسترس تھی۔ لوگ مجھے نشے میں دھت سمجھ کر اپنے سارے راز اُگل دیتے ہیں۔ اب مجھے پتہ چلا جسے میں اپنی طاقت سمجھتا تھا، وہ تو میری سب سے بڑی کمزوری ہے۔" اس کے لہجے میں شکستگی تھی۔

"تو اب کیا کرنا چاہتے ہو؟ اپنا فرض نبھایا؟ دے دی اطلاع؟" میں نے پوچھا۔

"نہیں اور نہ ہی دے سکتے ہیں۔" جوگی نے ہاتھ باندھ کر کہا۔

"کیوں؟" میں نے اس کے چہرے پر دیکھ کر پوچھا۔

"میں سمجھتا ہوں کہ اب میری نسل سے یہ صلاحیت ختم ہو جائے گیا ورسرے سے یہ صلاحیت ہی نہیں ہے اور نہ ہی انسانیت۔ ہم بھی سانپ صفت ہو گئے ہیں۔ ہمیں انسان بننا ہے۔ شیطان نہیں۔ نیلی آنکھوں والا سانپ شیطان ہی تو ہے۔" جوگی نے دست بہ دستہ ہو کر کہا۔

"یہ ملنگ......؟" میں نے پوچھا۔

"میں بھی اپنے ہوش میں آنا چاہتا ہوں۔" اس نے صاف لفظوں میں کہا۔

"یہاں رہو اور اپنی حالت کا مشاہدہ کرو۔ اپنے آپ کو تسخیر کرو۔ تم پر تمہارا باطن کھل جائے گا۔" میں نے کہا۔

"کیسے؟" جوگی نے اسی طرح ہاتھ باندھے پوچھا۔

"انسان چاہے جس مذہب، نظریے یا عقیدہ کا ہو، وہ انسان ہے اور ربّ تعالیٰ نے انسان کو بے تحاشا صلاحیتوں سے نوازا ہے، اسے احسن تقویم پر پیدا کیا ہے۔ یہ خود ہے جو اسفل سافلین میں جا گرتا ہے۔ تاریخ گواہ ہے کہ انسان نے اپنی ان ذاتی صلاحیتوں سے جو اسے ربّ تعالیٰ نے دی ہیں۔ ان سے دنیا کو حیرت زدہ کر کے رکھ دیا، بظاہر انہونیاں ہوئی ہیں لیکن جب بھی انسان اپنے باطن سے جڑا، تب اس نے انسانیت کے لیے بہت کچھ کیا۔ اگر انسان اپنا آپ شیطانیت کو دے سکتا ہے تو اس سے چھٹکارا بھی خود اسی نے پانا ہے۔ خود ہی کرنا ہے اس نے۔ اپنے باطن تک اس نے خود ہی رسائی لینی ہے۔ اپنا آپ تسخیر کرو، یہی تمہاری تعمیر ہے۔" میں نے کہا اور اٹھ گیا۔ وہ دونوں میری طرف دیکھتے رہے۔ میں کار میں آ بیٹھا۔ تانی میرے ساتھ اگلی نشست بیٹھ گئی۔ تبھی اشفاق نے پوچھا۔

"ان کا کرنا کیا ہے؟ جانے دیں انہیں۔ خواہ مخواہ توجہ ان کی طرف رہے گی۔"

"دیکھو، انہیں دیکھو، یہ کیا کرتے ہیں۔ اگر یہ خود کو بدل لیں تو دشمن کا یہی تیر، دشمن ہی کے سینے میں جا لگے گا۔ یہ جان لو کہ یہ تیر زہر میں بجھے ہوئے ہیں۔ احتیاط کرنا۔" میں نے کہا۔

"انہیں میں دیکھ لوں گی۔" تانی نے عام سے لہجے میں کہا تو میں نے اس کی طرف دیکھا سیاہ حجاب میں اس کا گلابی چہرہ تمتما رہا تھا۔ تبھی میں نے اشفاق سے کہا۔

"اور ہاں' آج سے یہ سارا نور نگر تم دونوں کے حوالے، اس کی سیکورٹی سے لے کر، یہاں کے سب انتظامات تک تمہاری ذمہ داری ہے۔" میرے کہنے پر وہ سر ہلا کر رہ گیا۔ واپس حویلی آنے تک پھر ہم میں کوئی بات نہیں ہوئی۔

☆......☆......☆

اس نیم تاریک کمرے میں جگجیت بھر بھرے اور دائیں جانب ونو درانا بیٹھے ہوئے تھے ان سے ذرا فاصلے پر دیوار کے ساتھ تین کانسٹیبل کھڑے تھے۔ کمرے کا دروازہ کھلا تو جسپال کے ساتھ بانیتا بھی اندر آ گئی۔ وہ دونوں آ کر ان کے سامنے دھری کرسیوں پر بیٹھ گئے۔ انہوں نے جگجیت بھر بھرے کو پہلی بار دیکھا تھا۔ وہ اس سارے معاملے میں پس پشت رہا تھا۔ وہ اچھی شخصیت کا مالک تھا اور اس کے چہرے پر عام پولیس والوں کی طرح سختی نہیں تھی۔ وہ اگر سول کپڑوں میں ہوتا تو پروفیسر ہی لگتا۔ اُن دونوں کے بیٹھتے ہی وہ مسکرایا اور پھر نرم

اور پرسکون لہجے بولا۔

"میں تم دونوں کا بہت مشکور ہوں۔آپ نے ہماری بہت مدد کی۔ہم اس کا کوئی عوض تو نہیں دے سکتے، ہاں مگر ایک چھوٹا سا تحفہ ضرور دیں گے اور وہ ہے، تم دونوں کی بے گناہی، کیونکہ میں سمجھتا ہوں کہ تم جرائم پیشہ نہیں ہو بلکہ محبت وطن اور حریت پسند ہو۔"

"تھینک یو آفیسر۔" بانیتا نے کسی جذبے کے بغیر کہا۔

"اگر میں آپ دونوں کو پولیس جوائن کرنے کا مشورہ دوں تو کیا آپ......" اس نے مسکراتے ہوئے، دھیمے لہجے میں پوچھا تو وہ تیزی سے بولی۔

"ہم ہرگز جوائن نہیں کریں گے۔"

"پوچھ سکتا ہوں کیوں؟" جگجیت بھر بھرے نے پوچھا۔

"محکمے میں رہ کر سو پابندیاں ہیں، جیسے کہ آپ ہماری مدد لینے پر مجبور تھے۔ ہمارا مقصد انسانیت ہے، اس کے لیے ہم کام کرتے رہیں گے۔" بانیتا ہی نے جواب دیا تو اس نے سر ہلاتے ہوئے سمجھانے والے انداز میں کہا۔

"یہ ممبئی بھی ایک گورکھ دھندہ ہے۔ دہلی کی ساری سیاست اب یہاں سمٹی ہوئی ہے۔ میں اچھی طرح سمجھتا ہوں کہ یہ یہودی ایک وائرس کی طرح ہیں، جہاں جائیں گے اس قوم کو کھوکھلا کر دیں گے اور ہمارے سیاست دان ان کے ہاتھوں بک چکے ہیں۔ صرف ہمارے ہی نہیں پڑوسی ملک کے سیاست دان بھی۔ ان میں کچھ سرمایہ دار ہیں، کوئی اپنی صنعت کا تحفظ چاہتا ہے اور کوئی اپنی بین الاقوامی ساکھ بچانا چاہتا ہے۔ اس سے ہوگا کیا؟ یہاں کے اور سرحد پار کے عوام کا لہو بہے گا۔ کتنے بچے مارے جائیں گے، کتنی عورتیں کتنے جوان، تباہی کے سوا کچھ نہیں، اور ان کی تجوریاں بھریں گی اسلحہ بیچ کر۔"

"تو پھر انہیں یہاں سے بھگا کیوں نہیں دیتے؟" جسپال نے کہا۔

"میں انہیں ایک منٹ برداشت نہیں کرتا۔ لیکن میرے اکیلے سے کچھ نہیں ہوگا۔ میں نے ان کی، فقط یہود نواز سیاست دانوں کی فائل کھولی تھی اور اتنا ہنگامہ ہو گیا۔" جگجیت بھر بھرے نے دکھی لہجے میں کہا۔

"تو بس، آپ نے جنگ ہار دی۔" جسپال نے پوچھا۔

"نہیں، جنگ تو اب شروع ہوئی ہے۔ اس تیواری سے بہت کچھ ملا ہے، میری اور اس کی ڈیل ہو گئی ہے۔ اس نے خود کو بچانے کے عوض ایک ہفتے کے اندر اندر دوسروں کے بارے میں بتانے کا کہا ہے، وہ سب کچھ جو اس کے پاس پڑا ہے، ہر دیک کو میں تھائی لینڈ بھجوا رہا ہوں۔ وہاں اس کے لیے کام کا بندو بست بھی کر دیا ہے۔ مجھے پتہ چلا ہے کہ وہی رامیش پانڈے ایک بہت بڑی گیم کھیلنے جا رہا ہے۔" جگجیت بھر بھرے نے جوش سے کہا۔

"کیسی گیم؟" جسپال چونکتے ہوئے بولا۔

"ابھی مجھے اس کے پورے خدوخال کا نہیں پتہ لیکن میں اپنے ماضی کے تجربے کی بنا پر کہہ سکتا ہوں کہ آئندہ کیا ہونے والا ہے۔" وہ مسکراتے ہوئے بولا۔

"ماضی میں کیا ہوا تھا؟" بانیتا نے سوال کیا تو وہ ذرا دیر کے لیے سوچ میں پڑ گیا، پھر بولا۔

"سن دو ہزار سے تم لوگوں نے ناندیڑ بم دھماکا، ٹرین بم دھماکا، اجمیر شریف بم دھماکا، مالیگاؤں بم دھماکا، احمد آباد بم دھماکا، یہ سب سنا ہوگا؟" اس نے پوچھا۔

"کچھ کچھ کا یاد ہے مجھے۔" بانیتا سوچتے ہوئے بولی۔

"بابری مسجد کو گرایا گیا، کیوں؟ گجرات کے فسادات ہوئے، کیوں؟ سمجھوتہ ایکسپریس میں بم دھماکا کیا گیا کیوں؟ یہ جواب طلب سوال ہیں نا؟" یہ کہہ کر وہ چند لمحے بانیتا کی طرف یوں دیکھتا رہا جیسے وہ کچھ اور ہی سوچ رہا ہو، پھر بولا۔

''یہ سب برہمنی ذہنیت کا شاخسانہ ہے، جن کی وجہ سے اب بھارت کو خطرہ ہے، ان کی جڑیں خفیہ اداروں ،خاص طور پر آئی بی میں بہت گہری ہو چکی ہیں۔ مطلب اندر تک، اتنی اندر تک کہ جس کے بارے میں تصور بھی نہیں کیا جا سکتا۔ یہ ادارے اب کس کے ہاتھ میں کھیل رہے ہیں؟ اسی برہمنی ذہنیت نے میڈیا اور خاص طور پر علاقائی میڈیا پر پوری طرح کنٹرول کیا ہوا ہے۔ یہ انسانیت سوز واقعات خود کرتے ہیں اور پھر الزام مسلمانوں پر لگا دیتے ہیں تاکہ انہیں دہشت گرد قرار دلوایا جا سکے۔ آئی بی ان کی پوری معاون ہے۔''

''کون لوگ ہیں یہ؟'' بانیتا نے پوچھا۔

''یہ تو میں بھی نہیں جانتا، ہو سکتا ہے تم ہو، میں ہوں یا یہ ونود رانا، کوئی بھی، کہاں تک کون بندہ ہے، یہ کوئی نہیں جانتا۔ لیکن؛'' یہ کہہ کر اس نے لحہ بھر کو سانس لے کر اس نے مسکراتے ہوئے پوچھا۔

''ایک سوال میں کروں؟''

''جی کیوں پوچھیں؟'' جسپال نے کہا۔

''تم لوگوں کے ذہن میں یہ خیال نہیں آیا کہ اتنی پولیس فورس ہونے کے باوجود میں نے تم لوگوں سے یہ اتنا سا کام کرنے کو کیوں کہا؟'' اس نے پوچھا۔

''یہ سوال تو ہے؟'' اس نے سنجیدگی سے جواب دیا۔

''میں جانتا ہوں کہ میں اس وقت ہٹ لسٹ پر ہوں اور کسی وقت بھی کوئی گولی مجھے چاٹ جائے گی، کیونکہ میں ان کے اندر تک اتر گیا ہوں۔ میں نے مالیگاؤں بم دھماکے کے مجرم پکڑ لیے ہیں، سادھو پرگیہ سنگھ ٹھاکر، حاضر سروس کرنل پروہت، جو سمجھوتہ ایکسپریس دھماکا کیس کا سرغنہ ہے، رمیش ایادھیا، سوامی دیانند پانڈے، سمیت گیارہ بندے میں نے پکڑ لیے ہیں اور یہ سارے ابھینو بھارت، جن جاگرتی سمیتی اور دیگر ہندو سخت گیر تنظیموں سے تعلق رکھتے ہیں۔ یہ لوگ ہندو راشٹریہ یعنی ہندوانہ حکومت چاہتے ہیں۔ ان کے ہاں سیکولر بھارت کا کوئی تصور نہیں۔ میں نے پہلی بار تجربہ کیا کہ فورسز سے ہٹ کر کام کروں تو میں نے کامیابی پالی۔۔ ورنہ میں ابھی کوئی پلان کرتا ہوں وہ اُن تک پہنچ جاتا ہے۔ ان کی جڑیں اس قدر مضبوط اور گہری ہیں، اسی سے سمجھ لو۔''

''یہ تو بہت خطرناک بات ہے؟'' بانیتا نے یوں کہا جیسے کسی کہانی سے بات کر رہی ہو۔

''بابری مسجد گرانے اور گجرات فسادات کے بعد برہمنی ذہنیت والوں کا مقصد حل نہیں ہو سکا۔ یہ تنظیمیں سنگھ پریوار سے بھی زیادہ خطرناک ہیں۔ جو ملک، حکومت، عوام اور عالمی سطح پر مسلمانوں اور سکھوں کے بارے میں گمراہ کرتا ہے۔ اخبارات اٹھا کر دیکھ لیں، کہیں بھی کوئی ایسی واردات ہوتی ہے فوراً مسلمانوں کے خلاف سکھوں یا کسی دوسرے کے خلاف رٹا رٹایا بیان میڈیا پر آ جاتا ہے۔ تفتیش میں وہ سب الٹ ہوتا ہے۔ اصل میں انٹیلی جنیس بیورو، پولیس میں مداخلت کرتی ہے۔ ٹرین بم دھماکوں میں جب مجرم گرفتار کرنے کے لیے دباؤ ڈالا گیا تو ہمارے ایک پولیس انسپکٹر ونود بھٹ نے خودکشی کر لی۔'' اس نے افسوس بھرے لہجے میں کہا تو جسپال نے پوچھا۔

''تو کیا ہم ابھی نہ جائیں، یہیں ممبئی میں رہیں۔''

''تمہارا یوں کہنا اچھا لگا، اگر تم دونوں چاہو تو رابطے میں رہنا، مجھے آپ لوگوں کی مدد چاہئے ہوگی۔ ابھی آپ چاہیں تو آج ہی اپنے گھروں کو چلے جائیں۔'' یہ کہہ کر اس نے اپنے ماتحت کی طرف ہاتھ بڑھایا تو اس نے نوٹوں کی چند گڈیاں اس کی طرف بڑھا دیں۔ اس نے وہ پکڑ کر میز پر رکھتے ہوئے کہا۔

''یہ ذرا سی بھینٹ ہے، یہ آپ قبول کر لیں۔''

''نہیں آفیسر! یہ آپ اپنے بچوں کی مٹھائی کے لیے لے جائیں۔ اب ہمیں اجازت۔'' جسپال نے کہا تو وہ چند لمحے سوچتا رہا پھر بولا۔

''ٹھیک ہے، میں براہ راست اب تم دونوں سے رابطے میں رہوں گا۔ اگر یہاں رہو تو میرا جتنا علاقہ ہے

وہ تم دونوں کا، جو چاہو سو کرو۔" جگجیت بھر بھرے نے کہا تو بانیتا ہنستے ہوئے بولی۔

"نہیں، ہم جرائم پیشہ نہیں ہیں۔"

یہ کہہ کر وہ اٹھی تو جسپال بھی اٹھ گیا۔ جگجیت بھر بھرے نے اٹھ کر دونوں سے ہاتھ ملایا۔

"اب کہاں جانے کا ارادہ ہے؟" ونود رانا نے پوچھا۔

"مطلب؟" جسپال نے چونکتے ہوئے پوچھا۔

"مطلب یہ ہے کہ اگر تم ابھی امرتسر جانا چاہتے ہو، تو میں تمہیں ائرپورٹ تک چھوڑ دیتا ہوں۔ ٹکٹ کی بھی کوئی اتنی دیری نہیں ہوگی۔" وہ اس کے چہرے کی طرف دیکھ کر بولا تو بانیتا نے ایک دم سے فیصلہ کرتے ہوئے کہا۔

"ٹھیک ہے ہم ابھی نکلتے ہیں۔"

"میں یہاں سے امرتسر تک آپ سے رابطے میں رہوں گا۔" ونود نے کہا تو ایک بار پھر وہ ایک دوسرے سے مصافحہ کر کے باہر نکل آئے۔

اس وقت رات کا آخری پہر چل رہا تھا جب وہ دونوں امرتسر ائرپورٹ سے باہر آئے تو ان کے انتظار میں سیاہ فریری کھڑی تھی۔ وہ دونوں اس میں بیٹھے تو فریری چل دی۔ ونود رانا نے اپنا وعدہ پورا کیا تھا۔ کسی نے انہیں ہاتھ تک نہیں لگایا۔ بانیتا نے بی ایس، نوتن کور، اور زوردار سنگھ کو بتا دیا کہ انہیں ہنگامی طور پر یہاں سے نکلنا پڑ رہا ہے۔ وہ بعد میں رابطہ کریں گے۔ جہاز میں سوار ہونے تک انہوں نے امرتسر میں بھی بتا دیا۔ وہ حویلی پہنچے تو جسپال نے کار رکتے ہی کہا۔

"دیکھو بانیتا تم اپنے گھر والوں سے ملو جلو، لیکن مجھے فی الحال اوگی جانے دو۔ اب ہماری جالندھر ہی میں ملاقات ہوگی۔"

"اندر تو آؤ، کچھ کھا پی لو، تھوڑا آرام کر لو؟" بانیتا نے حیرت سے کہا تو وہ بولا۔

"نہیں مجھے جانے دو۔"

"اوکے، تم جاؤ۔" اس نے کہا پھر اپنے ڈرائیور سے اسے لے جانے کو کہا اور خود اتر گئی۔ ڈرائیور نیچے بھی نہ اترا اور وہیں سے اوگی پنڈ کے لیے روانہ ہو گیا۔

سورج کی روشنی چاروں طرف پھیل چکی تھی۔ جب وہ جالندھر کی فضاؤں میں جا پہنچا۔ وہ اس بار ہرپریت کو سرپرائز دینا چاہتا تھا۔ کوئی سات آٹھ کے درمیان کا وقت ہوگا، جب وہ سرخ چھت والی کوٹھی کے گیٹ کے سامنے جا پہنچا۔ بنتا سنگھ نے اسے دیکھا تو فوراً ہی گیٹ کھول دیا اور ڈرائیور اسے پورچ میں لے گیا۔

وہ کار سے اتر کر اندر ڈرائنگ روم میں گیا تو ہرپریت صوفے پر آلتی پالتی مارے گرومکھی میں شائع ہونے والا پنجابی اخبار پھیلائے بیٹھی تھی۔ سفید قمیص، نیلی شلوار اور دوپٹہ، جو ڈھلک کر اس کی گود میں پڑا ہوا تھا۔ بالوں کی لٹ اس کے جھکے چہرے پر جھول رہی تھی ۔جسپال اسے دیکھتا ہی رہ گیا۔ آہٹ پا کر ہرپریت نے سر اٹھایا تو سامنے جسپال کو دیکھ کر وہ چند لمحوں کے لیے ساکت ہی رہ گئی، جسپال نے اپنی باہیں پھیلا دیں۔ وہ تیر کی مانند اس کے سینے سے آ لگی۔ اسے لگا زندگی جیسے رُک گئی ہو، روح تک میں سیرابی اترتی چلی جا رہی ہے۔ وہ الگ ہوئے تو جسپال نے پوچھا۔

"پھوپھو اور انوجیت کدھر ہیں؟"

"وہ گھر پر نہیں ہیں، گرودوارے گئے ہیں، آتے ہی ہوں گے۔ تم بیٹھو۔" اس نے صوفے کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا تو وہ بیٹھ گیا۔ ہرپریت اندر چلی گئی۔ پھر کچھ دیر بعد ہی لوٹ آئی اور اس کے پہلو میں بیٹھ گئی۔

"سناؤ یہاں سب خیر سکھ ہے نا؟"

"سب ٹھیک ہے۔ تو کچھ کھا پی لے، آرام کر لے، پھر باتیں ہی تو کرنی ہیں۔" ہرپریت نے کہا۔

"نہیں ہرپریت، مجھے آج شام سے پہلے جالندھر جانا ہے، لیکن تو فکر نہ کر، اس وقت تک میں تم سے بہت ساری باتیں کر لوں گا۔" اس نے کہا تو وہ مسکرا دی۔

☆......☆......☆

شام کا سورج ڈھل گیا تھا، جب میں اور جنید واپس لاہور پہنچ گئے۔ تمام راستے ہم اس کے کئے گئے سروے پر بات کرتے رہے۔ سڑکوں پر رش کی وجہ سے کافی دیر بعد ہم گھر پہنچے، جہاں سناٹا پھیلا ہوا تھا۔ ہم اندر گئے، ڈرائینگ روم میں کوئی نہیں تھا۔ کنٹرول روم میں فقط مہوش بیٹھی ہوئی زویا سے کراچی میں ہونے والے تازہ حالات کے بارے میں باتیں کر رہی تھی۔ اس نے ہمارے آنے پر خوش دلی کا اظہار تو کیا لیکن اس میں گرم جوشی نہیں تھی۔ کچھ تمہیدی اور روایتی باتوں کے بعد میں نے پوچھا۔

''سب کہاں ہیں؟''

''فہیم ابھی یہاں تھا، ہوسکتا ہے اپنے کمرے میں ہو۔ باقی سب بھی اپنے اپنے کمرے میں ہوں گے۔'' اس نے کاندھے اچکاتے ہوئے کہا۔

''سب لوگوں نے کھانا کھالیا؟'' میں نے پوچھا۔

''ابھی کہاں، ابھی تو دارا ہی واپس نہیں لوٹا، وہ مارکیٹ گیا تھا۔'' اس نے بتایا

''اوکے، سب کو یہاں بلاؤ، میں اوپر کمرے سے ہو کر آیا۔ ذرا جلدی۔'' یہ کہہ کر میں اپنے کمرے میں چلا گیا، مجھے سمجھ نہیں آ رہی تھی کہ وہ ایسے مایوس کیوں ہیں؟ میں نے زیادہ وقت نہیں لیا اور واپس کنٹرول روم میں آ گیا۔ وہاں جنید، اکبر انٹیلی جنٹ، مہوش اور فہیم، بیٹھے ہوئے تھے۔ تھوڑی دیر گپ شپ کے بعد میں نے ان کے مایوسانہ رویے کے بارے میں پوچھا تو اکبر نے بولا۔

''دراصل وہاں ممبئی میں جسپال کا آپریشن کامیاب نہیں رہا، وہ واپس اُوگی پنڈ چلا گیا ہے۔ اس کے ساتھ بانیتا بھی واپس لوٹ گئی ہے۔ یہ ساری بات نوتن کور نے بتائی ہیں۔ وہ کافی حد تک مایوس تھی، اس ناکامی کے بعد ظاہر ہے اس کا اثر لیا سب نے۔''

''اوہ، یہ تو اچھا نہیں ہوا۔'' میں نے سوچتے ہوئے کہا۔

''اچھا تو واقعی نہیں ہوا۔'' جنید نے رائے دی

''کوئی وجہ بتائی نوتن کور نے۔'' میں نے پوچھا۔

''نہیں، کہہ رہی تھی کہ انہیں اچانک وہاں سے نکلنا پڑا ہے، ظاہر ہے وہ چند لوگ کچھ نہیں کر سکتے تھے۔ ان یہودیوں کے پیچھے پوری حکومت کی سپورٹ ہے، فورسز ان کی حفاظت پر لگی ہوئی ہیں۔'' مہوش بولی۔

''ویسے اگر ہم وہاں پر ہوتے تو کچھ نہ کچھ کر آتے۔'' اکبر نے افسوس بھرے لہجے میں کہا جسے میں نے نظر انداز کرتے ہوئے پوچھا۔

''ان کی طرف سے مطلب جسپال یا بانیتا کی طرف سے کوئی فون یا کوئی اطلاع؟''

''ابھی تک تو نہیں، ان دونوں میں سے کسی نے رابطہ نہیں کیا اور نہ ہی ہم نے۔'' مہوش نے صورت حال بتائی

''اوکے میں دیکھتا ہوں، پھر ڈنر کے بعد بات کرتے ہیں۔'' میں نے کہا۔ وہ سب اٹھنے لگے تو اسی دوران مہوش کا فون بج اٹھا۔

''ٹھہریں، بھارت سے فون ہے۔'' اس نے پرجوش لہجے میں کہا تو سبھی رک گئے۔ مہوش نے کال رسیو کرتے ہوئے اسپیکر آن کر دیا۔ دوسری طرف اروند سنگھ تھا۔

''ہائے مہوش! گڈ ایوننگ۔'' اس نے کہا تو مہوش نے جواب دیتے ہوئے پوچھا۔

''کیا صورت حال ہے ادھر، سنا ہے......''

تبھی اس نے بات کاٹتے ہوئے کہا۔

''سنی سنائی کو چھوڑو، پہلے مجھے یہ بتاؤ، جمال واپس آ گیا نور نگر سے؟''

''ہاں میں آ گیا ہوں اور تمہاری بات سن رہا ہوں۔'' میں نے کہا تو پرجوش لہجے میں اس نے وہ بات بتائی کہ جسپال اور بانیتا واپس جالندھر کیوں آ گئے۔ مختصر انداز میں بتا کر وہ بولا۔

''ممبئی میں ایک بہت بڑا کام ہونے جا رہا ہے۔

مجھے اس گینگ کا پتہ مل گیا ہے جو وہ یہ سب کرنے جا رہے ہیں۔ ہم اس سے کیا فائدہ لے سکتے ہیں، یہ آپ لوگوں کے سوچنے کا کام ہے۔"

"تفصیل کیا ہے؟" میں نے خود پر قابو پاتے ہوئے کہا تو اس نے وہ تفصیل بتا دی جو اسے معلوم تھی۔ میں نے اسے کچھ دیر بعد فون کرنے کا کہا اور فون بند کرا دیا۔

اروند بہت بڑی کامیابی حاصل کر چکا تھا۔ سبھی نے سن لیا تو میں نے سبھی کے چہروں کو پر جوش دیکھا۔

"سب نے سن لیا۔" میں ان سب کو دیکھتے ہوئے کہا۔

"مزید کہنے کی ضرورت نہیں، ہم ابھی لگ جاتے ہیں کام پر۔" فہیم کمپیوٹر کے سامنے بیٹھتے ہوئے بولا۔

"اوکے۔ ڈنر پر ملتے ہیں اور پھر کوئی فیصلہ کرتے ہیں۔" میں نے کہا اور اٹھ کر اوپر چلا گیا۔

اروند سنگھ کا ایک دوست جو خود بھی کمپیوٹر سے متعلق تھا اور وہ ہیکنگ میں کافی آگے جا چکا تھا، اس نے اروند کو نئی تکنیک سے متعارف کروایا کہ انتہائی راز دارانہ پیغامات کس طرح کوڈ میں ایک جگہ سے دوسری جگہ جاتے ہیں اور پھر انہیں ڈی کوڈ کرنے کی تکنیک کیا ہے۔ اس کے دوست کو ایک خاص قسم کا سوفٹ وئیر چاہئے تھا، جو اروند بنا سکتا تھا۔ دونوں نے اس پر مل کر کام کیا۔ کچھ ہی دنوں میں انہوں نے وہ چند کمپیوٹر کھنگال لیے جہاں جہاں یہ تکنیک استعمال ہو رہی تھی۔ اروند کا دوست چونکہ چین میں بیٹھا تھا اسے بھارتی معاملات میں کافی دلچسپی تھی۔ اس لیے اس کی خفیہ تنظیموں کی سرگرمی پر نگاہ تھی۔ اسی دوران اِن دونوں کی توجہ ایک ایسی تنظیم کی طرف گئی جو یہودیوں کے بھارت میں دلچسپی کو گہری نظر سے دیکھ رہی تھی۔ ان کے کوڈنگ پیغامات میں یہودیوں کے خلاف کوئی بڑا آپریشن کرنے کی تیاریوں کے بارے میں بات چل رہی تھی۔ وہ لوگ پوری طرح تیار تھے۔ وہ سب بھارتی تھے اور ان کا سربراہ حکومتی پارٹی کا وزیر رامیش پانڈے تھا۔ بظاہر وہ یہودیوں کے قریب اور ان کا دوست تصور کیا جا رہا تھا۔ ان کی پلاننگ میں احتیاط اس قدر تھی کہ ابھی تک ان کے پیغامات میں یہ بات واضح نہیں ہوئی تھی کہ وہ کریں گے کیا؟ وہ یہ سب کیوں کرنے جا رہے تھے، اس کا بھی علم نہیں ہو سکا۔

میں نے اوپر جا کر جسپال سے بات کی۔ جسپال اس وقت جالندھر شہر کے فارم ہاؤس میں آ چکا تھا، جو بانیتا کا تھا۔ وہ ابھی تک نہیں پہنچی تھی۔ اروند اور رونیت کے ساتھ گرلین پوری طرح کمپیوٹر کے ساتھ جڑے ہوئے تھے۔ میں نے ساری صورت حال بتا کر اسے کہا۔

"جسپال! یہ ناکامی نہیں ہے۔ میں دیکھتا ہوں اسے، تم صرف اتنا کرو کہ جتنے لوگ بھی تمہارے ساتھ جڑے ہوئے ہیں، انہیں ایک مرکز پر لاؤ، کسی کو بھی کچھ کرنے کے لیے تیار کرو۔ دولت کی فکر مت کرو، صبح ہونے سے پہلے میں نوتن کور کو بھجوا دیتا ہوں۔"

"بانیتا آ جاتی ہے تو میں پھر تم سے رابطہ کرتا ہوں۔" اس نے کہا اور میں نے فون بند کر دیا۔

آدھی رات سے زیادہ کا وقت گذر گیا۔ کراچی، لاہور اور جالندھر کے ساتھ ممبئی میں لوگ سب رابطے میں تھے۔ وہ کامیابی جو ہاتھ سے نکل کرنا کامی کا احساس ہاتھوں میں دے گئی تھی، اس کی صورت بدلنے لگی تھی۔ میں مطمئن تھا۔ سلمان، اروند، فہیم اور رونیت، سبھی مل کر اس معاملے کو دیکھ رہے تھے۔

اس وقت رات کے دو بجے تھے کہ ایک دم سے فہیم پر جوش انداز میں بے ساختہ بولا۔

"پکڑ لیا۔"

"کیا پکڑ لیا؟" اروند نے پوچھا۔

"یہ دیکھ۔" اس نے ایک لنک اسے بھیجا اور میری طرف دیکھ کر بولا۔

"یہ واقعہ ممبئی میں ہوگا۔ اس کی یہ تفصیلات ہیں۔" یہ کہہ کر اس نے اسکرین پر دکھایا تو میرے اندر جوش بھرتا گیا۔ پورا پلان اس پر درج تھا۔ انہوں نے اسے ڈی کوڈ کر لیا تھا۔ جب وہ پلان سبھی کی نگاہ سے گذر گیا تو

میں نے سبھی کو مخاطب ہو کر کہا۔

''ممکن ہے یہ سب اُلٹ ہو، یہ بھی کوڈ در کوڈ بات ہو، ابھی خوش ہونے کی ضرورت نہیں۔ ابھی سے یہ دیکھیں کہ یہ ماحول، یہاں دے رہے ہیں۔ وہی ہے؟ کل شام تک کا وقت ہے ہمارے پاس۔ تب فیصلہ کریں گے کہ ہم نے کیا کرنا ہے۔''

''بالکل ٹھیک۔'' اروند نے کہا تو سبھی متفق ہو گئے۔ میں اوپر چلا گیا۔

وہ ڈی کوڈ پلان یہ تھا کہ ممبئی کے تاج محل ہوٹل میں یہودیوں کے کچھ بڑے اور ان سے متعلق دنیا بھر سے بزنس کمیونٹی کے لوگ وہاں آ رہے تھے۔ وہ لوگ یہ حتمی فیصلہ کرنے جا رہے تھے کہ بھارت میں وہ کیا اور کس حد تک اپنا بزنس دیں گے اور وہاں سے کیا مقاصد حاصل کریں گے۔ یہ اجلاس انتہائی خفیہ تھا۔ اسے ٹاپ سیکرٹ رکھا گیا تھا۔ وہ لوگ جو یہاں آ رہے تھے۔ انہیں بھی انتہائی خفیہ رکھا جا رہا تھا۔ ان لوگوں کا پلان یہی تھا کہ پہلے وہ خود طے کریں گے، پھر اس کے بعد وہ اپنا ایک نمائندہ چنیں گے جو بھارتی حکام سے بات چیت کرے گا اور وہ زیادہ سے زیادہ مراعات لے پائیں گے۔

اس وقت دنیا میں عالمی سطح پر جو بھی مذاکرات، معاملات، سمجھوتے یا پلان ترتیب دیئے جاتے ہیں۔ ان میں فقط ایک رخ ہی کو مد نظر نہیں رکھا جاتا بلکہ ملٹی پر پز ہوتا ہے، اس ایک ہی پلان سے ممکن حد تک کئی فوائد حاصل کرنے کی کوشش کی جاتی ہے۔ اگرچہ ہر ملک کی اپنی حیثیت ہے، لیکن دنیا میں لابی سسٹم ہے۔ وہ کسی نظریہ سے بھی متعلق ہو سکتی ہے۔ بظاہر ہمیں چند کمیونٹیز ہی دکھائی پڑتی ہیں، جیسے یورپی یونین، امریکن بزنس لابی، مسلم ممالک، چین روس لابی، لیکن اس سے بھی ماورا، خفیہ تنظیمیں ہیں، جو اپنے مفاد کی خاطر کسی ملک کو جنگ میں جھونک دیں تو انہیں کوئی فرق نہیں پڑتا، انہیں اگر اپنا مفاد دکھائی دیتا ہے تو وہ اسے جنگ میں جھونک دیں گے۔ تیل پر قبضہ کرنا ہے اور اس کے لیے کس کس کو لڑانا ہے۔ کتنے انسانوں کا خون بہانا ہے، انہیں کوئی فرق نہیں پڑتا۔ کہاں دولت پھینکنی ہے اور وہاں سے کیا اٹھانا ہے، وہ طے کرتے ہیں، کس جگہ پر کون سی ضرورت پیدا کرنی ہے، یہی لوگ کراتے ہیں۔ صرف 'فائدہ' ان کی نگاہ میں ہوتا ہے، انسان یا انسانی اخلاقیات ان کی نگاہ میں کوئی حیثیت نہیں رکھتی۔ یہ بھی ایسے ہی لوگ تھے۔ وہ بھارت کو فائدہ دینے کے ساتھ ساتھ وہاں سے کیا مقاصد چاہتے تھے اور پاکستان کو کس حد تک نقصان پہنچا سکتے ہیں یہ انکا ایجنڈا تھا۔

دراصل عالمی سطح پر دہشت گردی کی مبہم اصطلاح کے پردے میں جبر و استبداد کو قانونی جواز دینا شروع کر دیا گیا ہے۔ جعلی اور مصنوعی دہشت گردی کے واقعات کو بنیاد بنا کر دنیا بھر کے عوام کو خوف کی کیفیات کا شکار کر دیا جائے اور حکمرانوں سے کسی قسم کا کوئی سوال نہ کیا جائے۔ بھارت میں مسلمانوں کی حالت زار بد سے بدتر کرنے کا جواز یہی ہے۔ موساد کو ایسا موقعہ ملنا چاہئے۔ بھارت میں ان جیسی رجعت، فاشسٹ فرقہ پرست نظریات رکھنے والی قوتوں سے ناتہ جوڑنا ان کا فطری عمل تھا۔ اسی لیے وہ فطری طور پر بھارت میں اپنی جگہ بنا کر خود کو مضبوط کر رہا تھا۔

اس کے برعکس وہ لوگ بھی اسی دنیا میں موجود ہیں، جو کرتے تو اپنے فائدے ہی کے لیے ہیں، ان کا مفاد ان سے ٹکرا رہا ہوتا ہے۔ وہ اپنی طاقت کا اظہار کرتے ہیں۔ میرے ربّ تعالیٰ نے ہر ظالم کے لیے کوئی سبق دینے والا پیدا کرنا ہوتا، تبھی توازن قائم رہتا ہے۔ یہ انسان کا فیصلہ ہے کہ وہ کرنا کیا چاہتا ہے۔ جس نے اپنے آپ کو زندہ آئین و قوانین کے ساتھ جوڑ لیا وہ فلاح پا گیا، جو دنیا کی خواہش رکھتا ہے، وہ مردہ قرار پایا۔ فلاح وہی قوم پاتی ہے جو اپنے تنِ مردہ میں نئی جان پیدا کرتی ہے۔ ورنہ ''ہے جرم ضعیفی کی سزا مرگِ مفاجات''۔

کولابہ کے علاقے میں موجود تاج محل ہوٹل میں اس

تنظیم کے چند لوگ پہلے ہی پہنچ چکے تھے۔ وہ باقاعدہ کمرے لے کر عیش کر رہے تھے۔ یہ ہوٹل انڈیا گیٹ کے ساتھ اور ساحل سمندر پر واقع ہے۔ کولابہ ہی میں ایک کاروباری عمارت میں ان کا مرکز بن چکا تھا۔ صرف دو دن بعد وہ اس وقت حرکت میں آنے والے تھے، جب یہودی لابی کے لوگ وہاں پہنچ جاتے۔

میں بہت پرجوش ہو گیا تھا اور پوری توجہ اسی طرف لگا دی تھی۔ میں نے اروند اور فہیم کو آن لائن بٹھا کر سمجھا دیا تھا کہ انہوں نے کیا کرنا ہے۔ دوپہر کے وقت ہی میں نے نوتن کور سے پوچھا۔ اسے بھی معلوم نہیں تھا کہ کیا ہونے والا ہے۔ لیکن جو پلان ڈی کوڈ ہوا تھا، اگر شروعات اس کے مطابق ہوئیں تو آگے کا سارا معاملہ ویسے ہی ہونا تھا۔

☆......☆......☆

جالندھر پر سورج کی روشنی پھیل چکی تھی۔ جسپال اروند کے ساتھ بیٹھا ہوا تھا۔ اس کے ساتھ گرلین کور اور رونیت کور سمٹی ہوئی بیٹھی تھیں۔ ان سب کی آنکھیں دیکھ کر لگتا تھا جیسے ورم آلود ہوں۔ وہ کل شام سے مسلسل کمپیوٹر کے آگے بیٹھے ہوئے تھے اور پورا پلان سمجھنے کی کوشش میں تھے۔ اسی کمپیوٹر اسکرین پر بھی اکٹھا تھے۔ بانیتا ابھی تک فارم ہاؤس نہیں پہنچی تھی۔

''کچھ سمجھ میں آیا اروند؟'' رونیت نے پوچھا۔

''کئی آپشن ہیں، سمجھ میں آرہا ہے لیکن جیسے ہی یہ واردات ہوئی تبھی اس کی صورت واضح ہوگی۔ کیونکہ اس واردات کے لیے اندر کے لوگوں کا ہونا بہت ضروری ہے۔'' اس نے اسکرین پر نگاہیں جمائے کہا تو جسپال کے ذہن میں جگجیت بھر بھرے کی ساری بات ایک دم سے ابھری تو تیزی سے بولا۔

''تو پھر انتظار کرو، دیکھتے ہیں کیا ہوتا ہے۔''

یہ کہہ کر وہ اٹھا اور باہر کی جانب نکل گیا۔ وہ کچھ دیر ٹہلتا ہوا سوچتا رہا، پھر اس نے فون نکالا اور جمال کے نمبر ملانے لگا۔ ذرا سی دیر بعد رابطہ ہو گیا۔

''جمال، یہ جو بھی واردات ہے، اس کا تعلق بم دھماکوں کے اس سلسلے کے ساتھ ضرور جڑا ہوا ہے اور اس کا مرکز اگر ممبئی ہے تو جگجیت بھر بھرے بھی ان کی ہٹ لسٹ پر ہوگا، وہ اسے مار دیں گے۔''

''تمہیں پریشان ہونے کی ضرورت نہیں، ہونی کو کوئی نہیں ٹال سکتا۔ ہم نے چاہا ہے کہ یہ یہودی اور ان کے حواری سبق سیکھیں تو انہیں سبق ضرور ملے گا۔ اس میں کس کا کتنا نقصان ہوتا ہے، یہ تو بعد کی بات ہے۔'' جمال نے پرسکون لہجے میں کہا۔

''لیکن اس میں ہمارا فائدہ کہاں ہے؟'' جسپال نے پوچھا تو وہ بولا۔

''فی الوقت ہمیں صرف تماشائی بننا ہے، پھر اس کے بعد دیکھیں گے کہ ہم نے کیا کرنا ہے۔''

''میں سمجھا نہیں تم اتنے پرسکون کیوں ہو؟'' جسپال نے پوچھا۔

''دیکھو، یہ تسلسل ہے انہی بم دھماکوں کا تو انہوں نے ہٹ کرنا ہی ہے اسے، اب یہ بچ سکتا ہے تو بچ جائے، یہ کیا ہونے جا رہا ہے، ہو گیا تو اس کی سمت دیکھ کر اس کے نتائج دیکھ کر اندازہ لگایا جائے گا کہ یہ کون ہیں، ہم اس میں نہیں کود سکتے۔ ہمارا کوئی جواز نہیں بنتا۔ اروند وغیرہ سے کہو، سکون کریں۔''

''اوکے، میں کہتا ہوں۔'' اس نے کہا اور فون بند کرتے ہوئے اندر کی طرف چل پڑا۔

وہ سب لوگ آرام کرنے چلے گئے لیکن جسپال کو سکون نہیں آرہا تھا۔ یہ آگہی بھی بڑی اذیت دیتی ہے۔ بم دھماکوں میں کتنے لوگ اپنوں سے بچھڑ جائیں گے اور ان کا کوئی گناہ بھی نہیں، کسی کو یہ معلوم ہی نہیں ہوگا کہ وہ کیوں مارا جا رہا ہے۔ وہ اپنے کمرے میں پڑا یہی سوچ رہا تھا کہ بانیتا کور آگئی۔

''اوئے جسپال تو ادھر پڑا ہے، بڑی خاموشی ہے۔ کیا ہوا؟'' اس نے حیرت سے پوچھا اور اس کے پاس بیڈ پر بیٹھ کر اس کی طرف دیکھنے لگی۔

’’کچھ نہیں یار، یہ لوگ ساری رات بیٹھے رہے ہیں کمپیوٹر پر، میں نے کہا سو جاؤ تو وہ آرام کر رہے ہیں۔‘‘ جسپال نے عام سے انداز میں کہا۔

’’کچھ ملا بھی یا یہ اروند یونہی دعوے کر......‘‘ اس نے جان بوجھ کر بات ادھوری چھوڑ دی تو جسپال نے اسے ساری بات بتا دی۔ وہ سنتی رہی اور اس کی آنکھیں پھیلتی رہیں۔ ساری بات سن کر وہ بے چین ہو گئی اور تیزی سے پوچھا۔

’’یہ بات بھربھرے کو بتائی؟‘‘

’’نہیں، ابھی نہیں۔‘‘ اس نے سکون سے کہا۔

’’ہمیں بتا دینی چاہئے۔‘‘ یہ کہہ کر اس نے دلیل دیتے ہوئے کہا۔

’’دیکھو، میرا خیال ہے کہ اگر یہ بات انٹیلی جنس کو معلوم بھی ہوئی تو وہ اس تک یہ بات نہیں پہنچائیں گے۔ ہم اسے خبردار کر دیتے ہیں۔‘‘

’’جیسے تمہاری مرضی۔‘‘ جسپال نے کہا اور اٹھ کر بیٹھ گیا۔ بانیتا کور نے فون سے نمبر ملائے تو کچھ دیر بعد رابطہ ہو گیا۔ اس نے بھربھرے کو ساری بات بتا دی تو اس نے کہا۔

’’بانیتا یہ کوئی نئی بات نہیں روز کا معمول ہے۔ کسی نہ کسی طرف سے دھمکی آ جاتی ہے۔ اگر کچھ ہونے جا رہا ہے تو میں دیکھتا ہوں۔‘‘

’’ٹھیک ہے جیسے آپ کی مرضی۔‘‘ بانیتا نے مایوس ہوتے ہوئے کہا تو جسپال بولا۔

’’میں بھی کہہ دیتا تو اس کا جواب یہی ہونا تھا۔ اب صرف دیکھو۔ کیا ہوتا ہے۔‘‘

اس پر بانیتا کو خالی الذہن کے ساتھ اس کی طرف دیکھتی رہی پھر ایک دم سے بیڈ پر لیٹ کر گہرا سانس لیا اور نعرہ لگاتی ہوئی بولی۔

’’جو بولے سو نہال، ست سری اکال۔‘‘ یہ کہہ کر وہ ایک دم سے ہنس دی۔

’’بس اسی طرح رہو۔‘‘ جسپال نے کہا۔

’’چل یار میں بھی سو لوں۔‘‘ یہ کہہ کر وہ جوتوں سمیت بیڈ پر لیٹ گئی۔ جسپال دوسرے کنارے لیٹ گیا۔

وہ فریش ہو کر فارم ہاؤس کے ایک سبز لان میں شام کی چائے پی رہے تھے۔ ان کے درمیان یہی موضوع چل رہا تھا کہ ممبئی میں کیا ہو سکتا ہے۔ پھر باتیں مختلف موضوعات سے ہوتی ہوئیں نجانے کدھر نکل گئیں۔ سورج غروب ہوا تو وہ اٹھ کر اندر چلے گئے۔ وہ بھی کمپیوٹر اسکرین پر نگاہیں جما کر بیٹھ گئے۔ ان کا رابطہ ممبئی میں پوری طرح ہو چکا تھا۔ ٹی ایس، نوتن کور اور زوردار سنگھ کے لوگ اپنے پورے لوازمات کے ساتھ ان مختلف جگہوں پر چلے گئے جہاں انہیں کہا گیا تھا۔ ان سب کو بانیتا کور دیکھ رہی تھی اور ہم فقط تماشائی تھے۔

ممبئی پر شام اتر آئی تھی۔ ٹی ایس کے لوگ کولابہ جیٹی کے آس پاس پھیل چکے تھے۔ ان میں سے کچھ لڑکے سمندر میں بھی چلے گئے تھے۔ دھندلکا بڑھتے ہی ٹی ایس نے اطلاع دی کہ تقریباً چار ناٹیکل میل (سات کلومیٹر) کے فاصلے سے تین مختلف بوٹس پر تقریباً دس آدمی بڑی تیزی کے ساتھ ساحل جانب بڑھ رہے ہیں۔ ان کے پاس سامان کے بھرے ہوئے تھیلے ہیں۔ وہ ساحل کے پاس پہنچ گئے، انہیں کسی نہیں پوچھا، کوئی فورس کا بندہ وہاں نہیں تھا۔ وہ ایسی طرح ساحل پر اترے جیسے وہ کوئی مقامی ہوں۔ پہلی کشتی پر سے چار آدمی اپنی بھاری بیگز کے ساتھ مچھی مارنگر ساحل پر اترے، باقی چھ دوسری کشتیوں میں ساحل کے ساتھ پھرتے ہوئے ممبئی کیفے پریڈ کے علاقے تک جا پہنچے۔ وہ سارے کے سارے جوان اور نوعمر تھے۔ انہوں نے پتلونیں اور ٹی شرٹس پہنی ہوئی تھیں۔ وہ وہاں بیس منٹ تک پھرتے رہے لیکن سوائے مقامی مچھیروں کے کسی نے ان سے نہیں پوچھا کہ وہ کون لوگ ہیں تو انہوں نے یہی بتایا کہ وہ طالب علم ہیں اور دوسرے شہر سے آئے ہیں۔

’’اب یہ یہاں سے نکلیں گے۔‘‘ اروند نے کہا۔

’’پہلی نشانی پوری ہو چکی۔‘‘ فہیم بڑبڑایا

’’ٹی ایس سے کہو کہ یہ بندے نگاہوں سے اوجھل نہ

ہوں۔" بانیتا نے کہا تو ٹی ایس کا جواب آیا
"بالکل۔ایسا ہی ہوگا،ہم پوری طرح تیار ہیں۔"
بھدوار پارک، ممبئی کیفے پریڈ کے قریب ساحل پر کچھ دیر رکنے کے بعد وہ چھ لڑکے وہاں سے نکل پڑے۔انہوں نے اپنی کشتیاں وہیں چھوڑ دیں اور مین روڈ تک پیدل آگئے۔وہاں پر آکر وہ دو ٹولیوں میں تقسیم ہوگئے۔ایک ٹولی میں دو اور دوسری میں چار لڑکے تھے۔
"وہ بھی ٹیکسیوں میں بیٹھ چکے ہیں۔" ٹی ایس نے اطلاع دی
"کوئی اندازہ ہے کہ اب یہ کیا کریں گے؟" بانیتا نے پوچھا تو اروند بولا۔
"ان کے انداز سے یہی لگتا ہے کہ یہ چار مختلف جگہوں پر واردات کریں گے۔ان میں سب سے بھاری واردات وہ لوگ کرنے والے ہیں، جو چار ہیں۔" رونیت نے اپنے طور پر تبصرہ کیا۔
"اوکے اب دیکھو یہ کرتے کیا ہیں۔" جسپال نے ٹی وی پر نگاہیں جمائے کہا۔
اس وقت ساڑھے نو ہو چکے تھے۔جب نوتن نے اطلاع دی کہ وہ مچھی مارنگر سے ٹیکسی میں سوار ہوکر نارتھ لعل روڈ پر چڑھے، پھر چوک سے واپس ہوکر ٹیکسی سے اترے ہیں اور سیدھے کیفے لیو پولڈ میں داخل ہو گئے ہیں۔کچھ ہی دیر بعد اندر سے فائرنگ کی شدید آوازیں آنے لگیں۔چیخ پکار کے ساتھ ہی ہر طرف بھگدڑ مچ گئی تھی۔کسی کی ہمت نہیں پڑ رہی تھی کہ یہ معلوم کر سکے کہ اندر ہو کیا گیا ہے۔اس کے کچھ ہی دیر بعد ہی ٹی وی پر چیخ و پکار مچنے لگی۔وہ لوگ ایک ایک لمحے کی خبر دینے لگے۔وہاں سے لاشیں ہٹائے جانے اور زخمیوں کو اسپتال پہنچانے کا سلسلہ چل رہا تھا کہ ایک ٹیکسی میں بم پھٹنے کی اطلاع ملی۔اسی دوران ٹی وی رپورٹ کرنے لگا کہ شیواجی ریلوے اسٹیشن پر دو لوگوں نے فائرنگ شروع کر دی ہے اور اسی طرح اوبرائے ہوٹل میں دو لوگ گھس گئے ہیں اور انہوں نے فائرنگ کرنا شروع کر دی ہے۔

اسی لمحے یہ خبر بھی دی جانے لگی کہ یہودیوں کے سنٹر نریمان ہاؤس میں شدید فائرنگ ہوئی ہے اور وہاں پر دو لوگوں نے قبضہ کر لیا ہے اور وہاں کے لوگوں کو یرغمال بنا لیا ہے۔اس کے ساتھ ساتھ تاج محل ہوٹل کے اندر فائرنگ کی آوازیں آنے لگی ہیں۔ٹی وی اسکرین پر یہ ساری رپورٹس چل رہی تھیں۔
"تمہارا کیا خیال ہے، اب ان کا اگلا قدم کیا ہوگا؟" بانیتا کور نے پرجوش انداز میں اروند سے پوچھا۔
"یہ دیکھو، یہ سارا ڈرامہ یہاں لکھا ہوا ہے۔ان میں سے وہ لوگ جواب منظر سے ہٹ گئے ہیں، وہی اب جگجیت بھر بھرے کو ماریں گے۔"
"وہ،کون ہیں اس وقت؟" بانیتا نے پوچھا۔
"وہ تو شیواجی ٹرمینل پر فائرنگ کرنے والے منظر سے ہٹ گئے ہیں، پولیس ان کی تلاش میں ہے۔" رونیت کور نے تیزی سے کہا۔
"وہ جال میں لا رہے ہیں جگجیت بھر بھرے کو۔" اروند نے کہا تو بانیتا نے اپنا سیل فون نکالا اور نمبر ملانے لگی، مگر فون مصروف جا رہا تھا۔اس نے ونود کا نمبر ملایا وہ بھی ویسا ہی ملا تب اس نے ٹی ایس کو مخاطب کیا اور پوچھا کہ وہ کہاں ہے؟
"میں شیواجی ٹرمینل کے پاس ہی ہوں۔یہاں سے وہ دہشت گرد نکل چکے ہیں اور ہر طرف پولیس ہے۔"
"دیکھو ٹی وی پر دکھایا جا رہا ہے کہ جگجیت بھر بھرے نے بلٹ پروف جیکٹ پہن لی ہے اور وہ پوری طرح مقابلے پر تیار ہو گیا ہے۔اس تک یہ اطلاع پہنچ جانی چاہئے کہ وہ جال میں پھنس رہا ہے۔" بانیتا نے تیزی سے کہا تو وہ بولا۔
"مگر میں اسے تلاش کہاں کروں گا اور مجھے اس تک پہنچنے کون دے گا۔"
"دیکھو، یہ ٹی وی والے جو لمحہ لمحہ کی رپورٹ دے رہی ہیں نا، وہ حملہ آوروں کی کتنی بڑی مدد کر رہے ہیں۔ اس سارے کھیل کو جو کھیل رہی ہیں، وہ سامنے دیکھ

رہے ہیں کہ کیا ہو رہا ہے۔ کیا تم اندازہ نہیں کر سکتے ہو؟" اس نے پوچھا تو ٹی ایس بولا۔

"وہ تو ٹھیک ہے مگر میں اس تک پہنچوں گا کیسے؟"

"میں کرتی ہوں کچھ" یہ کہہ کر اس نے ونود رانا کے نمبر ملائے تو چند لمحے بعد اس نے فون ریسیو کر لیا۔" جگجیت بھر بھرے کو بچا سکتے ہو تو بچا لو۔"

"مطلب ایسا کیا؟"

"تم لوگوں کے ساتھ بہت بڑا دھوکا ہو رہا ہے۔ جگجیت بھر بھرے کو غلط اطلاع دی جائے گی اور وہ جال میں جا پھنسے گا۔" اس نے چیخ کر بتایا

"مجھے کچھ سمجھ میں نہیں آ رہا ہے کہ تم کیا کہہ رہی ہو۔"

"تمہیں ابھی سمجھنے کی ضرورت نہیں، میری بات سمجھو، کہاں ہو؟"

"میں ان سے تھوڑا فاصلے پر ہوں۔"

"ٹی ایس ابھی آپ کو ملتا ہے۔ وہ ساری بات سمجھا دے گا۔" وہ بولی۔

"او کے۔" اس نے کہا اور فون بند کر دیا۔

ٹی ایس کوئی وقت ضائع کیے بغیر ونود رانا کی طرف بھاگا۔ کچھ ہی دیر بعد وہ اس سے جا ملا۔ اسی دوران یہ اطلاع آ رہی تھی کہ دو حملہ آور، شیوا جی ٹرمنل کے پچھلی طرف موجود کاما اسپتال میں موجود ہیں، وہاں انہوں نے فائرنگ کی ہے اور لوگوں کو یرغمال بنایا ہوا ہے۔

کاما اسپتال کے نزدیک ہی آزاد نگر پولیس اسٹیشن تھا۔ ونود اور ٹی ایس جیسے ہی وہاں پہنچے تو پتہ چلا کہ جگجیت بھر بھرے اپنے دو سیکورٹی گارڈز کو ہدایت دے کر اپنے ساتھ لے جا چکا ہے۔ وہیں پر انسپکٹر رامتے اور سالسکر بھی آ گئے۔ وہ شیوا جی ٹرمنل ہی سے آئے تھے انہیں بھی یہ اطلاع مل چکی تھی کہ کاما اسپتال میں کیا ہو رہا ہے۔ وہیں انہوں نے فیصلہ کیا تھا کہ کاما اسپتال کی مین انٹرنس تک جائیں اور وہاں سے اپنے آپریشن کا آغاز کریں۔

کاما اسپتال کی مین انٹرنس کے سامنے درختوں کا جھنڈ تھا۔ رامتے نے یہ تجویز دی کہ سامنے سے اٹیک کیا جائے۔ وہ وہاں سے گنوں کی فائرنگ کی آواز سن رہے تھے۔ وہ درختوں کی اوٹ سے سارا منظر دیکھ رہے تھے۔ وہیں سے انہوں نے فائرنگ کی ابتدا کی تو اسپتال کی طرف سے بھی فائرنگ ہونے لگی۔ ذرا سی دیر کے بعد اسپتال سے ایک دستی بم آ گرا۔ وہ بم ان سے ذرا فاصلے پر گرا اور پھٹ گیا۔ ایک چندھیا دینے والی روشنی میں زبردست دھماکا ہوا۔ وہ سبھی فوراً وہاں سے ہٹ گئے۔ انہوں نے فیصلہ کیا کہ بلٹ پروف گاڑی میں سامنے کی طرف جایا جائے۔ وہ تینوں اور ان کے کانسٹیبل جن میں اورون جادھو بھی تھا، گاڑی میں بیٹھ گئے اور ان کا رخ کاما اسپتال کی طرف ہو گیا۔ اسی لمحے انہیں وائرلیس پر پیغام موصول ہوا کہ قریب ہی کی ایک عمارت راج بھون کے پاس سرخ رنگ کی گاڑی کے پاس چھپے ہوئے ہیں۔ وہیں انہیں دیکھا جائے۔ یہ ان کے لیے حیرت انگیز بات تھی۔ ان کی ساری توجہ ادھر ہو گئی۔ اسی پوائنٹ پر سالسکر نے ڈرائیور کو ہٹا کر خود ڈرائیونگ سیٹ سنبھالی۔ اس وائرلیس کی گونج ابھی ختم نہیں ہوئی تھی کہ وہ دونوں حملہ آور کاما اسپتال کی اوٹ سے سو فٹ کے فاصلے پر ایک دم نکلے، جیسے انہیں پوری طرح پتہ ہو کہ اس گاڑی میں کون ہے، وہ انہی کی طرف آ رہی ہے۔ انہوں نے بے تحاشا پورے اعتماد کے ساتھ فائرنگ کرنا شروع کر دی۔ رامتے کے پاس اے کے فورٹی سیون تھی جبکہ سالسکر کے پاس نو ایم ایم کا پستول تھا۔ ایک بار تو یوں لگا جیسے ایک حملہ آور زخمی ہو کر گر گیا ہے، لیکن اگلے ہی لمحے وہ اٹھ گیا اور اس کا نشانہ وہ تینوں تھے۔ جگجیت بھر بھرے فائرنگ کی زد میں آ گیا اور اس نے موقعہ پر دم توڑ دیا۔ وہ دونوں آگے بڑھے، انہوں نے دیکھا، سبھی مر چکے ہیں۔ حالانکہ ارون جادھو ابھی زندہ تھا۔ وہ یوں بن گیا جیسے مر گیا ہو۔ ان میں سے ایک حملہ آور نے پوچھا۔

"ان میں جگجیت بھر بھرے کون ہے؟"

دوسرے نے گن کی نال سے جگجیت بھر بھرے کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

”یہ ہے۔“

”اس نے بلٹ پروف جیکٹ پہنی ہوئی ہے، ہوسکتا ہے ابھی یہ زندہ ہو۔“ اس نے یہ کہا ہی تھا کہ دوسرے نے نفرت سے اس پر پھر گولیاں برسانا شروع کردیں۔

”ہم اپنا کام کر چکے، یہ اتنی آسانی سے مارا جائے گا۔ باسٹرڈ۔“ دوسرے نے نفرت سے کہا اور تیزی سے مرے ہوؤں کو نکال کر گاڑی میں بیٹھے اور نکل گئے۔ کچھ ہی دیر بعد یہ خبر ٹی وی پر تھی کہ جگجیت بھر بھرے مارا گیا ہے۔

”اوہ، بہت برا ہوا۔“ بانیتا کور نے صدمے سے کہا۔

”اسے جال میں لایا گیا، وہ چلا گیا اور پھنس گیا۔ انسداد دہشت گردی اسکواڈ کا سربراہ یوں آسانی سے مر جائے گا، کیا یہ انہونی نہیں ہے۔“ اروند نے کرسی موڑتے ہوئے تیزی سے کہا۔

”بات انہونی یا ہونی کی نہیں ہے ارون، کسی وقت بھی کچھ ہوسکتا ہے۔ یہ اس دنیا......“ بانیتا نے کہنا چاہا تو وہ اس کی بات کاٹ کر بولا۔

”دنیا میں جو مرضی ہوتا رہے، میں اپنی بات کر رہا ہوں، یہ جو اسکرین پر چل رہا ہے یہ سب ڈرامہ ہے، افسوس اور صدمہ یہ ہے، اس میں انسان مر رہے ہیں، ابھی نجانے کتنے لوگ مریں گے۔ یہ جو فورسز یہاں لگائی جا رہی ہیں، کیا یہ انسان نہیں؟ کتنے لوگ خون کی اس ہولی میں جھونکے جا رہے ہیں، کس لیے؟“

”یہ تو وہی لوگ بتا سکتے ہیں جو یہ کھیل کھیل رہے ہیں۔“ بانیتا نے کاندھے اچکاتے ہوئے کہا جیسے وہ اب صدمے سے باہر نکل آئی ہو۔

”یہی کھیل میں ان پر الٹنا چاہتا ہوں۔ میں ابھی بتا دوں کہ سب نیپال کی سرحد کے پاس طے ہوا ہے۔ اور یہ لوگ وہیں کے ہیں۔ یہ سامنے اسکرین پر ان کے بارے میں سب موجود ہے۔ اب انہوں نے الزام کس پر لگانا ہے یہ بھی طے ہے، گر لین، دیکھو ڈنر تیار ہے یا نہیں۔“ اروند نے کہا اور اپنی سیٹ سے اٹھ گیا

”یہ تمہارا کیا طریقہ اروند، ادھر لوگ......اور......تم ڈنر کی بات۔“ رونیت نے حیرت سے کہا۔

”یہ درندگی سے بھرا ڈرامہ ابھی ختم ہونے والا نہیں۔ پوری ممبئی ہل چکی ہے۔ ممبئی میں موجود فورسز، ممبئی کے دادا بڑ دادا سب ڈھیر ہیں، کسی میں جرات نہیں کہ اس کو سمجھ سکیں اور تم لوگ کب تک کھانا نہیں کھاؤ گے؟“ اس نے جوش بھرے انداز میں یوں کہا جیسے وہ صدمے میں جانے کے بعد حواس باختہ ہو گیا ہو۔

”اروند ٹھیک کہہ رہا ہے، آؤ ڈنر کرتے ہیں۔“ جسپال نے کہا اور اٹھ گیا۔

”دیکھو، نریمان ہاؤس میں کیا ہو رہا ہے۔“ رونیت نے اس کی توجہ ٹی وی کی طرف دلائی۔ وہ وہی فائرنگ اور پولیس کے گھیرنے کی اطلاعات تھیں۔ اسی طرح تاج محل ہوٹل، اوبرائے ہوٹل میں جو آپریشن ہو رہے تھے، ان سب کی لمحہ بہ لمحہ رپورٹ نشر ہو رہی تھی۔ تبھی جسپال نے تبصرہ کرتے ہوئے کہا۔

”یار یہ میڈیا کی خبروں، اپ ڈیٹس اور رپورٹ سے تو یوں لگتا ہے جیسے ان حملہ آور دہشت گردوں کو بتایا جا رہا ہے پولیس اور دوسری فورسز ان کے خلاف کیا کر رہی ہیں، یا پھر ان لوگوں کو جنہوں نے یہ حملہ کروایا ہے۔“

”مجھے بھرے بھرے کی بات اب تک یاد ہے کہ کن لوگوں نے مقامی میڈیا پر قبضہ کیا ہوا ہے۔ اب دیکھنا، یہ سب ہو رہا ہے نا، کسی کو اس بارے میں معلوم نہیں کہ یہ کون کر رہا ہے۔ لیکن، یہ فوری طور پر الزام مسلمانوں پر لگائیں گے، ہوسکتا ہے یہ سکھوں کے سر بھی تھوپ دیا جائے۔“ بانیتا کور نے دھیمے سے لہجے میں کہا۔

”آؤ، دوسرے کمرے میں چلیں۔“ جسپال نے اٹھتے ہوئے کہا اور باہر کی جانب چلا گیا۔

☆......☆......☆

اڑسٹھ گھنٹے گزر گئے تھے۔ برصغیر میں موجود لوگوں کی طرح ہم بھی اس واقعے کے ساتھ مسلسل جڑے رہے تھے۔ پوری توجہ اسی دہشت گردی کی واردات پر تھی۔ اس سارے واقعے میں ایک سو چھیاسٹھ سے زائد بے

گناہ لوگ مارے گئے، جبکہ ساڑھے تین سو کے قریب لوگ زخمی ہو گئے تھے۔ ان میں بائیس غیر ملکی مارے گئے۔ وہ بائیس غیر ملکی کون تھے؟ جگجیت بھر بھرے کی بلٹ پروف جیکٹ کہاں گئی؟ اسے کس نے اس طرف دھکیلا؟ کیا بھارتی انٹیلی جنس اور نیوی کی خفیہ اس قدر نالائق ثابت ہوئی کہ انہیں ان حملوں کا احساس تک نہیں ہوا۔ دس بندے ان کے ملک میں آسانی سے داخل ہو گئے، کسی نے ان سے نہیں پوچھا؟ وہ اپنی نااہلی کے باعث لاعلم تھے یا ان کی ملی بھگت تھی؟ ابھی حملہ ہوا ہی تھا، تاج محل میں لوگ محصور تھے، ہر طرف افراتفری تھی، کسی کو کچھ معلوم نہیں تھا کہ کیا ہو رہا ہے، لیکن بھارتی میڈیا یہ بکنے لگا تھا کہ پاکستان کے کن کن شہروں پر حملہ کر دینا چاہیے۔ اس دوران مجاہدین نامی نامعلوم تنظیم نے حملوں کی ذمہ داری بھی لے لی اور ای میل کے ذریعے یہ ذمہ داری قبول کی؟ یہ ای میل کسے بھیجی گئی؟ وہی بندہ کیوں پکڑا گیا جس نے جگجیت بھر بھرے کو قتل کیا؟ وہ وہاں سے نکل کر کدھر جا رہے تھے؟ وہ زندہ گرفتار ہونے والا دہشت گرد تین برس پہلے نیپال سے گرفتار کیا گیا تھا۔ وہی زندہ کیوں بچا جس نے بھر بھرے کو مارا؟ تاج محل کے باہر پولیس اور "کچھ لوگ" اس طرح لوگوں کی "مدد" کر رہے تھے جیسے وہ ہلاکتیں بڑھانا چاہتے ہیں اور سب سے اہم سوال کہ جگجیت بھر بھرے کو کاما اسپتال کی طرف کس نے دھکیلا اور وائرلیس پر ایسا پیغام کیوں دیا گیا تھا۔ ایک ہی جگہ تین آفیسر کس طرح جمع ہو گئے تھے۔ کس نے انہیں وہاں جانے کا حکم دیا تھا۔ یہ اور ایسے سوالوں کا تسلسل تھا جس کی سمجھ اسے آ سکتی جسے ہندتوا کی تنظیموں کے بارے میں ذرا سا بھی پتہ ہو۔ یہ بھارت کا گھٹیا اور فلاپ ڈرامہ تھا۔ اگر پاکستانی حکومت اسی وقت ہوش سے کام لیتی تو حملے کی پہلی رات ہی بھارت کے کپڑے اُتار کر اس کے میڈیا کے منہ پر دے مارتے۔ مگر افسوس کہ ایسا نہ ہو سکا۔

ان اڑسٹھ گھنٹوں کی کارروائی نے مجھے بہت کچھ سوچنے پر مجبور کر دیا تھا۔ ہر نئی سوچ کے ساتھ ایک ایسا سوال پیدا ہوتا کہ میں اپنے اندر سے ہل جاتا۔ جدید ٹیکنالوجی جہاں ہر راز کھول رہی ہے، وہاں درندگی کس تک بڑھتی چلی جا رہی ہے یہ سوچا بھی نہیں جا سکتا۔ یہ سب کیوں؟ ایک سوچ ہی ہے نا، جسے نظریہ بنا لیا جاتا ہے اور پھر اس کی آبیاری انسانی خون کے ساتھ کی جاتی ہے۔ کیا یہ انسانیت ہے یا شیطانیت؟ ہندو انتہا پسند جو مسلمانوں کو زندہ جلانے سے دریغ نہیں کرتے، ان کے لیے اپنوں کو مار دینا کوئی اہمیت نہیں رکھتا۔ ان شدت پسند ہندوؤں کی حالت تو یہ تھی کہ ان کے اخبار "سامنا" کے اداریے میں یہ لکھا گیا کہ ہم نے بھر بھرے کے منہ پر تھوک دیا۔ مجھے ان سے کوئی غرض نہیں تھی، لیکن ان کا پاکستان کو میلی نگاہ سے دیکھنا ہرگز قبول نہیں تھا۔ ان میں کچھ انتہا پسند ہندو ایسے بھی تھے جن کا بس نہیں چل رہا تھا کہ بھارتی فوج آج ہی پاکستان پر چڑھائی کر دے۔ سیاسی بیانات کی مچھلی منڈی میں صرف پاکستان ہی کو موردِ الزام ٹھہرایا جا رہا تھا۔ مجھے یہ ہرگز قبول نہیں تھا۔

میں اپنے کمرے میں پڑا سوچتا رہا۔ پھر اس شام میں نے دو اہم فیصلے کر لیے۔ ایک یہ کہ پاکستانی سیاست میں ان لوگوں کا قلع قمع کرنا جو کسی بھی لحاظ سے پاکستان کے وجود کو برداشت نہیں کرتے اور دوسرا زخم زخم پاکستان کی سیاسی نظام کو عوامی بنانا۔

ڈنر کے بعد کراچی اور لاہور کے لوگ آن لائن ہو گئے۔ جس طرح پچھلے دو دنوں سے رات کے وقت بیٹھ کر ان حالیہ واقعات پر تبصرہ آرائی ہوتی تھی۔ میں نے ان سب کو اپنا فیصلہ سنا دیا۔

"جمال تمہارے یہ فیصلے سر آنکھوں پر، یہ ہونے چاہئیں لیکن یہ ابھی فوری نوعیت کے نہیں ہیں۔ ہمیں ابھی اس طرف توجہ دینا ہوگی کہ اس وقت پاکستان کے خلاف جو سازشیں ہو رہی ہیں ان کا سدباب کیسے کیا جائے۔" اکبر علی انٹیلی جنٹ نے اپنی رائے دی

"اگر ہم اس میں پڑ گئے تو جو اک نیا جہان جمال بنانا

چاہتا ہے، وہ نہیں بنا پائیں گے۔" زویا ایک دم سے بولی۔
"مطلب دونوں کام ایک ساتھ کرنے ہوں گے۔" جنید نے دھیمے لہجے میں کہا۔
"ظاہر ہے ابتدا ایسے ہی ہوگی، یہ سیاست دانوں کی اتنی غلاظت ہے کہ اسے سمیٹتے سمیٹتے عمر گذر جائے گی۔" علی نواز نے اپنی بھڑاس نکالی
"تو ڈن ہو گیا۔" اکبر علی نے ہاتھ اٹھاتے ہوئے کہا۔
"کیا؟" میں نے پوچھا۔
وہ لوگ جو ہمارے نئے جہان میں رکاوٹ ہوں گے انہیں دور کریں گے اور بس۔" اس نے وضاحت کی
"اس کے لیے طاقت چاہئے، دولت کی ہمارے پاس کمی نہیں، افرادی قوت اکٹھا کر رہے ہیں۔ اسلحہ جتنا چاہے مل سکتا ہے۔" اکبر نے جذباتی لہجے میں کہا۔
"چلو یہیں سے شروعات کرتے ہیں۔" میں نے کہا تو ہمارے درمیان بحث چھڑ گئی۔ ہم نے طے کر لیا کہ کس نے کیا کرنا ہے۔ کل کی شام سے ہم اپنا کام شروع کر دیں گے۔ کسی انتظار کی ضرورت نہیں۔

☆......☆......☆

"ہمارا مسئلہ وہی ہے جو غلام کا ہوتا ہے۔ ہم آزاد ملک میں آزاد شہری ہوتے ہوئے بھی غلام ہیں۔ ایک سکھ اس ملک میں دہشت گرد اور ملک دشمن ہی سمجھا جاتا ہے، کیوں، ایسا کیوں ہو رہا ہے، اس کی وجہ صرف اور صرف وہ ہندو ذہنیت ہے جو اپنے سوا کسی کو برداشت ہی نہیں کر پا رہی ہے۔ اور ہمارے گرو مہاراج، سچے بادشاہ نے جو ہمیں سبق دیا ہے وہ یہی ہے کہ سچا سکھ مر تو سکتا ہے لیکن غلام نہیں ہو سکتا۔ بانیوں میں یہی لکھا ہے، ہم جدوجہد کریں گے۔" جسپال نے پورے جوش سے کہا اور سب کی طرف دیکھا۔ اس کے سامنے رونیت، بانیتا، گرلین اور اروند بیٹھے ہوئے تھے۔
"ہم نے اپنی زندگی اپنے دھرم کے نام لگا دی ہے جسپال، یہ تم اچھی طرح جانتے ہو۔" رونیت نے گرلین کی طرف دیکھا تو اس نے اثبات میں سر ہلا دیا۔
"اروند! اگر تم یہاں رہو یا کینیڈا، تمہارے لیے ایک ہی بات ہے۔ اگر میں تم تینوں کو وہاں بھیج دوں تو کیا تم محفوظ نہیں ہو جاؤ گے اور ہماری مدد......"
"میں سمجھ گیا ہوں تم کیا کہنا چاہ رہے ہو۔ ہم وہاں زیادہ محفوظ ہوں گے اور زیادہ کام آ سکیں گے۔" اس نے تیزی سے کہا۔
"تو پھر تیاری کرو۔ یہ بانیتا کی ذمہ داری ہے کہ تمہارے جانے کا بندوبست کر دے۔ وہاں تم میرے پاس ہی ہو گے۔ بانیتا اور میں یہاں اپنی طاقت بنائیں گے، جو جیسی بھی بنی۔" جسپال نے کہا۔
"ہو گیا سمجھو، ابھی امرتسر کے لیے نکلو۔" بانیتا نے ساری بات سمجھتے ہوئے کہا اور اٹھ گئی۔
آدھی رات سے کچھ زیادہ ہی وقت ہو گیا تھا جب جسپال انہیں امرتسر کی جانب روانہ کر کے خود اوگی کی طرف چل پڑا۔ اس نے ہرپریت کو فون کر دیا تھا کہ وہ آ رہا ہے۔ وہ اس کے انتظار میں جاگ رہی تھی۔ جیسے ہی اس نے پورچ میں گاڑی کھڑی کی، ہرپریت نے دروازہ کھول دیا۔ وہ دونوں ایک دوسرے کو کویوں دیکھتے رہے جیسے صدیوں بعد ایک دوسرے کو دیکھا ہو۔
"ایسے ہی کھڑی رہو گی یا اندر آنے کو بھی کہو گی۔" جسپال نے مسکراتے ہوئے کہا۔
"جو دل میں بستے ہوں انہیں کسی اجازت کی ضرورت نہیں ہوتی، میں تو جی بھر کے تمہیں دیکھ رہی ہوں، ہو سکتا ہے تم یہ کہہ دو کہ میں نے ابھی واپس لوٹ جانا ہے اور میں تمہیں روک بھی نہیں سکتی۔" ہرپریت نے یوں کھوئے کھوئے انداز میں کہا کہ جسپال کے وہ اندر تک اتر گئی۔ وہ مسکرا دیا اور پھر بولا۔
"آؤ، اوپر کمرے میں چل کر باتیں کرتے ہیں۔"
"تم چلو، میں آتی ہوں۔" اس نے دھیمے سے لہجے میں کہا تو اس نے قدم بڑھا دیئے۔
زیادہ وقت نہیں گزرا تھا۔ جسپال ایزی ہو کر بیڈ پر

آن لیٹا تھا کہ ہرپریت اس کے لیے چائے کے ساتھ لوازمات لے آئی تھی۔ اس نے ٹرے بیڈ پر رکھا اور اس کے سامنے آلتی پالتی مار کر بیٹھ گئی۔

"سوری ہرپریت! میں جالندھر میں ہوتے ہوئے بھی تم سے رابطہ نہیں کر سکا۔" یہ کہہ کر اس نے چائے کا مگ اٹھایا تو وہ حسرت آمیز لہجے میں بولی۔

"جسی، کیا تمہیں یہ احساس ہے کہ ایک عرصہ ہو گیا تم نے مجھے پریت نہیں کہا؟"

اس پر جسپال نے اُسے چونک کر دیکھا، پھر چند لمحے سوچتے رہنے کے بعد بولا۔

"کاش ہم اپنی محبتوں میں وہ مٹھاس رکھ پاتے، لیکن کیا کریں ہرپریت، اس دنیا میں جینے کا حق صرف طاقت وروں کو ہے، یا تو وہ اپنا غلام بنا لیتے ہیں یا پھر مار دیتے ہیں، تیسری کوئی راہ نہیں ہے جینے کی۔ کاش ہم بھی آزادی سے اپنے رشتوں کو نبھا سکیں۔" یہ کہتے ہوئے وہ ایک دم سے افسردہ ہو گیا۔

"میرا مقصد تمہیں افسردہ کرنا نہیں جسی، میں تو یہ کہنا چاہ رہی ہوں کہ میرے لیے تمہارے پاس جتنا بھی وقت ہو، وہ پوری طرح میرا ہو اور بس۔" یہ کہہ کر وہ مسکرا دی، صاف ظاہر ہو رہا تھا کہ وہ زبردستی کی مسکراہٹ تھی۔

"ہاں یہ تو ہے۔" جسپال نے بھی افسردہ سی مسکراہٹ سے کہا اور بیڈ کے ساتھ ٹیک لگا لی۔ ان دونوں میں خاموشی اتر آئی تھی، جیسے ساری بات سمجھتے بھی ہیں اور سمجھنا بھی نہیں چاہتے۔ کچھ دیر بعد اس نے خوشگواریت سے پوچھا۔

"اچھا چھوڑ، بتا یہاں کیسا چل رہا ہے سب؟"

"جیسا تم نے کہا تھا، ویسا ہی چل رہا ہے۔ پورے علاقے میں جتنے بھی گرودوارے ہیں، میں نے سردار ویر سنگھ نے سیوا یاترا مکمل کر لی ہے۔ بہت ساری جگہوں پر مسائل ہیں۔ لیکن وہ مسئلے ایسے ہیں جن میں لوگوں کی ذاتی انا شامل ہے، باقی کچھ نہیں۔" ہرپریت نے بتایا

"اصل چیز لوگوں کی ہمدردی ہے، کیا ویر سنگھ وہ ہمدردی حاصل کرنے میں کامیاب رہا ہے یا ناکام؟" جسپال نے پوچھا۔

"بہت حد تک، وہ جو آئی بی والے مارے ہیں نا، ان کا بڑا اثر ہے۔" ہرپریت نے سوچتے ہوئے کہا۔

"مطلب یہ بھی طاقت ہی کو مانتے ہیں، انسانیت یا دھرم کو نہیں۔" وہ مسکراتے ہوئے بولا۔

پھر چند لمحے سوچ کر بولا۔

"ہمیں صبح ویر سنگھ جی کے پاس جانا ہے۔"

"ٹھیک ہے۔" ہرپریت نے تابعداری سے کہا تو جسپال ہنس دیا۔ پھر اس کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے کر اسے اپنے قریب کر لیا۔ وہیں بیٹھے، باتیں کرتے انہیں پوری رات گذر گئی۔ اس کا احساس انہیں اس وقت ہوا جب گرودوارے سے گیانی پورے گاؤں کو اٹھانے کے لیے محکم جاری کرنے لگا۔

انہیں ناشتے پر کافی دیر ہو گئی۔ پھوپھو کلجیت کور اور انوجیت سے باتیں کرتے وقت گذرنے کا احساس ہی نہیں ہوا۔ وہاں انہوں نے گھر بار کے علاوہ کوئی دوسری بات نہیں کی۔ کلجیت کور جب اٹھ گئی تو اس نے انوجیت سے کہا کہ وہ آج بلبیر سنگھ پنچ کو یہاں گھر میں بلائے۔ دن کافی چڑھ آیا تھا جب ہرپریت اور جسپال دونوں کار میں بیٹھ کر ویر سنگھ کی حویلی چل دیئے۔ ویر سنگھ انہی کے انتظار میں تھا۔ وہ انہیں دیکھ کر بہت خوش ہوا۔ ان کے ملازم آؤ بھگت میں لگ گئے۔ کافی دیر ادھر اُدھر کی باتوں کے بعد جسپال نے پوچھا۔

"سردار جی اب کیا سوچا ہے آپ نے الیکشن کے بارے میں۔ یہاں سے کس کو اپنا نمائندہ بنانا ہے۔"

"سیدھی اور سچی بات تو یہ ہے کہ میں اب اس قابل نہیں رہا۔ گرودوارہ سیوا میں کچھ اتنا سکون ملا ہے کہ کچھ دوسرا کرنے کو جی نہیں چاہتا۔ میرے منہ بولے بیٹے جوگندر سنگھ اور سریندر سنگھ تیار ہو سکتا ہے۔ لیکن میں یہ فیصلہ تم پر چھوڑتا ہوں تو جسے چاہے اس کام کے لیے چن لے۔" اس نے واضح لفظوں میں اپنی رائے دے دی

"میں اکیلا یہ فیصلہ نہیں کر سکتا سردار جی۔ جتھے داروں اور گیانیوں کے بغیر یہ فیصلہ نہیں ہو سکتا۔ میں نہیں چاہتا کہ طاقت کے زور پر اسے منوایا جائے۔ ہم نے دھرسیوا کرنی ہے اور اس حکومت سے اپنا حق مانگنا نہیں چھیننا ہے۔ جس میں یہ جرأت ہے وہ آگے آئے۔" جسپال نے انتہائی جذباتی لہجے میں کہا۔

"ہونا بھی یہی چاہئے۔ اب تک جو ہمارے نمائندے تھے، وہ ہمیں ہی بیچتے رہے۔ حکومت کے مخبر بن کر اپنی قوم کے لوگوں کو مرواتے رہے، لیکن اب ایسا نہیں ہوگا۔" ویر سنگھ نے دکھی لہجے میں جواب دیا۔

"تو سردار جی، آج شام کو علاقے کے کسی بھی گردوارے میں سارے گیانیوں کو بلاتے ہیں اور ان سے بات کرتے ہیں۔" جسپال نے کہا۔

"اوہ بھائیا! میں نے بات کر لی ہے، اور انہوں نے مجھے یہ حق دے دیا ہوا ہے کہ اگر میں چاہوں تو ٹھیک ورنہ جسے میں چاہوں۔ اور میں نے سوچ لیا ہوا ہے۔" اس نے سکون کہا۔

"کیا سوچا؟" اس نے بھی اسی سکون سے پوچھا۔

"میں تجھے اس مقصد کے لیے چنتا ہوں۔" یہ کہہ کر ویر سنگھ نے اس کے چہرے پر دیکھا۔ جسپال مسکرا دیا اور کسی جذبے کے بغیر بولا۔

"نہیں ویر سنگھ جی، میں نہیں۔ علاقے کا کوئی بھی جوان......"

"یہ چناؤ میں نے تم پر چھوڑا۔" ویر سنگھ نے اس کی بات مکمل ہونے سے پہلے کہہ دی تو جسپال نے کہا۔

"تو ٹھیک ہے، میں انوجیت سنگھ کا نام دیتا ہوں۔"

"مجھے یہ پوری طرح احساس تھا کہ تم ایسے ہی کرو گے۔ میں اس نام پر پہلے ہی لوگوں کا اتفاق لے چکا ہوں۔ الیکشن سے پہلے ہی ہم اسے یہ ذمہ داری دے دیں گے۔" ویر سنگھ نے فیصلہ کن لہجے میں کہا پھر اسی حوالے سے باتیں ہوتی رہیں۔ وہ دوپہر کے بعد وہاں سے واپس لوٹ آئے۔ وہ گھر نہیں گئے بلکہ اوگی میں پہلے بلبیر سنگھ پنچ کے گھر گئے، پھر اسے ساتھ لے کر گاؤں کے لوگوں سے ملتے اور ایک حسرت زدہ نگاہ اپنی برباد حویلی پر ڈال کر وہ شام تک واپس گھر آ گئے۔

گہری شام اتر آئی تھی۔ جسپال کا دل چاہ رہا تھا کہ وہ اڑے اور فضاؤں میں پھیل جائے۔ وہ اپنی اس کیفیت کو نہیں سمجھ پایا تھا۔ وہ کافی دیر تک اسی طرح اپنے احساس میں کھویا رہا تبھی اس کا من چاہا کہ وہ جمال کو فون کرے۔ اس نے فون نکال کر نمبر ملائے۔ چند لمحوں بعد رابطہ ہو گیا۔ تھوڑی دیر ادھر ادھر کی باتوں کے بعد جمال نے کہا۔

"اروند نے مجھے کچھ نام دیئے ہیں۔ یہ وہ شدت پسند ہندو ہیں، جو ہندوؤں کے علاوہ بھارت میں کسی کو دیکھنا بھی پسند نہیں کرتے ہیں اور ملک میں ہندو حکومت چاہتے ہیں۔ یہی وہ لوگ جوان کی طاقت ہیں۔ ختم کرنا ہے انہیں۔"

"ابھی جانا ہے؟" اس نے پوچھا۔

"نہیں ابھی کچھ دیر بعد تجھے اروند سنگھ پوری تفصیل بتائے گا۔ پھر شاید تجھے کسی بھی طرف نکلنا پڑے۔" جمال نے کہا۔

"ٹھیک ہے میں انتظار کر رہا ہوں۔" اس نے کہا اور کچھ دیر باتیں کرنے کے بعد فون بند کر دیا گیا۔

اس وقت ڈنر لے کر چائے پی رہے تھے، جب اروند سنگھ کا فون آ گیا۔ جسپال نے اس کی کال سنی تو وہ اسے تفصیل بتانے لگا۔ اروند نے اسے میل بھی کر دی تھی۔ جسپال کے بدن میں سنسنی پھیل گئی۔

☆......☆......☆

رات کا گہرا اندھیرا ہر طرف پھیلا ہوا تھا۔ اکبر، جنید اور میں لاہور سے شمال کی جانب نکل رہے تھے۔ ہمارے پاس فور وہیل جیپ تھی جس میں ہر طرح کا اسلحہ رکھا ہوا تھا میں نے نکلنے سے پہلے سارے بندوبست کر لیے تھے۔ ہمارا رخ کوٹ بہادر پور کی طرف تھا۔ راوی پل تک ٹریفک کے رش کی وجہ سے جیپ آہستہ رکھنا

پڑی، پھر رفتار تیز کر دی۔

ہمیں چوہدری الطاف گجر کے ڈیرے تک جانا تھا۔ وہ سابق رکن اسمبلی تھا اور نئے الیکشن میں رکن اسمبلی بن جانے کی سرتوڑ کوشش کر رہا تھا۔ اس کے لیے جو بھی ذریعہ ملا اسے استعمال کرنے کی فکر میں تھا۔ وہ جاگیردار ہونے کے ساتھ ساتھ فیکٹری آنر بھی تھا۔ اس کا بھائی اس کے کاروبار کی دیکھ بھال کرتا تھا۔ جن دنوں وہ رکن اسمبلی تھا، ان دنوں دولت کمانے اسے بہت ساری آفرز ہوئی تھیں۔ جن میں ایک آفر اسے بھارت سے بھی تھی۔ یہ آفر لاہور ہی کی ایک قحبہ خانہ چلانے والی عورت میڈیم زرینہ کے توسط سے ہوئی تھی اور بعد میں الطاف گجر کو اسی نے ان لوگوں سے ملوایا تھا۔ وہ چند لوگ ایک مافیا کی حیثیت رکھتے تھے۔ ان کے جہاں اور دوسرے مقصد تھے، وہاں حکومتی رسائی رکھنے والے لوگوں کو اپنے ساتھ ملاتے تھے۔ کاروباری وسعت میں مدد اور غیر ملکوں تک رسائی دیتے تھے اور ان سے اپنا مقصد نکالتے تھے۔ بظاہر وہ بھی کاروباری لوگ تھے لیکن دراصل وہ ''را'' کے وہ ایجنٹ تھے، جو انتہائی خطرناک تھے اور ہر طرح کے مقاصد حاصل کرنے کے لیے زمین تیار کرتے تھے۔ جیسے ہی الطاف گجر ان سے جڑا، اس کا کاروبار وسعت اختیار کر گیا۔ دولت اس پر برسنے لگی اور غیر ملکی دورے بڑھ گئے۔ اگلے الیکشن میں وہ ہار گیا۔ اب آنے والے الیکشن میں وہی لوگ اس کی بھرپور حمایت کر رہے تھے۔ دولت پانی کی طرح بہائی جا رہی تھی۔ اس بار وہ ایسا گھوڑا تیار کر رہے تھے، جس پر وہ پوری طرح سواری کر کے اپنی منزل حاصل کرنا چاہتے تھے۔ وہ اس چین میں شامل ہو گیا تھا، جس کے آخر میں یہودی تھے۔

وہ ایک انتہائی خطرناک پلان تیار کر چکے تھے۔ انہوں نے رکن اسمبلی بنوانے کے عوض اسے منسٹر بنوانا تھا، اسی وعدے پر وہ اپنے کافی سارے بندے پاکستان میں پھیلا رہے تھے۔ وہ لوگ بھارت سے آتے، کچھ عرصہ یہاں اس کے پاس رکتے، دستاویزات بنواتے اور لاہور اور اس کے گردونواح میں پھیل جاتے۔ وہ جو بھی کرنا چاہتے تھے وہ میرے وطن کے لیے کسی طور بھی ٹھیک نہیں ہو سکتا تھا۔ الطاف گجر دولت کمانے کے ساتھ طاقت حاصل کر رہا تھا۔ میرے وطن کے لیے زہر رکھنے والا سانپ کسی بھی وقت عفریت بن سکتا تھا۔ میں نے یہی سوچا، وقت ضائع کرنے کا کوئی فائدہ نہیں۔ سیدھے اسے اٹھاتے ہیں، بعد میں دیکھا جائے گا جو ہوگا۔ میں نے سوچا، فیصلہ کیا اور چل پڑے۔ راوی پل سے ہمارا رخ شیخوپورہ کی طرف ہو گیا۔ میرے فون پر راستہ صاف دکھائی دے رہا تھا۔ ہمارے درمیان خاموشی تھی۔

میں نے شام سے پہلے ہی ایک بندہ اس گاؤں میں بھیج دیا تھا۔ ہمارا اور اس کا وہاں پہنچنے کا دورانیہ تین گھنٹے کا تھا۔ وہ بھکاری کے روپ میں کوٹ بہادر کے اس گاؤں میں پھر چکا تھا، جہاں الطاف گجر کی آبائی حویلی اور گاؤں سے ذرا فاصلے پر اس کا ڈیرہ تھا۔ اس نے فون پر مجھے پوری تفصیل بتا دی تھی کہ وہ علاقہ کیسا ہے اور وہاں کی زمینی صورت حال کیا ہے۔ میرا ہمیشہ سے ہی یہ وتیرہ رہا تھا کہ میں پہلے نکلنے کا راستہ تلاش کرتا ہوں۔ وہ میں نے اس سے پوچھ لیا تھا۔ وہ کوئی تر نوالا نہیں تھا کہ جاتے ہی اسے ختم کیا جا سکتا تھا۔ وہاں موجود بندے نے یہ اطلاع دی تھی کہ اس کے ڈیرے پر کئی طرح کے لوگ ہیں، جو شکل ہی سے بدمعاش لگتے ہیں۔

میں کوٹ بہادر کے بالکل قریب پہنچ چکا تھا۔ میں اس بندے سے رابطہ کیا اور صورت حال کے بارے میں پوچھا۔

''ابھی تک میں نے الطاف گجر کو نہیں دیکھا اور یہ بھی معلوم نہیں ہو سکا کہ وہ یہاں ہے کہ نہیں۔ میں اب تک ڈیرے پر دو چکر لگا چکا ہوں۔'' اس نے بتایا تو میں نے اروند کو فون کیا۔

''اس کے فون کی لوکیشن تو یہی بتا رہی ہے کہ وہ اپنے گاؤں ہی میں ہے۔ وہ وہیں ہوگا۔'' اس نے

پورے یقین سے کہا۔

جیپ اکبر ڈرائیو کر رہا تھا۔ میں اسے گاؤں کا ایک چکر لگانے کا کہا۔ ہم مین روڈ سے اتر کر کوٹ بہادر کی طرف چل پڑے۔ اس گاؤں کی لوکیشن اس طرح تھی کہ اس کے دو طرف راستہ جاتا تھا، ایک وہ جس پر ہم تھے، دوسرا گاؤں سے باہر سیدھا نکل جاتا تھا اور تیسرا گاؤں کے درمیان سے ہو کر بائیں جانب نکل جاتا تھا، جو دوسرے گاؤں سے ہو کر پھر مین روڈ پر جا چڑھتا تھا۔ ہم گاؤں میں چلے گئے۔ میں نے سوچ لیا تھا کہ میں نے کیسے بات کرنی ہے۔ میں نے اکبر سے کہا کہ وہ سیدھا ڈیرے کی بجائے اس کی حویلی چلے۔

گاؤں میں بجلی کی روشنی تھی۔ لیکن بہت کم جگمگاہٹ کی وجہ سے ملگجا اندھیرا پھیلا ہوا تھا۔ گاؤں کے درمیان چوک میں ایک بڑا سارا مکان تھا۔ جس کے درمیان ایک دو منزلہ مکان تھا۔ اس کے اطراف میں کافی جگہ ہونے کے باعث ایک طرف ٹریکٹر، گاڑیاں اور زرعی مشینیں کھڑی تھیں۔ دوسری طرف ایک بڑا سا راڈیرہ تھا لیکن اب وہ کھلا نہیں ہوا تھا۔ بلاشبہ پرانے وقتوں میں یہی ڈیرہ استعمال ہوتا تھا۔

گاؤں میں اجنبی گاڑی دیکھ کر بہت سارے لوگ متوجہ ہو گئے تھے۔ جیسے ہی اس کی حویلی کے سامنے جیپ رکی، میں نے الطاف گجر کو فون کیا۔

"ہیلو، کون بات کر رہا ہے۔" اس نے کہا۔

"میں فرحان علی باجوہ بات کر رہا ہوں اور آپ سے ملنا چاہتا ہوں۔" میں نے کافی حد تک رعب سے کہا۔

"کون فرحان علی، اپنا تعارف کرائیں۔" اس نے کہا۔

"میں آپ کی حویلی کے باہر کھڑا ہوں، آپ سے ملنا چاہتا ہوں، مل کر پورا تعارف کرا دیتا ہوں۔" میں نے اسی لہجے میں کہا۔

"باہر کھڑے ہیں، مطلب، مجھ سے پوچھے بغیر کہ میں گاؤں میں ہوں بھی یا نہیں۔" اس نے محتاط ہوتے ہوئے کہا۔

"مجھے معلوم ہے کہ آپ کہاں ہے، اسی لیے سیدھا ادھر آ گیا، ڈیرے پر نہیں گیا۔" میں نے کہا۔

"تو آپ چلو ڈیرے پر، میں وہیں آتا ہوں۔" اس نے کہا میں نے قدرے غصے میں کہا۔

"لیکن میں آپ سے یہیں بات کرنا چاہتا ہوں، بات کرنی ہے یا میں جاؤں۔" میں نے رعب سے کہا۔

"ٹھیک ہے میں دیکھتا ہوں۔" یہ کہہ کر اس نے فون بند کر دیا۔ اگلے چند منٹ میں ایک لمبا تڑنگا شخص اندر سے برآمد ہوا۔ اس کے ساتھ دو تین اور آدمی تھے۔ تب تک میں جیپ سے باہر آ چکا تھا۔ اس نے میری طرف دیکھا اور مجھ سے ہاتھ ملایا۔ اسی دوران ایک بندہ واپس چلا گیا۔ وہ لمبا شخص مجھے لیتا ہوا اندر کی جانب چل پڑا۔ اس گھر والے ڈیرے کا راستہ اندر سے تھا۔ وہاں صحن میں کافی ساری کرسیاں پڑی ہوئی تھیں۔ جن پر دو لوگ بیٹھے ہوئے تھے۔ ان کے ہاتھوں میں جدید گنیں تھیں۔ ایک طرف بڑی ساری چارپائی تھی۔

"آئیں بیٹھیں، چوہدری صاحب ابھی آتے ہیں۔" اسی لمبے شخص نے کہا۔ میں نے اس کی بات پر کوئی توجہ نہیں دی بلکہ یوں ہو گیا جیسے کافی مضطرب ہوں۔ زیادہ وقت نہیں گذرا، ایک لمبے قد اور فربہ جسم کا ادھیڑ عمر شخص اندرونی کمرے سے برآمد ہوا۔ اس نے سفید شلوار قمیص پر نیوی بلیو ویسٹ کوٹ پہنا ہوا تھا۔ وہ بڑی آہستہ سے چلتا ہوا آیا۔ اس نے یوں میری طرف دیکھا جیسے میں کوئی حقیر کیڑا مکوڑا ہوں اور پھر آدھا سا ہاتھ ملاتے ہوئے طنز سے بولا۔

"ہاں جی فرحان علی جی، کون ہیں آپ، کرائیں تعارف۔"

"میرا تعارف یہ ہے کہ مجھے اشوک کانت نامی ایک بندے نے آپ کے بارے میں بتایا ہے جو تقریباً چھ ماہ یہاں اس گاؤں میں رہا، پھر لاہور میں آپ کی فیکٹری میں کام کرتا رہا اور پھر ہمیں مل گیا۔" میں نے اس سے

بھی زیادہ طنزیہ لہجے میں کہا تو وہ میری طرف دیکھنے لگا۔ پھر ایک دم سے مسکراتے ہوئے اپنے لوگوں کی طرف دیکھ کر بولا۔

"ارے۔ ہمارے اس گاؤں میں کوئی ہندو بھی رہتا رہا ہے، مجھے پتہ نہیں۔ خیر تم نے مجھے یہی بتانا تھا؟" اس نے آخری لفظ بڑی تضحیک سے کہے

"کیا اتنا کافی نہیں ہے۔" میں نے پوچھا۔

"ہاں تمہاری موت کے لیے اتنا بھی کافی ہو سکتا ہے۔ اب تم بتاؤ کون ہو؟" اس نے غصے میں کہا۔ اسی لمحے اس کے دونوں گارڈ الرٹ ہو گئے۔ انہوں نے اپنی گنیں سیدھی کر لیں۔ وہ لمبا شخص اپنا پسٹل نکال چکا تھا۔ مجھے پوری طرح احساس تھا کہ باہر سب کچھ دیکھا جا رہا ہے۔ میں نے گھوم کر پورا ماحول انہیں دکھا دیا۔ ان کے لیے اتنا ہی کافی تھا۔ میں نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا۔

"مطلب آپ میرے ساتھ تعاون کرنے کی بجائے مجھے قتل کرنے کی دھمکی دے رہے ہیں۔" میں نے کہا تو وہ ہنستے ہوئے بولا۔

"جس طرح کا مذاق تم نے کیا ہے، تمہارے جوتے مارے جانے چاہیں۔" اس نے غصے میں کہا ہی تھا کہ ٹھک ٹھک کی ہلکی سی آوازیں ابھریں اور اس کے اردگرد کھڑے تینوں گارڈز چیخیں بلند کرتے ہوئے ڈھیر ہوتے چلے گئے۔ ان کی پوری توجہ میری طرف تھی۔ ان کے گمان میں بھی نہیں تھا کہ کوئی باہر کی دیوار پر چڑھ کر اتنی تیزی سے اس کے بندے پھڑکا دے گا۔ الطاف گجر نے چھ فٹ سے زیادہ دیوار پر کھڑے جنید کو دیکھا، جس کے ہاتھ میں سائیلنسر والا آٹو میٹک پسٹل تھا جو مسلسل اس کے بندوں کے بدن میں سیسہ اتار رہا تھا۔ اس نے ایک دم اندر جانے کے لیے قدم بڑھائے ہی تھے کہ میں نے آگے بڑھ کر اسے گردن سے پکڑ لیا۔ پھر پوری قوت سے اس کی آنکھوں کے درمیان پنچ مارا۔ وہ چند لمحوں کے لیے اندھا ہو گیا۔ میں نے اسے گھسیٹا اور باہر کی جانب لے کر بڑھا۔ میں گلی میں آیا تو دو بندے حویلی میں سے نکلے۔ اس سے پہلے کہ وہ کوئی فائر کرتے، جنید نے ان پر فائر کر دیا۔ اکبر جیپ کا دروازہ کھول چکا تھا۔ میں نے اسے اندر دھکیلا اور خود بیٹھ گیا۔ وہ تڑپ رہا تھا۔ میں نے اس کے سر پر زور سے ہاتھ مارا وہ بدحواس ہو گیا۔ تب تک جنید آ گیا۔ اس نے آتے ہی پسٹل کا دستہ اس کے سر پر مارا۔ وہ بے ہوش ہو گیا۔ اکبر نے تب تک جیپ بڑھا دی تھی۔ وہ بندہ گاؤں سے نکل کر باہر والے راستے پر تھا۔ وہ مسلسل رابطے میں تھا۔ وہاں ابھی تک کچھ پتہ نہیں تھا۔ اکبر نے جیپ ادھر بڑھا دی۔ راستے میں اسے اٹھایا اور ہم تیزی سے مین روڈ کی جانب بڑھ گئے۔

"اصل خطرہ اب ہو گا سر جی۔" اس بندے نے بتایا

"کیسا خطرہ؟" جنید نے پوچھا۔

"یہ سارا علاقہ اس کے بندوں سے بھرا پڑا ہے۔ سیل فون سے چند منٹوں میں یہ خبر پورے علاقے میں پھیل جائے گی۔ ہمارا نکلنا ......" وہ کہہ رہا تھا کہ سامنے دائیں طرف سے دو کاریں بھاگتی ہوئی مین روڈ کی طرف آتی دکھائی دیں۔ ان سے کچھ فاصلے پر مزید گاڑیاں بھی تھیں۔ ہمارے روڈ تک پہنچنے سے پہلے وہ روڈ تک پہنچ جاتی تو وہ ہمارا راستہ روک سکتی تھیں۔

"جنید، گجر کو سنبھالو، میں کار والوں کو دیکھتا ہوں، اکبر جیپ نہیں رکنی، ان میں مار دو بے شک۔" میں نے کہا اور کھلے ہوئے سن روف میں لانچر لے کر اٹھ گیا۔ میں یونہی ان پر فائر نہیں کرنا چاہتا تھا بلکہ یہ تصدیق کرنا چاہتا تھا کہ وہ واقعی ہمارا راستہ روکنے کے لیے آئے ہیں یا اس معاملے سے متعلق ہیں ہی نہیں۔ زیادہ وقت نہیں گذرا تھا۔ وہ کاریں کچھ فاصلے پر سڑک کے بالکل درمیان میں رک گئیں۔ انہوں نے راستہ روک لیا تھا۔ اگر ہم سائیڈ سے بھی ہٹ کر جاتے تو رفتار بہر حال کم کرنا پڑتی۔ صاف ظاہر تھا کہ وہ ہمارا راستہ روکنا چاہتے تھے۔ میں نے نشانہ لیا اور لانچر داغ دیا۔ اگلی ہی لمحے ایک دھماکا

ہوا اور دونوں کاریں کئی فٹ اچھلیں۔ اس کے فوراً بعد دو دھماکے ہوئے اور وہ کاریں پھٹ گئیں۔ اس وقت تک ہم ان کے قریب پہنچ چکے تھے۔ اکبر کو رفتار بالکل آہستہ کرنا پڑی۔ اس نے سائیڈ سے جیپ نکالی اور پھر اسی طرح آگے تیز رفتاری سے بڑھنے لگا۔

اس وقت ہم مین روڈ پر چڑھ آئے تھے۔ مجھے پورا یقین تھا کہ مین روڈ پر ہمارے لیے ناکے لگ جائیں گے۔ اسی لیے میں الطاف گجر کا بندوبست وہیں کیا ہوا تھا۔ شیخوپورہ سے پہلے ہی دائیں جانب سڑک کنارے ایک کارخانہ تھا۔ اس کا مالک اگرچہ لاہور میں رہتا تھا لیکن ہمارے لیے وہاں آیا ہوا تھا۔ اس نے اپنی رہائش کے لیے وہیں ایک شاندار سیٹ اپ بنایا ہوا تھا۔ ظاہر ہے یہ ان لوگوں کی عیاشیوں اور خفیہ معاملات کے لیے ہوتے ہیں۔ وہاں ملازمین بھی ان کے اعتماد کے لوگ رکھے ہوئے تھے۔ میرا فون پر رابطہ ہو چکا تھا۔ وہ میرے انتظار میں تھا۔ ہم اس طرف جا پہنچے جہاں اس نے الگ کوٹھی بنائی ہوئی تھی۔ وہاں ہر طرف ویرانی چھائی ہوئی تھی۔ ہم نے الطاف گجر کو نکالا اور اندر لے گئے۔ وہ ابھی تک بے ہوش تھا۔ تہہ خانے میں آمنے سامنے چار کمرے تھے۔ ان کے درمیان ایک راہداری تھی۔ اندر کمروں میں قالین بچھے ہوئے تھے اور دیواروں کے ساتھ گاؤ تکیے لگے ہوئے تھے۔ ایک کمرے میں اسے لے جا پھینکا۔ اکبر اور جنید وہیں ٹھہر گئے۔ میں وہاں سے باہر جاتے ہوئے کہا۔

''جیسے ہی اسے ہوش آجائے مجھے بتانا۔''

انہوں نے کوئی جواب نہیں دیا۔ میں اوپر آ گیا۔ جیپ پورچ سے ہٹا دی گئی تھی۔

میں ڈرائنگ روم میں آن بیٹھا اور فہیم سے رابطہ کیا۔

''وہاں چھ بندے سڑک پر مارے گئے ہیں اور تین گاؤں میں، پولیس کو مصیبت پڑ گئی ہے۔'' فہیم نے پوری تفصیل بتانے کے بعد کہا۔

''بات آئی جی تک پہنچی ہے کہ نہیں؟'' میں نے پوچھا۔

''پہنچ گئی ہے؟''

''اوکے، میں دوبارہ رابطہ کرتا ہوں۔'' میں نے کہا اور فون بند کر دیا۔ میرا میزبان میرے سامنے نہیں آ رہا تھا۔ اس کی وجہ مجھے سمجھ آ رہی تھی۔ وہ میرا سامنا کرنا ہی نہیں چاہتا تھا۔ میں نے بھی اسے ڈسٹرب نہیں کیا۔ مجھے کچھ دوسرے لوگوں سے بھی رابطہ کرنا تھا، میں نے ان سے بات کی۔ میں ابھی اسی میں مصروف تھا کہ اکبر نے مجھے کال کی کہ اسے ہوش آ گیا ہے۔ میں وہاں سے اٹھا اور تہہ خانے میں چلا گیا۔

الطاف گجر آنکھیں پھاڑے مجھے دیکھ رہا تھا۔ میں اس کے سامنے گاؤ تکیے کے سہارے بیٹھا اس کی جانب مسلسل دیکھ رہا تھا۔ تبھی وہ سہمی ہوئی آواز میں بولا۔

''کون ہو تم؟''

''اپنے گھر میں تو کتا بھی شیر ہوتا ہے، تم تو کتے سے بھی کم نکلے ہو، یہاں تمہاری ہوا ہی نکل گئی ہے۔'' میں سرد سے لہجے میں کہا۔

''میں نہیں جانتا کہ تم کون ہو۔'' اس نے اسی طرح ڈرے ہوئے انداز میں کہا۔

''یہی بات تم اپنے گھر میں بھی کر سکتے تھے، تین بندے گھر میں اور بارہ بندے سڑک پر مارے گئے، کیا فائدہ ہوا، تم اب ہماری قید میں ہو۔''

''پندرہ بندے مارے گئے؟'' وہ یوں بولا جیسے ابھی بے ہوش ہو جائے گا۔

''سڑک پر تو وہی مرے ہوں گے نا، جو تیرے ڈیرے پر کتوں کی طرح پڑے رہتے ہیں اور تیرے گندے عزائم میں تیری مدد کرتے تھے، مالک کی وفاداری میں آئے اور مارے گئے۔ سچ بتانا، ان میں کتنے بھارتی تھے اور کتنے یہاں کے مقامی۔'' میں نے پوچھا تو وہ میری جانب یوں دیکھنے لگا جیسے اس میں خون ہی نہ رہا ہو۔

''کک.....کون ہوتم؟''

''وقت ضائع نہ کرو، اگر زندگی چاہتے ہوتو، جو میں پوچھو بتاتے جانا، ورنہ، تم موت مانگو گے وہ نہیں ملے گی۔''

''تم خفیہ والے ہو یا......'' اس نے کہنا چاہا تو مجھے ایک دم سے غصہ آ گیا

''میں چاہے تمہارے باپ ہوں۔ میں نے جو پوچھا ہے اس کا جواب دو۔''

''ہاں، ان میں چند لوگ ہیں جو بھارتی ہیں۔''

''کتنے لوگ پاکستان میں پھیلا چکے ہو؟'' میں نے پوچھا تو وہ سوچتے ہوئے بولا۔

''یہی کوئی، تیس چالیس تو ہوں گے اب تک۔''

''تجھ جیسے بے غیرت کو یہ سمجھانا بہت مشکل ہے کہ یہ اپنی ہی قوم کے خلاف کتنا بڑا جرم ہے۔ وہ یہاں ہمارے اچھے کے لیے تو نہیں آئے۔ خیر، پوری تفصیل چاہئے مجھے ان بندوں کی، کون کون اس میں ملوث ہے۔ تعاون کرو گے تو تیری بیوی بچے بچ جائیں گے، میں تجھے بھی کچھ نہیں کہوں گا لیکن اگر ذرا سی بھی بے غیرتی کی تو اس زمیں سے تیری نسل ختم ہو جائے گی۔'' یہ کہہ کر میں اٹھا اور باہر نکل گیا۔ جنید اور اکبر سمجھ چکے تھے کہ انہیں کیا کرنا ہے۔ میں اوپر آیا تو میرا میزبان مضطرب سا ڈرائینگ روم میں ٹہل رہا تھا۔ مجھے دیکھتے ہی سیدھا ہو گیا۔

''یہ اس وقت تک یہاں رہے گا، جب تک اس سے پوری معلومات نہیں مل جاتیں۔ زیادہ سے زیادہ آج رات یا کل کا دن۔ آؤ مجھے چھوڑ دو۔'' میں نے کہا تو وہ ہچکچاتے ہوئے بولا۔

''اگر آپ کہیں تو میں اِدھر ہی رہتا ہوں۔ کسی وقت بھی ضرورت پڑ سکتی ہے۔ میں ڈرائیور کو بھیج دیتا ہوں یا آپ خود میری کار لے جائیں۔''

''چابی کہاں ہے؟'' میں نے ہاتھ بڑھایا تو اس نے فوراً جیب سے چابی نکالی اور میری طرف بڑھا دی۔ میں چابی لے کر باہر آ گیا۔ پورچ میں اس کی سوک کھڑی تھی۔ میں اس میں بیٹھا اور لاہور کی طرف نکل گیا۔

رات کافی ہو گئی تھی۔ میں الطاف گجر کو چھوڑ کر واپس آ رہا تھا، اس وقت میں راوی پل سے کافی پیچھے تھا کہ کرنل سرفراز کا فون آ گیا۔ حال احوال کے بعد انہوں نے خوشی کا اظہار کیا کہ میں ایک بڑی کامیابی کی طرف بڑھ گیا ہوں۔ کافی عرصے سے گینگ مل نہیں رہا تھا۔

''پتہ نہیں کتنے بندے اس نے ملک میں پھیلا دیئے ہیں۔'' میں نے کہا۔

''وقت لگے گا لیکن وہ مل جائیں گے، خیر تم راوی پل پر پہنچو گے تو اس سے پہلے ہی ایک سرخ ہنڈا ملے گی۔ اس میں ایک لڑکا ہے طارق نذیر، وہ تجھے ملے، باقی ساری بات وہ بتا دے گا۔ غیر معمولی اعتماد کا لڑکا ہے۔''

''ٹھیک ہے۔'' میں نے مختصر جواب دیا۔

''میں تم سے بعد میں بات کروں گا، ممکن ہوا تو تجھے ملنے آ ؤں گا۔ اپنا بہت خیال رکھنا۔'' یہ کہہ کر انہوں نے فون بند کر دیا۔ ان کا فون بند ہوتے ہی فون پر کال آ گئی۔

''میں طارق نذیر بات کر رہا ہوں اور آپ کا انتظار کر رہا ہوں۔''

''میں پانچ منٹ میں پہنچ رہا ہوں۔'' میں نے کہا اور فون بند کر دیا۔

راوی پل سے پہلے ہی سڑک کنارے سرخ ہنڈا کھڑی تھی۔ ایک لڑکا اس کا ٹائر بدل رہا تھا، جبکہ سوٹ میں ملبوس ایک وجیہہ اور لمبے قد کا لڑکا پاس کھڑا تھا۔ عام لوگ یہی دیکھ سکتے تھے کہ کار کا ٹائر بدلا جا رہا ہے۔ وہ نظر انداز کر کے آگے گذر رہے تھے۔ میں اس کے پاس جا کر رک گیا۔ لمبے قد والے نے مجھے دیکھا اور مسکراتے ہوئے بنا کچھ کہے میرے ساتھ پسنجر سیٹ پر آن بیٹھا۔ وہ طارق نذیر تھا۔ پل پار کرتے تک وہ اپنے بارے میں بتا چکا تھا۔

”یہ کافی بڑا اور مضبوط گینگ ہے سر جی، میں پچھلے ماہ سے اس پر کام کر رہا تھا۔ لیکن کوئی ایسا ثبوت نہیں تھا جس کے بل بوتے پر میں کوئی کارروائی کر سکتا یا آگے بڑھ سکتا۔“ اس نے اعتراف کرتے ہوئے کہا۔

”ان کی طرف توجہ کیسے گئی؟“ میں نے پوچھا۔

”یہ اطلاع تو تھی کہ سرحد پار سے لوگ آئے ہیں، ان میں مرد بھی ہیں اور عورتیں بھی، لیکن وہ کہاں کھپ جاتے ہیں، اس کا پتہ نہیں چل رہا تھا۔ ایک ماہ پہلے سیکرٹری کی سطح کے بندے نے ایک نجی محفل میں الطاف گجر سے کافی بڑی رقم کا مطالبہ کیا۔ اس معاملے کو لے کر ان میں کچھ تو تکار بھی ہوگئی۔ محفل میں تو بات آئی گئی ہوگئی لیکن اگلی صبح وہ سیکرٹری اپنے ہی گھر میں مردہ پایا گیا۔ اس قتل کی تفتیش میں نہ صرف ناکامی ہوئی بلکہ الطاف گجر کے بارے میں کوئی ثبوت ہاتھ نہیں آیا۔ سیکرٹری کے ایک دوست نے مجھے صرف اتنا بتایا تھا کہ رقم کا مطالبہ کسی لمبے ہی دو نمبر دھندے کی وجہ سے تھا۔ تب سے میں کوشش کر رہا تھا۔ مگر ہاتھ نہ ڈال سکا۔“

”یہ پتہ چلا تھا کہ بھارت سے آنے والے بندے آگے بھیج رہا تھا؟“ میں نے پوچھا۔

”یہی تو ان دنوں میں مجھے پتہ چلا تھا۔ قتل والا معاملہ تو پیچھے رہ گیا، میں اس کی چھان بین میں لگ گیا۔“ اس نے تیزی سے کہا۔

”اب سب کچھ پتہ چل جائے گا۔“ یہ کہہ کر میں اس سمجھانے لگا کہ اب کرنا کیا ہے۔ وہ سنتا رہا۔ یہاں تک کہ ہم ایک اوپن ایئر ریستوران کے پاس پہنچ گئے۔ کھانا کھانے تک میں نے اسے سمجھا دیا۔ پارکنگ میں اس کی کار آچکی تھی۔ وہ اس طرف بڑھ گیا اور اپنی کار کی طرف۔ ہمارے درمیان اب فون پر ہی رابطہ ہونا تھا۔ کھیل اب شروع ہوا تھا۔

☆......☆......☆

جسپال کے ساتھ پانچ لوگ تھے۔ وہ فور وہیل میں تقریباً چار گھنٹے کا سفر کر کے جالندھر سے کھیتل شہر کے قریب پہنچے تھے۔ اس وقت صبح کے پانچ سے اوپر کا وقت ہو چکا تھا، جب وہ شہر سے باہر ہی ایک ڈھابے پر رُکے۔ وہاں پہلے ہی ان کے لیے دو لوگ بیٹھے ہوئے تھے۔ تمام راستے وہ ان سے رابطے میں رہے تھے۔ گاڑی رکتے ہی وہ انہیں پہچان گئے۔ وہ لوگ کھیتل شہر ہی کے تھے اور ایک نیٹ ورک کے ساتھ جڑے ہوئے تھے جو انہیں ہر طرح سے نواز رہا تھا۔ ان کا تعلق کہیں جا کر کینیڈا میں تھا۔ ایک طرح سے وہ بھی سکھ دھرم ہی کے لیے اپنی جان وارے بیٹھے تھے۔ وہ بھی منہ ہاتھ دھونے لگے۔ ایک ان میں سے مہمانوں کی خدمت میں لگ گیا، دوسرا جسپال کے ساتھ ایک طرف بیٹھ گیا تو جسپال نے پوچھا۔

”سنا مال تیار ہے یا ابھی کچھ وقت لگے گا؟“

”وہ تو تیار ہے، لیکن آپ نے ڈلیوری کہاں لینی ہے؟“ اس نے اسی انداز میں جواب دیا۔

”کیا مطلب، وہ تم لوگ جیسا چاہو۔“ جسپال نے خوشگوار لہجے میں کہا۔

”نہیں، جہاں آپ ڈلیوری لیں گے، اسی مطابق پھر سارا مال تیار ہوگا۔ ظاہر ہے گودام بھی تو چاہیے ہوگا مال رکھنے کے لیے۔“ سامنے بیٹھا شخص کافی سمجھ دار تھا

”ڈلیوری کہاں لی جا سکتی ہے؟“ جسپال نے اس کی بات پر سوچتے ہوئے پوچھا۔

”ایک تو بالکل وہیں، جہاں مال پڑا ہے، دوسرا جہاں شوروم ہے۔ یہ فیصلہ کرنا ہوگا، ابھی ہمارے پاس کم از کم تین گھنٹے ہیں۔ یہی وقت ہے جب مال کارخانے سے شوروم جاتا ہے۔“ اس بندے نے جواب دیا۔

”کیا خیال ہے، شوروم پر تو کافی رش ہوگا، صبح کا وقت، کارخانہ ٹھیک رہے گا۔“ جسپال نے صلاح دی

”چلیں، یہ آپ کی مرضی، مال چونکہ خراب ہونے کا ڈر ہے اس لیے جلد از جلد اسے گودام تک لے جانا ہوگا۔ وہ بھی شہر کے باہر۔“ اس بندے نے کہا۔

”چلو ٹھیک ہے۔“ جسپال نے ڈن کرتے ہوئے کہا

اوراس بندے کے چہرے کی طرف دیکھنے لگا۔
جلد ہی وہ سارے آ کر بیٹھ گئے۔ان کے لیے گرم گرم پراٹھے اترنے لگے تھے۔کھانے کے لیے میز بھر گیا تھا۔وہ کھانے لگے۔
ارجن کھتری، کھیتل شہر کا مشہور کاروباری اور سیاست دان تھا۔ وہ سیاست کے میدان میں کبھی سامنے نہیں آیا تھا،لیکن اسی میدان کا سب سے گھاگ کھلاڑی وہی تھا۔ پورے علاقے کی خبر اس کے پاس ہوتی تھی۔ دیکھنے اور سمجھنے والے یہی سمجھتے تھے کہ اس کی سیاست بس شہر تک محدود ہے۔وہ وہی کام کرتا ہے جس سے اس کے کاروبار کو کسی نہ کسی حوالے سے فائدہ ہوتا ہو لیکن وہ اس سے بھی آگے کا کھلاڑی تھا۔وہ فقط شہر ہی کی سیاست پر نہیں خالص ہندو حکومت قائم کرنے کی جدو جہد کرنے والوں میں چند لوگوں میں سے ایک تھا۔ سمجھوتہ ایکسپریس میں جو بم دھما کا ہوا تھا،اس میں اس نے پوری طرح معاونت کی تھی، یہی اس کی آنکھیں اور کان تھا۔
ممبئی حملوں کے بعد پاکستان کے لیے جو الزام تراشی کرنی تھی اس میں اس کا ایک اہم کردار یہ بھی تھا۔ دولت کے انبار اس کے پاس جمع تھے اور اسی طرح وہ آگے خرچ بھی کر رہا تھا۔ جو صرف اور صرف ''ہندو راشٹریہ'' کے لیے مخصوص تھا۔یہودیوں نے نہ صرف ان کے مقصد میں انہیں کامیابی کے لیے مدد دینے کا بھرپور وعدہ کیا تھا بلکہ ان کی تجارت کو بھی عالمی سطح پر لے جانے کی بھی معاونت کی تھی۔اس نے حکومت میں موجود ایم ایل ایز پر سرمایہ کاری کر رہا تھا کہ وہ انہی کی بات کریں۔ بھارت میں یہودیوں کے پیر جمانے میں اس کی سب سے زیادہ مدد شامل تھی۔جسپال اس کی سرکوبی کے لیے وہاں پہنچ چکا تھا۔اروند سنگھ نے اسے ساری معلومات دے دی تھیں۔
سورج اُگنے کی ملگجی روشنی پھیل چکی تھی۔سردی کا احساس کافی حد تک زیادہ ہو گیا ہوا تھا،جس کی وجہ سے بہت کم لوگ سڑکوں پر تھے۔ ہلکی ہلکی دھند تھی۔زیادہ تر وہی لوگ تھے جو اپنے کام کاج کے لیے آجا رہے تھے۔ وہ کم رفتار سے آگے ہی آگے بڑھتے جا رہے تھے، وہ انہیں فالو کر رہے تھے، جو ڈھابے سے ان کی راہ نمائی کرتے ہوئے موٹر سائیکل پر جا رہے تھے۔ ارجن کھتری کھیتل انبالہ روڈ پر موجود سیکٹر ۲۰ کے ایک گھر میں اپنے خاندان کے ساتھ رہتا تھا۔ جسے انہوں نے وہ جگہ بتائی تھی جہاں مال پڑا تھا، جبکہ اس کا کاروبار پرانے شہر میں تھا جسے وہ شوروم کہہ رہے تھے۔وہ کھیتل انبالہ روڈ پر آ گئے۔ جہاں سے دائیں طرف سیکٹر ۲۰ کو راستہ جاتا تھا، وہ پہلی ہی سڑک پر مڑ گئے۔ پھر مختلف راستوں سے ہوتے ہوئے وہ دو منزلہ کوٹھی کے سامنے جا رکے۔ موٹر سائیکل والے آگے نکل گئے۔گھر کے سامنے دو سیکورٹی والے کھڑے تھے۔ جیپ رُکتے ہی وہ الرٹ ہو گئے۔ ان کے ساتھ جیپ میں سے ایک بندہ نکلا اور اس نے جا کر سیکورٹی والوں سے کہا۔
''ہمیں فوری طور پر ارجن کھتری جی سے ملنا ہے، ہم فون کر رہے ہیں وہ فون ریسیو نہیں کر رہے ہیں۔''
''وہ اس وقت سو رہے ہیں۔ کچھ دیر بعد وہ اٹھ جائیں گے تب اگر ان کی اجازت ہوگی تو مل لینا۔'' سیکورٹی والوں نے خشک سے لہجے میں جواب دیا۔
''ہمیں بھی پتہ ہے کہ وہ اس وقت آرام کر رہے ہوں گے لیکن ان سے ملنا بہت ضروری ہے، اسی وقت ، انہیں صرف اتنا بتا دو کہ رمیش پانڈے جی کا پیغام ہے۔ ہم سے نہ ملیں ،صرف فون پر بات سن لیں۔'' اس نے کچھ ایسے کہا کہ سیکورٹی والا ایک لمحے کے لیے سوچ میں پڑ گیا۔اس نے اس بندے کو وہیں رُکنے کا اشارہ کیا اور اندر کی طرف چلا گیا۔کچھ دیر بعد وہ واپس آ کر بولا۔
''وہ اٹھ گئے ہیں اور اشنان کر رہے ہیں، پاٹھ کرنے کے بعد ہی وہ آپ لوگوں سے مل پائیں گے۔ اس وقت تک انتظار کرنا ہوگا۔'' سیکورٹی والے کے لفظ

منہ ہی میں رہ گئے تھے۔ اس نے پسٹل نکالا اور اسے اندر کی جانب دھکیلتا چلا گیا۔ دوسرے نے گن سیدھی کی تو جیپ میں سے فائر ہوا اور اس کی کھوپڑی میں سوراخ کر گیا۔ وہ لڑھکتا ہوا گیٹ میں جا لگا۔ اس کے ساتھ ہی وہ سارے جیپ سے اتر آئے۔ صرف ڈرائیور کی سیٹ پر ایک بندہ بیٹھا رہا۔ وہ چند لمحوں میں گیٹ کے اندر تھے۔ گیٹ پر تالا نہیں تھا۔ انہوں نے گیٹ کھولا اور جیپ اندر لانے کا اشارہ کر کے اندر گھس گئے۔

ڈرائنگ روم کے ساتھ والے کمرے میں ایک سجی سنوری عورت کھڑی تھی۔ اس کے ہاتھ میں پوجا کی تھالی پکڑی ہوئی تھی اور وہ اندر کی جانب بڑھ رہی تھی، جیسے ہی اس کی نگاہ جسپال پر پڑی کہ کوئی اجنبی گھر میں گھس کر اس کے سر پر پہنچ گیا ہے تو اس نے لاشعوری طور پر خوف زدہ ہو کے چیخ مارنا چاہی تھی لیکن آواز اس کے حلق میں دب کر رہ گئی۔ وہ پھٹی پھٹی آنکھوں سے اس کی طرف دیکھتی چلی جا رہی تھی۔ جسپال اس کے قریب گیا اور دھیمے مگر کرخت لہجے میں پوچھا۔

''کہاں ہے ارجن کھتری؟''

''میں یہاں ہوں۔'' کمرے کے اندر سے آواز آئی تو اس نے گھوم کر دیکھا، سامنے ایک بھاری جثے والا گنجا شخص کھڑا تھا۔ اس کے ہاتھ میں پسٹل تھا۔ اس وقت وہ سفید دھوتی اور کرتے میں تھا۔ کاندھوں پر پیلے رنگ کا کپڑا رکھا ہوا تھا۔ اس کے عقب میں لکشمی دیوی کی مورتی دھری ہوئی تھی، جس پر تازہ پھولوں کے ہار چڑھائے ہوئے تھے اور سامنے اگر بتیاں سلگ رہی تھیں۔ کمرے میں تیز روشنی تھی۔ جسپال اسے دیکھنے لگا۔ موٹے نین نقش پر انتہائی نفرت پھیلی ہوئی تھی۔

''تم ہو ارجن کھتری؟'' جسپال نے مسکراتے ہوئے پوچھا تو اس کے چہرے پر نفرت بڑھنے سے اس کا چہرہ مسخ ہو گیا۔

''کون ہو تم اور اس طرح میرے گھر میں کیسے داخل ہوئے ہو؟'' اس نے لفظ چباتے ہوئے پوچھا۔

''میں تجھے رمیش پانڈے کے پاس لے جانے کے لیے آیا ہوں، چلو گے میرے ساتھ؟'' جسپال نے کہا تو وہ ایک دم سے چونک گیا، پھر اس کی طرف غور سے دیکھتے ہوئے کہا۔

''کیا کہا تم نے، کون ہے یہ رمیش پانڈے؟''

''سارا بھارت جانتا ہے اسے، روز اخبار میں پڑھتے ہو، اس سے باتیں کرتے ہو، اتنا جھوٹ تو نہ بولو سوامی ارجن کھتری جی۔'' جسپال نے کہا اور اس سے پہلے کہ وہ جواب دیتا۔ جسپال نے چھلانگ لگائی اور اس پر جا رہا۔ اس کے ہاتھ میں پکڑے ہوئے پسٹل سے فائر ہو گیا۔ ایک دھماکا ہوا جو کمرے میں گونج کر رہ گیا۔ پسٹل اس کے ہاتھ سے نکل گیا تھا، جو اندر آنے والے ایک بندے نے اٹھا لیا۔ وہ دونوں قالین پر گرے ہوئے تھے اور جسپال اس کی پوری طرح سے دھنائی کر رہا تھا۔ دو منٹ میں ارجن کھتری کے منہ سے خون بہنے لگا اور وہ بے حواس ہو گیا۔ جسپال نے اسے گردن سے پکڑا اور باہر لے جاتے ہوئے اپنے ساتھیوں سے بولا۔

''گھر کا ہر فرد باندھ دو، اور جو ذرا بھی گڑبڑ کرے اسے گولی مار دو۔'' یہ سنتے ہی وہ عورت تھر تھر کانپنے لگی۔ جسپال نے ارجن کھتری کو دھکیلا اور باہر کی طرف لے گیا۔ جیپ پورچ کے ساتھ لگی ہوئی تھی۔ جسپال نے اسے جیپ میں دھکا دے دیا۔ وہ اندر جا گرا۔ جسپال نے اس کے سر پر پسٹل کا دستہ مارا تو بے ہوش ہوتا چلا گیا۔ یوں جیسے مر گیا ہو۔ باقی لوگوں کو چند منٹ لگے تھے، وہ بھی آ گئے تو وہ وہاں سے نکلتے چلے گئے۔

کھیتل انبالہ روڈ پر انبالہ کی طرف جاتے ہوئے سڑک کے بائیں ہاتھ پر ایک کالج آتا ہے، اس سے ذرا آگے دائیں جانب ہی ایک چھوٹی سڑک نکلتی تھی۔ ان کی راہنمائی کرنے والے موٹر سائیکل والے اسی جانب مڑ گئے۔ انہوں نے جیپ بھی ان کے ساتھ موڑ لی۔ تقریباً دو فرلانگ کے بعد وہ ایک کچے راستے پر مڑے اور سیدھے ایک ڈیرے میں جا گھسے۔ وہ بھی انہی کے

پیچھے چلے گئے۔ وہ ویران ڈیرہ تھا، کوئی ذی روح وہاں دکھائی نہیں دے رہا تھا۔ انہوں نے جلدی سے ارجن کھتری کو جیپ سے اتارا اور اسے اندر لے جا کر ایک کمرے میں فرش پر لٹا دیا۔ ایک بندہ پانی لے آیا۔ وہ اس کے منہ پر چھینٹے مارنے لگا۔ کچھ دیر بعد ارجن کھتری کو ہوش آ گیا۔ وہ ان کی طرف ہونقوں کی طرح دیکھنے لگا۔ جلد ہی اسے سمجھ آ گئی کہ وہ اغوا ہو چکا ہے۔ تبھی جسپال اس کے قریب فرش پر بیٹھتے ہوئے بولا۔

''اب تم یہ پوچھو گے کہ تمہیں یہاں کیوں لایا گیا ہے۔ میرا خیال ہے تمہیں رمیش پانڈے کا نام سن کر سمجھ جانا چاہئے تھا۔ تمہارا یہ قصور کیا کم ہے کہ تم نے سمجھوتہ ایکسپریس میں بے گناہ لوگوں کی جان لینے کا جرم کیا۔''

یہ سن کر وہ چند لمحے اس کی طرف دیکھتا رہا، پھر سوچتے ہوئے بولا۔

''کیا چاہتے ہو؟''

''صرف یہ کہ تمہارے بڑے اپنی حرکتوں سے باز آ جائیں۔ سکھوں کے بارے میں جو تم لوگ چاہ رہے ہو، اس خواہش کو اپنے اندر دفن کر لو۔'' جسپال نے سرد لہجے میں کہا

''میں سمجھا نہیں تم کہنا کیا چاہتے ہو۔'' اس نے حیران ہوتے ہوئے پوچھا۔

''یہ جو تم لوگوں نے ممبئی میں ڈرامہ کیا ہے نا، اب اس کے ڈانڈے تم لوگ سکھوں اور مسلمانوں سے ملا رہے ہو، جس فون پر باتیں ہوئیں، وہ امریکہ میں کسی کھڑک سنگھ کے ذمے ڈال کر اپنا جرم چھپانا چاہتے ہو۔ اس سے پہلے کہ تم لوگوں کا ڈرامہ کوئی نیا رخ اختیار کرے، بندے بن جاؤ۔'' جسپال نے کہا تو اس کی طرف دیکھنے لگا

''میں اب بھی پوچھتا ہوں کہ تم کیا چاہتے ہو؟'' اس نے بے چارگی سے پوچھا۔

''مجھے معلوم ہے کہ پولیس کتوں کی طرح ہمیں تلاش کرنے پر لگ گئی ہوگی۔ اس لیے وقت کم ہے اور ہمیں نکلنا ہے۔ اپنے آقا سے بات کرو اور اسے بتاؤ جو میں نے کہا ہے۔'' یہ کہہ کر اس نے اس کا فون آگے کر دیا۔ ارجن کھتری نے لرزتے ہاتھوں سے فون پکڑا اور اس کے نمبر ملانے لگا۔ کچھ دیر بعد اس کا رابطہ ہو گیا۔ اس نے ساری بات دہرا دی۔ پھر فون جسپال کی طرف بڑھا دیا۔

''ہاں، بولو۔'' اس نے کہا۔

''اسے چھوڑ دو، تمہارا مطالبہ جو بھی ہے ہم اسے مان رہے ہیں۔''

''تم رامیش پانڈے ہو؟'' اس نے پوچھا۔

''ہاں۔'' دوسری طرف سے جواب آیا

''تو سن لو، جب تک جگجیت بھر بھرے کے قاتل سامنے نہیں آئیں گے، یہ سلسلہ چلتا رہے گا۔ یہ ہماری شروعات ہیں۔ سنو، یہ میں اس کے سر میں سوراخ کرنے لگا ہوں جہاں بے گناہ انسانوں کے بارے میں نفرت پکتی ہے۔'' یہ کہہ کر اس نے ارجن کھتری کے سر میں گولی مار دی۔ اس کی چیخ بلند ہوئی۔ جسپال نے سیل فون وہیں پھینکا اور باہر کی جانب چل پڑا۔ وہ سب بھی وہاں سے نکلتے چلے گئے۔ وہ ارجن کھتری کو تڑپتے ہوئے وہیں چھوڑ گئے۔ انہوں نے پلٹ کر نہیں دیکھا۔

☆......☆......☆

میں ساری رات فہیم کے ساتھ کنٹرول روم میں رہا تھا۔ وہ ان لوگوں کے فون ٹریس کرتا چلا جا رہا تھا جو کسی طرح بھی الطاف گجر سے متعلق تھے۔ پولیس اور خفیہ اداروں پر حکومتی دباؤ بڑھ گیا تھا۔ دوسری طرف زویا اور رونیت مصروف رہی تھیں۔ وہ رامیش پانڈے کو مرکز بنا کر ان کے ارد گرد لوگوں کو تلاش کرتے چلے جا رہے تھے۔ صبح کا سورج طلوع ہوا تو میرے پاس کافی حد تک معلومات آ چکی تھیں اور مجھے یہ پتہ چل چکا تھا کہ لاہور میں فیضان بٹ اس سارے گینگ کو چلا رہا تھا۔ اس کے بندے یہ معلوم نہیں کر پائے تھے کہ آخر وہ لوگ ہیں کون جنہوں نے اتنا بڑا اقدام اٹھا لیا تھا؟

طارق نذیر پولیس ہیڈ سے اس کے گھر پر مل چکا تھا۔ اس نے ہمارے متعلق کوئی بات کئے بغیر پولیس ہیڈ کو بتا دیا کہ یہ معاملہ کیا ہے اور اسے کس حد تک لے کر جانا ہے۔ پولیس اتنا ہی کام کرے، جتنا اس سے کہا جائے۔ ابھی وہ پولیس ہیڈ کے گھر ہی تھا کہ فیضان بٹ کا فون آ گیا۔ وہ پولیس ہیڈ سے ایک وفد کے ساتھ ملنا چاہتا تھا، اس نے آفس میں آجانے کا وقت دے دیا۔

جس وقت فیضان بٹ اپنے ساتھ چھ لوگوں کا وفد لے کر پولیس ہیڈ کے آفس میں پہنچا، اس وقت طارق نذیر وہیں موجود تھا۔ فیضان بٹ صرف حکومتی دباؤ کا پتا کھیلتے ہوئے الطاف گجر کو اپنی تاجر برادری کا فرد ظاہر کر کے ہمدردی جتا رہا تھا۔ طارق نذیر مجھے ان کی ساری گفتگو فون پر سنا رہا تھا۔ پولیس ہیڈ نے فوری کارروائی کرنے اور الطاف گجر کو بازیاب کرنے کا وعدہ کر لیا۔ ایسے ہی وقت میں نے فیضان بٹ کو فون کر دیا۔ اجنبی نمبر دیکھ کر اس نے فون بند کر دیا۔ میں نے دوسری بار ملایا تو اس نے فون رسیو کر لیا۔

''ہیلو۔ کون؟''

''میں ہوں جس نے الطاف گجر کو اغوا کیا ہے۔'' میں نے دھیمے لہجے میں کہا۔

''تم؟'' اس کی حیرت اس کی آواز سے مجھ تک پہنچی، وہ مزید لفظ نہیں کہہ پایا۔

''میں جانتا ہوں کہ اس وقت تم کن لوگوں کے ساتھ ، کس کے پاس بیٹھے ہو۔ میں تمہیں اتنا بتا دوں تم نے یا کسی نے الطاف کو بازیاب کیا کرنا ہے، میں تجھے اوپر پہنچانے کا فیصلہ کر چکا ہوں۔'' میں نے غصے میں کہا۔

''تجھے معلوم نہیں کہ تم کس سے بات کر رہے ہو، میں تمہیں......'' اس نے کہنا چاہا تو میں نے اس بات کاٹتے ہوئے کہا۔

''وہ بے بس کیا کر سکتا ہے جو پولیس کی مدد لینے، پولیس کے در پر کسی کتے کی طرح دُم ہلا رہا ہے۔ اگر تم میں اتنی جرات ہوتی کہ تم کچھ کر سکتے ہو تو پولیس کی مدد لینے یہاں نہ بیٹھے ہوتے۔'' میں نے انتہائی طنز سے کہا تا کہ اس کے اندر غصہ بھڑک اٹھے

''میرے سامنے آؤ تو میں تجھے بتاؤں۔'' اس نے انتہائی غصے میں کہا۔

''میں تمہارے سامنے آتا ہوں یا تجھے اپنے سامنے لے کر آتا ہوں، شام تک فیصلہ ہو جائے گا۔ ابھی صرف اپنی کار کے بارے میں پتہ کر اس کا کیا بنا۔ میں بعد میں فون کرتا ہوں۔'' یہ کہہ کر میں نے فون بند کر دیا۔

کچھ دیر بعد طارق نذیر نے مجھے کال ملا لی۔ اس نے بتایا کہ فون کال کے بعد اس نے کوئی بات نہیں کی اور اپنے لوگوں کے ساتھ تیزی سے باہر نکل گیا۔

''مجھے بتاؤ، تمہارا کوئی سیف ہاؤس ہے، جہاں تم آسانی سے الطاف گجر سے تفتیش کر سکو؟''

''بالکل ہے۔ میں آپ سے یہی کہنے والا تھا۔'' اس نے کہا۔

''ٹھیک ہے، میں بعد میں بتاتا ہوں کہ وہ تجھے کہاں ملے گا۔'' میں نے کہا اور فون بند کر دیا۔

فیضان بٹ کی کار پولیس ہیڈ آفس سے کافی دور ویرانے میں پہنچ چکی تھی۔ اس کا ڈرائیور اسی میں پڑا تھا۔ لڑکوں نے اسے کھول دیا، کار میں بم لگایا اور وہاں سے دوسری گاڑی میں بیٹھ گئے۔ وہ چند قدم چلے اور ریموٹ سے کار اُڑا دی۔ کار پھٹنے کا چشم دید اس کا ڈرائیور تھا۔

جس وقت یہ کارروائی ہو رہی تھی، جنید اور اکبر کافی حد تک الطاف گجر سے معلومات لے چکے تھے۔ اس سے مزید وقت ضائع نہیں کیا جا سکتا تھا۔ میں نے انہیں الطاف گجر کو طارق نذیر کے سپرد کرنے کا کہا۔ اگلے ایک گھنٹے میں وہ اس فیکٹری سے الطاف گجر کو نکال کر، خود سامنے آئے بغیر طارق نذیر کے سپرد کر دیا۔ وہ اسے لے کر سیف ہاؤس چلا گیا اور وہ دونوں گھر کی طرف لوٹ آئے۔ تب میں نے فیضان بٹ کو فون کیا

''کچھ پتہ چلا کار کا؟''

''کیا چاہتے ہو تم؟'' اس نے کافی حد تک دھیمی آواز

میں پوچھا۔
"تمہاری طاقت دیکھنا چاہتا ہوں۔" میں نے جواب دیا۔
"بہت پچھتاؤ گے۔" اس نے کرختگی سے کہا۔
"شام تک اپنی طاقت دکھا دو تو ٹھیک، ورنہ میں تیرا زہر نکالنا خوب جانتا ہوں۔" میں نے اسے غصہ دلایا
"سامنے آ کر بات کرو تو میں تجھے دیکھوں۔" اس نے بھنا کر کہا تو میں نے ہنستے ہوئے کہا۔
"بس یہیں گھٹنے ٹیک دیئے۔ کہو کہ مجھے تلاش نہیں کر سکتے ہو، پھر میں تم تک پہنچوں۔"
اس نے کوئی جواب نہیں دیا اور فون بند کر دیا۔ اسی وقت مجھے طارق نذیر نے بتایا کہ وہ سیف ہاؤس پہنچ چکا ہے اور فیضان بٹ کے گرد گھیرا تنگ کرنے کے لیے پولیس سیکورٹی کے نام پر تین بندے گھر بھیج دیئے ہیں۔ یہ اس نے میرے ہی کہنے پر کیا تھا، تاکہ اس کی نقل و حرکت کے بارے میں پوری طرح آگاہی رہے۔ وہ اس واقعہ کی وجہ کافی پریشان ہو چکا تھا اور اپنی طاقت کو اکٹھا کر رہا تھا۔ میں شام تک اسے اُس کی حالت پر چھوڑ دیا۔
الطاف گجر نے کافی حد تک مار کھانے کے بعد تعاون کیا تھا۔ اس نے وہی چند بندے بتائے جو اسے یاد تھے۔ اس میں فیضان بٹ کس حد تک ملوث تھا، وہ بھی اس نے بتا دیا۔ طارق نذیر نے اسے اپنے ادارے کے کھاتے میں ڈال کر ایک بڑے آپریشن کی منظوری لے لی۔ وہ اب مزید گرفتاریوں کے لیے پلان کر رہا تھا۔

شام ہو چکی تھی۔ فیضان بٹ کا اضطراب کافی حد تک بڑھ گیا تھا۔ وہ اپنے گلبرگ مارکیٹ والے آفس میں تھا اور اس کے اردگرد سیکورٹی کا ایک حلقہ بن چکا تھا۔ اس نے اپنے غیر ملکی آقاؤں کو بھی بتا دیا تھا کہ حالات نے کیا رخ اختیار کر لیا ہے۔ انہیں یہ خبر نہیں مل رہی تھی کہ یہ سب ہو کیسے گیا؟
الطاف گجر کے گاؤں سے چند بھارتی شہری پکڑے جا چکے تھے۔ انہوں نے وہاں چھاپہ مار کر کچھ دستاویزات بھی حاصل کر لی تھیں۔ فیضان بٹ آفس سے نکل کر کہیں جانا چاہتا تھا۔ اس نے وہیں ان چند لوگوں کو بلایا تھا جو اس کے خاص لوگ تھے اور لاہور میں اس گینگ کو چلانے کے پورے ذمہ دار تھے۔ اس کے بارے میں یہ نہیں کہا جا سکتا تھا کہ وہ جاتا کدھر ہے؟
جیسے ہی شام اُتری وہ اپنی پوری سیکورٹی کے ساتھ مارکیٹ سے نکلا۔ طارق نذیر اور میری گینگ کے افراد اسی مارکیٹ میں اس کا انتظار کر رہے تھے۔ اسی وقت میں بھی باہر نکل آیا۔ میرے ساتھ شیرا اکبر اور جنید تھے۔ میں تیزی سے مارکیٹ کی جانب جا رہا تھا۔ گھر سے نکلنے اور مارکیٹ کے قریب پہنچ جانے تک میں تمام متعلقہ افراد سے رابطہ کر چکا تھا۔ فیضان بٹ کی کار کے آگے پیچھے کافی کاریں چل پڑیں تھیں۔ ان کا تعاقب شروع ہو چکا تھا۔ کافی دیر بعد جب وہ نہر کنارے چڑھے تو پتہ چلا کہ ان کا رخ کس طرف ہو سکتا ہے۔ جنید آندھی اور طوفان کی طرح کار بھگائے لحہ بہ لحہ ان کے قریب ہوتا چلا جا رہا تھا۔ ان کا قافلہ جلو پارک سے تھوڑا پہلے دائیں جانب پل پار کر کے چل پڑا۔ آگے بہت کھلے کھلے گھر تھے۔ وہ قافلہ ایک گھر میں چلا گیا جس کی بناوٹ سے ظاہر ہو رہا تھا کہ اس کی ڈیزائننگ کسی غیر ملکی ماہر آرکیٹیکر سے کرائی گئی ہے۔ گھر برقی قمقموں سے جگمگا رہا تھا کچھ کاریں وہیں گیٹ کے پاس ہی رک گئیں اور فیضان بٹ والی کار کے ساتھ ہی پولیس کی وین بھی پورچ میں جا رکی۔ پولیس اہلکار باہر ہی رک گئے اور وہ تیزی سے اندر چلا گیا۔
"پتہ کرو کہ اس گھر میں کس طرف سے داخل ہوا جا سکتا ہے؟" میں نے اپنے لوگوں کو ہدایت دی اور پل پار کر گیا۔ وہ نو تعمیر علاقہ تھا اور ابھی بہت ساری جگہوں پر تعمیر کا کام جاری تھا۔ میں جس وقت اس گھر کے پاس

پہنچا، مجھے اطلاع مل گئی کہ مجھے کہاں سے اس گھر میں داخل ہونا ہے۔

ہم جیسے ہی گیٹ پر پہنچے، گیٹ پر کھڑے چوکیدار نے ہمیں روکنے کی کوشش نہیں کی۔ وہیں قریب ہی ایک پولیس اہلکار گن لیے کھڑا تھا، بلاشبہ اسی نے سیکورٹی والوں کو کہا تھا کہ نئے آنے والے مہمانوں کو اندر آنے دیا جائے۔ ہم بڑے آرام سے پورچ میں جارکے۔ میں نے وہیں کھڑے ہوکر باہر کا جائزہ لیا۔ پولیس اہلکاروں کے ساتھ آنکھوں ہی آنکھوں میں بات ہوگئی تھی۔ انہیں بتادیا گیا تھا کہ نفری پہنچ رہی ہے۔ میں نے انہیں بھی ہدایت دی تھی کہ اگر بات ہاتھ سے نکلتی ہوئی محسوس ہوتو وہ وہاں تک آئیں ورنہ ہمارے گھر سے باہر نکل جانے کے بعد ہی وہاں پہنچیں۔ لان میں بہت سارے لوگ بیٹھے ہوئے تھے، ان میں کچھ افراد اسلحہ بردار بھی تھے۔ سیکورٹی والوں کو شک ہوا تھا یا نہیں میں اس بارے میں کچھ نہیں جانتا تھا۔ ہم زیادہ دیر تک پورچ میں نہیں رہے چند لمحوں میں اردگرد کا جائزہ لیا اور اندر داخل ہوگئے۔ داخلی دروازے کے سامنے ہی ایک کشادہ ڈرائینگ روم تھا۔ یہاں چھ افراد بیٹھے ہوئے تھے، ان میں پانچ افراد مقامی تھے جبکہ ایک فرد شکل وصورت سے ہی غیر ملکی لگ رہا تھا۔ اس کے چھوٹے چھوٹے سنہری بال تھے، نین نقش تیکھے اور آنکھیں نیلی تھیں۔ ادھیڑ عمر ہونے کے باوجود وہ بہت چست دکھائی دے رہا تھا۔ اس کے پہلو میں فیضان بٹ بیٹھا ہوا تھا۔ میں نے اسے پہلی نگاہ میں پہچان لیا تھا، ایک تو اس کی تصویر میں پہلے دیکھ چکا تھا، دوسرے اب تک جو اس کے بارے میں سنا تھا وہ اس کی پہچان کے لیے کافی تھا۔ ہمارے اچانک اندر داخل ہونے پر انہوں نے چونک کر ہمیں دیکھا۔ ہم تین ہی تھے۔ میں سیدھا ان کے سامنے جا کر کھڑا ہوگیا اور اکبر اور جنید دونوں دائیں بائیں ہو گئے۔

"کون ہو تم اور اندر کیسے آگئے ہو؟" فیضان بٹ نے ایک دم سے اچھلتے ہوئے پوچھا۔

"میں کون ہوں، یہ تو بعد میں پتہ چلے گا لیکن تم لوگوں کے بارے میں معلوم ہوگیا ہے کہ تم کون لوگ ہو۔" میں نے کہا تو ان سب کے چہروں پر سوالیہ نشان کھنچ گیا۔ میں نے انہیں زیادہ حیران نہیں رہنے دیا اور آگے بڑھ کر فیضان بٹ کے پاس چلا گیا۔ اسے کالر سے پکڑا ہی تھا کہ اس نے زور سے اپنا کالر چھڑانا چاہا، میں نے دوسرے ہاتھ سے ایک زوردار گھونسہ اس کے منہ پر دے مارا، وہ صوفے سے الٹ کر گرا۔

"کون ہو تم؟" اس بار غیر ملکی نے اٹھتے ہوئے غصے میں کہا۔ اس سے پہلے کہ میں جواب دیتا، وہ ہوا میں اچھلا اور میرے اوپر آرہا۔ میں نے مانا تھا کہ وہ بہت اچھا فائیٹر ہوسکتا تھا لیکن اس وقت میرے پاس یہ کھیل تماشے دکھانے کا وقت نہیں تھا۔ وہ میرے اوپر تو آرہا لیکن مجھ سے الگ نہیں ہوسکا۔ میں نے دونوں ہاتھوں سے اس کو سینے کے قریب سے گھیر لیا پھر اوپر اٹھایا اور زمین پر دے مارا۔ قالین ہونے کی وجہ سے اسے چوٹ نہیں آئی۔ لیکن اس وقت تک جنید کے سائلنسر لگے پسٹل سے ٹھک کی آواز نکلی تو اس کی چیخ بلند ہوئی۔

"خبردار۔ کوئی ہلنا بھی مت ورنہ وہ اپنی موت کا خود ذمہ دار ہوگا۔" اکبر نے اونچی آواز میں کہا تو سب نے ہمیں حیرت سے یوں دیکھا جیسے ہم کوئی انہونی مخلوق ہیں جو ان کے سروں پر مسلط ہوگئی ہے، ورنہ شاید ان کے گمان میں بھی نہیں تھا کہ یوں کسی کی جرأت ہوسکتی ہے کہ ان کی جانب کوئی انگلی بھی اٹھائے۔ میں نے ان کی طرف دیکھ کر کہا۔

"تم لوگ شاید یہی سمجھ رہے ہو کہ تم سب کسی آسمانی مخلوق سے تعلق رکھتے ہو، اس وطن میں جو کیے جاؤ تمہیں کوئی پوچھنے والا نہیں۔ ہم آگئے ہیں پوچھنے کے لیے۔ میں تم لوگوں کو صرف چوبیس گھنٹے کا وقت دیتا ہوں، اب تک جتنے بھی بھارتی یہاں داخل ہو چکے ہیں، انہیں واپس لے آؤ، ورنہ تم لوگوں کے ساتھ کیا ہونے والا ہے

یہ تمہاری سوچ میں بھی نہیں ہوگا۔" یہ کہتے ہوئے میں نے دونوں ہاتھوں میں پسٹل نکال لیے اور پھر سب کی ٹانگوں پر فائرنگ کرنے لگا۔ وہ چیخنے لگے۔ میں نے فیضان بٹ کو اٹھایا اور اسے اکبر کی طرف دھکیلا پھر اس غیر ملکی کو اٹھایا اور پوری قوت سے اس کی ٹھوڑی کے نیچے گھونسہ مارا۔ اس بار اس نے کوئی مزاحمت نہیں کی۔ تب میں نے پسٹل اس کے ماتھے پر رکھا اور گولی چلا دی۔ وہ لڑکھڑاتا ہوا وہیں ڈھیر ہو گیا۔ فیضان بٹ کو اپنے آگے لگائے اکبر باہر کی طرف چل دیا، میں ایک نگاہ تڑپتے ہوئے ان سب کو دیکھا اور تیزی سے باہر کی جانب نکلا۔

دروازے کے ساتھ ہی پولیس والا کھڑا تھا' وہ اندر کا سارا منظر دیکھ رہا تھا۔ باہر لوگ پریشان تھے۔ اچانک جنید میرے پیچھے سے نکل کر ڈرائیونگ سیٹ پر جا بیٹھا۔ میں جیسے ہی پورچ میں نکلا، اس وقت تک جنید لان میں بیٹھے ہوئے لوگوں کی جانب دستی بم اچھال چکا تھا۔ تین دستی بم مختلف جگہوں پر جا گرے۔ ایک زوردار دھماکا ہوا، اس کے ساتھ ہی دو دھماکے مزید ہوئے۔ دھواں اور مٹی کا غبار اٹھا۔ اس وقت تک اکبر نے فیضان بٹ کو گاڑی میں دھکا دے دیا تھا۔ جنید تیر کی طرح وہاں سے نکلا۔ جب تک لوگوں کو ہوش آتا، ہم گیٹ سے باہر جا چکے تھے۔ جنید انتہائی رفتار سے نکلا تھا۔ پل تک جاتے ہوئے میں نے طارق نذیر سے کہہ دیا کہ وہ بندہ سنبھال لے۔ ہم پل سے نکلے تو پولیس ہمارے قریب سے گزر گئی۔ کچھ فاصلے پر وہ ہمارے انتظار میں کھڑا تھا۔ ہم نے گاڑی اس کے حوالے کی اور اس کی کار میں بیٹھ کر نکل گئے۔

☆......☆......☆

رات کا آخری پہر چل رہا تھا۔ جسپال سنگھ جالندھر کے ایک گھر میں موجود تھا۔ یہ اس نے اپنے لوگوں کا ٹھکانہ بنا کر دیا تھا۔ اصل میں جب اس نے اروند کو کینیڈا بھیجا تھا، اس کے فوری بعد روہی کی طرف سے لوگوں کو ایک مرکز پر جمع کیا جانے لگا تھا۔ ایک مرکز جالندھر میں بن گیا تو دوسرا لاہور میں۔ وہ ایک طبی خوشگوار نیند کے بعد فریش ہو کر کمپیوٹر کے سامنے آن بیٹھا تھا۔ اروند آن لائن تھا۔ دوسری طرف جمال موجود تھا۔ اروند انہیں بتانے لگا تھا۔

"دونوں طرف کے سیاسی حلقوں میں جو کھلبلی مچی سو مچی، خفیہ ایجنسیوں پر بھی سوالیہ نشان لگ چکا ہے۔ سیاسی حلقے انہیں ہی موردالزام ٹھہرا رہے ہیں۔"

"وہ جو بھی کہتے رہیں، سب سمجھتے ہیں کہ یہ ردعمل تو ہونا ہی ہے، تم ذرا کال ملاؤ، میں رمیش پانڈے سے بات کرنا چاہتا ہوں۔" جسپال نے کہا۔

"ٹھہرو پہلے یہ بتاؤ، کیا بات کرو گے؟" جمال نے تیزی سے پوچھا۔

"یہی کہ......وہ......اب ہوشیار ہو جائیں۔" اس نے کہا تو جمال کے ساتھ اروند بھی ہنس دیا۔ جسپال کو سمجھ آ گئی کہ اس کے پاس کہنے کو کچھ نہیں۔

"یار جسپال کیا تمہارا کچھ کہنا بنتا ہے۔" جمال نے پوچھا۔

"نہیں۔" اس نے ایک دم سے اعتراف کر لیا لیکن پھر تیزی سے بولا۔ "یار انہیں پتہ تو چلنا چاہئے کہ وہ ہر وقت ہماری ہٹ لسٹ پر ہیں۔"

"میں کرتا ہوں بات۔ تم سنو۔" جمال نے کہا تو اروند سنگھ کال ملانے لگا۔ کچھ دیر بعد ہی کال مل گئی۔ فون اس کے کسی بندے نے اٹھایا۔ کچھ دیر بحث کے بعد اس نے فون رامیش پانڈے کو دے دیا۔

"کون ہو تم؟" اس نے بڑے سکون سے پوچھا۔

"وہی، جس نے ارجن کھتری کو قتل کیا۔ جس کی لاش ابھی تک تم لوگوں کو نہیں ملی۔" جمال نے بھی اسی سکون سے کہا تو تیزی سے بولا۔

"کہاں ہے اس کی لاش؟"

"بتاتا ہوں، لیکن اس سے پہلے تجھے بتانا بہت ضروری ہے۔" جمال نے اپنا سکون نہیں ٹوٹنے دیا۔

"کیا کہنا ہے مجھ سے؟" وہ بولا۔

"یہی کہ اگر تم لوگ ہندو راشٹر یہ چاہتے ہو نا تو ہم بھی ایک سیکولر بھارت چاہتے ہیں۔ ممبئی حملوں میں تم لوگ بہت بڑی غلطیاں کر گئے ہو، مگر ہم نہیں کریں گے۔ میں چاہوں تو تیرے وہ سارے شدت پسند ہندو جیلوں ہی میں ماردوں، کرتے ہو سودا؟" جمال نے اس بار انتہائی غصے میں کہا۔

"تمہیں غلط انفارمیشن ملی ہے۔ ہم ایسا نہیں چاہتے۔ ہم تو حکومت کی....." اس نے کہنا چاہا تو جمال نے اس کی بات کاٹتے ہوئے کہا۔

"جھوٹ مت بولو پانڈے، میں اس وقت سے تمہاری بے غیرتیاں دیکھ رہا ہوں، جب تم نے مختلف جگہوں سے بندے اٹھا کر ایک جزیرے پر اکٹھے کیے۔ تمہارا پلان یہی تھا کہ ممبئی بم دھماکوں کے بعد انہی لوگوں کو پکڑوا دو اور بات ختم۔ اس کے ساتھ تم نے دیکھا کہ بیوی کو تم کس حد تک دھوکا دے سکتے ہو، تم نے اپنی وزارت کا بھر پور فائدہ اٹھایا پانڈے۔ لیکن اب نہیں۔" جمال نے طنزیہ لہجے میں ہتک آمیز انداز میں کہا۔

"کیا چاہتے ہو اب؟" اس کے لہجے میں غصہ چھلک پڑا تھا

"یہی کہ اپنی ساری دکانداری سمیٹ لو۔ وہ بندہ جو تم نے پکڑ لیا ہے، بلکہ پکڑوا دیا ہے، اس کے ساتھ جو مرضی سلوک کرو، لیکن کھیل یہیں بند ہونا چاہئے۔" جمال نے تحکمانہ انداز میں کہا۔

"دیکھو، تم اپنا کام کرو، میں اپنا کام کرتا ہوں۔ ایک ارجن کھتری کو مار لینے سے یہ مت سمجھو کہ ہماری اتنی بڑی تحریک ختم ہو جائے گی۔ ایسا نہیں ہوگا۔"

"اور اب تم کچھ کر بھی نہیں سکو گے۔ میں چاہوں تو تمہیں آسانی سے ختم کر سکتا ہوں لیکن میں تمہیں زندہ رکھنا چاہتا ہوں کیونکہ دشمن کو زندہ رکھنا ہی نہ صرف مردانگی ہے بلکہ میں نے ابھی تم سے ادھار بھی چکانا ہے۔"

"کیسا ادھار، کیسی مردانگی۔"

"ادھار یہ ہے کہ جگجیت بھر بھرے کے قاتل مجھے دے دو، تو زیادہ بندے نہیں پکڑ کاؤں گا۔ میں اب تمہیں فون نہیں کروں گا۔ میں اس وقت سمجھ جاؤں گا کہ تم میری بات ماننا چاہتے ہو۔ جب تم چوبیس گھنٹوں میں اپنی وزارت سے استعفیٰ دے دو گے، نہ دیا تو میں تمہیں ماردوں گا، یہ چنوتی (چیلنج) ہے تمہیں۔"

"میں انتظار کروں گا۔" اس نے کہا۔

"چلو پھر پہلی لاش کا تحفہ لو، وہ کھیتل انبالہ روڈ پر کالج سے آگے پڑی ہے اٹھا لو جا کر۔ صبح ہونے تک مزید لاشیں مل جائیں گی۔" جمال نے کہا تو دوسری طرف سے چند لمحوں تک کوئی بات نہیں ہوئی، پھر وہ تھکے ہوئے لہجے میں بولا۔

"میں انتظار کروں گا۔" یہ کہہ کر اس نے فون بند کر دیا۔ ان کے درمیان چند لمحے خاموشی رہی تبھی جسپال بولا۔

"نہیں کرنی تھی بات، اب اپنا قول نبھانا پڑے گا۔"

"یہ نبھانا ہی تھا میری جان، تم نے شاید اسے اتنا سنجیدہ نہیں لیا، مگر اس کی کھوج میں رہا کہ آخر اس جزیرے میں کیوں لے جایا گیا اور وہ کون تھا۔ میں نے اس سے بدلہ لینا ہے وہ میں لے لوں گا۔ اسے بچنے کا ایک راستہ دیا ہے لیکن وہ نہیں مانا، اب بھی اگر وہ سوچ لے۔ خیر، تم سب سے پہلا یہ کام کرو، واپس اوگی جاؤ۔ اور انوجیت کو پنجاب کی سیاست میں داخل کرنے کی بھر پور محنت کرو۔ چند دن ہرپریت کے ساتھ گزارو۔ میں دیکھ لیتا ہوں سب۔" جمال نے اسے سمجھاتے ہوئے کہا۔

"یہ تم مجھ پر طنز کر رہے ہو؟" جسپال نے خفگی سے کہا۔

"نہیں تمہیں بے عزت کر رہا ہوں۔" جمال نے ہنستے ہوئے کہا تو اروند کے ساتھ کئی لوگوں کا قہقہہ بلند ہو گیا جو یہ سب سن رہے تھے۔

"اب تو ہو گیا۔ کیا فائدہ ملا تجھے۔" جسپال نے ڈھیٹ بنتے ہوئے کہا۔

"یار سر نہ کھاؤ۔" جمال زچ ہوتا ہوا بولا۔

"اوکے، جیسا تم کہو گے ویسا ہی ہوگا، ویسے آئینہ دیکھتے ہو آج کل، تمہارا چہرہ کسی غریب قسم کی کمپنی کی ادھیڑ عمر ریسپشنسٹ کی طرح لگ رہا ہے تم بھی جاؤ نور نگر اور سوہنی کے ساتھ چند دن گزارو، فریش ہو جاؤ گے۔" جسپال نے بھی مذاق کیا۔ لیکن اس پر جمال نے سنجیدہ ہوتے ہوئے کہا۔

"اور ہاں، نور نگر سے یاد آیا، تم فوری طور پر مناسکر جاؤ، یا بندہ بھیجو، وہاں سے معلوم کرو کہ رام نام کا کوئی جوگی ہے؟"

"کیا ہوا؟" جسپال نے پوچھا تو جمال نے اسے اختصار سے بتادیا۔

"ارے اس سانپ کو وہاں کیوں چھوڑ آئے۔ وہ تو ......" اس نے کہنا چاہا تو جمال بولا۔

"اس کا زہر میں نے نکال دیا ہے۔ وہ کچھ نہیں کر سکتا۔ ویسے میں اس کا پوچھتا ہوں۔ جو تمہیں کہا ہے وہ کرو۔" جمال نے کہا۔ ان کے درمیان مزید بات چلتی کہ اروند نے کہا۔

"ابھی رامیش پانڈے نے پرائم منسٹر سیکرٹریٹ فون کیا ہے۔ اس کے بعد اس نے ممبئی میں کال ملائی ہے۔ اس کے بارے میں کچھ دیر بعد بتاتا ہوں۔"

"وہ جو مرضی کرے، ہم اپنا کام کریں گے۔" جمال نے کہا اور پھر یونہی ان کے درمیان بحث چھڑ گئی۔ یہاں تک کہ انہیں باتیں کرتے ہوئے سورج نکل آیا۔

"جمال، یہاں تو نکل آیا ہے سورج، تمہاری طرف چند منٹ بعد نکلے گا۔" جسپال نے کہا۔

"لیکن تو نے اگلے چوبیس گھنٹوں میں زیادہ سے زیادہ لوگوں میں رہنا ہے۔ یہ کنفرم ہو جائے کہ تم اوگی پنڈ ہی میں ہو۔ کل سارا دن لوگوں میں گزارنا، ہو سکے تو لوگوں کو اکٹھا کر کے کھیل تماشا کر لینا۔" جمال نے اسے سمجھایا تو جسپال کو سمجھ آ گئی تھی کہ اس نے کیا کرنا ہے۔ کچھ دیر بعد ان کی باتیں ختم ہو گئیں۔

دو گھنٹے بعد وہ نکلا اور اوگی کی طرف چل پڑا۔ جہاں ہرپریت اس کا انتظار کر رہی تھی۔ وہ اوگی پہنچا تو ناشتہ میز پر لگا ہوا تھا۔ پھوپھو کلجیت، انوجیت اور ہرپریت اس کا انتظار کر رہے تھے۔ خوشگوار ماحول میں ناشتہ ختم ہوا۔ کلجیت کور اوگی میں کسی کے ہاں چلی گئیں اور وہ تینوں اسی موضوع پر بات کرنے لگے کہ آئندہ الیکشن کیسے لڑنا ہے۔ اسی دوران اس نے جوگی کے بارے میں معلومات کے لیے ایک بندے کو مناسکر بھجوا دیا۔

☆......☆......☆

رامیش پانڈے سے بات کر کے میں ذہنی طور پر تناؤ میں آ گیا تھا، میں نے دعویٰ کر لیا تھا، مجھے یقین تھا کہ جیسا میں نے کہا ہے ویسا ہو جانا ہے، لیکن ممکن ہے وقت آگے پیچھے ہو جائے۔ میں کچھ دیر اس بارے میں سوچتا رہا، پھر اچانک میرے ذہن میں سارا پلان آتا چلا گیا۔ بس مجھے چند چیزیں کنفرم کرنا تھیں۔ وہ میں نے فہیم اور اروند کو بتا دیں۔ انہوں نے مجھے دوپہر تک اس بارے میں کنفرم کر دینے کا وعدہ کر لیا تھا۔

میں ناشتہ کر کے چھت پر چلا گیا۔ میں جانتا تھا کہ میرا تناؤ کھلی فضا میں دور ہوتا ہے۔ میرے لاشعور میں کہیں تھا کہ میں نے کسی کو چیلنج دیا ہے، اسے پورا کرنا ہے۔ میں نے ایک دم سے رامیش پانڈے کو ذہن سے نکال باہر کیا اور اس کی جگہ انوجیت سنگھ کے بارے میں سوچنے لگا جو سیاست کے میدان میں کودنے والا تھا۔ اچانک میرے من میں آیا کہ سیاسی نظام کو چلانے والے آخر لوگ ہی تو ہوتے ہیں۔ جب تک ٹھیک اور درست بندے نہ آئیں، اس وقت تک نظام درست چل ہی نہیں سکتا۔ میرا دھیان اپنے ہی سیاسی نظام کی طرف چلا گیا جہاں سوائے کرپشن، جھوٹ اور استحصال کے اور کچھ دکھائی نہیں دے رہا تھا۔ میرا دل کیا کہ اس سیاسی نظام میں اچھے لوگوں کو آنا چاہئے، مگر کیسے؟ یہ ایک الجھا ہوا سوال تھا جس کا جواب بہر حال موجود تھا، فوری طور پر میرے ذہن میں نہیں آ رہا تھا۔ میں نے سوچا کہ اشفاق کو اپنے علاقے سے ایم این اے الیکشن لڑوا دیا جائے۔

اس بارے میں اس نے سوچا بھی نہیں ہوگا۔ جب تک عام عوام یہ سمجھتی رہے گی کہ یہ کام چند مخصوص خاندانوں کا ہے، یہ عوام اسی طرح پستی رہے گی۔ چونکہ اس نظام کو لوگوں ہی نے بدلنا ہے، اس لیے لوگ بھی اچھے ہی لائے جائیں۔ میری سوچ اس طرف چل پڑی۔ ایسے میں کرنل سرفراز کا فون آ گیا۔

''کیا ہو رہا ہے؟''

''ایویں ہی کچھ سوچیں سوچتا چلا جا رہا تھا یہاں کی سیاست کے بارے میں۔'' میں نے کہا۔

''مثلاً کیا۔'' انہوں نے دلچسپی لیتے ہوئے پوچھا تو میں نے اختصار سے بتا دیا، تب انہوں نے کہا۔

''میں نے اس پر بہت سوچا ہے اور میرے پاس ایک پلان بھی ہے۔ اس بارے میں تم سے میں بات کرتا لیکن ابھی تم نے جو رامیش پانڈے کو چیلنج دیا ہے، اسے پورا کرنا اور پوری سنجیدگی سے کرنا ہے۔''

''ہو گیا، اس بارے میں آپ کے جو ذہن میں ہے، میں وہ ضرور سننا چاہوں گا۔'' میں نے جواب دیتے ہوئے کہا۔

''میں نے کچھ معلومات تجھے میل کر دی ہیں۔ اسے دیکھو، یہ نوتن کور گروپ کے بس کی بات نہیں ہوگی۔ تم ونود درانا سے رابطہ کرو، میں بھی کچھ کرتا ہوں۔'' انہوں نے راستہ دکھاتے ہوئے کہا۔

''او کے۔'' میں نے کہا تو انہوں نے فون بند کر دیا۔ میں چھت سے اتر کر نیچے اس کمرے میں آ گیا جہاں فہیم بیٹھا ہوا تھا۔ میں نے اس سے لیپ ٹاپ لیا اور میل دیکھنے لگا۔ کچھ دیر بعد میں نے لیپ ٹاپ بند کیا اور چند لمحے سوچنے کے بعد بانیتا کور سے رابطہ کیا۔

''ہائے ظالم یہ میری قسمت ہے کہ تم نے مجھے اس قابل سمجھا کہ مجھ سے بات کرو، یقین جانو بڑا مس کرتی ہوں تمہیں، بولو کیا حکم ہے میرے لیے۔ اب یہ مت کہنا کہ کوئی حکم دینے کے لیے نہیں صرف تم سے بات کرنے کو جی چاہا تھا۔'' اس نے ایک دم سے شوخی بھرے لہجے میں کہا تو میں نے ابھی اسی انداز میں کہا۔

''یار تم تو گیانی ہو گئی ہو۔ اب تو کہنے سے پہلے ہی من کی بات جان جاتی ہو۔''

''بولو، بات کیا ہے۔'' اس نے کافی حد تک سنجیدہ ہوتے ہوئے پوچھا تو میں نے اسے رامیش پانڈے سے ہونے والی ساری بات بتا دی

''کرنا کیا ہے؟'' اس نے پوچھا۔

''تم ونود درانا سے بات کرو، کہو میں اس سے بات کرنا چاہتا ہوں۔ پھر جو بھی بات ہوگی تمہارے سامنے ہو جائے گی۔'' میں نے اس سے کہا۔

''میں اس سے رابطہ کرتی ہوں۔'' اس نے کہا اور فون بند کر دیا۔ میں انتظار کرنے لگا، تقریباً دس منٹ کے بعد اس نے کال کر کے بتایا کہ وہ خود بات کرنا چاہتا ہے۔ میں نے کانفرنس کال میں دونوں کو لے لیا۔ کچھ دیر تمہیدی باتوں کے بعد میں نے پوچھا۔

''کیا تم جگجیت بھر بھرے کا انتقام لینا چاہتے ہو؟ اس سیٹ اپ کو ختم کرنا چاہتے ہو جو رمیش پانڈے نے بتا دیا ہے؟ یا خاموشی سے اپنی نوکری کرنا چاہتے ہو؟''

''مجھے خود سمجھ نہیں آ رہی کہ مجھے کیا کرنا ہے۔ میں دلبرداشتہ ہو چکا ہوں۔'' وہ مایوسی سے بولا۔

''میرے کہنے پر ایک بار اپنے پاؤں پر کھڑے ہو جاؤ۔ حوصلہ پکڑو۔ ایک بار پھر سے فتح یاب ہو جاؤ۔'' میں نے اسے حوصلہ دیتے ہوئے کہا۔

''کیسے کوئی راستہ ہی نہیں ہے؟'' اس نے پھر اسی مایوسی میں کہا۔

''دیکھو ونود، میں نے اسے چوبیس گھنٹے کا وقت دیا ہے، جس میں سے ایک گھنٹے سے زیادہ وقت گذر چکا ہے، اس دوران اس نے پرائم منسٹر سیکرٹریٹ سے بھی رابطہ کر لیا ہے۔ وہ اپنے بندوبست میں لگ گیا ہے۔ اسے یہ اندازہ ہے کہ میں ایسا کر سکتا ہوں تو اس پر خوف طاری ہے۔ میں مانتا ہوں کہ خوف زدہ انسان بہت خطرناک ہوتا ہے، اسے اپنے سائے سے بھی ڈر لگتا

ہے، لیکن ظالم اندر سے انتہائی بزدل ہوتا ہے۔ اس کا بندوبست ہی اسے لے ڈوبتا ہے۔ میری بات سمجھ رہے ہو۔"

"میں سمجھ گیا، مجھے کیا کرنا ہے، بولو تم کیا چاہتے ہو۔" اس نے ایک دم سے چونکتے ہوئے پوچھا۔ اس کے لہجے میں جوش بھرا ہوا تھا۔

"بس اسے گھیر کر رکھو، اوپر سے جو بھی سیکورٹی کے لیے ہوگا، اس میں اپنے بندے داخل کردو۔ باقی کام بانیتا کرلے گی، یہ ابھی ممبئی آرہی ہے۔" میں نے کہا تو بانیتا کور نے شوخی میں کہا۔

"ارے تم تو مجھے نارتھ پول جانے کا بھی کہو تو میں جانے کو تیار ہوں، یہ تو اپنی ممبئی ہے یار۔" یہ کہہ کر وہ کھلکھلا کر ہنس دی۔ تب میں نے کہا۔

"بس تم وہاں پہنچو، یہ ذہن میں رکھنا کہ یہی صرف تمہارا آپریشن ہوگا۔ اس میں جسپال کہیں نہیں ہے۔"

"وہ کیا ہرپریت کے پاس ہے؟" اس نے پوچھا۔

"ہاں وہ ادھر ہی ہے، میں نے خود اسے وہیں رکنے کو کہا ہے۔" میں نے جواب دیا۔

"کاش تو بھی میرے پاس ہوتا۔" اس نے حسرت سے کہا تو میں ایک دم سے بولا۔

"یہ کل تک ختم کرو، پرسوں میرے پاس ہوگی تم۔"

"مجھے معلوم ہے یہ تم اپنی بات سچ کر دکھاؤ گے۔ کیا یہ آج رات نہیں ہوسکتا ممبئی والا کام۔" یہ کہہ کر وہ پھر ہنس دی۔ تو میں نے کہا۔

"میں نے اسے چوبیس گھنٹے کا وقت دیا ہے، تم نکلنے کی تیاری کرو۔ ونود میں تم سے رابطے میں رہوں گا۔ تم سن رہے ہونا۔" میں نے پوچھا۔

"میں سن رہا ہوں۔ جیسے ہی مجھے کوئی ڈیویلپمنٹ دیکھنے کو ملی میں آپ سے رابطہ کرلوں گا۔" اس نے جوش سے کہا۔

"نہیں، تمہیں، میرا نمبر نہیں ملے گا، میں خود کروں گا، یہ کہیں بھی ٹریس نہیں ہوگا۔ اب تم اپنی آنکھیں کھول لو اور ٹھنڈے دماغ سے سوچنا شروع کردو۔"

"اوکے۔" اس نے کہا تو میں نے رابطہ منقطع کر دیا۔

کچھ دیر بعد میں نے سب کو بتا دیا کہ میں کیا کرنے جا رہا ہوں۔ سب لوگوں کی توجہ اس کام پر لگ گئی تھی۔

کچھ وقت گذرا تھا کہ کرنل سرفراز کا فون آگیا۔ اس نے مجھے ایک فون نمبر دیتے ہوئے کہا۔

"یہ وہ جوان ہے، جسے میں نے اس کام کے لیے چنا ہے جو تم چاہ رہے ہو۔ میں چاہتا تھا کہ اسے کندن بناؤں کیونکہ میں سمجھتا ہوں کہ یہ ابھی کندن نہیں بنا، ابھی اسے بھٹی میں ڈالنا ہے، ڈال سکتے ہو تو یہ کام اپنے ذمے لے لو، اس کی تمام تر ذمہ داری تمہیں خود پر لینا ہوگی۔ اگر یہ تمہیں اپنے مطلب کا بندہ نہ لگے تو......"

"اگر آپ نے چنا ہے تو وہ اس قابل ہوگا۔ میں تیار ہوں اس کی ذمہ داری لینے کے لیے۔" میں نے کہا۔

"میں نے اس کے بارے میں تمام ضروری معلومات ای میل کر دی ہیں۔ جب چاہے اسے بلالینا۔" انہوں نے کہا اور فون بند کر دیا۔

ولید احمد کا تعلق پنجاب کے شہر جہلم سے تھا۔ اس کا باپ ایک چھوٹا زمیندار تھا، جس کی چند ایکڑ زمین تھی۔ جو قیام پاکستان سے پہلے ہی کی آبائی زمین تھی۔ ولید باپ کا اکلوتا بیٹا ہی تھا۔ دو بہنیں تھیں جو اس سے بڑی تھیں اور اپنے گھروں میں آباد تھیں۔ اس کا بچپن بہت غربت میں گذرا تھا۔ اس نے اپنی زندگی کی ابتدا ٹاٹ اسکول سے کی تھی۔ وہ بہت ذہین تھا۔ ہر امتحان میں امتیازی نمبر لیتا ہوا بورڈ میں پہلی پوزیشن لی۔ آگے پڑھنے کے لیے اس کے پاس سرمایہ نہیں تھا۔ باپ نے حوصلہ دیا اور زمین کا ایک ٹکڑا گروی رکھ کر اسے کالج میں داخلہ دلوا لیا۔ اس نے سائنس کے مضامین کا انتخاب کیا۔ جب تک اس نے کالج کی تعلیم ختم کی اور انجینئرنگ میں جانے کا وقت آیا اس وقت تک وہ غربت کی انتہاؤں پر پہنچ چکا تھا۔ باپ نے زمین بیچ دینے کا ارادہ

کرلیا۔ جس جاگیردار نے وہ زمین گروی رکھی ہوئی تھی، اس نے اپنی رقم کے عوض زمین پر قبضہ کرلیا۔ نہ زمین بکی اور گروی زمین چھڑوا سکے۔ وہ انجینئرنگ میں نہ جا سکا۔ باپ نے اسے حوصلہ نہ ہارنے کا کہا اور آگے پڑھائی جاری رکھنے پر زور دیا۔ مجبوراً اسے یونیورسٹی میں داخلہ لینا پڑا۔ یونیورسٹی میں ولید کے اندر جو لیڈرانہ صلاحیتیں تھیں، ان کا اظہار ہونے لگا تھا۔ اس کی دو وجوہات تھیں، ایک اس کے اندر کا غصہ دوسرا، استحصالی نظام سے نفرت۔ ان دنوں طلبہ تنظیموں پر پابندی تھی۔ طلبہ نے اپنے اظہار کے کئی دوسرے راستے نکال لیے تھے۔ مقامی جاگیردار نے پہل تو اسے اپنے انداز میں استعمال کرنے کوشش کی، پھر باقاعدہ اس کی مخالفت پر اُتر آیا۔ جس کا خمیازہ ولید کو زمین چھن جانے کی صورت میں ملا۔ یہاں تک کہ جب اس نے یونیورسٹی کی تعلیم ختم کی تب تک وہ پورے علاقے کے سیاسی لوگوں میں اپنی پہچان بنا چکا تھا۔ وہ ایک شعلہ جوالا تھا، جو کسی بھی وقت کہیں بھی آگ لگا سکتا تھا۔ انہی دنوں وہ کرنل سرفراز کی نگاہ میں آگیا۔ اس نے ولید کو حوصلہ دیا اور پڑھنے کے لیے بریڈ فورڈ یونیورسٹی بھجوا دیا۔ وہاں اس نے اپنی پڑھائی کے ساتھ کام بھی کیا۔ اس نے سیاست اور قانون کی تعلیم حاصل کرنے کے ساتھ ساتھ پیسے بنائے اور اپنے والدین کی کفالت کرتا رہا۔ چھ سال تک وہ وہیں رہا۔ پڑھائی ختم کرنے کے فوراً بعد اس نے وہاں رہنے کی بجائے پاکستان آنے کو ترجیح دی۔ کرنل سرفراز کی مدد اس کے ساتھ شامل تھی۔ اس نے یہاں آتے ہی اپنا بزنس شروع کیا اور سیاست کے لیے بالکل نئی پارٹی کا انتخاب کرلیا۔ اس نے مقامی زمیندار کو بالکل نہیں چھیڑا، بلکہ اسے نظر انداز کر کے اپنی ساکھ بنانی شروع کردی تھی۔ اسے پاکستان آئے دو برس ہوچکے تھے۔

میں نے اسے فون کیا۔ وہ میرے ہی انتظار میں تھا۔

''کہاں ہو؟'' میں نے پوچھا۔

''میں لاہور سے ابھی تھوڑی دور ہوں۔ گوجرانوالہ کراس کرآیا ہوں۔'' اس نے بتایا

''ٹھیک ہے، راوی پل پر آکر مجھ سے رابطہ کرنا۔'' میں نے کہا اور فون بند کردیا۔

سہ پہر کا وقت تھا جب میں نے جنید اور اکبر کو ساتھ لیا اور نکل پڑا۔ میں ابھی راستے ہی میں تھا جب ولید کا فون آگیا۔ میں نے اقبال پارک میں مینار پاکستان کے پاس پہنچ جانے کو کہا۔ ہم وہاں پہنچ گئے۔ وہ مینار پاکستان کے سائے میں کھڑا تھا۔ ہم اس کے قریب چلے گئے۔ ہم دونوں ہی ایک دوسرے کی تصویر دیکھ چکے تھے۔ وہ لمبے قد کا ایک متوازن اور بارعب شخصیت کا مالک تھا۔ اس نے سفید شلوار قمیص کے ساتھ گہرے نیلے رنگ کا کوٹ پہنا ہوا تھا، جس کے اندر ہلکے نیلے رنگ کا اسکارف تھا۔ علیک سلیک کے بعد ہم کچھ دیر باتیں کرتے رہے۔ اکبر اور جنید دونوں خاموش پاس کھڑے رہے۔ میں نے اسے کہا۔

''ولید! مسلمانوں نے الگ وطن کی جدوجہد نجانے کب سے کی تھی۔ اس کے لیے بڑی قربانیاں بھی دیں۔ لیکن الگ وطن کا مطالبہ ۱۹۴۰ء میں یہاں کیا۔ مقصد کا تعین کیا اور چند برس میں الگ وطن حاصل کرلیا۔''

''جی، میں اس وقت کو بہت اچھی طرح محسوس کرسکتا ہوں۔'' اس نے دھیمے لہجے میں کہا۔

''تم شاید میری بات نہ سمجھ سکو لیکن میں نے وہ منظر دیکھا ہے، اس وقت کے مسلمان اور آج کے مسلمان میں فرق کیا، مجھے یہ بھی نہیں کہنا، میں صرف اتنا کہنا چاہتا ہوں کہ اسی قوم میں ایک نئی روح پھونکنی ہے۔ یہ جو مردہ قوم ہے، اسی میں ایک نئی زندگی بیدار کرنی ہے۔'' میں نے خیالوں میں کھوئے ہوئے انداز میں کہا۔

''آپ کے خیال میں یہ کیسے ہوگا؟'' اس نے پوچھا۔

''سنو! اپنی قوم کو یہ پیغام دینا ہے کہ اس زندہ آئین کی طرف آ، جس میں زندگی ہے، زندگی کی حفاظت ہے،

زندگی کی بقا ہے۔ جو تیری عزت، فخر اور غیرت ہے۔ مردہ آئین وقوانین کو جلا دے اور زندہ آئین وقوانین کو لے آ۔ جس آئین کا دنیا میں کوئی ثانی نہیں۔ اس اندھیرے کو جس نے تیری آنکھوں اور فکر کو اندھا کیا ہوا ہے اس زندہ آئین وقوانین سے جلا ڈال۔ یہی مقصد اس ملک کے وجود میں آنے کا ہے۔"

"زندہ آئین وقوانین کا مطلب آپ قرآن وسنت ہی کو لے رہے ہیں نا۔" اس نے پوچھا۔

"ہاں، زندہ آئین وقوانین کے علاوہ کسی دوسرے آئین وقوانین کو نہ مان۔ جس میں حکمرانوں کو استثنیٰ حاصل ہوں اور قوم کو کچھ بھی حاصل نہ ہو۔ اگر تمہیں طمانچہ لگاتا ہے تو عدالت میں طمانچے کا جواب طمانچہ ہے۔ لیکن یہ ان حکمرانوں کو گوارا نہیں۔ اسی لیے کہ زندہ آئین وقوانین، زندہ کے لیے ہیں۔ مردہ سوچ کچھ قوت نہیں رکھتی۔ تو انیس کروڑ اور وہ چند لوگ مردہ خور۔ حکمرانوں پر کوئی آئین لاگو نہیں۔ یوں لگتا ہے عدلیہ اور انتظامیہ کو حکومت کے خلاف آواز بلند کرنے والے عوامی دماغوں کا 'علاج' کرنے کے لیے رکھا ہوا ہے۔

اے نوجوان اسلام اٹھ کھڑا ہو۔ اسی اعلیٰ مقصد کے لیے۔ یہ جو وطن عزیز کی بنیادوں میں خون ہے، یہ تیرا ہی خون ہے اور تو اُن کا خون ہے، تُو جہاں بھی ہے، تعلیم میں، صحافت میں، سائنس میں، میڈیا میں، سیاست میں، ٹیکنالوجی میں، فوج میں، تو جس شعبہ زندگی میں بھی ہے۔ جہد عمل میں آجا کیونکہ عمل ہی سے ہر شے ظہور میں آتی ہے۔ تو بہت بڑی قوت ہے، یقین نہیں آتا تو تاریخ پر نظر ڈال۔ ان سلاطین کی طرف نہ دیکھ، ملاّ کی طرف نہ دیکھ، پیران عظام کی طرف نہ دیکھ، صرف اپنی طرف دیکھ، اپنے دل کی طرف دیکھ اور حق سے قوت پالے۔

"باقی نہ رہی تجھ میں وہ آئینِ ضمیری...... اے کشتۂ سلطانی، ملائی و پیری"

"جی بالکل۔" اس نے بہت توجہ سے سنتے ہوئے کہا۔ تو میں نے اپنی بات جاری رکھی۔

"کیا وجہ ہے کہ ایک عام آدمی محبِّ دین وملت ووطن، جو بے لوث خدمت کا عزم رکھتا ہو وہ ایوان اقتدار میں کیوں نہیں پہنچ سکتا۔ انہوں نے رکاوٹیں ہی اتنی کھڑی کی ہوئی ہیں کہ ان کے علاوہ کوئی ان ایوانوں کے متعلق سوچ بھی نہ سکے۔ کیا ان کے علاوہ کوئی اعلیٰ دماغ نہیں جو عنانِ حکومت سنبھال سکے۔ اس شیطانیت کے جال کو پھاڑ ڈالو، جس طرح یہ وطن حاصل کیا تھا۔ تجھے تو اعلیٰ پیدا کیا گیا تھا اور شیطان مردود تجھے نیچا دکھانے کے درپے ہے۔ تجھے محکومی، محتاجی اور غلامی میں ڈالا ہے۔

جمہوریت کا راگ الاپنے والے بے غیرتوں سے کوئی یہ پوچھے کہ کیا یہ دن رات سڑکوں پر بادشاہت کا تماشا نہیں ہے کہ شاہی سواریاں گزرتی ہیں تو سیکورٹی الرٹ کے نام پر سڑکیں بند کر دی جاتی ہیں۔ بوڑھے، بیمار بچے ایمرجنسی والے ذلیل وخوار ہوتے ہیں یہاں تک کہ ہماری مائیں، بہنیں، بیٹیاں، اسپتال کی بجائے رکشوں میں بچے جننے پر مجبور ہیں۔ کیا بات ہے ان عوامی نمائندوں کی جنہیں عوام کا احساس ہی نہیں۔ یہ عوامی جمہوریت کا تماشا ہے یا بادشاہت کا بے غیرتانہ مظاہرہ۔ ان کا حکومت میں آنے کا مقصد سرمایہ داری، جاگیرداری، وڈیرہ شاہی، غرور، تکبر ہونا کی کی حفاظت کے سوا کچھ بھی نہیں۔ تاکہ ملکی سرمایہ کو، زمین کو اور وسائل پر زیادہ سے زیادہ فتوحات کر سکیں۔ تاکہ اس پورے ملک کو اپنی جاگیر بنالیں ان کی حسین صبحوں کو دیکھو اور ان کی رنگین شاموں کو دیکھو اور عوامی امنگوں کا قتل عام دیکھو۔"

میں نے یہ کہہ کر ایک لمحہ سانس لیا اور آسمان کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

"اے عشق جلوہ گر ہو، خودنمائی اور خودافزائی فرما، اپنے لشکر سے سامنے آ، عقل نے حرم پاک میں بغاوت کر ڈالی ہے تو اپنے نشتر سے ان کی کھوپڑیوں سے خون فاسد نکال دے۔ عقل کو پنجہ شیطانی سے آزاد کر، اسے اپنے قبضہ میں لے لے، اس کی گردنوں سے لینٹر نکال

دے تا کہ یہ انسان بنیں اور انہیں انسان نظر آئیں۔"
وہ خاموش کھڑا میری طرف دیکھتا رہا اور میں کہتا چلا گیا۔
"قوم کو بیدار کرنے کے لیے کہ یہ جوان لوگوں نے تم پر جیتے جی موت وارد کی ہوئی ہے۔ تیری ذہنی خوبیوں کو جو نئی تخلیق و ایجادات کی حامل ہیں اگر تو اپنی ضروریات خود پوری کرے گا تو تجھے دوسروں سے مانگنے کی ضرورت نہیں رہے گی۔ یہی تیری خود داری ہے۔ لیکن یہ لوگ نہیں چاہتے کہ تو خود دار ہو جائے۔ قومیں اعلیٰ ذہنوں کو وسائل مہیا کرتی ہیں۔ جبکہ انہوں نے تیری ذہنی خوبیوں کے ہاتھ کاٹ دیئے ہیں۔ ان کا مقصد برآمدات و درآمدات سے ٹیکس بٹورنا ہے۔ تو جانتا ہے کہ حرکت میں زندگی ہے اور موت سکون۔ زندہ بنو اور ان زنجیروں کو توڑ دو۔ زندہ بنو، حرکت میں آجاؤ۔ اسی زندہ انقلاب کی طرف آؤ، اپنی طرف آؤ۔ دل کی طرف آؤ۔ خوداری کی طرف آؤ، پاش پاش کردو ان رکاوٹوں کو۔ اس کے مقابل نعرہ حیدری لگا۔ جنہوں نے اس ملک کی دولت، زمین اور وسائل پر قبضہ کر رکھا ہے اور زیادہ سے زیادہ پر قبضہ کے خواہاں ہیں۔ ان کے پنجہ ہوس سے یہ ہتھیار چھین لو۔ دین پاک کی طرف آجاؤ، پلیدیت کو جلا دو، مردہ تمنا کو جلا دو۔ عوام سے نفرت کرنے والے، انہی لوگوں کو ان کے خداوندِ افرنگ نے حریت پسندوں کے خون کے عوض یہ جاگیریں دی ہیں۔ ان حریت پسندوں کا خون ان کے ہاتھوں پر ہے۔ اور آج یہ تیری امنگوں کا خون بہا رہے ہیں۔ تا کہ ہمیشہ کے لیے تجھے غلام بنائے رکھیں۔ اب یہ اس ملک کے خدا بنے بیٹھے ہیں۔
جس نے تیرے ارادے پر قبضہ کیا ہوا ہے، جس نے تجھے غلامی، محکومی اور محتاجی میں ڈالا ہوا ہے، وہ جانتے ہو کیا ہیں؟ سرمایہ داری، جاگیرداری، وڈیرہ شاہی، ان کی غلامی سے نکل اور حق کی پناہ میں آجا۔ یہ تجھے آزاد کرتی ہے، شیطانیت سے، مادیت سے، ہوسناکی سے۔
دھوکا باز شیطان کے چیلوں، ہوس پرستوں نے تیری فکر اور وطن پر شب خون مارا ہوا ہے۔ اپنے اندر زندگی کی قوت کو پہچان و عقل کے ڈر اور خوف سے نکل کر عزم اور یقین لے۔ دل کی طرف آجا۔ جہدِ مسلسل اور عمل پیہم کی طرف آ۔ اپنے دل سے قوت حاصل کر، عقل

ذرا مسکرائیے

ایک شخص کی سائیکل چوری ہوگئی وہ چوک میں آکر اعلان کرنے لگا۔
"اگر میری سائیکل نہ ملی تو میں وہی کروں گا جو میرے باپ نے کیا تھا" چور بوکھلا گیا اور سائیکل وہیں چھوڑ کر فرار ہو گیا' سائیکل ملنے کے بعد لوگوں نے اس شخص سے پوچھا۔
"تمہارے باپ نے کیا کیا تھا؟" وہ شخص بولا۔
"میرے باپ نے نئی سائیکل خرید لی تھی۔"

نصیب والے

جھڑکیاں دینے والا' رعب جمانے والا' دھمکیاں دینے والا بھول چکا ہے کہ وہ بھی انسان ہے۔ انسانوں پر رعب جمانے اور انہیں جھڑکی دینے کا کوئی حق نہیں۔ ہر نفلی استحقاق صرف غرور نفس کا دھوکا ہے اور غرور کسی انسان میں اس وقت تک نہیں آسکتا جب تک وہ بد قسمت نہ ہو۔ نصیب والے قسمت والے ہمیشہ عاجز و مسکین رہتے ہیں۔

غصہ

ایک جذباتی شخص کسی سے جھگڑ پڑا اور اول فول بکنے لگا' مدمقابل نے اسے خوب مارا اور اس کا لباس تار تار کر دیا۔ اس کا یہ حال دیکھا تو ایک دانا شخص نے کہا۔
"اگر تُو عقل سے کام لیتا اور اپنی زبان کو قابو میں رکھتا تو تیرا یہ حال نہ ہوتا۔ تُو اگر غنچے کی طرح اپنا منہ بند رکھتا تو پھول کی طرح دریدہ دامن نہ ہوتا۔"
ایک کم عقل شخص ہی شیخی بگھارتا اور اس کے نتیجے میں نقصان اٹھاتا ہے' سب جانتے ہیں کہ آگ سر تا پا زبان ہی زبان ہے۔ بھڑکتی ہے' چیختی ہے' لپکتی ہے لیکن پانی کی تھوڑی سی مقدار بھی اسے بجھا دیتی ہے۔
مرسلہ: ماجد خان...... سیالکوٹ

کو شیطان کے پنجہ خونیں، شک اور ڈر سے پاک کر اور اپنے سامنے سے اس منظر کو ہٹا دے، اپنے ارادہ کو آزاد کر لے۔ تم کتنے کروڑ ہو اور یہ چند لوگ، جنہوں نے تیری فکر اور وطن پر قبضہ کر رکھا ہے۔''

میں نے اسے پیغام دے دیا۔ میں کہہ چکا تو وہ بولا۔

''میں نے سن لیا اور سمجھ لیا۔ میں اسے ہمیشہ یاد رکھوں گا یہی سبق جب چاہیں سن لیں۔''

''اور پھر چلیں۔'' میں نے کہا اور چل دیا۔ میں سمجھ رہا تھا کہ میں ایک نئے دور میں داخل ہونے جا رہا ہوں۔

ولید نے علامہ اقبال ٹاؤن میں ایک گھر بنایا ہوا تھا۔ ہم وہاں چلے گئے۔ رات تک وہیں بیٹھے باتیں کرتے رہے۔ اس دوران مجھے کوئی فون نہیں ملا۔ رات ہوتے ہی ہم وہاں سے اٹھ گئے۔ میں نے ولید سے اگلے دن ملنے کا وعدہ کیا تھا۔

میں واپس گھر پہنچا تو فہیم نے مجھے بتایا کہ بانیتا ممبئی پہنچ چکی ہے اور وہ ائر پورٹ سے نوین کور کے ساتھ اس کے گھر کی طرف جا رہی ہے۔ میں نے ونود رانا کو فون کیا۔ اس نے بتایا کہ رامیش پانڈے کی سیکورٹی بڑھا دی گئی ہے۔ انسداد دہشت گردی کے خصوصی اسکوڈ کو الرٹ کر دیا گیا تھا اور ممبئی میں کسی بھی قسم کی دہشت گردی کو روکنے کے احکامات جاری کر دیئے گئے تھے۔ پولیس کا ایک دستہ اس کے گھر کی طرف روانہ کر دیا گیا تھا۔

میں نے جو چیلنج رامیش پانڈے کو دیا تھا، اس میں ابھی آٹھ گھنٹے سے بھی زیادہ وقت پڑا تھا۔ لیکن اس دوران مجھے یہ ثابت کرنا تھا کہ میں کیا کر سکتا ہوں۔ مجھے ایک میل آنا تھی، اسے پڑھنے کے بعد ہی میں اگلا قدم اٹھا سکتا تھا۔ رات دس بجے کے بعد وہ میل مجھے مل گئی۔

رمیش پانڈے کے راجستھان میں آبائی گاؤں جگر واس میں ہی اس کی اصل طاقت تھی۔ یہی اس کا حلقہ تھا اور یہیں ان شدت پسندوں کا گڑھ تھا۔ بذات خود وہ ان سے دور رہتا تھا کہ عام عوام کو یہ تاثر دے سکے کہ وہ ان کے خلاف ہے اور سیکولر ہے، لیکن سب سے زیادہ تحفظ انہیں یہی فراہم کرتا تھا۔ وہیں ایک مندر تھا۔ جس کے ساتھ ایک بڑا سارا دھرم شالہ بنا ہوا تھا۔ اسی میں ان کی ساری پلاننگ ہوتی تھی۔ اس وقت اس دھرم شالے میں چند لوگوں کی میٹنگ جاری تھی۔ ان پر میری دھمکی کا اثر ہو گیا ہوا تھا۔ وہ بے بس تھے کیونکہ انہیں یہ معلوم ہی نہیں تھا کہ یہ دھمکی آئی کس طرف سے ہے۔ وہ رامیش پانڈے کو گاؤں آنے کا کہہ چکے تھے مگر وہ خود کو ممبئی میں زیادہ محفوظ تصور کر رہا تھا۔ انہوں نے گاؤں سے بندے بھی بھجوا دیئے تھے۔ وہ اس انتظار میں تھے کہ رامیش پانڈے انہیں مدد کو کہے تو وہ اس کی مدد کر سکیں۔ لیکن خاموشی کے باعث وہ گومگو کی کیفیت میں تھے۔

یہ سب کچھ وہاں پر موجود میری آنکھیں اور کان دیکھ اور سن رہے تھے۔ یہ سیٹ اپ بنانے میں مجھے بڑی محنت اور صبر کرنا پڑا تھا اور میں نے اپنے طور پر یہ کام کر لیا تھا۔ وہ میرے حکم کا انتظار کر رہے تھے کہ میں کب انہیں کہوں اور وہ اپنا کام شروع کر دیں۔ میں اس پر کاری ضرب لگانے کے لیے خود کو تیار کر چکا تھا۔

(باقی ان شاء اللہ آئندہ ماہ)

تریاق

محمد سلیم اختر

خون کے رشتے مجبوری ہوتے ہیں. انسان لاکھ کوشش کرلے ان رشتوں سے دامن نہیں چھڑا سکتالیکن دوستی کا رشتہ اختیار میں ہوتا ہے'انسان دوست کا انتخاب اللہ تعالیٰ کی عطا کردہ صلاحیتوں کو بروئے کار لا کر ہی کرتا ہے. اگر اس کا انتخاب درست ہو تو دنیا سورگ بن جاتی ہے.
ایک نوجوان کا احوال واقعی جس کے انتخاب نے اسے دنیا میں ہی جنتی بنا دیا تھا.

وہ رات مجھ پر گزرنے والی تمام راتوں پر بھاری تھی۔ میرے سامنے پڑا ہوا ایش ٹرے سگریٹ کے ٹکڑوں اور ان کی راکھ سے بھر چکا تھا مگر میں پھر بھی سگریٹ پر سگریٹ پھونکے جا رہا تھا کیونکہ میرے دوست رابیل کے مقدر کی طرح سیاہ رات ختم ہونے کا نام نہیں لے رہی تھی۔ میں خوفزدہ تھا کہ صبح کا اجالا میرے لیے افشائے راز کا سبب بن جائے گا۔ آنے والا کل میری اور رابیل کی دوستی کا بھرم کھول دے گا۔ لوگ مجھ پر سنگ برسائیں گے، مجھے یار مار کا لقب دیں گے، مجھے قاتل کہا جائے گا'ہاں میں اس قابل ہوں۔ میں دوستی کے قابل نہیں ہوں کیونکہ میں نے اپنے پیارے دوست رابیل کو زہر دے دیا ہے۔ وہ اس وقت زندگی اور موت کی کشمکش میں مبتلا ہوگا، وہ تڑپ رہا ہوگا، درد سے بلبلا رہا ہوگا۔ میں بھی اس بھیانک صبح کا منتظر ہوں جب رابیل کی موت کی خبر پھیلے گی اور ساتھ ہی یہ بھی تو بتایا جائے گا کہ رابیل کا قاتل اس کا جانی دوست ہے۔ اسی نے اسے زہر لا کر دیا تھا۔

......☆☆☆......

ہماری دوستی کی ابتدا کالج میں ہوئی تھی۔ تھرڈ ایئر میں داخلہ کے لیے میرا نام آخری میرٹ لسٹ میں آیا تھا۔ فیس جمع کرانے کے لیے صرف ایک دن دیا گیا تھا۔ میری جیب میں اتنی رقم نہ تھی کہ میں اسی دن فیس جمع کرا دیتا لہٰذا مجھے گھر واپس آنا پڑا۔ واپسی تک کالج کا دفتر بند ہو چکا تھا۔ میں نے اگلے روز فیس جمع کرانے کا ارادہ کرلیا۔ اگلے روز میں نے کالج جلدی پہنچنے کی غرض سے بس کی بجائے ویگن میں سفر کرنے کا فیصلہ کیا مگر پھر بھی ویگن نے جگہ جگہ اسٹاپ کر کے ایک گھنٹہ لگا دیا۔ ویگن میں گنجائش سے زیادہ مسافر سوار ہو رہے تھے، میں نے بھی بڑی مشکل سے یہ سفر طے کیا۔ میں کالج کے دفتر کے سامنے پہنچا تو وہاں بھی فیس جمع کرانے والوں کی ایک لمبی قطار لگی تھی، لگتا تھا کہ میری باری دو گھنٹوں کے بعد ہی آئے گی۔ خدا خدا کر کے میری باری آئی تو میں نے پینٹ کی جیب میں ہاتھ ڈال کر رقم نکالنی چاہی مگر میرے ہاتھوں میں کچھ نہ آیا، میری جیب خالی تھی' میں نے گھبرا کر ادھر ادھر دوسری جیبوں میں ہاتھ ڈالا مگر وہاں بھی کچھ نہ تھا۔ ویگن کے سفر کے دوران کسی نے میری فیس کی رقم اڑا لی تھی۔ دکھ اور شرمندگی کے مارے میرا برا حال ہو گیا کیشئر بھی میری طرف ہی دیکھ رہا تھا۔ میری حالت دیکھ کر بولا۔

''اگر آپ کے پاس رقم نہیں ہے تو لائن سے ہٹ جائیں، دوسروں کو موقع دیں۔''

میں نے شرمندگی کے مارے لائن چھوڑ دی اور

کھڑکی کے ساتھ کھڑا ہو کر پھر سے اپنی جیبیں ٹٹولنے لگا کہ شاید کسی جیب سے رقم نکل آئے۔

''کیا بات ہے، خیریت تو ہے نا؟'' میرے پیچھے کھڑے طالب علم نے میری پریشانی دیکھ کر پوچھا، اس کے لہجے میں ہمدردی کا عنصر نمایاں تھا۔

''کالج آتے ہوئے ویگن میں کسی نے میری رقم نکال لی ہے۔ اب اگر گھر جاؤں اور پھر واپس آؤں تو کالج کا ٹائم ختم ہو جائے گا۔'' میں نے پریشانی کے عالم میں کہا۔

''آپ کا نام اور گروپ؟ اس نے پوچھا۔

''شکیل احمد ولد احمد دین آرٹس گروپ تھرڈ ائیر۔'' میں نے نگاہیں جھکا کر کہا۔

''آپ پارک میں بیٹھیں، میں آتا ہوں۔''

میں پارک میں آکر بیٹھ گیا اور اپنی بدقسمتی کا ماتم کرنے لگا، ساتھ ہی ساتھ جیب کاٹنے والے کو بد دعائیں دینے لگا۔ کچھ ہی دیر گزری تھی کہ وہ آگیا ہے، آتے ہی بولا۔

''شکیل صاحب! یہ لیں رسید آپ کی فیس میں نے جمع کرا دی ہے۔ یہ ادھار ہے، جس روز کالج کھلے گا، میری رقم لوٹا دینا۔''

''میں آپ کا یہ احسان زندگی بھر نہ بھولوں گا۔'' ایسا کہتے ہوئے میری آنکھیں بھر آئیں۔

''نہیں، شکیل! یہ احسان نہیں، ایک اخلاقی فرض تھا جو میں نے نبھایا ہے۔''

''آپ اپنا تعارف تو کرائیں نا؟'' میں نے اس سے دوستی کرنے کا عہد کرتے ہوئے پوچھا۔

''میں عیسائی ہوں، رابنسن میرا نام ہے۔ والدین کی اکلوتی اولاد ہوں۔''

''تم عظیم ہو، رابنسن! تم نے مجھ پر مہربانی کی ہے اس کا اجر تمہیں ضرور ملے گا۔''

میری آنکھیں تشکر کے آنسوؤں سے بھر آئیں تو رابنسن نے آگے بڑھ کر مجھے گلے سے لگایا اور کہنے لگا۔

''انسان ہی انسان کے کام آتا ہے، اب شکریہ کا لفظ زبان پر نہ لانا۔ آج سے ہم دوست ہوئے۔''

''مجھے تمہاری دوستی پر فخر رہے گا۔ رابنسن! ہماری دوستی مثالی ہوگی، لوگ اس کی مثالیں دیا کریں گے۔''

ہم دیر تک ادھر ادھر کی باتیں کرتے رہے۔ پھر کینٹین میں چائے پی۔ واپسی کا کرایہ بھی مجھے رابنسن نے ہی دیا اور میں گھر لوٹ آیا۔

......☆☆☆......

میں دو بہنوں کا اکلوتا بھائی ہوں اور ان سے چھوٹا بھی۔ اس لیے میں گھر بھر کا لاڈلا تھا۔ ابا جان ایک سرکاری ادارہ میں کام کرتے تھے۔ وہ بہت ہی محبت کرنے والے اور زندہ دل انسان تھے۔ ہر ایک کے کام آنا اور احترام کرنا ان کا شیوہ تھا۔ ان کا رویہ ہم سے دوستوں جیسا تھا، ہم اپنی ہر بات ان سے بلا جھجک کہہ دیتے اور وہ بھی ہمارا بھرپور ساتھ دیتے، تعاون کرتے اور ہمارا ہر مسئلہ ترجیحی بنیاد پر حل کرتے ہمیں اپنے ابا جان پر فخر تھا۔ ہماری امی جان، ابا جان کے بالکل برعکس تھیں۔ وہ ہر کام میں تفریق اور نفاست برتنے کی عادی تھیں، ہم بہن بھائی ان سے دبتے تھے۔ گھر کے ملازموں اور مانگنے والوں سے ان کا رویہ نہایت ہی ظالمانہ ہوتا تھا۔ وہ کسی کی کوئی بھی غلطی معاف نہ کرتی تھیں۔ اپنے سے چھوٹے لوگوں سے ان کو خواہ مخواہ کا بیر تھا، گویا وہ انسان کو انسان ہی نہ سمجھتی تھیں۔ ہم بہن بھائیوں کا ان کے ساتھ اکثر ایسی ہی باتوں پر اختلاف ہوتا تھا مگر ان کے سامنے زبان کھولنے کی ہمت نہ رکھتے تھے۔ ابا جان تو امی جان کے معاملات میں دخل ہی کم دیتے تھے، اسی وجہ سے امی اور بھی شیر ہو گئی تھیں کہ گھر

میں ان کو روک ٹوک کرنے والا کوئی نہ تھا۔ اس کے ساتھ ساتھ وہ ہم تینوں سے محبت بھی کرتی تھیں۔ وہ ہمیں بھی اپنے جیسا ہی سنگدل دیکھنا اور بنانا چاہتی تھیں مگر وہ اس میں کامیاب نہ ہو پاتی تھیں کیونکہ ہم اپنے ابو کے نقش قدم پر چل رہے تھے مگر گھر کا ماحول پر سکون ہی رہتا تھا۔

اس روز میں گھر پہنچا تو ابا جان ابھی دفتر سے نہیں آئے تھے۔ میں نے امی جان کو رقم چوری ہونے اور پھر رابنسن کی طرف سے فیس جمع کرانے کی پوری تفصیل سنائی تو انہیں غصہ آ گیا۔ پہلے تو انہوں نے ویگن والوں کو سنائیں پھر رقم چوری کرنے والے کو بد دعائیں دینے لگیں کہ خدا کرے اس کے گھر میں آگ لگ جائے۔ اس کے وہ ہاتھ ٹوٹ جائیں جن ہاتھوں سے اس نے میری جیب صاف کی ہے پھر میری طرف متوجہ ہوئیں اور غصہ سے کہنے لگیں۔

''تم نرے بدھو ہو، تم سے رقم بھی نہیں سنبھالی گئی۔ پہلے دن ہی باپ کی کمائی لٹا دی تو اب آئندہ کیا کرو گے؟''

''آئندہ سے میں بس میں جایا کروں گا امی۔'' میں نے کہا۔

''جب تمہیں معلوم ہو گیا کہ تمہاری رقم چوری ہو گئی ہے تو گھر آ جاتے اور گھر سے رقم لے کر دوبارہ کالج جا کر جمع کرا آتے۔ تم نے تو خاندان کی ناک کٹوا دی ہے۔''

''میں گھر آتا اور پھر یہاں سے رقم لے کر دوبارہ کالج جاتا تو کالج بند ہو چکا ہوتا۔ فیس جمع نہیں ہو پاتی تو داخلہ نہ ملتا اور قیمتی تعلیمی سال ضائع ہو جاتا۔''

میں نے غصہ بھرے انداز میں کہا تو ان کے لہجے میں معمولی سی نرمی آ گئی، کہنے لگیں۔

''کسی مسلمان لڑکے سے رقم لے کر فیس جمع کرا دی ہوتی، کرسچن سے رقم لے کر تم نے فیس جمع کرا کے مسلمانوں کو خوار کر دیا ہے۔''

''نہیں امی جان! ایسی بات نہیں ہے۔ میں نے کسی سے رقم نہیں مانگی تھی، رابنسن نے خود ہی میری فیس جمع کرا دی تھی۔ امی جان! آپ کو تو اس کا ممنون ہونا چاہئے۔''

''ابھی جاؤ اور رقم اسے دے کر اس کا احسان اتار دو، مجھے نہیں اچھے لگتے یہ لوگ۔'' امی نے اٹھ کر الماری سے رقم نکالی اور میری طرف بڑھاتے ہوئے کہا۔

''ابھی کہاں دوں اسے، میں تو اس کا گھر ہی نہیں جانتا۔ چار دن بعد کلاسز شروع ہوں گی تو رقم اسے دے دوں گا اور ساتھ ہی اس کا شکریہ بھی ادا کروں گا۔'' میں نے رقم لے کر جیب میں رکھتے ہوئے کہا۔

''جب رقم لوٹا دو گے تو شکریہ کس بات کا؟'' امی سوالیہ لہجے میں بولیں۔

''شکریہ بر وقت میری مدد کرنے، میرے کام آنے، میرا تعلیمی سال بچانے کا؟'' میں نے بھی اسی لہجے میں جواب دیا۔

''اب تو تم اس سے دوستی بھی کرو گے؟'' امی نے طنزیہ لہجے میں کہا۔

''وہ تو ہو چکی۔'' میں نے فوراً جواب دیا۔

''اب اس دوستی کو کالج تک ہی محدود رکھنا، گھر تک نہ لانا۔ سمجھے!''

امی یہ کہہ کر اٹھ کر دوسرے کمرے میں چلی گئیں تو میں نے بھی سکھ کا سانس لیا۔

......☆☆☆......

یہ اتفاق ہی تھا کہ میرے اور رابنسن کے مضامین اور سیکشن بھی ایک ہی تھے۔ یہ ہم دونوں کے لیے راحت کا باعث تھا۔ میں نے شکریہ کے ساتھ رابنسن کو اس کی رقم واپس کر دی تھی۔ کلاس میں ہم ایک ہی بینچ پر بیٹھتے تھے۔ کالج ٹائم کے دوران ہمارا اٹھنا بیٹھنا، کھانا

پینا، لائبریری اور کھیل کے میدان جانا ایک ساتھ ہی ہوتا۔ ہمارے مزاج میں بھی قدرتی طور پر ہم آہنگی تھی۔ دن بدن ہماری دوستی مضبوط سے مضبوط تر ہوتی گئی۔ ہمیں ایک دوسرے پر فخر تھا۔ مجھے کئی بار مسلمان طالب علموں کی طنزیہ باتیں بھی سننی پڑتی تھیں مگر مجھے کسی کی پروا نہ تھی، مجھے صرف رابنسن سے غرض تھی جسے میں اب پیار سے رابی کہہ کر بلاتا تھا کیونکہ اس کے گھر میں بھی اسے رابی ہی کہا جاتا تھا۔ ہم تعلیم کے معاملہ میں بھی کسی سے کم نہ تھے۔ میں اپنے گھر میں ابا جان اور اپنی بہنوں سے رابی کا ذکر کرتا تھا۔ ابا جان کی خواہش تھی کہ میں رابی کو اپنے گھر لاؤں۔ وہ اس سے ملنا چاہتے تھے مگر امی کی وجہ سے میں رابی کو گھر آنے کی دعوت نہ دے رہا تھا حالانکہ میرا بھی دل چاہتا تھا کہ میں رابی کو اپنے گھر والوں سے ملواؤں۔ ادھر رابی تھا کہ ہر روز ہی مجھے اپنے ساتھ گھر جانے کے لیے اصرار کرتا تھا۔ اس نے اپنے گھر میرا تعارف اچھے انداز میں کرا کے میرے نمبر بنا رکھے تھے۔ میری طرح رابی کا بھی کوئی بھائی نہیں تھا' اس سے بڑی ایک اس کی بہن تھی جو شادی شدہ تھی اور کسی دوسرے شہر میں رہتی تھی۔ اب گھر میں اس کی ماں اور باپ تھے۔ رابی ان کی آنکھوں کا تارہ تھا، ان کی زندگی کا واحد سہارا تھا۔ اس نے اپنی ماں سے میرا ذکر نہایت ہی اچھے انداز میں کیا تھا۔ وہ بھی کئی بار پیغام بھیج چکی تھیں کہ میں رابی کے ہمراہ ان کے گھر آؤں مگر میں رابی کو ٹال رہا تھا محض اس ندامت کی بنا پر کہ میں رابی کو ایک بار بھی گھر آنے کی دعوت نہیں دے رہا تھا، میں ڈرتا تھا کہ کہیں میری امی کوئی ایسی بات نہ کہہ دیں کہ ہماری دوستی کے ستون کمزور ہو جائیں۔ میں رابی کو کھونا نہیں چاہتا تھا، نہ جانے کیوں رابی کے بغیر مجھے ادھورے پن کا احساس ہوتا تھا۔

......☆☆☆......

وہ رمضان کا مبارک مہینہ تھا۔ کالج میں طلباء یونین نے اپنے مطالبات منظور نہ ہونے کی بنا پر کلاسوں کا بائیکاٹ کر ڈالا اور ایک جلوس نکالا۔ میں اور رابی بھی اس میں شامل تھے۔ جب ہمارے ساتھیوں نے توڑ پھوڑ شروع کی تو ہم نے ان کا ساتھ نہ دیا، ہم جلوس سے علیحدہ ہو گئے۔ میں نے گھر آنے کا پروگرام بنا لیا مگر رابی نے میرے اس فیصلہ سے اتفاق نہ کیا بلکہ مجھے اپنے گھر لے جانے پر بضد ہو گیا۔ مجھے بالآخر ہتھیار ڈالنے ہی پڑے۔ میں اس کے ہمراہ اس کے گھر پہنچا تو اس کی امی نے میرا استقبال بڑے ہی خوشی بھرے انداز میں کیا، انہوں نے میری پیشانی پر بوسہ دیا اور سینے لگایا۔

''میں تم میں اور رابی میں کوئی فرق نہیں سمجھتی۔ رابی تمہاری تعریفیں روزانہ ہی کرتا ہے اس لیے تم سے ملنے کو بہت جی چاہتا تھا۔ آج سے میرے دو بیٹے ہو گئے، ایک تم اور دوسرا رابی۔''

رابی کی ماں کی محبت نے مجھے نہال کر ڈالا۔ اتنی محبت، چاہت اور خلوص میں نے کہیں نہ دیکھی اور نہ پائی تھی۔ ان کی محبت بھری باتیں میری روح کو سیراب کر گئیں، میں اندر ہی اندر یہ سوچ کر کڑھنے لگا کہ کاش! میری ماں بھی رابی کو اس طرح بیٹا کہہ کر پیار کرتیں۔ رابی اور اس کی ماں کو معلوم تھا کہ میں روزے سے ہوں۔ اس وجہ سے انہوں نے بھی نہ ہی کچھ کھایا اور نہ ہی پیا۔ میں نے رابی سے کہا کہ وہ کھانا کھا لے مگر اس نے انکار کر دیا۔ رابی نے میرے گھر فون کر کے کہہ دیا کہ میں اس کے گھر ہوں اور رات تک آؤں گا۔ میں نے اسے لاکھ کہا کہ میں گھر جاؤں گا مگر رابی اور اس کی ماں کی بے لوث اور بیکراں محبت میرے قدموں کی زنجیر بن گئی۔ مغرب کے وقت میں یہ دیکھ کر دنگ رہ گیا کہ رابی کی ماں نے میرے لیے نہایت پرتکلف افطاری تیار کی تھی۔ میں نے افطاری کی، پھر نماز پڑھی اور پھر دیر تک

باتیں کرتے رہے۔ رات کو جب میں روانہ ہونے لگا تو رابی کی ماں نے مجھے ایک سوٹ کا کپڑا تحفے میں دیا، ساتھ ہی ڈھیروں دعائیں بھی اور آتے رہنے کی تاکید بھی کی۔ گھر پہنچا تو امی کے تیور دیکھ کر ڈر سا گیا۔

"تم مجھ کو بتا کر کیوں نہ گئے کہ تم رابنسن کے گھر جاؤ گے؟" امی نے غصہ سے پوچھا، جواب میں کالج میں کلاسوں کے بائیکاٹ، جلوس اور توڑ پھوڑ کے بعد رابنسن کے اصرار کے بارے میں بتایا اور کہا کہ میں مجبور ہو گیا تھا اس لیے انکار نہ کر سکا اور اس کے گھر چلا گیا۔

"رات تک وہاں ٹھہرنے کی ضرورت کیا تھی؟" امی کے لہجے میں مزید تلخی آ گئی۔

"رابنسن کی امی نے نہ آنے دیا، انہوں نے بہت ضد کی تو میں ان کے خلوص کو رد نہ کر سکا۔" میں نے دھیمے لہجے میں جواب دیا۔

"میں خوب جانتی ہوں ان لوگوں کو، وہ تمہیں اپنے ماحول اور اپنے مذہب کی طرف مائل کرنا چاہتے ہیں اور اسی وجہ سے میں تمہاری اس دوستی کے خلاف ہوں اور آج تم نے روزہ بھی صحیح طرح افطار نہ کیا ہوگا؟" امی کا لہجہ طنزیہ ہو گیا۔

"امی جان! آپ غلط سمجھ رہی ہیں۔ رابنسن اور اس کی ماں نے مجھے اتنا پیار دیا کہ میں بتا نہیں سکتا۔ رابنسن کی امی نے میرے لیے افطاری بھی بنائی تھی۔ انہوں نے روزہ کا پورا اور مکمل احترام کیا تھا۔"

"جھوٹ بولتے ہو تم، میں اب تمہاری کوئی بات نہ سنوں گی۔ بہتر ہے کہ تم اس عیسائی لڑکے سے دوستی ختم کر لو۔ میں آئندہ تمہاری زبان سے اس کا نام نہ سنوں۔"

امی نے اس قسم کی کئی باتیں کیں جو میں نے خاموشی سے سنیں اور پھر بھلا دیں کیونکہ میں رابی سے دوستی کا ناتا ختم کرنے کا تصور بھی نہ کر سکتا تھا۔ میں آئندہ کے لیے محتاط ضرور ہو گیا کہ امی کے سامنے رابی کا نام نہ لیتا تھا البتہ ابا جان اور بہنوں کے ساتھ اس کا ذکر کرتا رہتا تھا۔ مجھے یہ دکھ بھی کھائے جا رہا تھا کہ میں رابی کو اپنے گھر نہیں بلا سکتا۔ رابی کو میری اس مجبوری کا علم نہ تھا پھر بھی اس نے کبھی اس سلسلہ میں مجھ سے بات نہ کی تھی۔ البتہ وہ امی اور ابا کے بارے میں کبھی کبھی پوچھ لیتا تھا کہ وہ کیسے ہیں؟

......☆☆☆......

بی اے کرنے کے بعد ہم نے ایم اے میں داخلہ لے لیا کیونکہ اس کالج میں ہی ایم اے کی کلاسیں ہو رہی تھیں۔ میں مہینہ میں ایک دو بار رابی کے گھر ضرور جاتا تھا، اس کی وجہ سے رابی کی امی سے ملاقات اور ان کی ڈھیروں پرخلوص دعائیں لینا ہوتی تھی۔ وہ بھی مجھ دیکھ کر اور مل کر بہت ہی خوش ہوتی تھیں۔

ان دنوں ہم فائنل ائیر میں تھے کہ رابی کی امی بیمار ہو گئیں، انہیں اسپتال میں داخل ہونا پڑا۔ میں روزانہ ہی رابی کے ہمراہ ان کو دیکھنے اسپتال جاتا تھا۔ کئی دن کی تشخیص کے بعد پتہ چلا کہ ان کو کینسر کا موذی مرض لاحق ہے۔ ان کا علاج کرانے میں کوئی کسر نہ چھوڑی گئی مگر اس موذی مرض نے بالآخر ان کی جان لے لی۔

اس روز میں دھاڑیں مار مار کر رویا، لگتا تھا جیسے میری سگی ماں فوت ہو گئی ہو۔ رابی کا بھی رو رو کر برا حال تھا۔ میں اسے دلاسہ دیتے ہوئے خود بھی رو پڑتا۔ کئی دن تک میری اور رابی کی طبیعت نہ سنبھل سکی تھی۔ رابی کو امی کی بیماری کے دوران خون کی ضرورت پڑی تو رابی کے ساتھ میں نے بھی ان کو خون دیا تھا، دکھ تھا کہ میرا خون بھی ان کے کام نہ آیا۔ رابی کی بہن اب یہاں ہی آ گئی تھی۔ وہ ہو بہو اپنی ماں کی کاپی تھی، شکل وصورت عادات واطوار میں بھی اپنی ماں پر ہی گئی تھی۔ میں اسے باجی کہتا تھا اور وہ مجھے رابی کی طرح چھوٹا بھائی ہی سمجھتی تھی۔ میرے ابو افسوس کرنے کے لیے رابی کے گھر

آئے تھے مگر میری امی نے مجھے بھی دو لفظ افسوس کے نہ کہے۔ ان کے گھر جانا تو دور کی بات ٹھہری۔ وہ اب مطمئن تھیں کہ شاید اب میرا رابی کے گھر آنا جانا کم ہو جائے گا مگر وہ یہ نہ جانتی تھیں کہ ماں کے بعد مجھے اس جیسی باجی مل گئی ہے۔

ماں کی وفات کے بعد رابی کا پڑھائی سے جی اچاٹ ہوگیا۔ اس کی طبیعت بھی خراب رہنے لگی۔ اس کے معدہ میں کوئی تکلیف ہوگئی تھی۔ کبھی کبھار پیٹ میں شدید درد اٹھتا تھا۔ ڈاکٹر کو دکھایا تو انہوں نے اسے معمولی تکلیف قرار دیا اور مطمئن کر کے واپس بھیج دیا۔ میں نے رابی کی پڑھائی ختم نہ ہونے دی۔ بالآخر ہم دونوں نے ماسٹر کرلیا اور پھر سروس کی تلاش شروع ہوگئی۔ رابی ابھی تک ماں کی جدائی کا غم نہ بھولا تھا۔ خود میں بھی ان کی میٹھی اور پیار بھری باتیں نہ بھول پایا تھا۔ میں رابی کے گھر جاتا تو اس کی بہن خوشی سے کھل اٹھتی۔ وہ میری اور میرے گھر والوں کی خیریت پوچھتی اور مجھے کسی قسم کی اجنبیت کا احساس تک ہونے دیتی۔ رابی اور اس کے گھر والوں کا بے لوث پیار پا کر میں خود سے شرمندہ ہوجاتا اور سوچتا کہ میں کتنا مجبور ہوں اور بے بس ہوں کہ رابی کو ایک بار بھی اپنے گھر لے کر نہیں گیا، وہ کیا سوچتا ہوں گا؟ مگر آفرین ہے رابی پر کہ اس نے کبھی بھی اس بارے میں بات نہ کی تھی، اس نے کبھی بھی میرے گھر آنے اور میرے گھر والوں سے ملنے کی خواہش نہ کی تھی، شاید اسے میری مجبوری کا علم ہوگیا تھا مگر اب میں مجبوری کی یہ زنجیر توڑنے کے بارے میں سوچنے لگا تھا۔ رابی کی اداسی مجھ سے دیکھی نہ جاتی تھی۔

رابی کو ایک پرائیویٹ ادارہ میں اچھی ملازمت مل گئی تھی مگر میں ابھی تک سروس کی تلاش میں سرگرداں تھا۔ بالآخر رابی کی ہی کوششوں سے مجھے بھی ایک اچھے ادارہ میں جاب مل گئی۔ تنخواہ بھی معقول تھی اس لیے میں بھی خوش تھا۔ اس عرصہ میں میری دونوں بہنوں کی شادیاں ہوگئی تھیں مگر میں نے بہنوں کی شادی پر رابی کو نہ بلایا تھا۔ گھر میں جب میں نے سروس ملنے کی خبر سنائی تو امی اور ابو دونوں ہی خوش ہوئے کہ میں اب گھر کی کفالت کرنے کے قابل ہوگیا ہوں۔ ابو ریٹائر ہوگئے تھے اس لیے اب گھر کا نظام مجھے ہی چلانا تھا۔ مجھے پہلے تنخواہ ملی تو میں نے وہ امی کے ہاتھوں پر لاکر رکھ دی، اس کے ساتھ ہی ان سے فرمائش کر دی کہ میں نے ایک دو دوستوں کی دعوت کی ہے اس لیے اچھا سا کھانا تیار کریں۔ امی نے دعوت کا پروگرام اگلے روز پر رکھ دیا۔

......☆☆☆......

اس روز میں نے اپنے دفتر سے آدھا گھنٹہ قبل ہی چھٹی کرلی اور سیدھا رابی کے دفتر پہنچا۔ میں نے رابی سے وعدہ کر رکھا تھا کہ اسے کسی اچھے ہوٹل میں کھانا کھلاؤں گا اور یہ سب کچھ سروس ملنے کی خوشی میں ہوگا۔ میں نے اپنے موٹر سائیکل پر اپنے ساتھ بٹھالیا اور اس کا رخ اپنے گھر کی طرف موڑ دیا۔

"یہ تم کون سے ہوٹل جارہے ہو؟" رابی نے مجھے محلّہ کی گلیوں میں داخل ہوتے دیکھ کر کہا۔

"اپنے ذاتی ہوٹل، اپنے گھر۔" میں نے مختصر سا جواب دیا۔ رابی میرا جواب سن کر خاموش ہوگیا اور مزید کوئی سوال نہ کیا۔ میں نے بھی مزید کوئی بات نہ کی کیونکہ آج میں نے عہد کرلیا تھا کہ رابی کو میں اپنی ماں اور باپ سے ملواؤں گا اور اپنی ماں سے التجاء کروں گا کہ وہ رابی کو ماں کا پیار دیں، بالکل اسی طرح جس طرح رابی کی ماں مجھ پر محبتیں نچھاور کرتی تھی۔ میں نے رابی کو ڈرائنگ روم میں بٹھایا اور پھر ابا جان کو ساتھ لے کر آگیا۔ وہ دونوں باتیں کرنے لگے تو میں امی کے پاس کچن میں آگیا جہاں وہ کھانا بنانے میں مصروف تھیں۔

"آگئے تمہارے دوست؟" امی نے مجھے دیکھتے

ہی پوچھا۔

"صرف ایک دوست آیا ہے، امی جان!" میں نے جواب دیا۔

"تم تو کہہ رہے تھے، دو ہوں گے۔" امی بولیں۔

"میرا دوست تو صرف ایک ہی ہے۔" میں نے بھی اسی انداز میں جواب دیا۔

"کون ہے وہ؟" امی نے میری طرف غصہ سے دیکھتے ہوئے پوچھا۔

"رابنسن۔" میرے منہ سے اتنا ہی نکلا تھا کہ امی کے تیور بگڑ گئے، کہنے لگیں۔

"میں نے تمہیں منع کیا تھا کہ کسی بھی عیسائی دوست کو گھر نہ لانا مگر تم نے میری بات نہیں مانی۔ جاؤ، اسے ہوٹل پر لے جا کر کھانا کھلا دو۔ میں کھانا نہیں بناؤں گی۔"

دکھ اور درد کی کیفیت سے میری آنکھیں بھر آئیں، میں امی کے قدموں میں بیٹھ گیا اور ہاتھ جوڑ کر کہا۔

"امی جان! ایسا مت کریں میں آپ کا بیٹا ہوں، میرا مان مت توڑیں۔ رابی میرا واحد اور جان سے عزیز دوست ہے۔ اس کی ماں اس دنیا میں نہیں رہی۔ وہ ماں کی محبت کا ترسا ہوا ہے۔ آپ اسے بیٹا سمجھ کر ماں کا پیار دے دیں۔ ماں کا دل تو سمندر ہوتا ہے، ماں تو سراپا محبت ہوتی ہے اور محبت میں کوئی غیر نہیں ہوتا۔ آج رابی پہلی بار ہمارے گھر آیا ہے۔ پلیز، امی جان! صرف آج کا دن اسے ماں بن کر خوش آمدید کہیں، ایسا کرنے سے میرے من کو چین مل جائے گا۔"

"نہیں شکیل! میں ایسا نہ کر پاؤں گی، میں کھانا پکا دیتی ہوں۔ تم اسے کھانا کھلاؤ اور فارغ کر دو۔" امی کے لہجے میں بدستور سختی تھی۔

"امی جان! اتنی کٹھور نہ بنیں۔ کیا میں آپ کو عزیز نہیں ہوں؟" میں نے التجائیہ لہجے میں کہا۔

"تمہیں تو دیکھ کر میں جیتی ہوں۔"

"پھر بھی میری خواہش کی تکمیل نہیں کر سکتیں؟"

"یہ خواہش نہیں، تمہاری ضد ہے۔" یہ کہہ کر وہ پھر سے کھانا بنانے لگیں۔

"ٹھیک ہے، امی جان! اگر آپ میرے دوستوں سے اچھا سلوک نہیں کر سکتیں تو میں بھی اس گھر میں نہیں رہوں گا، میں کل یہ گھر چھوڑ کر چلا جاؤں گا۔" میں نے بالآخر دھمکی آمیز رویہ اختیار کر لیا۔

"کہاں جاؤ گے؟" امی غصہ سے بولیں۔

"رابی کے ساتھ، اس کے گھر۔"

میری دھمکی کام کر گئی، امی نے ہتھیار ڈال دیئے اور کہنے لگیں۔

"پہلے تم لوگ کھانا کھالو پھر میں تمہارے رابی سے مل لوں گی۔"

میں نے امی کا شکریہ ادا کیا اور خوشی خوشی ڈرائنگ روم میں آ گیا۔ کچھ ہی دیر میں کھانا تیار ہو گیا۔ ہم تینوں نے مل کر ڈرائنگ روم میں ہی کھانا کھایا۔ کھانے کے بعد ابا جان اٹھ کر چلے گئے، میں خود ہی برتن اٹھا کر کچن میں لے گیا۔ پھر میں نے امی کو ساتھ چلنے کو کہا تو وہ میرے ساتھ ڈرائنگ روم میں آ گئیں۔ رابی نے ان کو دیکھا تو اٹھ کر سلام کر کے ان کی شفقت پانے آگے بڑھا تو امی پیچھے ہٹ گئیں۔ انہوں نے رک کے سلام کا جواب دیا اور اس کے علاوہ رابی سے کوئی بات نہیں کی۔ وہ نظریں جھکائے کھڑا تھا کہ جب امی بیٹھ جائیں گی تو پھر وہ بھی بیٹھے گا۔ مگر ابھی مشکل سے دو منٹ گزرے ہوں گے کہ وہ بغیر کوئی بات کیے واپس لوٹ گئیں۔ امی کے اس رویہ نے مجھے رابی کے سامنے نادم کر دیا۔ رابی نے ایک ٹھنڈی سی آہ بھری اور کرسی پر بیٹھ گیا۔ میں نے دیکھا کہ اس کی جاگتی آنکھوں میں بلا کی ویرانیاں پھیل گئی تھیں، ایک عجیب سی وحشت ان میں جھانکنے لگی تھی۔

وہ لمحے میرے لیے بھی بڑے ہی اذیت ناک بن گئے۔ ایک بے رحم سچائی پوری حشر سامانیوں کے ساتھ سامنے آگئی تھی۔ میں رابی سے نظریں چرانے لگا کیونکہ میرے دل میں بھی انگارے دہک اٹھے تھے۔ رابی کی آنکھوں کی گہرائی میں تلاطم بپا تھا جو اس کی پلکوں کے کناروں پر تھرتھرانے کو بے تاب ہو رہے تھے۔ یوں لگ رہا تھا جیسے وہ اس دنیا میں اکیلا ہو، اس کا کوئی غم گسار نہ ہو اور وہ تنہا اپنی تقدیر پر ماتم کناں ہو۔ میرے دیکھتے ہی دیکھتے اس کے آنسو پلکوں کے کناروں کے بند توڑ کر بہہ نکلے۔ وہ اٹھا اور آگے بڑھ کر میرے گلے سے لگ گیا، خود میری آنکھیں بھی ساون بھادوں بن گئیں۔ میں اس سے بہت کچھ کہنا چاہتا تھا، اسے اپنا دل چیر کے دکھانا چاہتا تھا مگر زبان میرا ساتھ نہ دے رہی تھی۔ اس نے بھی کچھ نہ کہا۔ کوئی گلا نہ کیا، زبان نہ کھولی بس آنکھوں ہی آنکھوں میں اس نے مجھ سے اجازت مانگی اور ڈرائنگ روم کا دروازہ کھول کر باہر نکل گیا۔ میں اسے روک بھی نہ سکا۔ میں اسے بھلا کیسے روک سکتا تھا؟ اس کے نازک احساسات، محبتوں سے لبریز من کو میں نے ہی تو مجروح کیا تھا۔ میرے گھر ہی سے اسے خالی ہاتھ واپس جانا پڑا تھا۔ میں کرسی پر ڈھے کر سسکنے لگا۔ ابا جان نے آکر مجھے تسلیاں دی اور اپنے کمرے میں لے گئے۔ امی جان نے مجھ سے کوئی بات نہ کی، وہ جو کچھ چاہتی تھیں ہو گیا۔ رابی مجھ سے ناراض ہو کر چلا گیا تھا۔

......☆☆☆......

دو دن بعد میں اس کے دفتر اس سے ملنے گیا تو اس خبر نے مجھے چونکا دیا کہ رابی نے سروس چھوڑ دی ہے، اس نے استعفیٰ دے دیا تھا۔ میرا رخ اب اس کے گھر کی طرف تھا۔ مجھے اس سے اس اقدام کی توقع نہ تھی۔ میں اس کے گھر پہنچا تو وہاں تالا لگا ہوا تھا۔ پڑوس والوں سے معلوم ہوا کہ وہ اور اس کی بہن حیدر آباد چلے گئے ہیں جہاں اس کا بہنوئی ملازمت کرتا تھا۔ مجھے وہاں کا ایڈریس معلوم نہ تھا۔ رابی کو یہی کرنا چاہئے تھا۔ دل دکھانے والوں کے شہر میں اسے رہنے کی ضرورت ہی نہ تھی۔ دکھ کے مارے میری آنکھوں میں آنسو آگئے، مجھے یہ یقین تھا کہ وہ مجھ سے ناراض ہو کر گیا ہے۔ اسے میرے گھر والوں سے جس ہمدردی اور خلوص کی توقع تھی وہ اسے نہ ملا تھا۔ وہ یہ شہر چھوڑ کر جانے میں حق بجانب تھا۔ میں پریشان اور بے بس سا ہو کر گھر لوٹ آیا مگر مجھے کسی پل بھی چین نہ تھا۔ میں نے امی سے جی بھر کر لڑائی کی اور ان کو ہی رابی کے چلے جانے کا ذمہ دار قرار دیا۔ میں نے امی سے کہا تھا کہ رابی چلا تو گیا ہے مگر میرے دل کے صفحہ پر اب بھی جا بجا اس کا نام لکھا ہے۔ میں اسے کبھی بھی نہ بھول پاؤں گا، میں دوستی کے اس امتحان میں پورا اتروں گا۔

......☆☆☆......

مجھے نہ دن کو چین تھا، نہ رات کو سکون تھا۔ رابی کے بعد میں اپنے آپ کو ادھورا محسوس کر رہا تھا۔ یوں ہی ایک ہفتہ گزر گیا۔ میرا کسی کام میں بھی جی نہ لگتا تھا، دفتر میں بھی اور گھر میں بھی میں کسی سے زیادہ بات نہ کرتا، رابی کے بغیر میری دنیا اندھیر ہو گئی تھی۔ پھر ایک روز یوں ہوا کہ جیسے گلشن میں چپکے سے بہار آگئی ہو، اندھیری رات میں اچانک بادلوں کی اوٹ سے چاند نمودار ہو گیا ہو۔ وہ خوشبو بن کر میرے انگ انگ میں سما گیا۔ رابی کا خط میرے نام آیا اور میرے وجود کو پیار کی مدھر خوشبو سے مہکا گیا۔ اس نے لکھا تھا۔

"پیارے دوست! معذرت چاہتا ہوں کہ میں تمہیں بتائے اور ملے بغیر آگیا۔ میں تم سے ناراض نہیں ہوں۔ یقین جانو، تم مجھے اس دنیا کی ہر چیز سے زیادہ عزیز ہو۔ مجھے تمہاری دوستی پر فخر ہے اور تمام عمر

رہے گا۔ جب سے میری ماں اوراس دنیا سے گئی ہے تب سے میں بے سکون اور بے آرام ہو گیا ہوں۔ اگر تم اور باجی نہ ہوتے تو میں زندگی ہار گیا ہوتا۔ تم نے تو کبھی نہیں بتایا مگر میں تمہاری کیفیت سے پوری طرح آگاہ ہوں۔ اس دنیا کے ہر انسان کی اپنی اپنی طبیعت ہوتی ہے، میں جانتا ہوں کہ تمہاری امی کو میری اور تمہاری دوستی پسند نہیں ہے۔ اس کی وجہ صرف یہ ہے کہ میں عیسائی مذہب کا پیروکار ہوں مگر ماں تو سب کی اور سب کے لیے ایک جیسی ہوتی ہے۔ میں تمہاری ماں کو اپنی ماں سمجھتا ہوں، ان کا احترام کرتا ہوں اور تمام عمر کرتا رہوں گا۔ وہ دن جلد آئے گا کہ تمہاری ماں مجھے بیٹا کہہ کر سینے سے لگالیں گی کیونکہ ماں کا روپ تو شفقت کا روپ ہوتا ہے۔ اس عظیم ہستی کو بنانے کے لیے خالق دو جہاں نے ایک بہت ہی بڑی صراحی لی ہوگی اس میں لازوال محبت کا عرق ڈالا ہوگا پھر اس عرق میں ایثار کی خوشبو، نیکی کے پھول، خوش اخلاقی کا ذائقہ، عبادت کا نور اور خلوص بے کراں کی ٹھنڈک ڈالی ہوگی۔ عفوو در گزر کے پھولوں سے اس صراحی کو سجایا ہوگا پھر اسے انسانی پیکر میں ڈھال کر دنیا میں اتارا ہوگا تو بھلا میں ایسی عظیم ہستی کی محبت سے کیوں محروم رہوں گا؟ تم کو یہ جان کر خوشی ہوگی اور یہ خبر ماں جی کو بھی سنا دو کہ میں اپنے خاندان کی مخالفت کے باوجود مسلمان ہو گیا ہوں کیونکہ مجھے تمہاری دوستی اور ماں جی کی محبت سے بڑھ کر پیاری ہے۔ میں نے یہ فیصلہ بہت عرصہ قبل ہی کر لیا تھا اور اسلام کے ارکان و فرائض سے واقفیت حاصل کر لی تھی۔ ایمان کی طاقت بہت بڑی طاقت ہوتی ہے۔ اسی ایمان کی قسم کہ مجھے مذہب اسلام پر ناز ہے، یہ مذہب دلوں کو مسخر کرنے والا مذہب ہے۔ میں جلد ہی واپس تمہارے شہر لوٹ کر آرہا ہوں۔ اب میں وہاں ہی رہوں گا تمہارے سنگ۔ اب دنیا کی کوئی طاقت ہماری دوستی کی راہ میں دیوار نہ بنے گی۔ تمہارا رابیل۔''

رابی کا خط پڑھ کر خوشی سے میری آنکھیں بھر آئیں، میری سونی زندگی میں جیسے بہار آگئی، میں جو اکیلا اور ادھورا رہ گیا تھا، رابی کے خط نے میری تکمیل کر دی۔ میں سیدھا امی پاس پہنچا اور وہ خط پڑھنے کے لیے دے دیا۔ امی نے بڑے غور سے رابی کا خط پڑھا۔ خط پڑھ کر ان کے چہرے پر خوشیوں کا میلہ سا لگ گیا، وہ اٹھیں اور دو نفل شکرانے کے پڑھنے کے بعد سجدہ میں گر گئیں۔ وہ رابی کے مسلمان ہونے پر اللہ کا شکر ادا کرنے لگیں اور پھر مجھے مبارک باد دے کر کہنے لگیں۔

''رابی کا نام رابیل مجھے پسند آیا ہے، تم سے ملتا جلتا ہے۔ آج سے رابیل مجھے تمہاری طرح عزیز ہے۔ میں تم میں اور اس میں کوئی فرق روا نہیں رکھوں گی۔ میں نے تمہارا اور رابیل کا بہت دل دکھایا مگر اب میں ماضی کی ہر زیادتی کی تلافی کر دوں گی، آج میری ایک خواہش کی تکمیل ہو گئی ہے۔ تم سوچتے ہو گے کہ میں تمہارے عیسائی دوست سے کیوں نفرت کرتی تھیں مگر تم نے مجھ سے کبھی اس کی وجہ نہیں پوچھی۔ اس کی وجہ میرے علاوہ کم لوگوں کو معلوم ہے حتیٰ کہ تمہارے باپ کو بھی اس کی خبر نہیں ہے۔ آج میں تمہیں اس کی وجہ بتا رہی ہوں۔ بچپن میں یاسمین میری بہت ہی پیاری سہیلی تھی، ہم کلاس فیلو بھی تھیں۔ ہر جگہ ہماری دوستی کے چرچے تھے۔ یاسمین ذہین ہونے کے ساتھ ساتھ حسن میں بھی اپنا ثانی نہ رکھتی تھی پھر بھی نہ جانے اسے کیا ہوا کہ وہ ایک عیسائی لڑکے کی محبت میں گرفتار ہو گئی۔ میں نے اسے منع کیا، لاکھ سمجھایا مگر اس پر محبت کا بھوت سوار تھا کہ اسے جیکسن کے علاوہ اور کچھ نظر نہ آتا تھا۔ کاش! جیکسن، یاسمین کی خاطر مسلمان ہو گیا ہوتا مگر ایسا نہ ہوا۔ یاسمین، جیکسن کی محبت میں اتنی دور نکل گئی کہ وہ اس کی ہم مذہب بن کر اس کی بیوی بن گئی

پھر اس نے ملک چھوڑ دیا اور جیکسن کے ساتھ امریکہ چلی گئی۔ اب معلوم نہیں وہ کس حال میں ہے۔ مجھے اس روز سے نہ صرف یاسمین بلکہ ہر عیسائی سے نفرت ہوگئی۔ یاسمین کا باپ اس کے غم کو سینے سے لگا کر مر گیا اور ماں پاگل ہوگئی۔ یہی وجہ ہے کہ میں تمہارے اس دوست رابنسن سے نفرت کرتی تھی، میری یہ خواہش تھی کہ میں کسی عیسائی کو اسلام کے دائرہ میں داخل کروں تو تب ہی مجھے چین آئے گا اور آج میری اس خواہش کی تکمیل ہوگئی ہے، اوپر والے نے میری یہ خواہش پوری کردی ہے۔ رابنسن کے مسلمان ہونے سے میرے اندر لگی ہوئی وہ آگ سرد پڑ گئی ہے جو یاسمین نے لگائی تھی۔"

......☆☆☆......

رابیل آیا تو امی نے سگی ماں کی طرح اس کا استقبال کیا۔ اب وہ ہمارے گھر کا فرد بن گیا، اسے پھر سے اسی ادارہ میں ملازمت مل گئی۔ اس نے اپنا آبائی مکان فروخت کر ڈالا اور ہمارے نزدیکی محلّہ میں مکان خرید لیا۔ اب وہ اکثر ہمارے گھر آجاتا۔ امی اس کی ہر ضرورت کا خیال رکھنے لگیں۔ پھر امی نے ہی اس کے لیے لڑکی پسند کی۔ رابیل کی بارات ہمارے گھر سے ہی روانہ ہوئی اور دلہن لے کر وہ اپنے گھر چلا گیا۔ امی نے اور میں نے جی بھر کر رابیل کی شادی پر خوشی منائی، میری بہنوں نے اپنے ارمان پورے کیے۔ کچھ عرصہ بعد میری بھی شادی ہوگئی۔ رابیل اور شازیہ بھابی نے میری شادی پر اپنے ارمان پورے کیے اور جی بھر کر دولت لٹائی، خوشیاں منائیں۔ اب ہر طرف سکھ ہی سکھ اور خوشیاں ہی خوشیاں تھیں۔ ہماری دوستی کا درخت دن بدن گھنا اور مضبوط تر ہوتا جارہا تھا۔

یوں ہی سات سال کا عرصہ بیت گیا۔ ہم بچوں والے ہوگئے امی اور ابا، دونوں ہی زندگی سے ناتا توڑ گئے۔ مصروفیات اور ذمہ داریاں بڑھ گئیں مگر ہماری دوستی میں فرق نہ آیا۔ ہم اب بھی ایک دوسرے کو اسی طرح ملتے تھے، ایک دوسرے کے دکھ درد بانٹتے تھے۔ اب کوئی غم، کوئی دکھ اور پچھتاوا نہ تھا۔ زندگی پرسکون گزر رہی تھی کہ اچانک زندگی کے پرسکون تالاب میں ایک پتھر آن پڑا اور زندگی کا نظام درہم برہم ہوگیا۔

رابیل بیمار ہوگیا، پیٹ درد کی وہ تکلیف جو اسے کالج کے زمانہ میں ہوتی تھی وہ دوبارہ شروع ہوگئی۔ پہلے تو اس کے پیٹ میں ہلکا درد شروع ہوا جس کی طرف اس نے خاص توجہ نہ دی، پیٹ درد کی گولیاں کیمسٹ سے لے کر کھالیں۔ مجھے علم ہوا تو میں اسے سول اسپتال لے گیا جہاں اس کے کئی ٹیسٹ لیے گئے مگر مرض کی تشخیص نہ ہوسکی کیونکہ تمام ٹیسٹ نارمل تھے مگر اس کے باوجود درد کی شدت میں کمی نہیں آرہی تھی۔ کسی نے ایک پرائیوٹ اسپتال کے بارے میں بتایا کہ وہاں کا ڈاکٹر نہایت ہی قابل ہے، اس کے ہاتھوں میں قدرت نے شفا دے رکھی ہے۔ میں رابیل کو وہاں

پشیمانی

پشیمانی عقل و خرد سے عاری لوگوں کے لیے ایک سزا ہے جو اپنے کاموں میں پہلے عقل و خرد کو داخل کرتے اور جب دوزخ کے در وا ہوئے ہیں تو پشیمانی انہیں گھیر لیتی ہے۔ پشیمانی جلتے ہوئے چراغ کے اس دھویں کی مانند ہے جو چراغ کے جلنے میں معاون نہیں ہوتا بلکہ اس فاسد مادے کی طرح ہے جو محض دھواں بنا کر فضا میں اڑ جاتا ہے۔ پشیمانی سے بچو کہ یہ عقل و خرد کی دشمن ہے اور بن بلائے رات کی تاریکیوں میں آتی ہے اور تمہاری راتیں بے نور آنکھوں کی طرح رہ جاتی ہیں۔

عبدالرحمان......کراچی

لے گیا۔ وقتی طور اس کے علاج سے آرام آ گیا، چند روز بعد دوبارہ تکلیف شروع ہو گئی۔ پھر وہ سرکاری اسپتال میں داخل رہا مگر وہاں بھی شفا نہ ملی۔ کسی لمحہ تو یوں لگتا کہ جیسے رابیل کو کوئی تکلیف نہیں ہے، وہ نارمل اور تندرست ہے مگر اچانک جب درد کی لہر اٹھتی تو وہ بے حال ہو جاتا، درد کی شدت سے وہ رونے لگتا۔ ڈاکٹروں اور حکیموں سے مایوس ہو کر ہم نے درباروں، پیروں اور فقیروں کا رخ کیا۔ درباروں اور مزاروں پر گئے، ہر طرح کی منتیں مانیں مگر سکھ اور چین رابیل سے روٹھ گیا۔ اس کی تکلیف کی کسی کو سمجھ ہی نہ آ رہی تھی۔ ہر ڈاکٹر، حکیم اور عامل نئی بیماری بتاتا۔ کوئی تبخیر کہتا، کوئی معدے کا السر، کوئی کینسر اور کوئی گیس بتاتا۔ ہر کوئی دعوے سے علاج شروع کرتا مگر ناکام رہتا۔ رابیل نے جو کچھ سروس کے دوران بچایا تھا وہ اس کے علاج پر خرچ ہونے لگا۔ دن بدن اس کا جسم کمزور ہوتا جا رہا تھا۔ ادھر جمع شدہ پونجی بھی ختم ہو گئی تو اس کی بیوی نے ملازمت کر لی۔ میں بھی حسب توفیق اس کی مدد کر رہا تھا۔ میں ہر دن اس کی صحت یابی کے لیے دعا گو تھا۔ میں نے رابیل کی خاطر اپنا سکھ اور چین قربان کر ڈالا۔ دفتر سے چھٹی کے بعد میرا زیادہ وقت رابیل کے ساتھ ہی گزرتا۔ جو کوئی کسی نئے حکیم یا ڈاکٹر کا بتاتا تھا، میں اسے کے پاس لے جاتا مگر اس کی بدقسمتی کی کوئی دوا بھی کارگر ثابت نہ ہو رہی تھی۔ لگتا تھا، رابیل چند دنوں کا مہمان ہے۔ دن بدن اس کی بھوک ختم ہوتی گئی۔ کھانا بھی برائے نام ہی رہ گیا۔ وہ کوئی چیز کھا ہی نہ سکتا تھا، کوئی چیز کھاتا تو اس کے پیٹ میں شدید درد اٹھتا، اسے قے ہوتی اور کھایا پیا سب کچھ باہر نکل آتا۔ رابیل کی بیوی بھی دن رات اس کی خدمت کرتی اور کبھی اف نہ کرتی۔ رابیل کے گھر میں اداسیوں، پریشانیوں نے ڈیرے ڈال لیے۔ رابیل کی صورت دیکھ کر وحشت سی ہونے لگتی۔ اس کے بچوں کی حالت بھی نہ دیکھی جاتی، یوں لگتا کہ جیسے وہ باپ کے ہوتے ہوئے بھی یتیم ہو گئے ہوں، مجھے ان پر ترس آتا، میں ان کو اپنے گھر لے آتا تو وہ میرے بچوں کے ساتھ مل کر کھیلتے اور یوں ان کے مرجھائے ہوئے چہروں پر خوشیاں لوٹ آتیں۔ دوستی نے مجھے ایک امتحان میں ڈال دیا تھا۔ رابیل اس بیماری اور زندگی سے اس قدر تنگ آ گیا تھا کہ کبھی کبھی وہ موت کی دعائیں مانگنے لگتا۔ میں ایسے لمحوں میں اسے دلاسہ دیتا، اس کی ڈھارس بندھاتا کہ اوپر والا اسے ضرور صحت یاب کرے گا مگر وہ زندگی سے مایوس ہو گیا تھا، جینے کی امنگ ختم ہو گئی تھی۔ وہ خاموش خاموش سا رہنے لگا تھا، بجھا بجھا اور افسردہ سا۔ اس کا گلاب جیسا چہرہ دیکھ کر یوں لگتا تھا جیسے کوئل سے کوک جدا کر دی گئی ہو۔

......☆☆☆......

اس روز میں نزدیکی شہر کے ایک حکیم سے رابیل کی دوا لے کر آیا تھا۔ میں نے لوگوں سے اس کی بہت تعریف سنی تھی۔ اس نے دوا دیتے وقت دعویٰ کیا تھا کہ اس سے رابیل کی معدہ کی تکلیف ختم ہو جائے گی اور کھانا بھی ہضم ہو جائے گا۔ میں اس کے گھر داخل ہوا تو پتہ چلا کہ بھابی بازار گئی ہیں، گھر میں رابیل اور بچے تھے۔ میں جب رابیل کے کمرہ میں داخل ہوا تو وہ کہنے لگا۔

''شکیل! دروازہ بند کر کے اندر سے کنڈی لگا دو۔''

''کیوں؟'' بے اختیار منہ سے نکلا۔

''میں نے تم سے کوئی ضروری بات کرنی ہے۔'' وہ کراہتے ہوئے بے کسی سے بولا۔

میں نے کنڈی لگا دی اور اس کے قریب آ کر بیٹھ گیا اور حسب معمول اس کا ہاتھ اپنے ہاتھوں میں لیتے ہوئے کہا۔

''بتاؤ، رابیل! کون سی ضروری بات کرنی ہے تم نے۔''

”شکیل! مجھے تمہاری دوستی پر فخر ہے اور رہے گا۔ میں جانتا ہوں کہ تم میری کوئی بھی خواہش رد نہ کرو گے۔ آج اس دوستی کے ناتے میں تم سے کچھ مانگ رہا ہوں۔ وعدہ کرو کہ جو کچھ میں مانگوں گا، لاکر دو گے۔“

”تم جان مانگو، رابیل! میں اف نہ کروں گا۔“ میں نے دعوی سے کہا۔ رابیل نے اپنا ہاتھ چھڑایا اور پھر دونوں ہاتھ میرے آگے جوڑتے ہوئے بولا۔

”شکیل! میں اس زندگی سے تنگ آ گیا ہوں۔ میں نہ زندوں میں ہوں اور نہ مردوں میں۔ میں موت کی دعائیں مانگ مانگ کر تھک گیا ہوں۔ تم...... کہیں سے مجھے زہر لا دو، میں اس زندگی کا خاتمہ کرنا چاہتا ہوں۔“

میری آنکھیں بھر آئیں۔ میں نے رابیل کے دونوں ہاتھ تھام کران پر اپنے ہونٹ رکھ دیئے۔

”یہ کس امتحان میں تم مجھے ڈال رہے ہو دوست؟ کیوں دوستی کا نام بدنام کرنے لگے ہو۔ نہیں، رابی! میں ایسا نہ کروں گا۔“ میں نے بھیگی آواز میں کہا۔

”تمہیں اپنی دوستی کی قسم، شکیل!“ وہ میری طرف حسرت بھری نگاہوں میں دیکھتے ہوئے بولا۔

”نہیں، دوست! میں ایسا ظلم نہ کرسکوں گا۔ تم مجھے اس طرح مت آزماؤ کہ ساری زندگی میں اپنے آپ سے شرمندہ رہوں۔ ویسے بھی مایوسی کفر ہوتی ہے، حوصلہ رکھو۔“ میں نے کہا۔

”اس سے بہتر ہے کہ آج سے دوستی ختم کر ڈالو۔“ رابیل کے الفاظ برچھی کی مانند میرے سینے میں اتر گئے۔ وہ اتنا بے درد بن جائے گا، میں نے کبھی سوچا بھی نہ تھا۔

”نہیں، رابیل! میں دوستی ختم نہیں کروں گا، میں اس آزمائش میں بھی پورا اتروں گا لیکن تمہارے بعد جو زندگی میں گزاروں وہ زندگی نہیں، جہنم کی آگ ہوگی جس میں مرتے دم تک جلتا رہوں گا۔ تمہاری بے کسی دیکھ کر میں یہ ظالمانہ قدم اٹھا رہا ہوں، تم نے مجھے عجیب امتحان میں ڈال دیا ہے۔“

رابیل کے آنسوؤں اور بے کسی نے مجھے مجبور کر ڈالا کہ میں اس کی خواہش کی تکمیل کر ڈالوں۔ میں اپنے گھر لوٹ آیا تو رات میں نے جاگتے ہوئے گزار دی۔ میں فیصلہ کی صلیب پر لٹکا رہا، صبح تک میں فیصلہ کر چکا تھا کہ میں دوستی کا بندھن ٹوٹنے نہ دوں گا۔ میں نے دفتر سے چھٹی کرلی اور اپنے ایک جاننے والے کی دوکان پر چلا گیا۔ وہ دیسی دوائیں فروخت بھی کرتا تھا مگر اس سے کوئی فائدہ نہ ہوا تھا۔ میں نے پھر اسے رابیل کی موجودہ حالت تفصیل سے بتائی کہ وہ زندگی اور موت کی کشمکش میں مبتلا ہے۔ میں اسی کے کہنے پر اس کے لیے کوئی زہر لینے آیا ہوں جو اس کی موت آسان کردے۔ تھوڑی سی پس وپیش کے بعد اس نے معقول رقم لے کر ایک ایسا زہر دیا جس میں نیلے تھوتھے کی آمیزش تھی۔ اس نے یہی بتایا کہ اس کی دو خوراکیں کھانے سے دو دن کے اندر اندر رابیل زندگی کی قید سے آزاد ہو جائے گا۔

......☆☆☆......

رابیل میرا ہی منتظر تھا۔ جب میں نے اسے بتایا کہ میں اس کے لیے زہر لے آیا ہوں تو اس کے چہرے پر اطمینان کی لہر دوڑ گئی۔ میں نے وہ پڑیا اس کے حوالے کی، استعمال کا طریقہ بتایا، اس کے ساتھ ہی میں رونے لگا۔ میں نے رابیل کے پاؤں پکڑ لیے اور اس سے معافی مانگتا رہا۔ میں نے رابیل سے الوداعی ملاقات کی اور اپنا سب کچھ لٹا کر اس کے گھر سے نکلا آیا۔ میں اپنے آپ سے نادم تھا کہ یہ میں نے کیا کر ڈالا ہے، میں اپنے ہی دوست کی زندگی ختم کرنے کا ذمہ دار بن گیا تھا۔

تمام رات میں نے سسکتے تڑپتے گزار دی، اگلا دن

بھی یہ منحوس خبر سننے کے انتظار میں گزر گیا کہ رابیل فوت ہوگیا ہے۔ وہ رات اور دن میری زندگی کے سب سے زیادہ تکلیف دہ لمحات بن کر گزرے مگر اب دوسری رات ان سے بھی بھاری بن کر گزر رہی تھی کیونکہ حکیم کے کہنے کے مطابق آج کی رات رابیل کی موت یقینی تھی۔ صبح کا سورج رابیل کی موت کی خبر کے ساتھ طلوع ہونا تھا۔ وہ رات سناٹوں سے لبریز، سوگوار، شرمساری گزرتی جارہی تھی۔ میری زندگی کے افق پر بدنصیبی کا سورج طلوع ہونے والا تھا جس کی ایک ایک کرن نے میرے زخمی وجود پر شعلے بن کر برسنا تھا۔ اس وقت یوں لگ رہا تھا کہ جیسے کسی نے میرے اردگرد دہکتے ہوئے انگارے ڈال دیئے ہوں۔ میرے اندر احساس ندامت اور پچھتاوے کی آگ بھڑک رہی تھی جس میں میرا وجود بری طرح جھلسنے لگا تھا، دکھ اور درد کی ملی جلی کیفیت نے میرے کرب میں اور بھی اضافہ کر ڈالا تھا۔ میری بیوی اور بچے جاگ گئے، ناشتہ کرنے کے بعد اسکول اور کالج چلے گئے مگر میں ابھی تک بستر پر پڑا تھا۔ میری بیوی نے ناشتہ کرنے کو کہا مگر میں نے اسے یہ کہہ کر ٹال دیا کہ آج میں نے دفتر سے چھٹی لے لی ہے، دیر سے ناشتہ کروں گا۔ وہ بار بار میری پریشانی اور دفتر سے چھٹی کرنے کی وجہ پوچھنے لگی مگر میں اسے مختلف حیلوں بہانوں سے ٹال رہا تھا۔ میں نے اسے بھی نہ بتایا تھا کہ میں دوستی کے ستون میں شگاف ڈال آیا ہوں۔ اتنے میں دروازے کی گھنٹی بجی جس کی آواز گولی کی مانند میرے سینے میں اتر گئی۔ میری بیوی نے جا کر دروازہ کھولا، چند لمحوں بعد وہ لوٹی اور بولی۔

''رابیل بھائی کا بیٹا جواد آیا ہے۔''

میرا دل تیزی سے دھڑکنے لگا کہ ابھی جواد، رابیل کی موت کی خبر سنائے گا۔ وہ یہی بتانے کے لیے آیا ہوگا۔ مجھے اپنے جسم سے جان نکلتی ہوئی محسوس ہونے

وحدانیت

لوگوں کی اکثر یہ رائے ہے کہ اللہ تعالیٰ ہماری دعائیں نہیں سنتا کیا کبھی ہم نے یہ غور کیا ہے کہ ہم دعائیں کیا مانگتے ہیں۔ ان کی نیت کیا ہوتی ہے کیا ہم کامل یقین سے دعائیں مانگتے ہیں۔ نہیں قطعی نہیں مانگتے اگر ہم دعا مانگ بھی رہے ہوتے ہیں تو اس میں ہماری بھلائی اور دوسرے کا نقصان ہوتا ہے۔ مثلاً اے اللہ! تو آج اتنی بارش دے کہ دل بھر جائے اس دعا سے ہمارا دل تو بھر جاتا ہے مگر دوسروں کا حال برا ہوتا ہے۔ دعا میں کاملیت نہیں ہوتی۔ اللہ مجھے فلاں چیز دے میں اس سے یہ وہ کردوں گا بھلا رب العزت کیسے وہ دعا قبول کرسکتا ہے جس میں ایک انسان کا بھلا ہورہا ہو اور دس کا نقصان۔ میرا ایمان ہے کہ جب بھی سچے دل سے نفع نقصان سوچ بغیر دعا مانگی جائے قبول ہوتی ہے۔ کہتے ہیں انسان سخت مشکل میں ہو تو اگر وہ کوئی دعا مانگے تو وہ قبول ہوجاتی ہے۔ اس وقت کی دعا کسی بھی نفع نقصان سے پاک ہوکر دل میں ایمان پختہ رکھ کر قبول ہونے کے یقین سے مانگی جاتی ہے اور قبول ہوتی ہے۔

حنا ناز..... پنڈدادن خان

لگی، یوں لگ رہا تھا کہ رابیل کی موت کی خبر سن کر میں بھی زندہ نہ رہوں گا، میری روح بھی اس کی ہم سفر ہو جائے گی اور یہی دوستی کی معراج ہوگی۔ اتنے میں جواد میرے کمرے میں آ گیا۔

''آؤ بیٹا! خیریت تو ہے نا؟'' میں نے لرزتے ہونٹوں سے پوچھا۔

''جی انکل! خیریت ہے۔ ابو نے آپ کو بلوایا ہے۔''

''کیسے ہیں تمہارے ابو؟'' میں نے بے تابی سے

پوچھا۔

"پہلے سے کافی ٹھیک ہیں۔ کل رات انہوں نے کھانا جی بھر کر کھایا تھا، نہ ہی درد ہوا اور نہ ہی قے ہوئی۔ آج صبح بھی انہوں نے سیر ہو کر ناشتہ کیا ہے۔" اس نے مسکراتے ہوئے بتایا۔

"سچ کہہ رہے ہو، بیٹا؟" میں نے بستر چھوڑتے ہوئے پوچھا۔

"جی، انکل! ابو کی صحت پہلے سے کافی بہتر ہو گئی ہے، اس لیے تو آپ کو بلایا ہے۔"

جواد کی باتوں پر مجھے یقین نہ آیا تھا۔ رابیل کی صحت کی بہتری کی خبر سن کر میری آنکھیں بھر آئیں، میں تو اس کی موت کی خبر سننے کا منتظر تھا مگر اوپر والے نے اس کی زندگی لمبی کر دی تھی۔ مارے خوشی کے میرا تمام وجود کانپنے لگا۔ میں نے نہ کپڑے بدلے، نہ ناشتہ کیا اور جواد کے ہمراہ اس کے گھر روانہ ہو گیا۔ رابیل کے کمرے میں داخل ہوا تو اس کی حالت دیکھ کر جواد کی باتوں پر یقین ہو گیا۔ رابیل واقعی زندگی کی طرف لوٹ آیا تھا۔ میں نے آگے بڑھ کر رابیل کو بازوؤں میں لیا اور اس کی پیشانی چومی اور اس کے ساتھ ہی ہم دونوں رو پڑے ہم دیر تک ایک دوسرے کے گلے مل کر روتے رہے۔ ہمارے وہ آنسو خوشی اور مسرت کے آنسو تھے۔

"یہ کیا معجزہ ہو گیا، میرے دوست؟" میں نے رابیل سے علیحدہ ہو کر پوچھا۔

تمہاری محبت اور خلوص سے کھلایا ہوا زہر تریاق بن گیا۔ یہ تمہاری محبت اور دوستی کا معجزہ ہی نہیں بلکہ اس مذہب کا بھی معجزہ ہے جو دلوں کو مسخر کرتا ہے، جو آگ میں پھول کھلاتا ہے۔ میں نے اسلام صرف ایک ہستی یعنی تمہارے لیے قبول نہیں کیا تھا بلکہ اس مالک حقیقی کے لیے اپنایا تھا جو اس کائنات کا پالن ہار ہے، اسی نے مجھے زندگی دی ہے۔"

رابیل کے لہجے میں زمانے بھر کی خوشیاں سمٹ آئی تھیں۔ میں بھی قدرت کے اس کرشمہ پر حیران تھا اور خوشی بھی کہ پروردگار نے میری اور رابیل کی دوستی کا بھرم رکھ لیا ہے۔ میں اپنے پالن ہار کا شکر گزار تھا، میرے اندر بھی خوشیوں کی برسات ہونے لگی۔ میں جو ندامت اور پچھتاوؤں کی آگ میں جل رہا تھا، خزاؤں میں گھر گیا تھا، اب یک لخت پھولوں سے مہکتے ہوئے چمن میں آ گیا۔ سارے موسم دل کے تابع ہوتے ہیں۔ اگر دل خوش ہے تو جون جولائی کی گرمی و پے میں ٹھنڈک کا احساس بن جاتی ہے ورنہ ساون کی بوندیں بھی دل و جان کو جلا کر راکھ کر دیتی ہیں۔ میرا دیا ہوا زہر رابیل کے لیے تریاق بن گیا، اس کی معدہ کی تکلیف ختم ہو گئی۔ گزرتے دنوں کے ساتھ ساتھ اس کی صحت بھی بہتر ہونے لگی۔ دو ماہ کے بعد وہ مکمل طور پر صحت یاب ہو گیا۔ اس نے پھر سے ملازمت کر لی، خوشیاں اور مسکراہٹیں پھر سے لوٹ آئیں۔ میں دوستی کے امتحان میں سرخرو ہو گیا۔

......☆☆☆......

برسوں بیت گئے ہیں۔ ہم دونوں بوڑھے ہو گئے ہیں۔ ہماری اولاد شادی شدہ اور بچوں والی ہو گئی ہے مگر ہماری دوستی اب بھی برقرار ہے۔ ہم جب تک ایک دوسرے سے دن میں ایک بار مل نہ لیں، ہمیں چین نہیں آتا۔ صبح اب بھی ہوتی ہے، چاند اب بھی نکلتا ہے، شفق اب بھی پھوٹتی ہے، ستارے اب بھی ٹمٹماتے ہیں، آبشاروں کی آواز اب بھی کانوں میں رس گھولتی ہے، کوئل اب بھی کوکتی ہے اور بالکل اس طرح ہماری دوستی بھی جوں کی توں ہے اور مرتے دم تک رہے گی۔

آتش انتقام

خلیل جبار

آگ کا کام جلانا ہے' خواہ وہ آتش جنوں ہو' آتش عشق ہو یا آتش انتقام ہو۔ آتش انتقام وہ آگ جو بظاہر نظر نہیں آتی مگر اندر ہی اندر روح کو جھلساتی رہتی ہے۔ اس وقت تک جب جذبہ جنوں منزل تک پہنچ کر شانت نہیں ہوجاتا۔
اک حسن بے بس کا فسانہ'وہ اپنی عزت کی پامالی کا انتقام لینا چاہتی تھی۔

آپریشن تھیٹر میں اسپتال کا عملہ تقریباً پورا موجود تھا' گیس کا سلنڈر ہونے کے باوجود دوسرے سلنڈر کا بھی بندوبست کرلیا گیا تھا۔ سیٹھ اختر علی انتہائی تکلیف کی حالت میں تھے' آج وہ اپنا پستول صاف کررہے تھے کہ اس کے اندر پھنسی ہوئی گولی چل گئی اور اُن کی ابھری ہوئی توند کے اندر داخل ہوگئی تھی۔ گولی لگتے ہی خون کا فوارہ پھوٹ پڑا تھا انہیں فوری طور پر اسپتال میں ایڈمٹ کردیا تھا۔ سیٹھ اختر علی کسی بھی قسم کا رسک لینا نہیں چاہتے تھے' اس لیے ڈاکٹر ندیم کو بلالیا گیا تھا' ڈاکٹر ندیم اپنے کام کا بہت ماہر تھا آج تک اس کا ایک بھی آپریشن ناکام نہیں ہوا تھا۔ اس لیے سیٹھ اختر علی کو ان پر اعتماد تھا اور انہوں نے خصوصی طور پر اپنے عملے کو ہدایت کی تھی کہ اس کا آپریشن صرف ڈاکٹر ندیم ہی کرے گا جب ڈاکٹر ندیم اسپتال پہنچا تو سیٹھ اختر علی کو اطمینان ہوگیا تھا کہ اس کا خیر خیریت سے آپریشن ہوجائے گا۔

سیٹھ اختر علی کا بہت بڑا بزنس تھا' ملازمین کی تنخواہیں بھی بہت زیادہ تھیں اس لیے جو اُن کے آفس میں ملازم ہوجاتا تھا پھر وہ کہیں اور ملازمت کا سوچ بھی نہیں سکتا تھا۔ سیٹھ اختر علی میں جہاں بے شمار خوبیاں تھیں وہیں ان میں ایک خراب عادت بھی تھی اور وہ بہت ہی عیاش طبیعت کا مالک تھا۔ چھ ماہ گزرنے پر اس کا اپنی سیکرٹری سے دل بھر جاتا اور پھر ان کے لیے دوسری سیکرٹری کا انتظام کرنا پڑتا تھا' کوئی سیکرٹری ایسی نہ تھی جو اس کے بیڈ کی زینت نہ بنی ہو۔

نزہت کا تعلق ایک غریب گھرانے سے تھا اس کے گھرانے میں دولت سے زیادہ عزت کو اہمیت دی جاتی تھی۔ نزہت ڈاکٹر بننا چاہتی تھی مگر اس کے والد الطاف فالج کا اٹیک ہونے پر وہ معذور ہوگئے تھے' گھر میں کوئی بڑا بھی نہیں تھا جو گھر کا سہارا بنتا۔ ایسے میں نزہت نے ڈاکٹر بننے کے خواب کو خیرباد کہہ کر گھر کی ذمہ داری اٹھانے کا فیصلہ کرلیا تھا۔ نوکری کی مخالفت کے باوجود اس نے نوکری حاصل کرنے کو مختلف دفاتر میں درخواستیں دے دیں' وہ خوب صورت و ذہین تھی۔ سیٹھ اختر علی نے اسے دیکھتے ہی سیکرٹری رکھنے کا فیصلہ کرلیا تھا' ٹائپسٹ کو فوری حکم دیا کہ وہ نزہت کا اپائمنٹ لیٹر تیار کرکے دوسرے دن دفتر آنے کا حکم دے۔ نزہت بھی حیران ہوگئی تھی کہ وہ نوکری کے معاملے میں اس قدر لکی ہے کہ پہلے ہی انٹرویو میں اسے نوکری مل گئی جب سیٹھ اختر علی نے اسے اپنے بستر پر لے جانے کے لیے مختلف حربے استعمال کرنا شروع کیے اس وقت اُسے احساس ہوا کہ یہ نوکری اس کے حسن سے متاثر ہوکر دی گئی ہے۔ وہ مجبور تھی گھر کا خرچ چلانے کے لیے نوکری کی ضرورت تھی' کہیں اور جاتی وہاں بھی اس سے ملتا جلتا ماحول ملتا۔

نزہت سیٹھ اختر علی کے اشارے سمجھتے ہوئے بھی انجان بن جاتی تھی جب سیٹھ اختر علی نے محسوس کیا کہ وہ اس کے قابو نہیں آرہی تو لالچ دے کر قابو کرنے کا فیصلہ

گیا۔ جوایسا حربہ تھا جولڑکی قانونی پابندی آپڑی تھی وہ پکے ہوئے پھل کی طرح جھولی میں آ گرتی تھی نزہت اس کے کمرے میں جب فائل دینے آئی اس نے اسے اٹھالیا۔

''نزہت! تمہارے والد کی طبیعت کیسی ہے؟''

''سر ہم اپنے وسائل کے مطابق ان کا علاج کرا رہے ہیں پہلے سے طبیعت بہتر ہے۔'' نزہت نے بتایا۔

''تمہیں یہ جان کر خوشی ہوگی کہ ہمارے آفس میں ملازمین کے لواحقین کی فلاح و بہبود کے لیے فنڈ ہوتا ہے میں نے فیصلہ کیا ہے کہ اس فنڈ سے تمہارے والد کا علاج کرایا جائے تاکہ وہ جلد سے جلد صحت یاب ہوجائیں۔'' سیٹھ اختر علی نے اس کی آنکھوں میں جھانکتے ہوئے کہا۔

''سر ایسا ہوجائے تو بہت اچھا ہوگا۔'' وہ خوش ہوتے ہوئے بولی۔

''جب تک تمہارے والد صحت یاب نہیں ہوجاتے میں نے سوچا ہے کہ تمہارے چھوٹے بہن بھائیوں کا خرچ آفس اٹھائے گا۔'' وہ کرسی سے اٹھتے ہوئے نزہت کے قریب آیا۔

وہ بظاہر کرسی پر بیٹھی ہوئی تھی لیکن سیٹھ اختر علی کی حرکات پر نظر رکھے ہوئے تھی۔

''میں تمہارا بہت خیال رکھنا چاہتا ہوں بس تم میرا خیال رکھو پھر دیکھو میں تمہارے لیے کیا کرتا ہوں۔'' یہ کہتے ہوئے اس نے اپنے دونوں ہاتھ نزہت کے کاندھوں پر رکھ دیئے۔

''سر یہ کرسی نہیں میرے کاندھے ہیں۔'' نزہت نے سخت لہجے میں کہا۔

''ارے بھئی تم ناراض کیوں ہو رہی ہو دوستی میں سب چلتا ہے۔''

''سر میں یہاں دوستی کرنے نہیں نوکری کرنے آتی ہوں۔''

''نزہت! تم ایک بار مجھ سے دوستی کرکے دیکھو پھر......''

''سر میں جس گھرانے سے تعلق رکھتی ہوں وہاں دولت سے زیادہ عزت کو اہمیت دی جاتی ہے۔ عزت کی خاطر لڑکیاں اپنی جان تک دے دیتی ہیں اور میں انہی لڑکیوں میں سے ایک ہوں۔''

''میں تمہاری بھلائی کا سوچ رہا ہوں اور تم ہو کہ چھوٹی سی قربانی نہیں دے سکتیں۔ بہرحال مجھے جلدی نہیں ہے تم اچھی طرح سے سوچ لو میں تمہاری توقع سے زیادہ تمہیں خوش کردوں گا۔'' سیٹھ اختر علی نے کہا۔

نزہت اس کا جواب دیئے بغیر خاموشی سے اٹھ کر باہر چلی گی وہ اسے جاتا دیکھتا رہ گیا۔ سیٹھ اختر علی کے لیے یہ تجربہ نیا نہیں تھا' کبھی لڑکیاں کچھ دن سوچ کر اس کی خواہش پوری کرنے کو تیار ہوجاتی تھیں اور اگر کوئی تیار نہ ہوتو پھر وہ دوسرا طریقہ زبردستی والا اپناتا تھا۔ پولیس کی مٹھی گرم کردینے پر اس پر کوئی مقدمہ نہیں بن پاتا تھا اور پھر وہ لڑکی اس کے اشارے پر چلنے پر مجبور ہوجاتی تھی۔ نزہت کے انکار پر بھی وہ مطمئن تھا کہ اس کے معاشی حالات وقت سے سمجھوتا کرنے پر مجبور کردیں گے۔ نزہت حالات کا مردانہ وار مقابلہ کرنا چاہتی تھی اس لیے اس نے سیٹھ اختر علی کی پیش کش کو ٹھکرادیا تھا۔

سیٹھ اختر علی کا شیطانی ذہن مسلسل کام کررہا تھا' وہ ہر حالت میں نزہت کو راضی کرنا چاہتا تھا۔ اپنی ناکامی پر اس نے دوسرا منصوبہ تیار کیا۔

ایک دن اس نے کچھ فائلیں نزہت کے حوالے کیں اور شام تک انہیں مکمل کرنے کا حکم سنادیا' فائلیں دیکھ کر اس نے احتجاج بھی کیا تھا کہ شام تک یہ کام مکمل نہیں ہوسکے گا۔

''مس نزہت یہ فائلیں آج ہر حالت میں مکمل کرکے ہمیں پارٹی کے حوالے کرنی ہیں ورنہ آرڈر کینسل ہوجائے گا۔'' سیٹھ اختر علی نے کہا۔

''سر میں پوری کوشش کروں گی۔'' نزہت نے فائلیں دیکھتے ہوئے کہا۔

اس نے فائلیں مکمل کرنے کی غرض سے اپنی پوری محنت صرف کردی تھی' ایک ہفتے کا کام ایک دن میں کرنا اتنا

آسان نہ تھا پھر بھی وہ ڈٹ کر فائلیں مکمل کرنے میں مصروف تھی۔ اس محنت میں شام کے سات بج گئے تھے آفس میں کام کرنے والے ملازمین ایک ایک کرکے جا چکے تھے' آفس میں سیٹھ اختر علی' نزہت اور چوکیدار خان بابا بچے تھے' وہ چائے بہت کم پیتی تھی مگر وہ آج دن بھر میں چائے کے کئی کپ پی چکی تھی پھر چائے کی طلب محسوس ہورہی تھی' اس نے جیسے ہی فائل پر سے نظریں اٹھا کر دیکھا خان بابا آفس سے غائب تھا' اسے بڑی حیرت ہوئی کہ خان بابا بغیر بتائے کہاں غائب ہوگیا ہے۔

''ہاں بھئی فائلیں تیار ہوگئیں ہیں۔'' سیٹھ اختر علی نے اس کے کمرے میں داخل ہوتے ہوئے پوچھا۔

''سر ابھی کچھ اور وقت لگے گا۔'' نزہت نے فائلیں دیکھتے ہوئے کہا۔

''تم بہت تھک گئی ہو۔''

''جی سر! اسی لیے خان بابا کو دیکھ رہی تھی کہ انہیں کہہ کر چائے منگواؤں لیکن وہ پتا نہیں کہاں چلے گئے ہیں۔''

''انہیں میں نے چھٹی دے دی ہے' میں کوشش کرتا ہوں کہ پارٹی سے ایک دن کی مزید مہلت لے لوں' تم یہ فائلیں لے کر میرے آفس میں آجاؤ۔'' سیٹھ اختر علی نے کہا۔

نزہت نے فائلیں اکٹھی کیں اور سیٹھ اختر علی کے کمرے میں پہنچ گئی' سیٹھ اختر علی کی آنکھیں مخمور سی ہورہی تھیں۔ نزہت کو دیکھ کر ان میں ایک خاص چمک آگئی تھی' وہ یہ بات محسوس کیے بغیر نہ رہ سکی تھی' نزہت نے فائلیں اس کی ٹیبل پر رکھ دیں۔

''تم بہت محنتی ہو' یہ عمر تمہارے کام کی نہیں عیش کرنے کی ہے۔''

''سر بنا کام کے پیسے کہاں سے آئیں گے؟''

''یہ سب تمہارے ہاتھ میں ہے' کتنے نوٹ چاہئیں میری تجوری نوٹوں سے بھری ہوئی ہے۔ بولو کتنے نوٹ چاہئیں؟'' وہ اس کے قریب منہ لاتے ہوئے بولا۔

شراب کا بھپکا نزہت کی ناک سے ٹکرایا' وہ شراب پیئے ہوئے تھا وہ ہوش سے بے گانہ ہوا جارہا تھا۔

''سر میں چلتی ہوں۔'' نزہت جانے کو اٹھی۔

''اتنی بھی جلدی کیا ہے گھڑی دو گھڑی میرے پاس بھی بیٹھ جاؤ۔''

''سر آپ ہوش میں نہیں ہیں' اس لیے میرا یہاں رکنا ٹھیک نہیں' کبھی بھی شیطان حاوی ہوسکتا ہے۔''

''شیطان مجھ پر نا جانے کب سے حاوی ہے میں جب بھی خوب صورت چہرے دیکھتا ہوں تو میں اپنے آپ میں نہیں رہتا۔ اپنی ہوس مٹائے بغیر اپنے سامنے والے خوب صورت چہرے کو جانے نہیں دیتا۔'' سیٹھ اختر علی نے اس کا ہاتھ پکڑ لیا۔

''سر میرا ہاتھ تو چھوڑ دیں۔'' نزہت نے ہاتھ کو ایک جھٹکا دیا' اس نے ہاتھ مضبوطی سے پکڑا ہوا تھا اس لیے وہ کوشش کے باوجود ہاتھ چھڑا نہ سکی۔

''ضد نہ کرو میری جان! میری بات مان لو۔''

''سر آپ حد سے بڑھ رہے ہیں' میری شرافت کا ناجائز فائدہ اٹھا رہے ہیں۔''

''میں معاوضہ دینے میں کنجوس نہیں ہوں' تمہیں پورا معاوضہ دوں گا۔'' سیٹھ اختر علی نے اس کے چہرے کے قریب اپنا منہ کرتے ہوئے کہا۔

نزہت نے اسے زور سے دھکا دیا اور باہر کی طرف بھاگی مگر دروازہ لاک تھا۔

''بھاگو...... میں بھی دیکھتا ہوں کہ کیسے بھاگو گی' یہ دروازہ ریموٹ سے کھلتا ہے اور اس کا بٹن میرے پاس ہے۔ دروازے سے سر ٹکرانے سے بہتر ہے میری بانہوں میں پناہ لے لو' بہت سکون ملے گا۔'' سیٹھ اختر علی نے زوردار قہقہہ لگایا۔

اس نے بڑے مکار پن سے اسے قابو کرلیا تھا' نزہت کے فرار کی ہر کوشش ناکام ہوچکی تھی اور وہ بے بس ہوچکی تھی۔ سیٹھ اختر علی کسی بھی صورت اسے چھوڑنے کو تیار نہ تھا' کمرے میں ایسی کوئی چیز بھی نہیں تھی جس کے ذریعے وہ اپنی عزت بچاتے ہوئے جان دے دیتی۔

سیٹھ اختر علی نے بلاآخر نزہت کو اپنی بانہوں میں بھر کر اپنی ہوس کی تلوار چلادی تھی' وہ سسکتی رہی تڑپتی رہی لیکن سیٹھ اختر علی کو بالکل بھی اس پر رحم نہ آیا۔

نزہت جب گھر جانے لگی سیٹھ اختر علی نے کچھ رقم زبردستی پرس میں رکھ دی تھی اور ساتھ ہی دھمکی بھی دے دی تھی اگر اس نے پولیس یا کسی اور کو اس واقعہ کے بارے میں بتایا تو اس کے ہاتھ بہت لمبے ہیں' وہ اس کے پورے گھرانے کو موت کی نیند سلادے گا۔ وہ روتی سسکتی ہوئی گھر کو روانہ ہوگئی تھی اس نے آفس میں سیٹھ اختر علی کے متعلق سن رکھا تھا کہ وہ بہت ظالم ہے اس کے پولیس اور غنڈوں سے بہت اچھے مراسم ہیں اور وہ اس کی خدمت کے بدلے جائز اور ناجائز کام کرنے سے نہیں چوکتے۔ وہ جس کے خلاف ہوجائے اس کا پیچھا نہیں چھوڑتا' اس لیے وہ کوشش کررہی تھی کہ کسی اور دفتر میں ملازمت مل جائے مگر نوکریاں اتنی آسانی سے ملنے لگیں تو پھر بے روزگار نوکریوں کے لیے دھکے کیوں کھاتے پھریں۔

سیٹھ اختر علی نے نزہت کی مجبوری کا بھرپور فائدہ اٹھالیا تھا اور وہ چاہنے کے باوجود اس کا کچھ بھی بگاڑ نہ سکی تھی مگر کمزور ہونے کے باوجود اس میں انتقام کی آگ دن بہ دن تیز سے تیز تر ہوتی جارہی تھی۔

آفس پہنچنے پر جب اس نے سنا کہ سیٹھ اختر علی کو گولی لگ گئی ہے اور وہ اسپتال پہنچ گیا ہے تو اس کے چہرے پر ایک پراسرار مسکراہٹ آکر غائب ہوگئی۔

ڈاکٹر ندیم اپنے کام کا ماہر تھا' اس نے بڑی مہارت سے سیٹھ اختر علی کا آپریشن کیا' پیٹ سے گولی نکال کر ڈاکٹر ندیم نے اپنا کام نمٹاتے ہوئے ٹانکے لگانا شروع کردیے۔ ٹانکے مکمل ہوجانے پر ڈاکٹر ندیم نے اطمینان کا سانس لیا۔ نرس تیزی سے سیٹھ اختر علی کی طرف بڑھی اور ایک انجکشن لگادیا' ڈاکٹر ندیم کو نرس کی آنکھیں دیکھ کر حیرت سی ہوئی کیونکہ وہ آنکھیں اس کے لیے اجنبی تھیں۔ ڈاکٹر ندیم نے ایک لمحے کو کچھ سوچا اور پھر تیزی سے آپریشن روم سے نکل گیا' وہ برابر کے کمرے میں آرام کی غرض سے کرسی پر ٹیک لگا کر بیٹھ گیا۔ ڈاکٹر ندیم کچھ دیر آرام کرنا چاہتا تھا' وہ آنکھیں موندے بیٹھا تھا کہ ایک نرس بدحواسی کی حالت میں اس کے کمرے میں داخل ہوئی۔

''سر...... سر...... مریض کی حالت خراب ہوگئی ہے۔'' وہ بولی۔

''مریض کی حالت خراب ہوگئی ہے۔'' ڈاکٹر ندیم کے منہ سے بے اختیار یہ جملہ نکلا اور تیزی سے وہ آپریشن روم کی طرف بھاگا۔

سیٹھ اختر علی کا چہرہ موت کی وجہ سے نہایت بھیانک ہوچکا تھا۔

''وہ نرس کہاں ہے' جس نے سیٹھ اختر علی کو انجکشن لگایا تھا۔'' ڈاکٹر ندیم کو وہ نرس جس کی آنکھوں میں اجنبی پن محسوس ہوا تھا اسے وہاں نہ دیکھ کر ان سے پوچھا۔

''سر! آپ کے باہر نکلتے ہی وہ بھی چلی گئی تھی۔'' ایک نرس نے بتایا۔

ڈاکٹر ندیم کے حکم پر اس نرس کو پورے اسپتال میں ڈھونڈا گیا تھا' مگر وہ ایسے غائب تھی کہ جیسے اسپتال میں آئی ہی نہ ہو۔ ڈاکٹر ندیم اس نرس کی پراسرار گمشدگی پر چکرا کر رہ گئے تھے۔ ان کی سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ وہ سیٹھ اختر علی کو کیا جواب دیں گے۔

رکشے میں بیٹھی نزہت آفس جارہی تھی اور وہ سوچ رہی تھی اگر آج فیصل اسپتال میں نرس فاطمہ کی ڈیوٹی نہ ہوتی تو وہ کبھی بھی سیٹھ اختر علی کو زہریلا انجکشن نہ لگاپاتی' آج اس نے بھرپور انتقام لے لیا تھا۔ آتے ہوئے وہ نرس فاطمہ کو اسٹور روم میں رسیوں سے باندھ آئی تھی تاکہ اسپتال کا عملہ اس کی بچپن کی سہیلی فاطمہ پر کسی قسم کا شک نہ کرسکے اور وہ ایک فرضی کہانی سنا کر بچ جائے۔

ایک رات

شہناز بانو

اس ایک کائنات میں نہ جانے کتنے عالم آباد ہیں۔ ہمارا ذہن' ہماری عقل اور سائنس اس کی کوئی توجیہ پیش نہیں کرسکتا۔ جب اللہ نے کہا کہ میں تمام کائناتوں کا رب ہوں تو انسانوں نے یہ پیغام دینے والے انبیا کو جھٹلایا۔ جب نبی آخری الزماں کو اس رب نے رحمت العالمین قرار دیا یعنی تمام عالموں کے لیے رحمت لانے والا تو کم عقل دنیا نے اسے تسلیم نہیں کیا اور اسے اپنے جیسا انسان قرار دینے پر سارا زور صرف کر دیا اور آج بھی کر رہے ہیں' یہ الگ بات ہے کہ آج سائنس بھی اس بات کو تسلیم کر رہی ہے کہ اس دنیا میں ہمارے علاوہ بھی کوئی مخلوق آباد ہے جو مختلف طریقوں سے اپنے ہونے کا اظہار کرتی رہتی ہے۔

اک رات کا قصہ' جب دکھوں کی ماری ایک مظلوم عورت کے لیے مرادوں کی بارات لے کر طلوع ہوئی تھی۔

دلچسپ نمبر کے لیے بطورِ خاص شہناز بانو کی ایک ایسی تحریر جو آپ کو سانس روکنے پر مجبور کر دے گی

میں دادی امیرن کے گھر سے واپس آئی تو گھر آ کر دیر تک ان کے بارے میں سوچتی رہی کہ کیا ٹھاٹ ہیں ان کے۔ ان کا شاندار گھر اور رہن سہن، کھانا پینا، پہناوا سب ہی بے حد شاندار اور قابل رشک تھا۔ گھر میں ملازمین کی فوج تھی۔ دو تین ملازمائیں تو ہر وقت ان کی خدمت میں حاضر رہا کرتی تھیں اور دادی امیرن سفید بے داغ ریشم کا کرتا اور ساٹن کا چوڑی دار پاجامہ ہمیشہ زیب تن کیے رہتیں۔ پان بہت شوق سے کھاتی تھیں مگر نہایت نفاست سے کیا مجال جو کبھی ان کے سفید لباس یا سفید بستر پر ایک بھی دھبہ دکھائی دیا ہو۔

خوش مزاج بھی تھیں ان سے باتیں کرنے بیٹھو تو وقت گزرنے کا پتا ہی نہیں چلتا تھا۔ بڑے دل والی ایسی کہ کبھی کوئی ان کے گھر سے خالی ہاتھ نہ جاتا تھا حد یہ کہ وہ اپنے گھر آنے والے مہمانوں کو بھی خالی ہاتھ نہ جانے دیتیں کوئی نہ کوئی تحفہ ضرور ساتھ کر دیتیں۔

مجھے یاد ہے کہ امی نے ان کے بارے میں بتایا تھا کہ ایک وقت وہ بھی تھا جب ان ہی دادی امیرن کے گھر کھانے کے لالے پڑے ہوتے تھے۔ شوہر سدا کے بیمار تھے پھر بھی اللہ کی شان کہ اللہ اولاد دیے رہا تھا۔

دادی امیرن میرے ابو کی چچی تھیں امی جب شادی ہو کر آئی تھیں تو تب ہی انہوں نے دادی امیرن کے حالات تیزی کے ساتھ بدلتے ہوئے دیکھے تھے اور ان کے بیمار شوہر کو صحت یاب ہوتے ہوئے دیکھا تھا۔

ان کے چار بچے تھے تین بیٹے اور ایک بیٹی تھی۔ بیٹی سب سے بڑی تھی اور بیٹے تینوں چھوٹے تھے۔

انہوں نے اپنے بچوں کی شادیاں بھی بہت شاندار طریقے اور دھوم دھام سے کی تھی۔ آس پاس کے کنبے بھی دعوت میں مدعو ہوتے تھے کتنے ہی دن ان کی شاندار حویلی میں چراغاں اور گاؤں والوں کی دعوت ہوتی تھی۔

عام لوگوں کا کہنا تھا کہ دادی امیرن کے کچے گھر کے صحن سے کوئی خزانہ نکلا ہے اور یہ بات انہوں نے لوگوں سے پوشیدہ رکھی ہے۔ براہ راست ان سے اس بات کو پوچھنے کی کسی میں جرأت نہیں ہوتی تھی۔

دادی امیرن مجھ سے بے حد پیار کرتی تھیں۔ میں جب بھی ان سے ملنے کے لیے جاتی مجھ سے بہت محبت سے پیش آتیں بلکہ میرا بہت شکریہ بھی ادا کرتیں کہ میں اپنے گھر اور بچوں کی مصروفیات میں ٹائم نکال کر ان سے ملنے کے لیے آئی ہوں۔

اس دن ان کے بارے میں بہت سوچنے کے بعد میں نے فیصلہ کیا کہ اب اگر میری دادی امیرن سے ملاقات ہوگئی تو میں باتوں ہی باتوں میں ان کے اچانک دولت مند ہونے کا راز جاننے کی کوشش کروں گی۔

پھر ہوا یوں کہ اچانک ہی میرے پاس دادی امیرن کا پیغام آیا انہوں نے مجھے بلوایا تھا وہ بیمار تھیں اور مجھ سے ملنا چاہتی تھیں۔

میں نے علی سے کہا کہ ہمیں پہلی فرصت میں دادی کی مزاج پرسی کے لیے جانا چاہیے اور پھر اگلے ہی دن صبح نماز کے بعد علی نے مجھ سے کہا کہ چلو تمہیں دادی کے گھر ڈراپ کرتا ہوا آفس چلا جاؤں گا چند منٹ رک کر میں بھی ان کی خیریت پوچھ لوں گا تم سارا دن ان کے پاس رہنا شام کو آفس سے واپسی میں، میں تمہیں پک کرلوں گا۔

میں تو یہی چاہتی تھی کہ ذرا زیادہ ٹائم ملے تو دادی کے پاس بیٹھوں اس لیے فوراً تیار ہوگئی۔

ماسی شریفاں حسب معمول صبح آٹھ بجے ہی آ گئی تھی میں نے اسے بچوں کے پاس چھوڑا اور علی کے ساتھ دادی کے گھر آ گئی۔

دادی اپنے بیڈ پر لیٹی تھیں۔ مجھے دیکھا تو ایک کمزور سی مسکراہٹ ان کے لبوں پر پھیل گئی۔

ان کی سرخ و سفید رنگت پر زردی سی چھائی ہوئی تھی اور وہ بہت کمزور اور نڈھال سی دکھائی دے رہی تھیں۔ انہوں نے مجھے اپنے نزدیک بیڈ پر ہی بٹھا لیا۔ میں ان کی بیماری کے متعلق پوچھتی رہی پھر ادھر اُدھر کی باتیں کرنے لگی۔ باتوں باتوں میں وہ اپنے ماضی کا ذکر کرنے لگیں۔ دوسرے رشتے داروں کا ذکر کرنے لگیں جو اب اس دنیا میں نہیں رہے تھے۔ ان میں میرے والدین بھی شامل تھے۔

میں نے محسوس کیا کہ مجھ سے اتنی دیر گفتگو کرنے کے بعد وہ تھوڑی فریش سی ہوگئی تھیں۔ تب میں نے سوچا کہ آج دادی اپنے ماضی کی یادیں تازہ کر رہی ہیں تو لگے ہاتھوں میں ان سے وہ باتیں پوچھ لیتی ہوں جو بہت دن سے میرے دل میں کھٹک رہی تھیں۔ تب میں نے بہت محتاط الفاظ میں کہا۔

”دادی ایک بات پوچھوں اگر آپ ناراض نہ ہوں اور اگر آپ کو میرا سوال ناگوار گزرے اور آپ جواب نہ دینا چاہیں تو کوئی بات نہیں، مجھے قطعی برا نہیں لگے گا۔“

”ایسی کون سی بات ہے، تم پوچھو۔“ دادی نے قدرے حیرانی سے کہا۔

”دادی! امی بتایا کرتی تھیں کہ جب وہ بیاہ کر آئی تھیں تب آپ کے یہ حالات نہیں تھے لیکن اچانک ہی سب نے آپ کے حالات تیزی سے بدلتے ہوئے دیکھے۔ جتنے منہ اتنی باتیں تھیں لیکن ایک بات جو عام تھی وہ یہ کہ شاید آپ کے گھر سے زمین کے اندر سے کوئی خزانہ نکلا تھا، سونے کی اشرفیوں سے بھرا ہوا گھڑا، کیونکہ آپ کو یاد ہوگا دادا اختر جو آپ کے شوہر کے ماموں زاد تھے انہوں نے ایک مرتبہ سنار کے پاس دادا کو سونے کی اشرفی بیچتے ہوئے دیکھا تھا تو کیا

ایسا کچھ تھا۔" میں نے جھجکتے ہوئے بہت ہمت سے آخر اپنے لبوں پر مچلتا ہوا سوال کر ہی ڈالا۔

میرے سوال پر دادی کے چہرے پر کئی رنگ آ کر گزر گئے۔ وہ خاموشی سے میرا چہرہ تکنے لگیں۔ مجھے ان کی آنکھوں میں ہلکا سا شکوہ دکھائی دیا۔ جیسے وہ مجھ سے کہہ رہی ہوں کہ تم بھی...... تمہارے دل میں بھی اتنے شکوک و شبہات تھے۔

"سوری دادی! مجھے معاف کر دیں، مجھے آپ سے ایسا سوال نہیں کرنا چاہیے تھا شاید آپ کو برا لگا ہے۔" میں نے شرمندگی سے پر لہجے میں کہا تو انہوں نے ایک گہرا سانس لیا پھر میری جانب سہارے کے لیے ہاتھ بڑھایا۔ وہ بیٹھنا چاہ رہی تھیں میں نے انہیں سہارا دے کر بٹھایا تو وہ بولیں۔

"نہیں میری جان! تمہارے سوال پر میں قطعی ناراض نہیں ہوں اور نہ ہی مجھے برا لگا ہے۔ حیرت کی بات یہ ہے کہ آج تک اس بارے میں کبھی کسی نے کوئی سوال مجھ سے نہیں کیا۔ نجانے اس کی کیا وجہ تھی۔ آج تم پہلی فرد ہو جو یہ سوال پوچھ رہی ہو لیکن اگر اس وقت کوئی مجھ سے یہ سوال پوچھتا تو میں نہ بتاتی کیونکہ مجھے "اس" نے بتانے سے منع کیا تھا۔" دادی ذرا سانس لینے کو رکیں تو میں نے جھٹ پوچھا۔

"کس نے منع کیا تھا؟"

"میری سہیلی نے۔" دادی نے آہستہ سے جواب دیا اور سر کو تکیے سے ٹیک لگا کر آنکھیں موند لیں۔

"سہیلی۔" میں نے حیرت سے کہا۔ "لیکن آپ کی سہیلی سے اس کا کیا تعلق ہے؟"

"اس سے ہی تو ہے اس سارے ٹھاٹ باٹ کا تعلق۔" انہوں نے سر اٹھایا اور آنکھیں کھول کر میری جانب گہری نگاہوں سے دیکھا اور میں نے گھبرا کر اپنی نگاہیں جھکا لیں۔

ہمارے درمیان تھوڑی دیر گمبھیر خاموشی چھائی رہی تب دادی نے اس خاموشی کو توڑا اور بولیں

"آج تمہارے سامنے میں اس راز سے پردہ اٹھا ہی دیتی ہوں۔ تم کہانیاں لکھتی ہو ناں، میری بھی یہ کہانی ضرور لکھنا لیکن اس کہانی کو اپنے دل میں چھپا کر رکھنا اس وقت تک جب تک میری سانسیں چل رہی ہیں۔"

"اللہ آپ کو سلامت رکھے دادی۔ میں آپ سے وعدہ کرتی ہوں کہ جیسا آپ چاہتی ہیں ویسا ہی کروں گی۔" میں نے خوشی سے اپنی دھڑکنوں کو قابو میں کرتے ہوئے کہا۔

دادی تھوڑی دیر چپ لیٹی چھت کو گھورتی رہیں پھر بولیں۔ "مجھے سب سے پہلے تمہیں اپنے حالات بتانے ہوں گے کہ میں کن حالات میں جی رہی تھی۔ پھر قدرت نے کس طرح مجھ پر اپنا کرم کیا بس تم اتنا کرنا کہ مکمل خاموشی سے میری باتیں سننا مجھے ٹوکنا نہیں ورنہ میں کچھ بھول سکتی ہوں۔"

"جی دادی۔" میں سر تا پا ہمہ تن گوش ہو گئی۔

دادی کی کہانی دادی کی زبانی سنیے۔

"میرے والدین کچھ زیادہ کھاتے پیتے گھرانے کے نہیں تھے بس اتنا تھا کہ ہم نے کبھی فاقے نہیں کیے۔ عید بقرعید پر نئے جوڑے بھی بن جایا کرتے تھے میری اماں بہت زیادہ سنجیدہ مزاج تھیں تو ابا جی بھی خاموش طبع تھے۔ مجھ سے بڑی بہنیں بھی ان دونوں کی طرح ہی تھی لیکن میں اللہ جانے کس پر چلی گئی تھی۔ ہر وقت پٹر پٹر باتیں کرنا جلد ہی دوسروں سے گھل مل جانا ہر وقت ہر کسی سے ہنسی مذاق کرنا میرا وطیرہ تھا۔

ہر وقت ہنسنے پر اماں سے ڈانٹ بھی خوب پڑتی تھی۔ لیکن میں نے اپنی عادت نہیں بدلی۔ اللہ تعالیٰ نے شکل و صورت اور رنگ و روپ بخشا تھا سو میری

بہت سی سہیلیاں تھیں
میرے پاس ایک ہی کپڑے کی گڑیا تھا جس کی نہ جانے میں نے کتنی شادیاں کر ڈالی تھیں۔ گڑیا کو رخصت ضرور کرتی تھی لیکن بعد میں لڑ جھگڑ کر اپنی گڑیا واپس لے آتی تھی۔
وہ دن بھی بہت اچھے تھے بے فکرے، نہ کسی کی پروا نہ پریشانی اور اس دن تو میں واقعی پریشان ہوگئی جب میں نے سنا کہ ماموں رفیق کے سلطان سے میری شادی ہورہی ہے۔
"لو بھلا بتاؤ، شادی اور وہ بھی میری ابھی تو مجھے اپنی گڑیا کی اور بھی شادیاں کرنی ہیں۔" میں نے حیرانی سے کہا۔
"چل چل بس کر اور پھینک پرے اس موئی گڑیا کو، کمبخت کی نہ جانے کتنی شادیاں کراچکی ہے۔ پہاڑ جیسا قد نکالا ہے اور ابھی تک بچی بنی ہوئی ہے۔" اماں نے پیار سے میری جانب دیکھتے ہوئے کہا۔
"لیکن اماں ابھی تو آپا موجود ہے وہ مجھ سے بڑی بھی تو ہے تو پہلے آپا کی شادی کردیں۔" میں نے منہ پھلا کر کہا۔
"تیرے ماموں نے تجھے مانگا ہے رفیقہ کے لیے بھی تیرے تایا جی نے بات کی ہے اب اپنے اباجی کے سامنے ایک لفظ بھی منہ سے نہ نکالنا، بیٹیوں کا زبان کھولنا بہت بڑی بے حیائی اور بے شرمی کی بات ہوتی ہے۔" اماں نے کچھ غصے اور کچھ پیار سے مجھے سمجھایا۔
میں اس الہڑ عمر میں شادی کا مطلب بھی نہیں جانتی تھی سوائے اس کے کہ اچھے اچھے کپڑے اور زیور پہننے کے لیے ملیں گے۔
شادی ہوئی تو پتا چلا کہ شادی کا مطلب کیا ہوتا ہے رات ہوتی تو شوہر کی منتیں کرتی کہ وہ مجھے مامی کے پاس سونے دے...... لیکن......
کچھ دنوں تک تو میں سہمی سہمی سی رہی پھر اس زندگی کے ساتھ سمجھوتہ کرلیا میری وہی ساری حرکتیں واپس آ گئیں وہی ہنسنا بولنا۔
ایک سال کے بعد پہلا بیٹا پیدا ہوگیا اور اسی سال ماموں اللہ کو پیارے ہوگئے دوسرے سال بیٹی پیدا ہوگئی تیسرے سال پھر بیٹا پیدا ہوگیا۔
چھوٹے چھوٹے بچے تھے سارا دن گھر کا کام اوپر سے مامی ایسی بیمار پڑیں کہ بستر سے اٹھنے کے قابل نہ رہیں ان کی بھی دیکھ بھال کرنا پڑتی تھی۔
میں تو گھن چکر بن کر رہ گئی تھی نہ میکے جانا یاد رہتا تھا اور نہ ہی کوئی اور بات...... ہاں اس کا اتنا فائدہ ضرور ہوا کہ اس مرتبہ سال ضرور چڑھا لیکن چوتھا بچہ پیدا نہیں ہوا تین سال مزید گزر گئے ان تین سالوں میں مجھے مزید صدمات سے گزرنا پڑا یکے بعد دیگرے میرے اماں ابا اور مامی بھی دنیا سے رخصت ہوگئے۔
بچے بھی تھوڑے بڑے ہوگئے تھے ایک دن پھر صبح ہی صبح مجھے الٹیاں شروع ہوگئیں تو انکشاف ہوا کہ میں پھر ایک بچہ پیدا کرنے والی ہوں۔
لیکن اب مجھے کوئی فکر نہیں تھی بچے ذرا سمجھدار ہوگئے تھے میں بچوں کے ساتھ بچہ بن کر کھیلتی ان سے باتیں کرتی ہنستی بولتی تھی۔
بچے کی پیدائش میں تین ماہ رہ گئے تھے ایک دن میرے شوہر کو بخار آ گیا۔ ہم نے اس بخار کو معمولی سمجھا لیکن وہ بڑا ظالم نکلا سلطان کا آدھا جسم مفلوج کر گیا۔
میں ان دنوں بہت پریشان رہا کرتی تھی۔ سلطان کے بستر پر پڑنے کی وجہ سے روزگار کا سلسلہ قریباً ختم ہی ہوگیا تھا اس وقت میری آپا نے میری درپردہ بہت مدد کی وہ اناج اور گھر کی روزمرہ کی ضرورت کی چیزیں مجھے خفیہ طور پر پہنچایا کرتی تھیں۔
ایک دن سارے گھر کے کاموں سے فارغ ہوکر

بچوں کو کھانا کھلانے کے بعد میں خود کھانا کھانے کے لیے بیٹھی، میں صحن میں نیم کے درخت کے نیچے بیٹھی تھی نہ جانے کہاں سے ایک بالکل سفید رنگ کی بلی میرے سامنے آ کر بیٹھ گئی اور ایک ٹک میری جانب دیکھنے لگی۔ میں جو پریشان کن سوچوں میں ڈوبی ہوئی تھی اسے دیکھ کر بولی۔

"ایسے کیا دیکھ رہی ہے میری طرف...... کھانا کھائے گی، بھوکی؟" بلی نے بہت دھیمی سی آواز میں "میاؤں" کہا۔

"اچھا میں سمجھ گئی تو بھی بھوکی ہے ٹھہر میں تجھے کھانا دیتی ہوں۔" میں جو اپنی عادت سے مجبور تھی کبھی کسی کو تکلیف میں نہیں دیکھ سکتی تھی۔ یہ کہتے ہوئے اٹھ کر گئی اور اندر سے ایک ٹوٹی ہوئی ناکارہ رکابی اٹھا کر لائی اور ایک مٹی کا آب خورہ بھی پانی بھر کر لائی، پھر اپنی روٹی سے آدھی روٹی توڑ کر اس کے چھوٹے چھوٹے ٹکڑے کیے سالن میں بھگو کر بلی کے آگے رکھ دیے اور کہا۔

"لو جی آپ بھی کھاؤ، بھئی معاف کرنا آج گوشت نہیں ہے۔ بہت دن ہو گئے گوشت ہم نے بھی نہیں کھایا، بس اللہ جو کھلا دے پیٹ بھر جائے یہی اس کا بہت شکر ہے۔" میں مزے سے بلی سے باتیں کر رہی تھی۔ وہ کھانے لگی تھوڑا سا کھاتی پھر سر اٹھا کر مجھے دیکھتی دھیرے سے میاؤں کرتی اور پھر کھاتی اس نے تھوڑا سا کھایا پانی پیا اور چھلانگ لگا کر دیوار پر چڑھ کر باہر کود گئی۔

اور پھر وہ بلی مجھے اپنے گھر میں وقتاً فوقتاً دکھائی دینے لگی میں جو کچھ بھی کھاتی اسے ضرور کھلاتی تھی حیرت انگیز بات یہ تھی کہ عام بلیوں کے برعکس وہ ہر چیز کھا لیتی تھی۔

ایک دن میرے شوہر کی طبیعت کافی خراب تھی۔ ایک تو میری اپنی حالت کافی خراب تھی ان دنوں چلنا پھرنا اٹھنا بیٹھنا مشکل ہوتا تھا دوسرے سلطان کی دیکھ بھال میں بہت زیادہ تھک جاتی تھی دائی اماں میرا معائنہ کرنے کے لیے گھر آیا کرتی تھی اس نے مجھ سے کہا کہ تو بہت کمزور ہے دودھ پیا کر اور کھانا پیٹ بھر کر کھایا کر۔

میں یہ سب عیاشیاں کیسے کر سکتی تھی۔ میرا خرچہ تو خود میرے رشتے دار پورا کرتے تھے سلطان کی دوا اور بچوں کا کھانا بعض اوقات تو ایسا بھی ہوتا تھا کہ میں بچوں اور سلطان کو کھانا کھلانے کے بعد ہنڈیا دیکھتی تو خالی نظر آتی، مجھے فاقہ کرنا پڑتا تو ایسی حالت میں کمزور ہونا تو فطری بات تھی۔

اس روز سلطان کی بہت طبیعت خراب تھی میں نے بچوں کو آپا کے گھر بھیج دیا تھا میں سلطان کے پاس بیٹھی تھی وہ میری حالت دیکھ کر رونے لگے۔ اپنے آپ کو برا کہنے لگے اللہ سے اپنے لیے موت مانگنے لگے کہ میرا وجود خوامخواہ تمہارے اوپر بوجھ بن گیا ہے اچھا ہے اللہ مجھے اس دنیا سے اٹھا لے۔

میں نے اپنے آپ کو بہت کنٹرول میں رکھا اور انہیں سمجھانے لگی لیکن ان کے پاس سے اٹھ کر باہر آ گئی صحن میں چارپائی پڑی تھی میں اس پر بیٹھ کر رونے لگی میرے سامنے بہت سے مسائل سر اٹھائے کھڑے تھے اور میرے ہاتھ میں اس کا کوئی حل نہیں تھا کچھ دنوں کے بعد چوتھے بچے کی پیدائش متوقع تھی اور میرے ہاتھ میں کچھ بھی نہیں تھا ان پریشان کن لمحات میں صرف اللہ سے دعا ہی کر سکتی تھی میں ہچکیاں لے لے کر بری طرح رو رہی تھی اور ساتھ ہی اللہ سے دعا بھی کر رہی تھی کہ وہ غیب سے میری مدد فرمائے۔

تب ہی مجھے محسوس ہوا جیسے کسی نے میرے دوپٹے کا پلو کھینچا ہو، میں بری طرح چونک پڑی کیونکہ

میرے اور سلطان کے علاوہ گھر میں کوئی نہیں تھا سلطان تو بستر سے اٹھ بھی نہیں سکتے تھے تو کیا سلطان، ایک نہایت دل خوش کن خیال مجھے آیا اور میں نے مڑ کر دیکھا تو وہاں کوئی نہیں تھا البتہ وہی سفید بالوں اور نیلی آنکھوں والی بلی اپنے اگلے دونوں پنجے چارپائی کی پٹی پر ٹکائے ہوئے تھے۔ اس نے ہی میرے دوپٹے پر اپنا پنجہ مارا تھا میں نے اسے دیکھا تو اس نے "میاؤں" کہا۔ جیسے پوچھ رہی ہو کہ کیوں رو رہی ہو۔

"کیا ہے؟" میں نے روتے ہوئے کہا۔ "تجھے اگر بھوک لگی ہے تو کہیں اور چلی جا میرے پاس تو اس وقت زہر بھی نہیں ہے جو ہم سب کھا کر ہمیشہ کے لیے ان دکھوں سے چھٹکارا حاصل کرلیں جا...... جاتی کیوں نہیں ہے۔" میں نے کہا لیکن وہ ٹس سے مس نہیں ہوئی اور مسلسل میاؤں میاؤں کرتی رہی، اندر سے سلطان کی آواز آئی تو میں دوپٹے سے اچھی طرح اپنے آنسو صاف کر کے کمرے کے اندر چلی گئی۔

شام کو جب آپا بچوں کو لے کر آئیں تو اپنے ساتھ کھانے کی بہت سی چیزیں لے کر آئی تھیں۔ ایک چھوٹی بالٹی میں دودھ بھی تھا آپا نے مجھ سے پیار سے کہا کہ وہ یہ دودھ میرے لیے لائی ہیں اصلی گھی تھا، سوجی، میوہ، چاول...... دالیں، آٹا غرض بہت کچھ تھا۔

آپا کی اتنی مہربانی دیکھ کر میرے لب تھرانے لگے لیکن ان سے ایک لفظ بھی نہ نکل سکا پھر میں آپا کے گلے لگ کر رونے لگی۔

آپا نے تسلی دیتے ہوئے کہا کہ تو میری چھوٹی بہن ہے تو تو ہر وقت ہنستی مسکراتی اچھی لگتی ہے میں تیرا اداس چہرہ نہیں دیکھ سکتی۔ اس وقت بچوں کو لے کر آئی ہوں کل پھر آ کر لے جاؤں گی تو فکر نہ کر...... اللہ سب بہتر کردے گا۔

"کب آپا کب اور کیسے سلطان کا حال تو دیکھو وہ بستر سے اٹھ نہیں سکتے کون کما کر لائے گا ان بچوں کے لیے اور تم بھی کب تک اپنے میاں اور ساس سے چھپ چھپ کر میری مدد کرتی رہو گی۔" میں نے روتے ہوئے کہا۔

"اللہ جب مصیبت دیتا ہے تو اسے ٹالتا بھی وہی ہے سلطان بھی اچھے ہو جائیں گے وہی کمائیں گے اپنے بچوں کے لیے اور سب سے اچھی بات یہ ہے کہ میں اب تیرے بہنوئی اور اپنی ساس سے چھپ کر یہ سامان نہیں لائی ہوں انہیں بتا کر ان کی اجازت سے لائی ہوں میں تو خواہ مخواہ ہی ڈر رہی ہے وہ لوگ تو بہت اچھے ہیں۔" آپا نے ایک بار پھر مجھے گلے لگاتے ہوئے کہا۔

آپا روزانہ آتی تھیں۔ صبح بچوں کو آ کر لے جاتیں اور شام کو چھوڑ جاتیں بچے کی ولادت کسی بھی وقت ہو سکتی تھی۔

اسی روز میں نے اس بلی کو دیکھا وہ سارے گھر میں بے قراری سے گھوم رہی تھی۔ شاید بچوں کو تلاش کر رہی تھی۔ حسب عادت میرے پاس آ کر میاؤں میاؤں بھی کر رہی تھی اس روز میری طبیعت خراب ہونا شروع ہوگئی میں نے آپا کی ہدایت کے مطابق دودھ گرم کر کے اس میں اصلی گھی ڈالا اور پینے لگی۔ وہ بلی پھر میرے پاس آ گئی۔ میں نے تھوڑا سا دودھ کٹورے میں ڈال کر اس کے آگے رکھ دیا۔ جسے اس نے پی لیا پھر صحن میں جا کر دیوار پر چڑھ کر بیٹھ گئی۔

میری تکلیف بڑھنے لگی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ کیا کروں، سلطان کے علاوہ گھر میں کوئی نہیں تھا آپا بھی شام ہی کو آنے والی تھی۔ سلطان کو اپنی طبیعت کی خرابی کا بتا کر پریشان نہیں کرنا چاہتی تھی اس لیے انہیں سوتا چھوڑ کر دوسرے کمرے میں آ گئی۔

میں درد کی شدت سے نڈھال ہو رہی تھی۔ اللہ

سے دعا کر رہی تھی کہ اللہ میری مدد کے لیے کسی کو بھیج دے۔ وہ بلی اس وقت بھی کمرے میں آ گئی اور بے قراری سے میرے اردگرد ٹہلنے لگی۔ میں جھنجلائی ہوئی تھی پریشان تھی۔ تیز لہجے میں بلی سے کہا۔

"کیا میرا تماشہ دیکھنے کے لیے آئی ہے کبھی تیرے ہاں بچہ پیدا نہیں ہوا تجھے نہیں پتا کہ اس وقت کیا حالت ہوتی ہے۔ اگر نہیں تو اللہ کرے تیرے بھی بچے ہوں۔" میری بات سن کر وہ چھلانگ لگا کر باہر چلی گئی اور میں اللہ کو اپنی مدد کے لیے پکارنے لگی۔

اور تب ہی آپا کمرے میں داخل ہوئیں، میں انہیں اچانک دیکھ کر حیران رہ گئی۔

"آپا تم، اس وقت کیسے آ گئیں، تمہیں کیسے پتا چلا کہ۔" آپا نے میری بات کا کوئی جواب نہیں دیا اور منہ پر انگلی رکھ کر مجھے خاموش رہنے کا اشارہ کیا۔ میں تو خود حال سے بے حال ہو رہی تھی۔ اس لیے آپا کی خاموشی کو محسوس نہیں کیا شاید وہ زیر لب کوئی دعا پڑھ رہی تھیں۔

پھر اللہ نے میری مشکل آسان کر دی میرے یہاں بیٹا آیا تھا ہوش وحواس درست ہوئے تو مجھے آپا کی خاموشی عجیب سی لگی۔ وہ چپ چاپ کاموں میں لگی تھیں۔ میں نے دو تین دفعہ انہیں پکارا تو انہوں نے لحہ بھر کو میری جانب دیکھا ان کے لب مسکرائے پھر وہ کمرے سے باہر نکل گئیں فوراً ہی واپس آ گئیں ان کے ہاتھ میں کچھ کھانے کے لیے تھا وہ انہوں نے میرے قریب رکھا اور جھک کر میرے بیٹے کو پیار کرنا چاہا لیکن فوراً تیزی سے پیچھے ہٹ گئیں۔

"کیا ہوا آپا تمہیں اچھا نہیں لگا۔" میں نے انہیں تیزی سے پیچھے ہٹتے ہوئے دیکھا تو پوچھا اور اس لمحے انہوں نے نگاہ اٹھا کر میری جانب دیکھا اف میرے خدا آپا کی گہری سیاہ آنکھیں ان آنکھوں میں ہزاروں حسرتیں تھیں اداسی تھی، ان کے لبوں پر ایک پھیکی سی مسکراہٹ تھی اور آنکھیں...... مجھے ایسا لگا جیسے ان کی آنکھوں میں ننھے منے دیے روشن ہوں، جو ایک لمحے کو جلتے ہوئے دکھائی دیے پھر آنکھیں صاف دکھائی دیتیں پھر آنکھوں کی جگہ دیے روشن ہو جاتے۔

میں یہ منظر دیکھ کر بوکھلا سی گئی۔ پھر مجھے اپنی آنکھوں پر شک ہونے لگا کہ میری ہی آنکھوں میں کچھ ہو گیا ہے۔ یہ تو میری آپا ہیں ان کی آنکھیں ایسی کیسی ہو سکتی ہیں۔

"آپا یہ تمہاری آنکھوں کو۔" میں نے پوچھنا چاہا کہ اچانک آگے بڑھ کر آپا نے میرا سر اپنے ہاتھوں میں تھاما اور اپنے لب میری پیشانی پر رکھ دیے۔

اور مجھے ایسا لگا جیسے کسی نے دو دہکتے ہوئے انگارے میرے پیشانی پر رکھ دیے ہوں میرا سر چکرانے لگا اور شاید میں بے ہوش ہو گئی تھی۔

ہوش آیا تو مجھے اپنے کانوں میں شور سا سنائی دیا بچے اور آپا میرے اوپر جھکے ہوئے تھے آپا میرا نام لے لے کر پکار رہی تھیں۔

میں نے بمشکل اپنی آنکھیں کھولیں سر بہت بھاری ہو رہا تھا اور اس میں شدید درد تھا آپا کا چہرہ سامنے نظر آیا تو میں نے جھٹ آنکھیں بند کر لیں۔

"کیا ہوا میرن، آنکھیں تو کھول، مجھ سے بات کر میری بہن۔" آپا کی بھرائی ہوئی آواز، محبت سے لبریز لہجے نے مجھے آنکھیں کھولنے پر مجبور کر دیا۔

"آپا تم۔" میں نے ڈرتے ڈرتے کہا۔

"ہاں، میں تیری آپا...... کیا ہو گیا ہے تجھے کیسی نیند سو رہی تھی بڑی مشکل سے جاگی ہے ہم تو پریشان ہو گئے تھے اور یہ منا کب آیا تو نے مجھے کیوں نہیں بلوایا۔" آپا نے کہا تو میں ان کی شکل دیکھتی رہ گئی یہ کیا کہہ رہی ہیں آپا کہ "مجھے کیوں نہیں بلایا۔" تو میرے

ساتھ کون تھا؟ وہ کون تھی جس کی آنکھوں میں دیے جل بجھ رہے تھے اور جس نے مجھ سے ایک بھی بات نہیں کی میرا دماغ ماؤف ہونے لگا فی الحال وہ بات آپا کو بتا کر میں پریشان نہیں کرنا چاہ رہی تھی اس لیے کہا۔

''گلی سے آپا حمیدہ آ گئی تھیں سب خیر رہی پھر پوچھا کہ کیا ٹائم ہوا ہے تو آپا نے بتایا کہ مغرب کی اذان ہونے والی ہے گویا دن ڈھل چکا تھا۔

آپا مجھ سے یہ کہہ کر اپنے گھر چلی گئیں کہ میں گھر پر بتا کر آتی ہوں کہ میں دو چار دن یہیں رہوں گی۔

پھر آپا پورے ہفتے میرے گھر رکی رہیں آپا کے ہاں اولاد نہیں ہوئی تھی اس لیے رکنے کے لیے انہیں کوئی مسئلہ نہیں تھا۔

اتنے دن آپا نے میرا بہت خیال رکھا محلے والے اور رشتے دار بھی آتے رہے اس دن میں چھٹی نہائی آپا میرے اور بچے کے نئے کپڑے لے کر آئی تھیں میں نہا کر بیٹھی تھی تو آپا نے پنجیری کا بھرا ہوا پیالہ میرے ہاتھ میں تھما دیا کہ میں یہ کھالوں۔ پھر وہ کچن میں چلی گئیں تب وہ سفید بلی ایک بار پھر میرے پاس آئی اس نے اپنے آگے کے پنجے چارپائی کی پٹی پر ٹکائے اور بولی ''میاؤں''

''ہاں ہاں تو ہی رہ گئی تھی مبارک باد دینے کے لیے خیر مبارک۔'' میں نے حسب عادت اس سے بات کی، پھر پیالے سے تھوڑی سی پنجیری نکال کر زمین پر رکھ دی اور کہا۔ ''لے تو بھی کھالے لیکن یاد رکھ جب تیرے ہاں بچہ پیدا ہو تو تجھے میری دعوت کرنی پڑے گی۔'' اپنی بات کہہ کر میں خود ہی زور سے ہنس پڑی۔ اس نے مجھ سے ایک بار پھر میاؤں کیا اور زمین پر پڑی پنجیری کھانے لگی پھر اطمینان سے بیٹھ کر اپنا منہ چاٹنے لگی۔

کھانے سے فارغ ہو کر میں بچے کو گود میں لے کر سلطان کے پاس گئی اور انہیں بچے کو دکھایا۔

اپنی بے بسی اور بے کسی کو محسوس کر کے سلطان کی آنکھوں میں آنسو آ گئے وہ بھرائے ہوئے لہجے میں بولے۔

''میں کتنا بے بس اور بے کس ہوں تمہاری اس مشکل گھڑی میں بھی تمہارے کام نہ آ سکا یہ کس وقت پیدا ہوا اور گھر میں کون آیا مجھے بالکل بھی پتا نہیں چلا۔

''پتا نہیں کیوں اللہ نے مجھے زندہ رکھا ہوا ہے میرا یہ مفلوج جسم کسی کے کام نہیں آ سکتا اس سے اچھا تو وہ بخار مجھے اپنے ساتھ لے جاتا میں تو تمہارے اوپر بوجھ بن کر رہ گیا ہوں۔'' سلطان یہ کہتے ہوئے بلک بلک کر رو پڑے۔

ان کو اس طرح روتے ہوئے دیکھ کر میں بھی اپنے آنسو ضبط نہ کر سکی اور رو پڑی۔ میں روتے ہوئے انہیں تسلی دے رہی تھی کہ شاید اللہ کو ہماری آزمائش مقصود ہے اور اللہ انہی لوگوں کو آزماتا ہے جن سے وہ پیار کرتا ہے اس کا کہنا ہے کہ وہ کسی انسان پر اس کی قدرت سے زیادہ بوجھ نہیں ڈالتا جس طرح سیاہ اور طویل رات گزر جاتی ہے اور پھر سورج نکل آتا ہے اندھیرا ختم ہو جاتا ہے اور روشنی پھیل جاتی ہے اس طرح ہمارے یہ برے دن بھی ہمیشہ نہیں رہیں گے۔ ہمیں صبر سے اچھے دنوں کا انتظار کرنا ہے اور مجھے دن تب ہی آئیں گے جب اللہ چاہے گا آئندہ اپنے آپ کو کبھی بوجھ نہ سمجھنا، زندگی اللہ کی امانت ہے۔ وہ جس حال میں بھی رکھے ہمیں ہر لمحہ اس کا شکر گزار ہونا چاہیے اور آپ یہ بھی تو دیکھیں کہ ہمارا ہر کام ہو ہی رہا ہے جو لوگ اللہ پر توکل اور قناعت کرتے ہیں اللہ اپنے دوسرے بندوں کے دلوں میں ان کے لیے رحم و محبت ڈال دیتا ہے میں اب فارغ ہو گئی ہوں نا تو آپ دیکھیے گا میں محنت کروں گی۔ اپنے بچے بھی

پالوں گی اور آپ کا علاج بھی کراؤں گی۔"

"تم...... تم محنت کرو گی...... کیا کرو گی؟" انہوں نے چونک کر ہلکے غصیلے لہجے میں کہا۔

"میں بہت اچھی سلائی اور کڑھائی کر لیتی ہوں گھر بیٹھ کر وہی کروں گی اللہ برکت دے گا بس آپ گھبرایا مت کریں آپ ہیں تو میری ہمت سلامت ہے آپ نہیں رہے تو میں بھی نہیں جی سکوں گی۔

میں دیر تک سلطان سے بیٹھی ایسی حوصلہ افزا باتیں کرتی رہی۔ تب ہی میں نے کمرے کے دروازے کے پاس سفید بلی کو بیٹھے دیکھا۔

میں نے سلطان کا دھیان بٹانے کی غرض سے ان کی توجہ اس سفید بلی کی جانب دلائی کہ دیکھیے کتنی پیاری بلی ہے یہ تو خود بخود ہمارے گھر پل گئی ہے۔

میرا یہ جملہ ادا ہی ہوا تھا کہ وہ اٹھ کر باہر بھاگ گئی۔ پھر دو تین روز تک مجھے گھر میں دکھائی نہیں دی۔

اب میں گھر میں چلتی پھرتی تھی اور گھر کے کام کاج انجام دیتی تھی آپا کا معمول تھا روز بچوں کو لے جائیں تھیں اور شام کو واپس لے آتی تھیں اس دن آئیں تو بولیں۔

"امیرن بچے اب بڑے ہو گئے ہیں انہیں مدرسے میں قرآن پاک پڑھنے کے لیے بٹھا دو۔"

میں نے آپا سے کہا کہ "آپا یہ کام تم ہی انجام دے دو مجھے تو فرصت نہیں ہے۔" تو آپا راضی ہو گئیں۔

بچے مدرسے جانے لگے سلطان بھی یہ سن کر خوش ہو گئے وہ بچوں کو تعلیم دلوانا چاہتے تھے۔ اس روز بچے مدرسے گئے ہوئے تھے میں کچن میں مصروف تھی کہ کس نے دروازہ کھٹکھٹایا میں نے جا کر دیکھا تو ایک درویش نما فقیر دکھائی دیا مجھ سے بولا۔

"اللہ کے نام پر بابا کو کچھ دے۔"

"بابا کھانا کھاؤ گے۔" میں نے پوچھا۔

"لا کھلا...... یاد رکھ میں بہت بھوکا ہوں تیرے گھر کا سارا کھانا کھا جاؤں گا دے سکتی ہے۔"

"ہاں بابا تم سارا کھا لو کوئی بات نہیں۔" میں نے نرم لہجے میں کہا۔

"پھر تیرا میاں اور بچے کیا کھائیں گے۔" بابا نے پوچھا۔

"ان کا رازق اللہ ہے وہی انہیں کھلائے گا۔" میں نے کہا اور پلٹ کر جانے لگی تو بابا نے کڑک لہجے میں کہا۔

"رک......!" تو میں پلٹ آئی۔ میں بابا کے اس لہجے سے ڈر سی گئی سہمے ہوئے لہجے میں کہا۔

"جی بابا۔"

"تیرا شوہر بیمار ہے۔ تو اس کے لیے پریشان ہے۔" اس وقت بھی بابا کا لہجہ سخت ہی تھا۔

"جی بابا...... وہ......!"

"مفلوج ہے...... بستر پر پڑا ہے۔" بابا نے میری بات تیزی سے کاٹ کر کہا۔

"بابا آپ کو کیسے پتا۔"

"ہمیں اندر اس کے پاس لے چل ذرا ہم بھی تو دیکھیں کہ جوان مرد کیوں بستر پر پڑا ہے۔" بابا نے پھر میری بات درمیان سے کاٹ دی۔

"آ...... آپ...... اندر...... اندر آ جائیں......!" میں حیران بھی تھی اور سہمی ہوئی بھی اس لیے بات کرتے ہوئے ہکلانے لگی۔

بابا جھٹ اندر آ گئے اور مجھ سے آگے چلتے ہوئے سیدھے سلطان کے کمرے میں پہنچ گئے میں ان کے پیچھے پیچھے کمرے میں پہنچی۔

سلطان اچانک اپنے سامنے یوں کسی اجنبی کو دیکھ کر حیران ہو گئے اور بولے "آپ کون۔"

"نہ سلام نہ دعا بس منہ پھاڑ کر کہہ دیا آپ کون!

مسلمان دوسرے مسلمان کو دیکھ کر پہلے سلام کرتا ہے السلام وعلیکم!'' بابا نے سلطان کو جھڑک دیا پھر اپنے کندھے سے تھیلا اتار کر زمین پر رکھا اور بستر کے پاس کھڑے کھڑے سلطان کا ہاتھ پکڑ کر کھینچا اور انہیں بٹھا دیا سلطان کے منہ سے ایک کراہ نکل گئی۔

''آرام سے بابا...... یہ بیمار ہیں۔'' میرے منہ سے بے ساختہ نکلا اور میں آگے بڑھی۔

''ادھر ہی کھڑی رہ چپ چاپ۔'' وہی سخت دبنگ لہجہ تھا' میرے قدم وہیں جم گئے۔

پھر بابا فرش پر آلتی پالتی مار کر بیٹھ گئے تھیلے میں سے دو پتھر نکالے سیاہ رنگ کے یہ تقریباً چھ انچ کے سائز کھردرے پتھر تھے پھر تھیلے میں ہاتھ ڈال کر کچھ تلاش کرتے رہے بالآخر ان کا ہاتھ باہر آیا تو اس میں کچھ پتے تھے بالکل سبز اور تازہ میری سمجھ میں نہیں آیا کہ یہ کس درخت کے پتے ہیں۔ وہ انہوں نے پتھر پر رکھ کر کوٹنے شروع کر دیے۔

انہوں نے دو تین ضرب ہی لگائی تھیں کہ حیرت انگیز طور پر وہ چٹنی کی طرح پس گئے ان میں سے سبز رنگ کا رقیق مادہ بہنے لگا۔

بابا نے وہ سارا رقیق مادہ اپنے ہاتھ میں منتقل کیا اور کھڑے ہو کر سلطان کو زوردار آواز میں حکم دیا۔

''اٹھ کر بیٹھ جا۔''

سلطان بے چارگی سے میری جانب دیکھنے لگے۔ ان کے اندر خود سے اٹھ کر بیٹھنے کی سکت نہیں تھی۔ میں جب انہیں کھانا وغیرہ کھلاتی تھی بڑی مشکل سے انہیں تکیوں کے سہارے اٹھا کر بٹھاتی تھی اس پر بھی وہ پوری طرح بیٹھ نہیں پاتے تھے آدھے لیٹے آدھے بیٹھے ہوتے تھے۔

''اس کی طرف کیا دیکھ رہا ہے خود سے اٹھ کر بیٹھ۔'' بابا نے سلطان کو زور سے ڈانٹا۔

''بابا میں...... میں بے بس ہوں بابا خود سے بیٹھ نہیں سکتا، بلکہ......!'' سلطان نے روہانسے لہجے میں جواب دیا۔

''اچھا...... یہ بات ہے۔'' بابا نے یہ کہتے ہوئے پھر جھک کر سلطان کا ہاتھ پکڑ کر جھٹکے سے اپنی جانب کھینچا۔

سلطان کے منہ سے زوردار کراہ نکل گئی۔ بابا سلطان کی تکلیف سے بے پروا تھے انہوں نے پیچھے سے سلطان کی قمیص اٹھائی اور ان کی ریڑھ کی ہڈی پر اس کی مالش کرنے لگے۔ میں یہ دیکھ کر حیران رہ گئی کہ وہ مادہ تیل کی مانند چکنا تھا۔

دو تین ہاتھ مارنے کے بعد بابا نے سلطان کے گھٹنوں پر ٹانگوں پر بھی زور زور سے دوائی والے ہاتھ کو رگڑا۔ پھر انہوں نے عجیب حرکت کی اور میرے منہ سے بے ساختہ چیخ نکل گئی اس چیخ میں سلطان کی چیخ بھی شامل تھی۔

انہوں نے پتھروں سے دو ضربیں سلطان کی کمر کے نچلے حصے میں لگائیں اور ایک ایک ضرب اس کے گھٹنوں پر لگائی۔

اللہ جانے سلطان کو کتنی تکلیف ہوئی ہوگی کہ وہ بے ہوش ہو کر بے دم سے چارپائی پر گر پڑے۔

میں بری طرح رونے لگی۔ میں نے بابا کے چہرے پر ایک عجیب سی پراسرار مسکراہٹ دیکھی مجھے روتے ہوئے دیکھ کر بولے۔

''اب تیرے دکھ کے دن ختم ہو گئے ہمارا بھی کام ختم ہو گیا ہمیں تو جو حکم ملا تھا۔ وہ ہم نے پورا کر دیا۔''

''بابا...... یہ...... یہ آپ نے کیا کیا...... سلطان کی ہڈیاں تو نہیں توڑ دیں وہ بے ہوش ہو گئے ہیں۔'' میں نے روتے ہوئے کہا۔

''یہ اب تو دیکھتی رہ کہ کیا ہوا ہے اور کیا نہیں۔'' بابا نے بے نیازی سے کہا اور اپنا تھیلا اٹھا کر تیز قدموں

سے باہر کی جانب لپکے۔
بابا کے جانے کے بعد میں لپک کر سلطان کی جانب بڑھی اور انہیں زور زور سے آوازیں دیں۔ سلطان عجیب انداز میں جھٹکے سے سانس لے رہے تھے۔
"منحوس بڈھے تو نے کیا کر دیا میرے شوہر کے ساتھ۔"
میں غصے اور رنج کی کیفیت میں تنتناتی ہوئی باہر کی جانب لپکی گلی میں جھانکا تو بابا کا نام ونشان نہیں تھا۔
میں سلطان کے پاس بیٹھی زور زور سے رو رہی تھی تب ہی وہ سفید بلی میرے پاس آ گئی اور بے چینی سے چارپائی کے گرد چکر کاٹتی ہوئی میاؤں میاؤں کرنے لگی۔
"چل دفع ہو یہاں سے تو نے اور میرا دماغ خراب کر رکھا ہے۔" میں نے زور سے اسے جھڑکا۔
میں ادھر پریشان بیٹھی تھی ادھر میرا بچہ رو رو کر ہلکان ہوا جا رہا تھا میری سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ کیا کروں، کدھر جاؤں، کس کو بلاؤں پھر سوچا کہ جا کر اس کو گود میں اٹھا لاتی ہوں۔
دوسرے کمرے میں گئی تو دیکھا کہ سفید بلی بستر پر چڑھی فاخر کے پاس بیٹھی ہے۔ مجھے دیکھا تو چھلانگ لگا کر بستر سے اتر کر بھاگ گئی۔
میں نے فاخر کو گود میں اٹھا کر سینے سے لگایا تو وہ چپ ہو گیا پھر بھاگتی ہوئی سلطان کے پاس آ گئی۔
اب ان کی سانسیں تو ٹھیک ہو گئی تھیں لیکن ان کا جسم تپنا شروع ہو گیا پھر دیکھتے ہی دیکھتے انہیں تیز بخار ہو گیا۔
میں قرآنی آیات پڑھ پڑھ کر ان پر دم کرنے لگی۔ میں آج بھی ان لمحات کو یاد کرتی ہوں تو بے ساختہ رونا آ جاتا ہے میں بچے کو گود میں لیے سلطان کے پاس بیٹھی تھی اور اللہ سے گڑگڑا کر دعائیں کر رہی تھی۔

باتوں سے خوشبو آئے

محبت اور عزم جو ہم دوسروں سے حاصل کرتے ہیں دراصل ہمارے اپنے کردار کا تحفہ ہوتے ہیں۔
❖ مستقبل وہ نہیں جو ہم کل کے لیے بناتے ہیں بلکہ وہ ہے جو ہم آج سرانجام دیتے ہیں حال میں اچھے کام کریں اور مستقبل میں اچھا پھل حاصل کریں۔
❖ زندگی ایک مکمل کتاب ہے اور غلطی کتاب کا صرف ایک ورق ہے تو ایک ورق کے لیے مکمل کتاب ضائع مت کریں۔

تابش علی......کراچی

پھر میں نے دیکھا کہ سلطان کو پسینہ آنا شروع ہو گیا اتنا زیادہ پسینہ آیا کہ نہ صرف ان کے کپڑے بلکہ بستر کی چادر بھی گیلی ہو گئی۔
میں دوپٹے سے سلطان کا چہرہ صاف کر رہی تھی اور یہ اطمینان ہو گیا کہ بخار اتر رہا ہے۔
سلطان کا جسم نارمل ہو گیا تب انہوں نے آہستہ سے اپنی آنکھیں کھولیں میری جانب دیکھا اور بولے۔
"امیرن تم رو کیوں رہی ہو؟" اس جملے کے ساتھ ہی انہوں نے غیر ارادی طور پر اپنی سیدھی رکھی ٹانگ ہلائی۔
میں نے یہ خوشگوار حیرت انگیز منظر دیکھا اور مارے خوشی کے میرے منہ سے چیخ نکل گئی۔
"سلطان آپ نے اپنی ٹانگ ہلائی ہے۔"
"کیا؟" انہوں نے بھی حیرت سے کہا اور ارادتاً دوبارہ ٹانگ ہلائی تو وہ ہلنے لگی گویا اس مفلوج اور مردہ ٹانگ کو زندگی مل گئی تھی۔
سلطان نے دونوں ٹانگیں پیٹ کی جانب موڑیں تو وہ کپکپاتی ہوئی پیٹ کی جانب مڑ گئیں۔
"ارے ہاں۔" انہوں نے پرمسرت لہجے میں کہا اور خود سے اٹھنے کی کوشش کی اور ذرا سی کوشش کے بعد

وہ اٹھ کر بیٹھ گئے۔

"سلطان آپ ٹھیک ہو گئے بابا نے آپ کا علاج کر دیا۔" میں نے بچے کو ایک ہاتھ میں منتقل کیا اور سلطان کے گلے لگ گئی اور ہم دونوں رونے لگے۔

پھر میں نے سلطان کے پھیلے ہوئے ہاتھوں میں فاخر کو تھما دیا سلطان نے اس کا منہ چوما اور سینے سے لگا لیا اور میں وضو کر کے شکرانے کے نفل ادا کرنے لگی۔

پھر سلطان چلنے پھرنے لگے ہم اس پراسرار فقیر بابا کے بارے میں سوچتے تو کچھ سمجھ میں نہیں آتا کہ وہ کون تھا کہاں سے آیا اور کس نے اسے یہاں بھیجا تھا۔

سارا خاندان خوش تھا لوگ سلطان کی صحتیابی کی مبارک دینے آ رہے تھے ہم نے بابا کے بارے میں کسی کو نہیں بتایا اور نہ ہی یہ بتایا کہ یہ معجزہ ایک دم رونما ہو گیا ہے۔

سلطان کی صحتیابی میرے لیے زندگی کی سب سے بڑی خوشی تھی۔ ایک دن میں نے مبارک کی آئی ہوئی مٹھائی کا ایک ٹکڑا سفید بلی کے آگے ڈالتے ہوئے کہا۔

"لے تو بھی منہ میٹھا کر میں بہت خوش ہوں۔" اس بلی نے مٹھائی بھی کھالی کمال کی بلی تھی وہ۔

دوسری خوشی مجھے یہ ملی کہ اللہ نے شادی کے دس سال کے بعد آپا کی گود ہری کر دی۔ اللہ نے انہیں پیاری سی بیٹی دی تھی۔

ان دنوں حالانکہ غربت تھی لیکن میں بہت خوش رہتی تھی سلطان اب چھوٹا موٹا کام کرنے لگے تھے۔ کچھ نہ ہونے سے ان کی کم آمدنی بھی میرے لیے بہت تھی۔

ایک دن اس سفید بلی کے آگے روٹی رکھتے ہوئے میں نے اس سے کہا۔ (ان دنوں میرا موڈ بہت اچھا رہتا تھا اور میں اپنی پرانی جون میں لوٹ آئی تھی)

"کیا بات ہے میری پیاری بلی تم اکیلی گھومتی رہتی ہو، کسی بلے سے شادی وادی کر لو، بچے پیدا کرو اپنا گھر بساؤ جب دیکھو یہاں اکیلی پڑی رہتی ہو۔"

میری بات سن کر وہ سفید بلی ناراض ہو گئی اس نے کھانا نہیں کھایا اور پلٹ کر چلی گئی۔

"لو بھئی تم تو ناراض ہو گئیں، میں تو مذاق کر رہی تھی۔ کھانا تو کھا لو۔" میں نے اسے آواز دی۔

اس نے پلٹ کر میری جانب دیکھا اور دیوار پر چڑھ کر گھر کے باہر کود گئی۔

میں نے اس کا کھانا وہیں رکھا رہنے دیا کہ ابھی گھوم پھر کر آئے گی تو کھا لے گی۔ لیکن دوسرے دن تک وہ کھانا یوں ہی پڑا رہا۔ نہ وہ آئی اور نہ ہی اس نے کھایا۔

پھر ہفتوں وہ مجھے گھر میں دکھائی نہیں دی......

مجھے بار بار اس کا خیال آتا تو بڑا املال ہوتا کہ واقعی وہ تو ناراض ہو گئی ہے۔

تقریباً ڈیڑھ دو ماہ بعد ایک دن میں دوپہر کو سو رہی تھی گھر میں تنہا تھی تو اس کی میاؤں سے میری آنکھ کھلی۔ وہ میرے تکیے کے پاس تھی اور شاید مجھے جگا رہی تھی میں نے خوشی اور محبت سے اس کو ہاتھ لگانا چاہا تو وہ پھرتی سے بستر سے اتر گئی۔

مسلسل میاؤں میاؤں کر رہی تھی میری پر مزاح رگ پھڑ پھڑکی تو میں نے کہا۔

"لگتا ہے تو نے بھی شادی وادی کر لی ہے۔ جب ہی تو اتنے دنوں سے غائب تھی اور لگتا ہے تو ماں بھی بننے والی ہے۔" میں نے اس کے گول مٹول جسم کو دیکھتے ہوئے کہا تو وہ پھرتی سے باہر بھاگ گئی۔

سردیاں شروع ہو چکی تھیں۔ مجھے احساس تھا کہ میری بلی بچے دینے والی ہے۔ ایک دن میں نے پرانے کپڑوں کا بستر سا بنا کر رکھ دیا اور اس سے کہا اپنے بچے یہاں رکھ لینا بہت سردی ہے۔"

مجھے اس بلی سے گہرا لگاؤ اور انسیت ہو گئی تھی اب

میں اس کا بہت خیال رکھا کرتی تھی۔

اس رات بہت سردی تھی باہر بارش بھی ہو رہی تھی سلطان دوسرے کمرے میں تھے اور میں بچوں کے ساتھ باہر والے کمرے میں تھی۔ اس کمرے میں اس لیے سوتی تھی کہ رات کو بچوں کو واش روم جانے کی ضرورت ہوتی تھی تو مجھے آسانی ہو جاتی تھی واش روم صحن کے کونے میں تھا اور بچوں کے اٹھنے سے سلطان بھی ڈسٹرب نہیں ہوتے تھے۔

اس رات سوتے ہوئے اچانک میری آنکھ کھلی تو احساس ہوا کہ کوئی باہر کا دروازہ کھٹکھٹا رہا ہے آواز متواتر آ رہی تھی۔

میں اٹھ کر بیٹھ گئی کہ اتنی سردی اور بارش میں اتنی رات گئے کون آیا ہوگا۔

پہلے سوچا کہ سلطان کو جگا لوں پھر سوچا کہ خود ہی دیکھ لیتی ہوں خوامخواہ ان کی نیند کیوں خراب کروں اس زمانے میں چوری چکاری کا کوئی ڈر و خوف نہیں تھا۔

میں نے گرم چادر خوب اچھی طرح اپنے گرد لپیٹی اور بارش کی بوچھاڑ سے بچتی ہوئی باہر دروازے کی جانب بڑھی اب آواز صاف اور واضح آ رہی تھی۔

''کون ہے؟'' میں نے دروازے کے قریب جا کر دھیمی آواز میں پوچھا۔ تو کوئی جواب نہ آیا البتہ دروازہ دوبارہ بجا۔

میں نے دروازہ کھولا تو دو اجنبی افراد کو دروازے پر کھڑا پایا جن کے قد غیر معمولی لمبے تھے انہوں نے سفید لباس پہنے ہوئے تھے سفید کرتا اور سفید تہہ بند پہنا ہوا تھا۔

''کون ہیں آپ؟'' میں نے پوچھا۔

''آپ کو آپ کی سہیلی نے بلایا ہے آپ کو ابھی اور اسی وقت ہمارے ساتھ چلنا ہے ہم سواری ساتھ لائے ہیں۔'' ان میں سے ایک بولا۔

''کون سی سہیلی؟'' میں نے حیرت سے کہا اور تب ہی میری نگاہ سامنے کھڑی ایک بگھی پر پڑی بہت شاندار بگھی تھی اس میں چھ سفید گھوڑے جتے ہوئے تھے۔

میری نگاہ دوبارہ اس شخص کے چہرے پر پڑی جس کی بڑی بڑی آنکھوں سے مجھے روشنی سی نکلتی ہوئی دکھائی دی۔

میرے اندر ایک عجیب سا خوف سرایت کر گیا میں نے چاہا کہ دروازہ بند کر کے اندر پلٹ جاؤں لیکن ایسا نہ کر سکی زمین نے جیسے میرے قدم جکڑ لیے۔

''آپ جلدی چلیں ہمارے پاس ٹائم نہیں ہے۔'' اس شخص نے کھڑکھراتی ہوئی آواز میں کہا۔

''وہ......وہ میں......!'' میں اتنا ہی کہہ سکی کہ اس شخص نے میری کلائی پکڑ کر جھٹکے سے کھینچی اور میں جیسے ہوا میں اڑتی ہوئی اس بگھی میں جا کر بیٹھ گئی۔

میرے بیٹھتے ہی وہ دونوں اشخاص آگے بیٹھ گئے یہ سب کچھ منٹوں میں نہیں سیکنڈوں میں ہو گیا وہ دونوں بھی اپنی جگہ سے کھڑے کھڑے بگھی میں سوار ہو گئے انہوں نے گھوڑوں کی لگامیں تھامی تو گھوڑے سرپٹ دوڑنے لگے۔ دوڑ کیا رہے تھے وہ بھی ہوا میں پرواز کر رہے تھے۔

میرا یہ حال تھا کہ کاٹو تو بدن میں لہو نہیں میرا دل اتنی زور سے دھڑک رہا تھا کہ اس کے دھڑکنے کی صدا مجھے خود اپنے کانوں میں سنائی دے رہی تھی۔ بدن پر لرزہ طاری تھا۔

میں گھبراہٹ میں کبھی سورۃ الفاتحہ پڑھنے کی کوشش کرتی پھر بھول جاتی، تو کبھی سورۃ الاخلاص پڑھنے کی کوشش کرتی آیۃ الکرسی پڑھنے کی کوشش کرتی تو چند الفاظ کے علاوہ پڑھ نہ سکتی میں یہ زیر لب پڑھنے کی کوشش کر رہی تھی تب ہی ایک شخص بولا۔

"خاتون آپ گھبرایے مت ہم آپ کو کوئی نقصان نہیں پہنچائیں گے بلکہ آپ تو ہماری مہمان ہیں اور ہم مہمان نوازی کرنا خوب جانتے ہیں مہمان نوازی تو ہمارے انبیاء کی سنت ہے۔"

"مم...... مجھے کس نے بلایا ہے؟" اس کے منہ سے یہ ساری باتیں سننے کے بعد میری کچھ ہمت بندھی تو میں نے ڈرتے ڈرتے پوچھا۔

"آپ کی سہیلی نے۔" اس نے جواب دیا پھر بولا۔ "آپ شاید انہیں بھول گئی ہیں لیکن انہیں آپ یاد ہیں وہ ہماری شہزادی ہیں اور ہم ان کے خادم ہیں آپ ان سے ملیں گی تو انہیں پہچان جائیں گی۔ بس اب ہم وہاں پہنچنے ہی والے ہیں۔" اور میں دل ہی دل میں سوچ رہی تھی کہ یا اللہ میری کوئی سہیلی تو کہیں کی شہزادی نہیں ہے۔ بلکہ میری تو کوئی خاص سہیلی ہے ہی نہیں یہ سب مجھے بہت پر اسرار لگ رہا تھا ڈر بھی تھا اور فطری تجسس بھی تا۔

اور پھر وہ بگھی رک گئی۔

"آیئے تشریف لے آیئے۔" اس نے کہا تو میں بگھی سے اتر گئی۔ اطراف میں دیکھا تو میری حیرت کی انتہا نہ رہی میں ایک گھنے جنگل میں کھڑی تھی ہر جانب اونچے اونچے درخت تھے اور ہر سو اندھیرا پھیلا تھا۔

یا اللہ یہ مجھے کہاں لے آئے ہیں کون ہیں یہ اجنبی مرد، ان کے کیا ارادے ہیں اور میں کیوں چلی آئی ان کے ساتھ میرا جی چاہا کہ میں یہاں سے جدھر منہ اٹھے بھاگ جاؤں۔

تب ہی اس شخص نے اس درخت کی جڑ کے پاس زور سے اپنا پاؤں مارا اور وہ سارا جنگل میری آنکھوں کے سامنے سے غائب ہو گیا۔ میں ایک وسیع وعریض محل نما گھر کے سامنے کھڑی تھی گیٹ پر دربان کھڑے تھے اور مشعلیں جا بجا روشن تھیں۔

"آیئے بلا خوف وخطر چلی آیئے۔" اس شخص نے آگے قدم بڑھاتے ہوئے کہا اور میں حیران وپریشان اس کے پیچھے چل دی۔ اس وقت تو حقیقت میں چکر آنا شروع ہو گئے تھے اور مجھے یقین ہو چلا تھا کہ میں غیر مرئی مخلوق کے چنگل میں گرفتار ہو گئی ہوں۔

اندر داخل ہوئی تو کافی عورتیں جو ساری کی ساری زرق برق لباس میں ملبوس تھیں مجھے آتی جاتی دکھائی دیں لیکن میری جانب کسی نے توجہ نہیں دی۔

یہاں کافی چہل پہل اور رونق تھی تب ہی سامنے سے ہی نے ایک عمر رسیدہ عورت کو آتے ہوئے دیکھا اس نے بھی قیمتی لباس اور بھاری زیورات پہنے ہوئے تھے۔ وہ ہماری جانب ہی آ رہی تھی میرے قریب آ کر بولی۔

"شہزادی صاحبہ کی کنیز خاص برقیہ آپ کو خوش آمدید کہتی ہے اور آپ کی خدمت میں سلام پیش کرتی ہے۔"

"ہمارا کام پورا ہو گیا ہے برقیہ، اب مہمان کو آپ سنبھالیں۔" اس نے برقیہ نامی عورت کو مخاطب کرتے ہوئے کہا۔

"ابھی آپ کا کام ختم نہیں ہوا ہے آپ شہزادی کے اگلے حکم کا انتظار کریں۔" برقیہ نے کہا تو انہوں نے سر کو خم دے کر تسلیم کیا اور وہاں سے چلے گئے۔

"آیئے، شہزادی آپ کا بے صبری سے انتظار کر رہی ہیں۔" برقیہ نے مسکراتے ہوئے کہا اور آگے آگے چلنے لگی۔

کئی طویل برآمدوں سے ہوتے ہوئے ہم ایک کمرے کے سامنے رک گئے۔

"آپ اندر تشریف لے جائیں۔" اس نے کہا اور دوسری جانب مڑ گئی اور میں لرزتے ہوئے جسم کے ساتھ کھڑی سوچ رہی تھی کہ اندر جاؤں یا نہ جاؤں۔

"اندر آیئے امیرن، ہم آپ کے منتظر ہیں۔"

میرے کانوں میں ایک نہایت میٹھی اور شیریں آواز ٹکرائی، میں سمجھ گئی کہ یہ آواز کمرے کے اندر سے آئی ہے۔ تب میں نے ہمت کر کے لکڑی کا نفیس آبنوسی دروازہ اندر کی جانب دھکیلا تو وہ بے آواز کھلتا چلا گیا میں اندر داخل ہوگئی۔ میں نے اپنے آپ کو ایک بہت وسیع اور شاندار کمرے کے اندر پایا۔

سامنے ہی ایک حسین اور قیمتی چھپر کھٹ بچھا تھا اور اس پر ایک انتہائی حسین و جمیل لڑکی یا عورت لیٹی کم بیٹھی تھی۔

سفید دودھ جیسی بے داغ رنگت، بڑی بڑی نیلی آنکھیں اور سیاہ لمبے اور گھنے بال تھے۔

''آیئے امیرن۔'' وہ مسکراتی ہوئی نگاہوں سے میری جانب دیکھتے ہوئے بولی اور میں حسن بے تحاشہ کے سحر میں کھوئی ہوئی تھی حقیقت تو یہ تھی کہ میں نے اپنی زندگی میں اس سے زیادہ یا اس جیسی حسین عورت کوئی اور نہیں دیکھی تھی۔

''کیا آپ کو ہم سے ملنے کی خوشی نہیں ہے۔'' اس کی میٹھی آواز نے پھر مجھے چونکا دیا۔ میں اس کے سحر سے باہر گئی۔

''اچھا آپ بیٹھیے تو سہی ہم آپ کو پوری بات سمجھاتے ہیں آپ حیران اور پریشان ہونے میں حق بجانب ہیں کیونکہ آپ ہم سے واقف جو نہیں ہیں لیکن ہم آپ سے اچھی طرح واقف ہیں۔'' اس نے ایک بہت خوبصورت منقش کرسی کی جانب ہاتھ سے مجھے بیٹھنے کا اشارہ کرتے ہوئے کہا تو میں آہستہ قدموں سے چلتی ہوئی جا کر کرسی پر بیٹھ گئی۔ اس وقت بھی میرا اور اس کا خاصا فاصلہ تھا وہ کمرہ جس میں، میں بیٹھی تھی شاید میرے پورے گھر کے برابر تھا وہ تکیوں سے ٹیک لگا کر سنبھل کر بیٹھ گئی اس کی جسمانی حالت سے مجھے اندازہ ہوا کہ وہ ماں بننے والی ہے۔ وہ پھر بولی۔

''آپ بہت اچھی ہیں امیرن بہت مہربان، خوش اخلاق، ہر ایک کا خیال رکھنے والی میں نے ان ہی خوبیوں کی بناء پر تو آپ کو اپنی سہیلی بنایا ہے۔''

''آپ کی ساری الجھنیں ہم ابھی دور کیے دیتے ہیں جب ہم آپ کو اپنی حقیقت بتائیں گے کہ اصل میں ہم کون ہیں تو آپ کی سمجھ میں سب آجائے گا۔''

''آپ کو اپنے گھر آنے والی وہ سفید بلی تو یاد ہوگی ناہم وہی بلی ہیں۔'' اس کے اس انکشاف کو سن کر میں بری طرح لرزنے لگی خوف و دہشت سے ایسا لگ رہا تھا جیسے ابھی میرا دم نکل جائے گا۔

''ارے آپ تو گھبرا گئیں۔ آپ ذرا بھی خوف زدہ نہ ہوں یہ حقیقت ہے کہ میں انسان نہیں ہوں۔ میرا تعلق قوم اجنا سے ہے میں شہنشاہ جنات کی بیٹی ہوں الحمدللہ مسلمان ہوں اور شادی شدہ بھی ہوں لیکن بہت عیش و آرام کے باوجود میں ایک بہت بڑی نعمت سے محروم تھی ہاں میں اولاد جیسی نعمت سے محروم تھی۔

جب بہت دل گھبراتا تو دنیا میں یوں ہی گھومتی پھرتی تھی۔ کبھی کبھار انسانوں کی آبادی کی جانب نکل جاتی تھی۔

ایک دن میرا گزر آپ کے گھر کے پاس سے ہوا میں نے صحن میں آپ کے بچوں کو کھیلتے ہوئے دیکھا آپ بھی وہاں موجود تھیں بچوں کے ساتھ کھیل رہی تھیں نہ جانے کیوں مجھے وہ منظر اتنا اچھا لگا کہ میں وہیں رک گئی اور آپ لوگوں کو دیکھتی رہی پھر میں نے بلی کا روپ اختیار کیا اور آپ کے گھر میں آگئی۔

آپ کے ہاں سے آنے کے بعد میرا دوبارہ دل چاہا کہ آپ کے پاس جاؤں تو میں پھر چلی آئی آپ نے بڑے پیار سے مجھے پیالی میں دودھ ڈال کر دیا اور وہ میں نے صرف اس لیے پی لیا کہ آپ نے تو ایک بلی کو دودھ دیا تھا اور جانور کی یہ خصلت ہے کہ وہ

کھانے کی چیز کی جانب فوراً متوجہ ہو جاتا ہے۔ آپ یہی سمجھتی رہی کہ میں صرف ایک بلی ہی ہوں۔

میں آپ کے گھر آتی رہی میں آپ کے گھریلو حالات سے واقف تھی بہت دفعہ دل چاہا کہ کسی بھی طرح آپ کی مدد کروں۔ پھر یہ سوچ کر خاموش رہی کہ آپ پریشان ہو جائیں گی مجھے آپ کے بچے بہت اچھے لگتے تھے اور میں انہیں کھیلتا ہوا دیکھ کر خوش ہوتی تھی۔

آپ مجھ سے باتیں کرتی تھیں ایک مرتبہ آپ نے کہا تھا کہ تیرے بچے نہیں ہیں تو میں بہت روئی تھی ایک مرتبہ آپ نے مجھے مشورہ دیا کہ میں کسی بلے کے ساتھ شادی کروں بچے پیدا کروں تب بھی میں بہت دکھی ہوئی تھی۔

پھر اللہ نے آپ کے گھر ایک اور بچے کی خوشی دے دی۔ اس روز جب آپ کو تکلیف ہو رہی تھی اور آپ کے پاس کوئی بھی نہیں تھا تب میں نے ہی اپنے ہاں سے کسی کو آپ کی مدد کے لیے بھیجا تھا میں خود بھی وہاں موجود تھی۔

اللہ نے اس مرتبہ پھر آپ کو بیٹا دیا تھا میرا بارہا دل چاہا کہ آپ کے بچے کو میں اپنے ساتھ لے جاؤں لیکن پھر وہی خیال آیا کہ اللہ کو میرا یہ ظلم پسند نہیں آئے گا اور ہو سکتا ہے کہ اللہ میری دعائیں قبول نہ کرے اور میں ہمیشہ اولاد کی نعمت سے محروم رہوں۔

پھر آپ کے گھر دوسرا مسئلہ آپ کے بیمار شوہر کا تھا اس روز جب آپ اپنے نوزائیدہ بچے کو اپنے شوہر کے پاس لے گئیں تو وہ اسے گود میں اٹھا کر پیار نہ کر سکے اس روز آپ دونوں جب بے بسی میں روئے تب بھی مجھے بہت دکھ ہوا میں نے ایک بار پھر آپ کی مدد کا فیصلہ کیا۔ یہی سوچا کہ شاید اللہ کو میری یہ نیکی پسند آ جائے اور اللہ میری بھی مراد پوری کر دے۔

میں نے اپنے ہاں کے طبیبوں میں سے ایک ماہر طبیب کو آپ کے شوہر کے علاج کے لیے بھیجا۔ الحمد للہ کے وہ صحتیاب ہو گئے۔

اور پھر میرے اللہ نے حقیقت میں میری دعا سن لی میری سونی گود بھی آباد ہونے والی ہے بچوں کی پیدائش کسی وقت بھی متوقع ہے۔

بس اس خوشی کے موقع پر میں آپ کو نہیں بھولی میں سمجھتی ہوں کہ شاید یہ میری ان نیکیوں کا صلہ ہے جو میں نے آپ کے ساتھ کی تھیں بغیر کسی ستائش اور صلے کی تمنا کے بغیر۔

اتنا کہہ کر اس نے ایک زور سے سانس لی، پھر ایک زور دار کراہ اس کے منہ سے نکلی اور اس نے نڈھال انداز میں اپنا سر تکیے پر رکھ دیا۔

میں دم بخود اس کی باتیں سن رہی تھی۔ میرے دماغ میں وہ سفید بلی اور اس کی ساری باتیں کسی فلم کی ریل کی مانند چل رہی تھیں۔

اس کی کراہ سنی تو میرے منہ سے بے ساختہ نکلا ''کیا ہوا؟''

تو وہ مسکرانے لگی اور بولی۔ شاید میرے ننھے مہمان آنے والے ہیں پھر اس نے ہولے سے پکارا۔ ''برقیہ۔''

اور لمحہ بھر میں میری آنکھوں کے سامنے برقیہ موجود تھی۔ ''جاؤ اسے بلاؤ۔'' ہمیں اس کی مدد کی ضرورت ہے۔'' اس نے آنکھیں کھول کر برقیہ سے کہا پھر ایک تیز سسکی اس کے لبوں سے نکل گئی۔

''کیا تکلیف زیادہ ہے۔'' میں نے بے قراری سے پوچھا تو اس نے اثبات میں سر ہلا دیا اور پھر کمرے میں برقیہ کے ساتھ ایک بہت بوڑھی بھونس عورت دکھائی دی اس نے اجنبی زبان میں شہزادی سے کچھ اور اس کے قریب چلی گئی۔

”میرا خیال ہے مجھے اب چلنا چاہیے۔“ میں آنے والے لمحات کے بارے میں سوچ کر گھبرا کر کھڑی ہوگئی۔

”نہیں آپ ٹھہریں، ہمیں ماں بننے کی مبارک باد دیے بغیر جا رہی ہیں۔“ اس نے کہا تو اس بڑھیا نے بڑی ناگواری سے میری جانب دیکھا اور شہزادی کی جانب متوجہ ہوگئی۔ میں کمرے کے دوسرے سرے پر شہزادی کے بستر سے دور بیٹھی تھی۔ مجھے شدید گھبراہٹ ہو رہی تھی۔

اور پھر میری آنکھوں نے ایک انتہائی حیرت انگیز منظر دیکھا مجھے اپنی آنکھوں پر یقین نہیں آ رہا تھا کہ آیا میری آنکھیں جو کچھ دیکھ رہی ہیں وہ حقیقت ہے یا خواب۔

میں نے بڑھیا کے ہاتھوں میں ایک بچہ دیکھا وہ اس کے ہاتھوں سے پھسل کر زمین پر سر کے بل گرا اور سر کے بل تیزی سے گول گول گھومنے لگا اور پھر قلابازیاں کھاتا ہوا کمرے کے کونے میں دیوار سے ٹک کر کھڑا ہوگیا۔

اس کے بعد دوسرا بچہ بڑھیا کے ہاتھوں میں آیا اس نے بھی بالکل وہی حرکتیں کیں جو پہلے والے نے کی تھیں۔ وہ بھی پہلے والے کے ساتھ دیوار کے ساتھ لگ کر کھڑا ہوگیا۔

پھر تیسرا...... پھر چوتھا...... پھر پانچواں......اس طرح پورے نو بچے آئے اور وہ سب لائن سے دیوار سے لگ کر کھڑے ہوگئے۔

میں پھٹی پھٹی آنکھوں سے یہ سب دیکھ رہی تھی۔ پھر بڑھیا اٹھی اس نے کسی کھلونوں کی طرح سارے بچوں کو اٹھالیا۔

میرا سر بری طرح گھوم رہا تھا اور مجھے شدید چکر آ رہے تھے بڑھیا لمحہ بھر میں میری آنکھوں کے سامنے سے غائب ہوگئی اور شہزادی، وہ مسکراتی ہوئی اس طرح اٹھ کر بیٹھ گئی جیسے گہری نیند لے کر اٹھی ہو۔ اس نے دونوں ہاتھ اٹھا کر انگڑائی لی پھر میرے ہونق زدہ چہرے کی جانب دیکھتے ہوئے بولی۔

”ہماری دنیا میں بچوں کی پیدائش اسی طرح ہوتی ہے آپ انسانوں کے ہاں ایک وقت میں عام طور پر ایک بچہ پیدا ہوتا ہے تو ہمارے ہاں عام طور پر نو بچے پیدا ہوتے ہیں اسی لیے جنات کی تعداد انسانوں سے نو گنا زیادہ ہے۔“

”اچھا مجھے یہ بات نہیں معلوم تھی۔“ میں نے کہا۔

”ہوں آج آپ نے بہت کچھ اپنی آنکھوں سے دیکھ بھی لیا ہمارے ہاں پیدائش کا کیا سلسلہ ہوتا ہے یہ بھی آپ کو معلوم ہوگیا۔ اس نے ایک بار پھر برقیہ کو آواز دی تو وہ پھر مجھے دکھائی دینے لگی۔

”ہمارے بچے کیسے ہیں ہم انہیں دیکھنا چاہتے ہیں لیکن اس سے پہلے ہماری پیاری سہیلی کی خاطر مدارت کا انتظامات کیا جائے۔“

”بچے بالکل ٹھیک ہے، شاہ صاحب بچوں کے پاس موجود ہیں اور آپ کی آمد کا انتظار کر رہے ہیں وہ یہاں آتے مگر یہاں آپ کی مہمان موجود ہیں آپ فکر نہ کریں ابھی سارا انتظام ہو جاتا ہے۔“ برقیہ نے مودب انداز میں کہا۔

”ہم ابھی آتے ہیں امیرن۔“ شہزادی (جس کا نام بھی میں نے نہیں پوچھا اور نہ ہی مجھے کبھی اس کا نام معلوم ہوا اسی لیے میں اسے شہزادی کہہ رہی ہوں) لمحہ بھر میں غائب ہوگئی وہ ابھی تک اپنے چھپر کھٹ سے نیچے نہیں اتری گئی۔

اور لمحہ بھر میں میرے سامنے انواع اقسام کے کھانوں اور مٹھائیوں کے ڈھیر لگ گئے۔ ان کی خوشبو ہی اتنی زبردست ہے تو ذائقہ کتنا اعلیٰ ہوگا میں

نے دل میں سوچا۔

کھانے کی جانب ہاتھ بڑھایا ہی تھا کہ مجھے اپنے بچوں اور سلطان کا خیال آ گیا ان لوگوں نے تو کبھی زندگی میں ایسا کھانا تو کجا ان کی خوشبو بھی نہیں سونگھی ہے پھر میں جو روکھی سوکھی بھی اپنے بچوں اور سلطان کو کھلانے کے بعد کھاتی تھی اتنے لذیذ کھانے تنہا کیسے اپنے حلق میں اتار لیتی۔

"کیا سوچ رہی ہیں۔" میرے کانوں میں برقیہ کی آواز آئی اور ساتھ ہی وہ مجھے اپنے قریب کھڑی ہوئی دکھائی بھی دی۔

اس کے یوں اچانک نمودار ہونے سے میں ایک دم ڈر گئی تو وہ بولی۔

"آپ پریشان نہ ہوں یہاں آپ کو کسی بھی قسم کا کوئی نقصان نہیں پہنچ سکتا آپ تو ہماری مہمان ہیں اطمینان سے کھانا کھایئے۔" لیکن اب بھی میں نے کھانے کی جانب ہاتھ نہیں بڑھایا تو وہ بولی۔

"کچھ اور چاہیے۔" تو میں نے نفی میں سر ہلا دیا۔

"دیکھیے اگر آپ نے کچھ نہیں کھایا تو یہ ہماری بے عزتی شمار کی جائے گی۔" اس نے کہا۔

"وہ دراصل میرے بچے اور شوہر......!" میں نے مارے شرم کے جملہ ادھورا چھوڑ دیا میں اس سے یہ نہیں کہہ سکی کہ میرے بچوں اور شوہر نے آج تک ایسے کھانوں کی خوشبو بھی نہیں سونگھی تو میں ان کے بغیر یہ کیسے کھا سکتی ہوں۔ تب وہ چند لمحوں کے انتظار کے بعد بولی۔

"برائے مہربانی آپ یہاں سے کھانے کی کوئی چیز اپنے ساتھ لے جانے کی کوشش بھی مت کیجیے گا آپ یہاں سے صرف وہی چیز لے جا سکتی ہیں جو آپ کو تحفتاً دی جائے لیکن ہم معذرت چاہتے ہیں کہ اگر آپ کی خواہش ہو بھی تو ہم کھانے کی کوئی چیز آپ کو نہیں دے سکتے۔"

"کیوں؟" میرے منہ سے بے ساختہ نکلا۔

"اس کی وجہ میں آپ کو بتانے سے قاصر ہوں۔" اس نے کہا اور میری نگاہوں کے سامنے سے غائب ہو گئی اور پھر میں نے شہزادی کو دیکھا جو ایک بار پھر اپنے حسین چھپر کھٹ پر نیم دراز تھی۔ اس نے بھی کھانے پر اصرار کیا تو میں نے کھانا کھایا اور یہ حقیقت ہے کہ اتنا لذیذ کھانا میں نے کبھی نہیں کھایا تھا۔

کھانے سے فارغ ہو کر میں نے شہزادی سے کہا کہ آپ مجھے میرے گھر پہنچا دیں اگر میرے شوہر یا بچوں میں سے کوئی بیدار ہو گیا اور مجھے بستر پر نہ پایا تو وہ پریشان ہوں گے۔

"اس بات کی آپ فکر نہ کریں اس کا انتظام کیا جا چکا ہے۔" اس نے مسکراتے ہوئے کہا۔

"کیا مطلب؟" میں نے چونکتے ہوئے پوچھا۔

"کچھ نہیں۔" اس نے مجھے ٹال دیا۔

"مجھے گھر جانا ہے۔" میں نے گھبرا کر کہا میں اس کے اس جملے سے ڈر گئی تھی جو اس نے ابھی کہا تھا پتا نہیں اس نے کیا انتظام کیا ہے۔

"لگتا ہے آپ کو ہم سے مل کر اور ہمارے یہاں آ کر خوشی نہیں ہوئی ہے آپ خوش نہ ہوں لیکن ہم بہت خوش ہیں یہ ہماری آخری ملاقات ہے ہم اب آئندہ کبھی نہیں ملیں گے لیکن آپ کو میں خالی نہیں بھیجوں گی میرے تحائف آپ کو ہمیشہ اس ملاقات کی یاد دلاتے رہیں گے۔ پھر اس نے برقیہ کو آواز دی برقیہ پھر دکھائی دینے لگی اب اس کے ہاتھ میں مجھے ایک تھال دکھائی دے رہا تھا اس پر سونے کے زیورات رکھے تھے اور ایک مخمل کی تھیلی تھی۔

"ہماری سہیلی کو ان زیورات سے سجا دو۔" شہزادی نے کہا اور ایک منٹ میں ہی مجھے اپنے گلے کانوں اور

ہاتھوں میں سونے کے بھاری زیورات دکھائی دینے لگے برقیہ نے وہ مخمل کی تھیلی میری جانب بڑھادی۔
"یاد رہے آپ یہ زیور چوبیس گھنٹے سے پہلے نہیں اتاریں گی۔ اگر میری بات مانیں گی تو زیادہ فائدے میں رہیں گی۔"
پھر اس نے برقیہ کو اشارہ کیا تو وہ غائب ہوگئی اس نے مجھے اتنے تحائف دیے تھے اور میں...... میں تو فقیر تھی میرے پاس تو اسے دینے کے لیے کچھ بھی نہیں تھا ہمارے ہاں جب کسی کے ہاں پہلا بچہ پیدا ہوتا ہے تو بچے کے لیے اور ماں کے لیے کپڑے وغیرہ لے کر جاتے ہیں میں نے شرمندگی کے احساس سے گردن جھکالی۔ اچانک میری نگاہ میرے ہاتھ کی انگلی میں پڑے چاندی کے چھلے پر پڑی جو میل کچیل سے تقریباً کالا ہی ہوگیا تھا۔
میں نے جھٹ وہ چھلا اپنی انگلی سے اتارا اور اس کی جانب بڑھایا کہ میرے پاس اس کے علاوہ تمہیں تحفے میں دینے کے لیے کچھ بھی نہیں ہے۔ اس نے اپنے چھپر کھٹ سے ہی اپنا ہاتھ دراز کیا اور میرے ہاتھ سے وہ چھلا لے لیا۔ اس کے چہرے پر بڑی انوکھی چمک پھیل گئی اس کے لب مسکرانے لگے اور وہ مجھے دیکھنے میں اس قدر محو ہوگئی جیسے وہ کوئی بہت قیمتی شے اس کی اس محویت سے فائدہ اٹھاتے ہوئے میں نے سامنے رکھے ہوئے کبابوں کے تھال سے دو کباب اٹھا لیے اور ہاتھ دوپٹے کے اندر کرلیا۔ میں برقیہ کی تنبیہ بھول گئی۔
مجھے اس بات پر حیرت ہورہی تھی کہ شہزادی ایک دفعہ بھی چھپر کھٹ سے نیچے نہیں اتری اور نہ ہی میرے قریب آئی برقیہ بھی مجھ سے فاصلے سے بات کررہی تھی۔
پھر برقیہ آئی اور میں واپسی کے لیے اس کے ہمراہ ہوگئی۔ میں طویل برآمدوں اور راہ داریوں سے ہوتی ہوئی گیٹ تک آ گئی۔ اس وقت اس ساری عمارت میں چراغاں ہورہا تھا بہت سے لوگ آتے جاتے دکھائی دیے ہر ایک خوشی میں مگن تھا لیکن میری جانب کسی نے توجہ نہیں دی۔
گیٹ پر مجھے وہی دونوں آدمی دکھائی دیے ہیں باہر کھڑی بگھی میں بیٹھ گئی اور پھر پتا نہیں شاید مجھے نیند آ گئی۔
میرے کانوں میں اللہ اکبر کی آوازیں آئیں تو میں اٹھ کے بیٹھ گئی۔ لمحہ بھر میں ہی مجھے سب کچھ یاد آ گیا۔ سونے سے پہلے میں بگھی میں سوار ہوئی تھی اور اب اس وقت اپنے گھر میں اپنے بستر پر موجود تھی۔
میں نے اردگرد نگاہ ڈالی تو بچے اپنے بستروں پر سو رہے تھے۔ میں نے اپنے ہاتھوں اور کلائیوں پر نگاہ ڈالی، گلے اور کانوں کو ہاتھ لگایا۔ وہاں زیورات موجود تھے۔
اگر میں زیورات کو نہ دیکھتی تو گزری باتوں کو محض خواب ہی سمجھتی۔ پھر مجھے اس مخملی تھیلی کا خیال آیا وہ میرے سرہانے رکھی تھی۔
میں بے تحاشا خوش تھی فجر کی اذان ہوچکی تھی اور میں ابھی تک نماز کے لیے بستر سے نہیں اٹھی تھی۔ سلطان بیدار ہوچکے تھے اور مسجد نماز کی ادائیگی کے لیے جارہے تھے مجھے یہ دیکھنے کے لیے میں بیدار ہوگئی ہوں یا نہیں انہوں نے کمرے میں جھانکا مجھے بیٹھے ہوئے دیکھا تو بولے۔
"نماز نہیں پڑھنی کیا ابھی تک یوں ہی بیٹھی ہو لیکن میرے اوپر نگاہ پڑی تو چلتے چلتے رک گئے اور بولے۔
"امیرن...... یہ...... یہ...... کیا ہے...... تمہارے پاس یہ زیورات کہاں سے آئے؟"
"سب کچھ بتادوں گی پہلے آپ نماز پڑھ آئیں ورنہ جماعت نکل جائے گی۔"

''لیکن یہ سب..... کہاں.....؟'' مارے تجسس کے ان کے قدم جم گئے تھے۔

''سلطان آپ نماز پڑھ کر آئیں کہہ تو رہی ہوں کہ سب بتادوں گی۔'' میں نے خوشی سے سرشار لہجے میں کہا تو سلطان تیز تیز قدموں سے باہر چلے گئے۔ میں نے اٹھ کر آئینے میں اپنا جائزہ لیا میں بہت حسین دکھائی دے رہی تھی پھر وضو کیا اور نماز پڑھی۔

سلطان جماعت ختم ہوتے ہی بھاگم بھاگ گھر لوٹ آئے وہ سخت ہیجان میں مبتلا تھے۔

تب میں نے آہستہ آہستہ انہیں ساری کہانی سنا دی۔ میری بات سننے کے بعد سلطان غصے سے ایک دم کھڑے ہوئے اور بولے۔

''جھوٹ مت بولو امیرن کیا تم نے مجھے بچہ سمجھ رکھا ہے جو یہ کہانی سنا کر بہلا رہی ہو۔ سچ سچ بتاؤ تمہارے پاس یہ زیورات کہاں سے آئے اور میں تمہاری اس بے سروپا بکواس کہانی پر یقین اس لیے نہیں کروں گا کہ فاخر رات میں اٹھا تھا اور وہ بہت رو رہا تھا اس کے رونے کی آواز سن کر میں یہاں آیا تو تم اسے کندھے سے لگائے بہلا رہی تھیں اور تم نے مجھ سے کہا تھا کہ میں اسے سنبھال لوں گی آپ جاکر سو جائیں اور ذرا دیر میں وہ سو گیا تو میں اپنے بستر پر جاکر لیٹ گیا۔''

''میں آپ سے جھوٹ کیوں بولوں گی۔ اللہ گواہ ہے میں بالکل سچ کہہ رہی ہوں یہ دیکھیں اس نے مجھے یہ بھی دی ہے۔'' یہ کہہ کر میں نے مخملی تھیلی انہیں دکھائی سلطان نے جھپٹنے کے انداز میں میرے ہاتھ سے تھیلی چھین لی اور اسے کھول کر دیکھا تو مارے حیرت کے ان کی آنکھیں پھٹی کی پھٹی رہ گئیں اس میں سونے کی اشرفیاں تھیں۔ اور چند ہیرے بھی تھے۔

''سچ سچ بتادے امیرن، کیا تیرے ڈاکوؤں سے تعلقات ہیں اور انہوں نے تجھے یہ سب چیزیں دی ہیں۔'' مارے غم کے سلطان کی آواز رندھ گئی۔

''اف میرے اللہ، میں سلطان کو کیسے یقین دلاؤں۔'' میں نے بے چارگی سے چھت کی جانب دیکھا اور میری آنکھوں سے آنسو چھلک پڑے۔

''میں مانتا ہوں امیرن کہ میں نے تمہیں کوئی سکھ نہیں دیا لیکن یہ بھی حقیقت ہے کہ میں نے تجھ سے بے پناہ محبت کی ہے میں تجھ سے اس بے وفائی کی توقع نہیں کرسکتا تھا۔'' یہ کہہ کر سلطان پھوٹ پھوٹ کر رونے لگے۔

میری سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ میں کیا کروں۔ کس طرح سلطان کو اپنی وفا کا یقین دلاؤں۔ کیسے یقین دلاؤں کہ وہ جو کچھ سمجھ رہے ہیں ایسا کچھ بھی نہیں ہے۔ اچانک ہی مجھے ان انوکھے ذائقے اور خوشبو والے کبابوں کا خیال آیا جو میں اپنے ہاتھ میں وہاں سے اٹھا لائی تھی اور بگھی میں بیٹھتے ہی میں نے انہیں اپنے دوپٹے کے پلو میں باندھ لیا تھا۔

''آپ کو میری بات کا یقین نہیں آرہا تو یہ دیکھیں میں وہاں سے دو کباب بھی اپنے ساتھ لے کر آئی ہوں آپ کے اور بچوں کے بغیر میرے حلق سے نوالہ بھی نہیں اتر رہا تھا۔'' یہ کہتے ہوئے میں نے دوپٹے کا پلو پکڑا اور اس میں لگی گرہ کھولنے لگی اور گرہ کھلتے ہی ہماری ناکوں میں ایک بہت بری بدبو کا بھبکا ٹکرایا۔

ایسا لگا جیسے میرا دوپٹا انسانی فضلے سے لتھڑا ہوا ہے میں نے اسے خود سے دور کر کے کمرے میں اچھال دیا تب ہی مجھے برقیہ کی تنبیہ یاد آئی اس نے مجھے منع کیا تھا کہ میں یہاں سے کھانے کی کوئی بھی چیز اپنے ساتھ نہیں لے جاسکتی اس کے منع کرنے کی وجہ اب میری سمجھ میں آئی تھی۔ ہماری دنیا میں آتے ہی ان کے کھانوں کا یہ حشر ہوجاتا تھا۔

''یہ سب کیا ہے؟'' سلطان نے پوچھا تو میں نے

انہیں برقیہ کی بات بتا دی۔ سلطان اب چپ بیٹھے تھے کچھ بھی نہیں بول رہے تھے۔

دن کا اجالا پھیل چکا تھا بچے ابھی تک سو رہے تھے۔ میں نے سلطان سے کہا۔ ''شہزادی نے مجھ سے کہا تھا کہ چوبیس گھنٹوں سے پہلے یہ زیورات اپنے جسم سے مت علیحدہ کرنا، لیکن آپ اتنے ناراض ہو رہے ہیں اس لیے میں انہیں اتارے دیتی ہوں۔''

یہ کہہ کر میں سارے زیورات اتار کر بستر پر رکھ دیے۔ سلطان ہاتھ میں چوڑیاں اور کڑے اٹھا کر دیکھنے لگے اور ان کی جیسے ہی مجھ پر نگاہ پڑی تو وہ بری طرح چونک گئے ان کے منہ سے آواز ہی نہیں نکل رہی تھی۔ ان کی یہ حالت دیکھ کر میں نے پوچھا۔

''سلطان کیا ہوا آپ کو؟''

''تم نے ابھی تو یہ زیور اتار کے رکھے ہیں لل...... لیکن...... تمہارے جسم پر ویسے ہی زیورات دوبارہ آ گئے ہیں۔''

سلطان کی بات سن کر میں نے جھٹ گلے اور کانوں کو ہاتھ لگایا اپنی کلائیوں کو دیکھا تو میں بھی گنگ ہو کر رہ گئی۔

وہ تمام زیورات جو میں اتار چکی تھی میرے سامنے ڈھیر کی صورت پڑے تھے اور ویسے ہی دوسرے زیورات میرے جسم پر موجود تھے۔

''س...... سلطان یہ سب کیا ہے؟'' میں نے تحیر آمیز لہجے میں کہا۔

سلطان چند لمحوں تک گو سکتے کے عالم میں مجھے تکتے رہے پھر آگے بڑھ کر مجھے گلے سے لگا لیا اور بولے۔

''تم ٹھیک کہہ رہی تھیں مجھے معاف کر دو میں نے تم پر شک کیا ایک بے ہودہ الزام لگایا، لیکن۔'' اتنا کہہ کر وہ ایک گہری سانس لے کر خاموش ہو گئے۔

''لیکن کیا؟'' میں نے تیزی سے کہا۔

''لیکن اب مجھے یقین آ گیا ہے کہ جو کچھ بھی تم نے کیا ایسا ہی ہے یہ سارا معاملہ مجھے بے حد پراسرار لگ رہا ہے...... وہ زیورات جو تم اتار چکی تھیں دوبارہ سے ویسے ہی یہ زیورات تمہارے جسم پر آ گئے گویا تمہاری وہ شہزادی نہیں چاہتی کہ تم یہ زیورات اتار دو۔'' سلطان نے پرسوچ لہجے میں کہا۔

مجھے اچانک ایک اچھوتا سا خیال آیا اور میں نے ایک بار پھر وہ زیورات اتارنے شروع کر دیے زیورات اتار کر پہلے والے زیورات کے ساتھ رکھ دیے اور پھر وہی حیرت انگیز بات ہوئی کہ ویسے ہی زیورات پھر میرے بدن پر موجود تھے۔

میں بے حد خوش تھی۔ بے حد بھاری زیورات کے تین سیٹ میرے سامنے تھے۔ میں اگر یہ زیورات اتار اتار کر اپنے پاس ڈھیر کرتی رہتی تو چوبیس گھنٹوں میں میرے پاس نہ جانے کتنا کلو سونا اکٹھا ہو جاتا لیکن اچانک مجھے شہزادی کی تنبیہ یاد آ گئی یہ ان زیورات کی پراسراریت تھی یا اللہ جانے کیا بات تھی۔ شاید اس لیے مجھے شہزادی نے چوبیس گھنٹوں سے پہلے یہ زیورات اتارنے کے لیے منع کیا تھا۔ اب اگر میں ایسا کرتی تو یہ میرا لالچ ہوتا اور لالچی انسان ہمیشہ نقصان ہی اٹھاتا ہے ویسے بھی مخملی تھیلی میں میرے پاس سونے کی اشرفیاں اور چند ہیرے موجود تھے۔

میں نے سلطان سے بہت سی ضروری باتوں پر ڈسکس کیا اور بچوں کے بیدار ہونے سے پہلے ہی میں نے تمام چیزوں کو حفاظت سے رکھ دیا اور اپنے زیورات چھپانے کے گرم چادر کو اچھی طرح اپنے گرد لپیٹ لیا۔ ہم دونوں نے یہ پروگرام بنایا کہ بچوں کو ناشتہ کرا کر آپا کی جانب بھیج دوں گی اور یہ کہہ دوں گی کہ مدرسے سے آنے کے بعد اپنے پاس روک لینا

سلطان رات کو آ کر لے جائیں گے میری طبیعت ٹھیک نہیں ہے۔ یہ میں نے اس لیے کہا کہ بچے سمجھدار تھے مجھے زیورات پہنے ہوئے دیکھتے تو سوال کرتے اور پھر یہ بات وہ باہر بھی کسی کو بتا سکتے تھے۔ میں نے سلطان سے یہ بھی کہا کہ اگر کوئی رشتہ دار یا محلے کی کوئی عورت آئے تو کہہ دینا کہ میں گھر پر نہیں ہوں آج دن بھر کی تو بات تھی۔

شکر اللہ کا کہ وہ دن خیریت سے گزر گیا۔ رات کو جب میں نے وہ زیورات اتارے تو دوبارہ میرے جسم پر وہ زیورات نہیں آئے۔

اب میں نے اور سلطان نے فیصلہ کیا کہ اس مخملی تھیلی سے ایک سونے کی اشرفی لے کر دوسرے شہر میں جائے اور سنار کے پاس جا کر فروخت کر دے سنار یقیناً اس اشرفی کے بارے میں سلطان سے سوالات کرے گا تو سلطان کو یہ جواب دینا تھا کہ اس کا تعلق مغلیہ خاندان سے ہے اور یہ اشرفیاں اس کی خاندانی ہیں لیکن اب شدید مالی پریشانی کا شکار ہونے کی وجہ سے وہ اپنے خاندان کی اس نشانی کو فروخت کرنے پر مجبور ہے۔

میں نے سلطان کا سب سے بہترین جوڑا نکال کر پہننے کے لیے دیا اچھی طرح نہا کر اور خوشبو لگا کر سلطان اللہ کا نام لے کر اشرفی فروخت کرنے گھر سے نکل گئے۔

دوسرے دن وہ اشرفی فروخت کر کے لوٹ آئے اور انہوں نے بتایا کہ ایسا ہی ہوا جیسا کہ ہم نے سوچا تھا سنار نے پہلے تو مشکوک نگاہوں سے انہیں دیکھا اور پھر سوالات کی بوچھاڑ کر دی۔

سلطان نے بہت اعتماد سے اس کے سوالات کے جوابات دیے تب سنار نے سرگوشی میں کہا کہ اس کا مطلب ہے کہ تمہارے پاس اور بھی اشرفیاں ہوں گی میں تمہیں ان کی اچھی قیمت دے دوں گا تم یہ اشرفیاں کسی دوسرے سنار کے پاس مت لے جانا، سونا خالص اور کھرا ہے سلطان نے بھی اس سے کہا کہ وہ اس بارے میں کسی اور سے ذکر نہ کرے۔ ورنہ اس کی اور اس کے خاندان کی بہت رسوائی ہوگی۔ ہم سفید پوش اور عزت دار لوگ ہیں سنار نے جب سلطان سے اس کی رہائش کے بارے میں پوچھا تو سلطان نے گول مول جواب دے دیا۔

رقم دیکھ کر مجھے اور سلطان کو اس بات کا اچھی طرح احساس ہوا کہ لالچی سنار نے اشرفی کی بہت کم قیمت لگائی ہے لیکن کچھ بھی نہ ہونے سے یہ بھی غنیمت تھی۔

چند اور اشرفیاں بیچنے کے بعد ہمارے پاس اچھی خاصی رقم جمع ہوگئی اور ہم نے فیصلہ کیا کہ ہم اس گاؤں کو چھوڑ کر یہاں سے دور کسی دوسرے شہر میں رہائش اختیار کر لیتے ہیں جہاں ہماری غربت کا کوئی اور گواہ نہ ہو۔ یہاں سے جانے کا ہم لوگوں کو یہی سبب بتاتے کہ سلطان کو وہاں بہت اچھی ملازمت مل گئی ہے۔ میری زندگی میں آنے والی اس ایک رات نے میری ساری زندگی بدل ڈالی۔

اور پھر ہم نے دوسرے شہر میں رہائش اختیار کر لی سلطان نے ان پیسوں سے کاروبار کر لیا پھر ہمارے اچھے حالات خاندان والوں سے چھپے نہ رہ سکے۔ لوگوں میں بہت چہ مگوئیاں ہوئیں لیکن مجھ سے سوال کرنے کی کسی نے جرأت نہیں کی کیونکہ میں اپنے گھر آنے والے کسی بھی رشتہ دار کو خالی ہاتھ جانے نہیں دیتی تھی۔ میں نے غربت دیکھی تھی اس لیے اپنی دولت سے میں بہت سے غریب گھرانوں کی دل کھول کر مدد کرتی تھی۔ یہاں میں نے اپنے بچوں کو اچھے اسکولوں میں پڑھایا انہیں بہترین تعلیم

دلوائی میں جتنی دولت خرچ کرتی تھی اتنی ہی زیادہ میری دولت میں اضافہ ہو رہا تھا۔
ایک اہم بات میں بتانا بھول گئی کہ میرا سب سے چھوٹا بیٹا فاخر غیر معمولی صلاحیتوں کا مالک تھا بعض اوقات وہ بہت پر اسرار حرکتیں کرتا تھا جب چھوٹا سا تھا تو اکیلے کمرے میں اس طرح کھیلتا رہتا تھا جیسے وہ بہت سارے بچوں کے ساتھ کھیل رہا ہو۔
کبھی اس کے ہاتھ میں کوئی مٹھائی ہوتی تو کبھی بے موسم کا پھل دکھائی دیتا۔ میرے پوچھنے پر کہ تم کہاں سے لائے ہو تو وہ جواب دیتا یہ میرے دوست نے دیا ہے میں پوچھتی کہ کون سا دوست تو کہتا وہی جو میرے ساتھ کھیلنے کے لیے آتے ہیں۔
کبھی کبھی وہ دور کی خبریں بھی مجھے بتا دیا کرتا تھا اس وقت میں حیران رہ جاتی جب وہ کسی رشتہ دار کی گھر آمد کی اطلاع دیتا اور وہ رشتہ دار ایک آدھے گھنٹے میں واقعی آ جاتا تھا۔
ایک دن کھیلتے کھیلتے میرے پاس آیا اور رونے لگا میں نے رونے کی وجہ پوچھی تو بولا۔
"خالہ جان کا انتقال ہو گیا ہے۔" یہ سن کر میں سناٹے میں آ گئی۔ دل کی عجیب حالت ہو گئی مجھ پر شدید گھبراہٹ طاری ہو گئی اور تھوڑی دیر کے بعد واقعی اطلاع آ گئی کہ آپا کا انتقال ہو گیا ہے۔
اصل میں جب فاخر پیدا ہوا تھا اس وقت شہزادی میرے گھر آیا کرتی تھی۔ میں نے بہت مرتبہ اسے بھی بلی کے روپ میں فاخر کے پاس اس سے کھیلتے ہوئے دیکھا تھا۔
ایک مرتبہ میں گھر میں تنہا تھی فاخر کو سلا کر نہانے کے لیے گئی ابھی میں غسل خانے ہی میں تھی کہ فاخر کے رونے کی آواز آئی اور پھر چیخ چیخ کر رونے لگا میں کیا کرتی بھاگ کر جا بھی نہیں سکتی تھی کہ اچانک فاخر کی رونے کی آواز آنا بند ہو گئی۔ میں نے جھٹ کپڑے پہنے اور بھاگ کر کمرے میں آئی تو دیکھا کہ وہی سفید بلی فاخر کے گدے پر بیٹھی ہے۔ وہ اپنی دم فاخر کے چہرے کے آگے لہرا رہی تھی اور فاخر اپنے ہاتھوں سے اسے پکڑنے کی کوشش کر رہا تھا وہ ہنس رہا تھا کھیل رہا تھا لمحہ بھر کو تو یہ منظر دیکھ کر میں سکتے میں آ گئی پھر آگے بڑھ کر بلی کو بھگا دیا اور فاخر کو گود میں اٹھا لیا۔ میری گود میں آنے کے بعد بھی فاخر کی نگاہیں بلی کے اوپر ہی تھی اور وہ اسی کی جانب جھک رہا تھا۔
لیکن جیسے جیسے فاخر بڑا ہوتا گیا اس نے پیشگوئیاں کرنی بند کر دیں لیکن وہ بہت گم صم رہنے لگا تھا اس نے بڑی سی داڑھی رکھ لی تھی اور پانچ وقت کی نماز با جماعت ادا کرنے لگا۔
میں اپنی زندگی کے سب سے بڑے سانحے سے اس وقت گزری جب ایک رات سلطان اور فاخر کا روڈ ایکسیڈنٹ میں انتقال ہو گیا۔
پھر کاروبار دوسرے بیٹوں کے ہاتھ میں آ گیا۔ میرے پاس اب بھی وہ مخملی تھیلی اور اس میں اشرفیاں اور ہیرے موجود ہیں اور وہ زیورات جو اس رات شہزادی نے مجھے پہنا کر بھیجے تھے جو ایک سے تین ہو گئے تھے۔
میری اب اتنی عمر ہو گئی ہے میں نے اپنے سب بچوں کی شادیاں کر دی ہیں کاروبار بہت پھل پھول رہا ہے سب لوگ خوش ہیں میں سوچتی ہوں کہ نہ جانے کب اللہ کے گھر سے بلاوا آ جائے اور وہ سونے کی اشرفیاں اور میرے زیورات میرے بچوں کے ہاتھ میں آ جائیں وہ میں کسی کو بھی نہیں دینا چاہتی، چاہتی ہوں کہ کاش ایک بار اور شہزادی سے ملاقات ہو جاتے اور میں تہہ دل سے اس کی اس مہربانی اور عنایت کا شکریہ ادا کروں۔
سلطان اور فاخر کے دنیا سے جانے کے بعد میرا

بھی دنیا میں دل نہیں لگتا ہے۔ سلطان کے بعد تم وہ دوسری ہستی ہو جس کے سامنے میں نے اپنی زندگی کے اتنے بڑے راز سے پردہ اٹھایا ہے۔ اب تم ہی مجھے مشورہ دو کہ میں ان زیورات اور اشرفیوں کا کیا کروں۔"

دادی امیرن نے بات ختم کر کے اس طرح گہری سانس لی اور تھک کر سر کو تکیے پر ٹکایا جیسے وہ بہت لمبی مسافت طے کر کے آ رہی ہوں۔

اور ایک لحاظ سے یہ ٹھیک بھی تھا انہوں نے اپنے ماضی کا بہت طویل سفر تو کیا تھا اور میں سحر زدہ سی ان کی اس انہونی اور دلچسپ داستان سننے میں محو تھی میرے لبوں سے ایک لفظ بھی نہ نکل سکا بہت دیر تک خاموشی چھائی رہی پھر میں نے پوچھا۔

"دادی ایک بات تو بتائیں ماضی کا وہ راز جو آپ نے آج تک کسی اور کے آگے بیان نہیں کیا میرے سامنے کیسے اس سے پردہ اٹھا دیا۔"

میری بات سن کر دادی نے چونک کر سر اٹھایا پھر وہ میری جانب تکنے لگیں۔ ان کی آنکھیں جیسے میری آنکھوں میں گڑی جا رہی تھیں مجھے دادی کی آنکھوں میں ایک سحر ایک انوکھی چمک اور روشنی دکھائی دی۔ پھر اس کے لب عجیب سے انداز میں مسکرا دیے تب میں نے گھبرا کر نگاہیں جھکا لیں۔

"کیا ہوا، ڈر گئیں۔" دادی نے سرگوشی میں پوچھا تو میں نے سر جھکائے جھکائے نفی میں گردن ہلا دی اور واقعی نہ جانے کیوں اس وقت مجھے دادی سے عجیب سا خوف محسوس ہونے لگا

اور پھر ایک آواز نے مجھے تیزی سے سر اٹھانے پر مجبور کر دیا اور دادی اپنے سامنے کھڑی اس حسین و جمیل ہستی کو آنکھیں پھاڑے دیکھ رہے تھے۔

وہ ایک بہت حسین و جمیل جوان عورت تھی جس نے ریشمی سفید لباس پہنا ہوا تھا اس کے ملیح چہرے ایک حلاوت تھی نرمی اور پیار تھا۔ تب دادی کے منہ سے سرگوشی میں نکلا۔

"شہزادی۔"

"تم نے سچے دل سے پکارا اور میں آ گئی۔ تم سوچ رہی ہو ناں کہ ان اشرفیوں اور زیورات کا کیا کرو تو میرا مشورہ ہے کہ انہیں فروخت کر کے ان پیسوں سے ایک مسجد بنوا دو یہ ہم دونوں کا صدقہ جاریہ ہوگا۔

اور پھر شہزادی غائب ہوگئی۔ دادی نے مسجد بنوانی شروع کی ہی تھی ایک دن ان کی دنیا سے رخصتی کی خبر آ گئی۔

خاندان والوں اور دوستوں کے علاوہ ایک بڑی تعداد بہت سے انجان لوگوں کی بھی تھی اور ہاں اور ایک بات بتاؤں میں نے شہزادی کو بھی دادی کی میت کے سرہانے قرآن پاک پڑھتے ہوئے دیکھا تھا۔ اس بات کی تصدیق کے لیے وہ صرف مجھے ہی دکھائی دے رہی تھی یا سب کو میں نے اپنی بہن سے پوچھا۔

"یہ سفید لباس میں جو خوبصورت سی عورت بیٹھی ہے وہ کون ہے؟"

تو میری بہن نے حیرانی سے کہا "کون سی عورت۔ مجھے تو کوئی بھی عورت دکھائی نہیں دے رہی۔"

آج دادی کو دنیا سے گئے بہت سال ہو گئے ہیں، مسجد تیار ہو چکی ہے اور دادی امیرن کی دلچسپ داستان میں آپ قارئین کے لیے تحریر کر رہی ہوں۔

مسٹر دلچسپ

انجم فاروق ساحلی

انجم فاروق ساحلی فکشن کے جانے مانے مصنف ہیں' انہوں نے زیادہ تر جرم و سزا کے موضوع پر لکھا ہے لیکن اس بار انہوں نے نئے افق کے دلچسپ نمبر کے لیے ہلکی پھلکی کہانی تحریر کی ہے۔ لیکن ان کی ایک کہانی میں تین کہانیاں ہیں جنہیں پڑھ کر آپ محظوظ بھی ہوں گے اور اداس بھی۔
دلچسپ نمبر کے لیے بطور خاص بولتی کہانی

بہار کا موسم تھا سبزہ نکھرا ہوا تھا' رنگ رنگ کے پھول شگفتہ کے باغیچے میں کھلے ہوئے مسکرا رہے تھے بھینی بھینی خوشبو پھیلی ہوئی تھی۔ کبوتر اور طوطے اڑتے بیٹھے پر پھڑ پھڑاتے بڑے دل کش معلوم ہوتے تھے۔ ماحول پر ایک رومان انگیز کیف سا چھایا ہوا تھا سورج کی نارنجی کرنیں درختوں کے گھنے پتوں سے چھن چھن کر زمین پر گرتیں بڑی خوشنما معلوم ہوتی تھیں جیسے وہ کسی بنجر دل کے لیے زندگی سے بھرپور اجالا ہوں۔

پرندوں کی چہچاہٹ سے موسیقی کا رس ٹپک رہا تھا۔ باغیچے کے عین وسط میں رنگ برنگے پھولوں سے آراستہ کیاریوں کے درمیان اس وقت شگفتہ کی نوجوان، خوبصورت خوش لباس حسین وجمیل سہیلیاں بے تابی سے اپنی سہیلی کا انتظار کررہی تھیں۔ ان سب کی بے تاب نگاہیں باغ کی مرکزی روش پر لگی ہوئی تھیں۔ آج اتوار کی صبح تھی اور ان کی کالج سے چھٹی تھی۔ شگفتہ کو اپنی سہیلیوں کو کہانیاں پڑھ کر سنانے کا شوق تھا اور جب کتاب کے مصنف عمران احمد عرف ''مسٹر دلچسپ'' کی ہوتی تھی۔ تو سب مجسم شوق انتظار بن جایا کرتی تھیں۔ مسٹر دلچسپ بڑی ہی دلچسپ اور پیاری کہانیاں اور واقعات سنایا کرتے تھے جن میں کوئی نہ کوئی سبق ضرور ہوا کرتا تھا۔

اس وقت شگفتہ روش کے سرے پر نمودار ہوئی، اس کے ہاتھ میں مسٹر دلچسپ کی نئی کتاب موجود تھی وہ تیز تیز چلتی ہوئی اپنی دوستوں کے درمیان چلی آئی، اس نے کتاب گھما کر سب کو دکھائی اس بار کہانی کا نام آخری کانٹا تھا جو تین مختلف حصوں پر مشتمل تھی۔ شگفتہ ریوالونگ چیئر پر بیٹھ گئی اور اس کی ساتھی لڑکیاں دوسری نشستوں پر بیٹھنے لگیں۔ لڑکیوں کا اشتیاق دیدنی تھا۔

شگفتہ نے سامنے درخت پر بیٹھے پرندوں کے ایک خوشنما جوڑے کو دیکھتے ہوئے بڑے بڑے خوش رنگ پھولوں پر بھی ایک تبسم آمیز نظر ڈالی اور کہانی سنانے کا آغاز کردیا۔ عنوان (بس اسٹاپ) تھا۔

آج پھر شہزاد نے وقار پر نگاہ ڈالی تو اس کا وقار آسمان کی قوس وقزح معلوم ہوا۔

''او خدایا میرے اندر کیا کمی ہے پورا چھ فٹ قد، فراخ سینہ، خوب صورت چہرہ، سرخ وسفید رنگت، شربتی آنکھیں، جدید ہیئر کٹنگ، عمدہ قیمتی لباس، ہاتھوں کی انگلیوں میں تین مختلف رنگوں کی جگمگاتی انگوٹھیاں لیکن ان تمام خوبیوں کے باوجود میں اس سے محروم تھا۔ جو وقار کے پاس تھا پونے چھ فٹ قد کا وقار سانولے رنگ کے ساتھ تھوڑے سے دلکش نقوش کا مالک تھا۔ اس کا لباس بھی عام سا ہوتا تھا۔ پیسے کے معاملے میں بھی اس

کا ہاتھ مجھ سے تنگ رہتا تھا لیکن بلا کا چرب زبان اور لڑکیوں کو شیشے میں اتارنے کا ماہر تھا۔ جب دیکھو کوئی نہ کوئی لیلی اور اس کے بازوؤں کے زاویے میں اٹکی ہوئی معلوم ہوتی تھی۔ وقار کو دراز قد، چھریرے جسم کی لڑکیاں پسند نہیں تھیں۔ البتہ گول میڈونا سا چہرہ ہو، رنگت زیتونی ہو، قد بوٹا سا ہو، جسم فربہی مائل ہو یعنی ہری بھری شاداب لڑکیاں ہوں تو وقار ان پر بے دھڑک مرنے لگتا تھا۔

میں اپنے روبرو کسی خوب صورت دراز قد لڑکی کو دیکھنے کا خواہش مند تھا مگر قسمت میں ایسی خشک سالی لکھی ہوئی تھی کہ قسمت کی دیوی ہر بار وقار کی گود میں آ گرتی تھی۔ پچھلے چھ مہینے میں وقار نے چھ لڑکیاں بدلی تھیں۔ جب میں کسی نئی لڑکی کو وقار کے کندھے پر جھکا ہوا دیکھتا تو مجھے اپنا دل جلتا ہوا محسوس ہوتا۔ ایک دن میں نے وقار کو قمیص کے کالر سے پکڑ کر اپنی طرف متوجہ کرلیا۔

''یہ روبی تمہیں کہاں ملی تھی؟''

''بس اسٹینڈ پر۔''

''اور وہ سونیا؟''

''ڈیئر وہ بھی ایس ایم ایس کے بعد بس اسٹینڈ پر۔''

''اور وہ جسے تم نے ڈریم گرل کہا تھا؟''

''وہ بھی اسی بس اسٹینڈ پر وہ بس کے انتظار میں بور ہو رہی تھی میں نے اس کی شان میں چند اشعار پیش کیے چنانچہ آخری مصرعہ سنتے ہی وہ میری موٹر سائیکل پر بیٹھ چکی تھی۔''

''کیا پھنسنے والی صرف بس اسٹینڈ پر ہی ہوتی ہیں؟'' میں نے حیرت سے پوچھا۔

وقار دھیرے سے مسکرایا۔

''ہاں میرے ساتھ پھنسنے والی صرف بس اسٹینڈ پر پائی جاتی ہیں لیکن جہاں تک صرف لڑکیوں کا تعلق ہے لڑکیاں اسکول، کالج، بیوٹی پارلر، سلائی سینٹر، آفس، ٹیوشن سینٹر، ڈرائیونگ سینٹر ہر جگہ پائی جاتی ہیں میرے دوست۔'' وقار میرے کندھے پر ہاتھ رکھتا ہوا بولا بولا۔

''بس اسٹینڈ پر اولین مرحلوں سے گزرنا پڑتا ہے۔ موبائل اور کمپیوٹر کے زمانے میں بھی بس اسٹینڈ کی اپنی انفرادیت اور اہمیت اپنی جگہ مسلمہ ہے۔ وہاں وقت کا ضیاع نہیں ہوتا۔ شادی شدہ عورتوں کے چہرے پر میں زیادہ نہیں رکتا۔ شادی شدہ اپنے جسمانی پیچ و خم، سامان کے تھیلوں اور سرد نگاہوں سے پہچانی جاتی ہیں۔ جیسے انہوں نے اپنے چہرے پر ہاؤس فل کا بورڈ لگا رکھا ہو، وہاں زیادہ دیر رکنے سے حاصل بھی کیا ہے مگر وہ جو اکیلی ہیں اور غیر شادی شدہ ہیں ان کے ساتھ کھیلنے میں سچ مچ بڑا مزہ آتا ہے۔'' ان الفاظ کی ادائی کے بعد وقار گھڑی دیکھتا ہوا بھاگ کھڑا ہوا۔ اس لمحے اس کے موبائل کی بیل بھی بجنے لگی۔ وہ نئی لڑکی کرن سے باتیں کرتا ہوا دور کھڑی اپنی موٹر سائیکل کی طرف جانے لگا۔ میں ایک ٹھنڈی آہ بھرتا ہوا اپنی کرولا سے ٹیک لگائے کھڑا تھا۔ میری خوب صورت کرولا جو سبک رفتار، آرام دہ اور اسٹیٹس کی علامت تھی میرا ساتھ دینے میں ناکام ثابت ہوئی تھی۔ کوئی خوب صورت اور شریف لڑکی اس کے حصار میں نہیں آئی تھی۔ جو چند ایک تھیں ان میں ایک جیب تراش تھی دوسری پستول دکھا کر نقدی گھڑی اور انگوٹھی لے اڑی' تیسری ایک سیکسی کھسرا تھی جو بادی النظر میں لڑکی ہی معلوم ہوتی تھی۔

اس وقت سرخ لباس میں چمکتی دمکتی ایک چاند چہرہ لڑکی موٹر سائیکل رکشا سے چھلانگ مار کر اتری اور تیر کی طرح وقار کی طرف آئی۔ دو منٹ کے بعد ہی وہ وقار کے پیچھے بیٹھ چکی تھی اور اس کی وارفتگی کا عالم ایسا تھا' جیسے کوئی جوڑا ہنی مون کے پہلے ہفتے میں ہو، آج میں نے شغل کے طور پر اس کا تعاقب کرنے کا فیصلہ کیا تھا۔

میں مناسب فاصلہ چھوڑ کر اپنی کار میں ان کا پیچھا کرنے لگا۔ ٹریفک کی مشکلات کے باوجود تعاقب آخر کامیاب ہو کر مون مارکیٹ کے ایک سستے ہوٹل کے سامنے ختم ہوا۔ وہ دونوں بائیک سے اتر کر ہوٹل میں داخل ہو گئے میں بھی جلدی سے پارکنگ میں گاڑی کھڑی کر کے اندر کی طرف لپکا، جب میں کاؤنٹر پر پہنچا تو وہ دوسری منزل کی سیڑھیوں پر تھے ان کی پشت میری طرف تھی۔

''حور کے پہلو میں لنگور''

اس ہوٹل میں اوپری منزل پر سستے ہال اور کمرے عام مل جایا کرتے تھے۔ اتفاق سے مجھے وقار کے ساتھ والا کیبن مل گیا تھا دونوں کیبنوں کے درمیان واش روم ایک ہی تھا میں اس وقت واش روم میں واقع روشن دان کے شیشے سے وقار کے کمرے میں جھانک رہا تھا۔ واش روم میں آنے والا دوسری طرف کا دروازہ اندر سے بند کرنے کا مجاز تھا چنانچہ میں نے وقار کی جانب کا دروازہ چٹخنی چڑھا کر جام کر دیا تھا۔

دوسری جانب کمرہ روشنیوں سے جگمگا رہا تھا اور میرے سامنے صوفے پر ایک حسین چہرہ مسکرا رہا تھا۔ وہ موبائل کیمرے سے وقار کا فوٹو اتار رہی تھی۔ اس کے مرمریں بدن سے اٹھنے والی خوشبو وقار کے حواس پر چھا گئی۔ اس کے متبسم ہونٹوں پر بے قراری مچلنے لگی۔ وہ بھی چند قدم آگے بڑھی۔ وقار کے قریب پہنچتے ہی اس نے تیزی سے پرس سے ڈبیہ نکالی اور سگریٹ ہونٹوں میں دبالیا۔ چاروں طرف خوشنما سانچوں میں سجی شمعیں روشن تھیں۔ ان کی مدھم روشنی میں کرن ملکہ عالیہ معلوم ہو رہی تھی۔ اس کا سرخ لباس چمک رہا تھا جیسے جذبات کے انگارے اس کے جسم پر رقص کر رہے ہوں، وقار نے جیب سے لائٹر نکالا اس کا ہاتھ مرتعش تھا پھر اس نے ہاتھ بڑھا کر اس کے ہونٹوں میں دبی سگریٹ سلگادی۔ شعلے کی نیلی چمک اس کے رخساروں پر پڑی میں مبہوت رہ گیا وہ بے حد حسین تھی۔

❀……۞……❀

میں بوجھل دل کے ساتھ اپنے گھر میں داخل ہوا۔ میں نے ملازم سے کہہ دیا کہ کھانا باہر سے کھا کر آیا ہوں لہٰذا وہ جا کر سو جائے۔

ملازم کے جانے کے بعد میں نے گاڑی پر تھکی تھکی الوداعی نظر ڈالی۔ میں نے فیصلہ کیا کہ بس اسٹاپ پر جا کر قسمت آزمائی جائے۔ اگلی صبح ہی میں بس اسٹاپ پر جا پہنچا۔ میں بس اسٹینڈ کی رونق کو دیکھتا ہوا بس اسٹاپ کی جانب متوجہ ہوا، وہاں دھنک رنگ زنانہ بھیڑ تھی۔ اب کامیابی کی امید اور کرن یہ بس اسٹاپ ہی تھا کیونکہ یہ علاقہ شہر بھر میں مرکزی حیثیت حاصل کر چکا تھا۔

لڑکیوں کے چمکتے روشن چہروں سے ایسا معلوم ہوتا تھا اسکول و کالج کی اسٹوڈنٹس نہیں فلمی ایکٹرز ہو۔ میں ایک ٹھنڈی آہ بھر کر رہ گیا۔ میں نے اس ماحول سے نظریں ہٹا کر ہورڈنگ بورڈ پر لگے کمرشل اشتہار کے فلیکس پر نگاہ ڈالی ایک بار پھر میرا چہرہ کھل اٹھا۔ اشتہار بنوانے والی ماڈل اپنی مسکراہٹ، حسن و جمال سے دلکش لگ رہی تھی۔

میں سڑک پار کرنے لگا اس کا سبب ایک لمبے قد کی خوب صورت لڑکی تھی۔ جو اگرچہ ماڈرن نہیں معلوم ہو رہی تھی مگر غضب کا سراپا تھا۔ میں نے کبھی ایسی لڑکی نہیں دیکھی تھی۔ اسی لمحے اسٹینڈ سے ایک بس نکلی اور لڑکی بس میں سوار ہو گئی میں بھی بس میں سوار ہو گیا۔ میرا چہرہ خوشی سے کھل اٹھا کیونکہ لڑکی جس سیٹ پر بیٹھی تھی اس کے ساتھ والی سیٹ خالی تھی۔ بس میں کوئی اور سواری کھڑی نظر نہیں آ رہی تھی۔ میں نے اپنے آپ کو مہذب ثابت کرنے کے لیے اِدھر اُدھر نگاہ کی دھیرے دھیرے چلتا ہوا اس کے قریب اور ''مجبوری ہے'' کہہ کر بیٹھ گیا۔ اس کے بدن سے اٹھنے والی خوشبو کا جھونکا

میرے رگ وپے میں سرایت کر گیا۔
میں نے کچھ سوچ کر اپنی پتلون کی جیب میں موجود ڈائجسٹ کا ایک تراشا نکالا تراشے پر ایک کارٹون موجود تھا۔ میں نے وہ کارٹون لڑکی کی طرف بڑھایا۔
''مس ذرا اس کا انداز دیکھیے۔''
لڑکی کاغذ کے ٹکڑے کو دیکھ کر بے ساختہ مسکرا اٹھی۔
''واقعی دلچسپ ہے۔ میڈم ناشتہ کر رہی ہیں، ملازم سر کے بل کھڑا ہے اور اس کے جوتوں کے تلوؤں پر ناشتے کی ٹرے رکھی ہے۔'' وہ بڑبڑائی لیکن پھر ایک دم سنجیدہ ہوگئی اور کھڑکی سے باہر دیکھنے لگی۔ میں اس کے چہرے پر پیدا ہونے والی کرختگی دیکھنے لگا۔ لڑکی اب مجھ سے بےزار دکھائی دی۔
''مس آپ انارکلی جا رہی ہیں؟'' میں نے ہمت کر کے پھر سلسلہ کلام جوڑا۔
''نو۔'' اس نے مختصر سا جواب دیا۔
''پھر کیا بھاٹی گیٹ پر اتریں گی؟'' میں نے دوبارہ استفسار کیا۔
''نو۔'' اس نے پھر میری جانب دیکھے بغیر جوب دیا۔
''تو کیا داتا دربار؟'' میں نے پھر سے پوچھا۔
''نو۔'' اس کا جواب پھر بے حد مختصر تھا۔
''مینار پاکستان یا بادامی باغ۔'' میں پھر پوچھ بیٹھا۔
اس بار اس کے چہرے پر مسکراہٹ آ گئی۔ بس چوبرجی اسٹاپ پر رک گئی۔ لڑکی اٹھ کھڑی ہوئی۔
''مسٹر راستہ دیجیے۔'' اس نے پھر کرختگی کا خول پہن لیا۔ میں اٹھ کر ایک طرف ہوگیا۔ پھر کچھ سوچ کر میں بھی نیچے اتر آیا اور فاصلہ چھوڑ کر اس کا تعاقب کرنے لگا۔
اس کا گھر چوبرجی کے علاقے میں ریواز گارڈن کی طرف نکلنے والے راستے پر موجود ایک بڑے سرسبز و شاداب پارک کے کنارے پر واقع تھا۔ لڑکی گھر کے اندر غائب ہوئی تو میری نظروں کا سلسلہ ٹوٹ گیا۔
''آج کے لیے اتنا ہی سہی'' میں بڑبڑاتا ہوا واپس ہولیا۔ میں گھر واپس آ کر بھی سارا دن اس کے تصور میں کھویا رہا۔
اگلے دن دوپہر کے وقت میں پھر بس اسٹاپ پر کھڑا اس لڑکی کو تلاش کر رہا تھا۔ اسی دوران مجھے وہ حسین سراپا نظر آیا۔ میں اس کے قریب جا کر ٹھنک گیا۔ اسٹاپ کی بیک سائیڈ سے ایک لڑکی سیاہ رنگ کا چوڑے جبڑے والا کتا لے کر نمودار ہوئی۔ کل والی لڑکی نے میری طرف اشارہ کیا۔ اس وقت اس لڑکی کے چہرے پر مسکراہٹ تھی۔ میں ڈرتے ڈرتے پیچھے ہٹنے لگا۔ اسی وقت اس نے کتے کی زنجیر چھوڑ دی، کتا غرا کر میری طرف لپکا میں بھاگ اٹھا اور بھاگتے بھاگتے ڈاک خانہ پہنچ گیا۔ میرا خون خشک ہونے لگا اور ٹانگیں کانپنے لگیں لیکن اچانک ایک مدد ملنے پر میں نے سکھ کا سانس لیا۔ وہ نوجوان سپاہی میرا محلے دار تھا جو اپنے ڈنڈے سے کتے کو بھگانے میں لگ گیا تھا۔ جب اس نے کتے کو مجھ پر غراتے دیکھا تو تیزی سے اپنا ڈنڈا پھینک کر کتے کو ڈرایا۔ اس وقت بس اسٹاپ پر موجود لڑکی نے تیز سیٹی بجائی تو کتا واپس مڑ کر اسٹاپ کی طرف جانے لگا۔ سپاہی ڈنڈا ہاتھ میں لیے دونوں لڑکیوں کے قریب چلا گیا۔
''تم نے میرے دوست پر کتا کیوں چھوڑا۔'' کانسٹیبل نے بارعب لہجے میں کہا۔
''آپ کا دوست کسی بھیڑیے سے کم نہیں کتا نہ چھوڑتے تو کیا خرگوش بھگاتے۔'' لڑکی نے ترش لہجے میں کہا۔
''کیا مطلب؟'' کانسٹیبل نے چونک کر وضاحت طلب کی۔

"آپ کا دوست کل سے ہمارے پیچھے پڑا ہوا ہے کل یہ ہمارے گھر تک چلا گیا تھا۔

"میں اسے منع کروں گا، لیکن اسے کھلا نہ چھوڑیے۔" کانسٹیبل نے کتے کی طرف اشارہ کیا۔

"ٹھیک ہے جناب آئندہ ایسا نہیں ہوگا۔" لمبی لڑکی نے زنجیر کھینچتے ہوئے کہا۔ جب کانسٹیبل میری طرف مڑا تو میں ایک موٹر سائیکل رکشہ پر بیٹھ کر دور جا چکا تھا۔ اگلے اسٹاپ پر میں اتر گیا اور واپس گھر کی طرف چلنے لگا۔ میں فیصلہ کر چکا تھا کہ کسی نہ کسی طرح اسے دام میں لا کر چھوڑوں گا۔

اگلے روز میں نقلی داڑھی مونچھ لگائے، آنکھوں پر سیاہ چشمہ پہنے حلیہ بدل کر اسٹاپ پر موجود تھا۔ حسب معمول وہ لڑکی اپنی ایک سہیلی سے ملی اور اس طرف آ کر بس کے انتظار میں کھڑی ہوگئی۔ وہ میرے قریب ہی تھی لیکن مجھے پہچان نہ سکی، جیسے ہی ان کی بس آئی وہ اس پر سوار ہوگئی۔ میں بھی جلدی سے داڑھی مونچھ اتار کر بس میں سوار ہوگیا۔

قسمت مجھ پر مہربان ہوگئی، آج پھر دو نشستیں خالی تھیں ایک پر وہ بیٹھ گئی اور دوسری پر میں بیٹھا تو مجھے دیکھ کر وہ دھک سے رہ گئی۔ میں مسکراتا ہوا اس کے پر شباب جسم پر نظریں گھمانے لگا۔ لڑکی کے پاس ایک بڑا لفافہ تھا جسے سنبھالنے میں وہ ناکام ہو رہی تھی۔ کچھ دیر گزر جانے کے بعد میں نے کہا۔

"لائیے لفافہ مجھے دے دیں میں سنبھال لیتا ہوں چوبرجی آنے پر لے لیجیے گا۔"

"نو۔" اس نے مختصر سا جواب دیا۔

"آپ کو نو کے علاوہ بھی کوئی لفظ یاد ہے؟" اس پر وہ مسکرائی لیکن بولی نہیں نہیں۔ لفافہ بھی میرے حوالے نہیں کیا۔ کوئی دس منٹ بعد میں نے اپنا ہاتھ آہستہ سے لفافے میں چھپے اس لڑکی کے ہاتھ پر رکھ دیا۔ لڑکی نے ہلے جلے، شور مچائے بغیر اپنا ہاتھ چھڑانے کی بہت کوشش کی مگر وہ ایک نازک بدن والی لڑکی تھی اور میرا ہاتھ مضبوط تھا، اس کا ہاتھ میرے ہاتھ میں ڈھیلا پڑ گیا۔ کچھ دیر کے بعد میں نے اپنا ہاتھ ہٹا لیا۔ لڑکی گہرا سانس لے کر کھڑکی سے باہر دیکھنے لگی۔ میں نے سوچا آج کے لیے اتنا ہی کافی ہے۔

چوبرجی اسٹاپ قریب آنے پر لڑکی اپنی سیٹ سے اٹھ گئی۔ میں نے اپنے متعلق اس کا تاثر معلوم کرنے کے لیے اس کے چہرے پر نگاہ جمائی لیکن وہاں ایک کرخت خول چڑھا ہوا تھا۔ وہ میرے اٹھنے پر دروازے کی طرف بڑھنے لگی۔ دروازے پر رک کر اس نے میری طرف دیکھا پھر اپنے موبائل کیمرے سے میری تصویر اتاری۔ میں خوشی سے مسکرایا لیکن اس کے چہرے پر ایک سنگدلانہ کیفیت منجمد تھی۔ میں الجھن میں پڑ گیا اور تصویر اتارنے کا مطلب نہ سمجھ سکا۔ میں بھی بس سے اتر کر سڑک کراس کر کے واپسی کی بس کا انتظار کرنے لگا۔ لڑکی ایک بیوٹی پارلر کے شیڈ کے نیچے رک کر میری طرف دیکھ رہی تھی۔ میرا پروگرام تھا کہ صبح صبح اس کے گھر جاؤں اور اس کی مصروفیت معلوم کروں لیکن میرا علی الصبح اٹھنا مشکل تھا۔ جب میں اٹھا تو سورج چڑھ چکا تھا۔ ناشتے سے فارغ ہو کر میں بس اسٹاپ کی طرف روانہ ہوگیا لیکن آج مجھے مایوسی کا سامنا کرنا پڑا۔ اس لڑکی کا کہیں نام و نشان تک دکھائی نہیں دے رہا تھا۔ میں انتظار کرتے کرتے اکتا گیا تو بس اسٹینڈ پر بنے ہوٹل پر بیٹھ کر چائے پینے لگا۔ چائے ختم کر کے میں نے بس اسٹاپ پر مایوسانہ نگاہ ڈالی اور واپس گھر کی جانب قدم بڑھائے ہی تھے کہ ایک لمبی اور صحت مند لڑکی میری طرف بڑھنے لگی۔ وہ میرے قریب آئی اور آتے ہی بے تکلفی سے میرا ہاتھ تھام کر بس اسٹینڈ کے جوس کارنر کی طرف اشارہ کیا۔ میں

میکانکی انداز میں اس کے ساتھ چل پڑا میں اپنے حواس پر چھانے والی افسردگی اور یاسیت ختم کرنا چاہتا تھا۔

جوس کارنر میں جا کر اس نے مینو کارڈ کھول کر انار کے جوس پر انگلی رکھ دی۔ میں نے جوس منگوایا۔ ہم دونوں جوس پینے لگے۔

"تمہارا نام کیا ہے؟" میں نے اس کی خاموشی توڑنے کی کوشش کی۔ وہ جواب میں صرف مسکرادی۔

میں اسے بازو سے تھام کر اپنی جانب متوجہ کیا۔ "تم کچھ بولتی کیوں نہیں ڈیئر۔" اب کی بار اس نے اپنا بازو چھڑا کر جیب سے ایک نوٹ بک نکالی اور اس پر جو لکھا اسے پڑھ کر میں ایک لمحے کے لیے چکرا گیا اور پھٹی پھٹی نگاہوں سے اسے دیکھنے لگا۔

اس لڑکی نے کاغذ پر لکھا تھا کہ وہ گونگی ہے لیکن کمپنی اچھی فراہم کرے گی۔"

میں نے سوچا کہ چلو کوئی بات نہیں اگر بولتی نہیں تو کیا ہوا۔ مجھے کون سا اس سے فلسفیانہ مسائل پر بحث کرنا ہے۔ دو تین ملاقاتوں میں وہ میرے ساتھ گھل مل گئی اپنے ہاتھوں پر اس نے سردی کی وجہ سے دستانے چڑھا رکھے تھے کچھ ڈسٹ الرجی کا بھی مسئلہ تھا۔ دستانوں میں اس کی انگلیاں موٹی اور لمبی معلوم ہوتی تھیں۔

میں اسے گلشن اقبال کی سیر کرانے کے بعد انار کلی میں گھماتا ہوا عجائب گھر لے گیا پھر اگلے روز اسے مینار پاکستان، شاہی قلعہ اور پھر مقبرہ جہانگیر کی سیر بھی کرائی۔

آج میں نے میکلوڈ روڈ پر شیش محل ہوٹل میں ایک کمرہ کرائے پر لیا اور اسے ساتھ لے کر کمرے میں آ گیا۔ وہ کمرے میں جاتے ہی سنگھار میز کے قریب چلی گئی پھر اچانک ہی میں ہکا بکا رہ گیا میری وہ حالت تھی کہ کاٹو تو بدن میں لہو نہیں میں پھٹی پھٹی نظروں سے لڑکی کو دیکھ رہا تھا۔ میرا دل اچھل کر حلق میں آ گیا۔

میرے سامنے لڑکی کے بجائے ایک ہٹا کٹا لڑکا کھڑا تھا جو طنزیہ انداز میں مسکراتا ہوا میری طرف لپکا میں دروازے کی طرف بھاگا وہ زیادہ پھرتیلا اور طاقتور تھا۔ پھر میں بے ہوش ہو گیا۔

جب مجھے ہوش آیا تو میں نے اپنے آپ کو ایک اسپتال میں پایا جو میکلوڈ روڈ پر واقع تھا۔ میرا جگری یار وقار اپنی گرل فرینڈ کے ساتھ میری تیمارداری کر رہا تھا۔

"یہ سب کیسے ہوا؟" وقار نے تفکرانہ لہجے میں پوچھا۔

"وہ لڑکا جس نے مجھے لڑکی بن کر دھوکا دیا اس پہلے والی لڑکی کا منگیتر ہے، اس نے مجھے سبق سکھانے کے لیے بری طرح مارا پیٹا اور میرا یہ حال کر دیا وہ کم بخت باکسر ہے میری ایک نہ چلی۔" میں نے بجھے ہوئے لہجے میں کہا۔

"اسے گونگا بننے کی کیا ضرورت تھی؟" وقار نے کچھ سوچ کر سوال کیا۔

"اس کی آواز بھاری اور پھٹی ہوئی تھی اگر وہ گونگا بننے کی اداکاری نہ کرتا تو مجھے فوراً معلوم ہو جاتا کہ وہ لڑکی نہیں کوئی مرد ہے۔" میں نے ٹھنڈی آہ بھرتے ہوئے کہا۔ میری پسلیوں میں پھر درد ہونا شروع ہو گیا تھا۔ وقار دھیرے سے مسکرایا اور بولا۔

"میرے دوست گھبرانا مت کبھی کبھی ایسا گھپلا ہو جاتا ہے میں خود دو دفعہ پٹتے پٹتے بچا تھا مگر ہمت نہ ہارنا بعض اوقات قسمت آزمائش کے بعد کھلتی ہے۔ بس اسٹاپ معاشقے کے لیے بہترین جگہ ہے اب اس لڑکی کو دیکھو یہ بھی تو مجھے اسی بس اسٹاپ پر ملی تھی۔

❀......✹......❀

شگفتہ نے کہانی کا پہلا حصہ ختم کیا تو سب لڑکیوں نے مسکرا کر اور مختلف تعریفی جملوں سے مسٹر دلچسپ کی اس کہانی کو سراہا۔ اسی وقت ملازم کھانے کی ٹرالی دھکیلتا

ہوا چلا آیا۔ لڑکیاں کھانا کھانے لگیں کھانے سے فارغ ہوتے ہی دوسری ٹرالی آ موجود ہوئی۔ اس پر چائے کے برتن سجے ہوئے تھے۔ چائے کا دور چلا پھر شگفتہ نے مسٹر دلچسپ کی کتاب کا دوسرا حصہ کھول لیا۔ لڑکیاں ہمہ تن گوش تھیں کیونکہ وہ جانتی تھی کہ اس بار بھی کوئی دلچسپ کہانی ہی ہوگی۔ شگفتہ نے کہانی کا عنوان پڑھا۔

"سفید خون"

نیلم اور سلیمان ہاتھوں میں ہاتھ دیے گلشن اقبال میں داخل ہو کر تیز تیز بڑی جھیل کی طرف قدم اٹھا رہے تھے۔ جب سے امریکہ کی ایک تفریحی کمپنی نے جھیل کے اردگرد کشتیوں والا کھیل نصب کیا تھا۔ نوجوان طبقے کا ہجوم ہر وقت وہاں لگا رہتا تھا۔ سلیمان اپنے ملازم کو بھیج کر دو ٹکٹ منگوا چکا تھا۔

اس جھیل کے کھیل کے بعد اور عجائبات بھی تھے جنہیں پارک کے مختلف پلاٹوں میں ترتیب سے پھیلایا گیا تھا۔ اس نئی سیریز کا آغاز جھیل والے کھیل سے ہوتا تھا۔ عجائبات بھی اسی ٹکٹ میں دکھائے جاتے تھے۔ ٹکٹ خاصا مہنگا تھا۔

اچانک نیلم کسی خیال سے پریشان دکھائی دینے لگی وہ اچانک ہی چونک کر مڑی اور پیچھے دیکھنے لگی پھر اس نے گرد و پیش پر بھی نظر ڈالی سلیمان حیرت سے اس کی بدلی ہوئی کیفیت دیکھنے لگا۔

"کیا بات ہے نیلم تم کچھ خوفزدہ سی ہو رہی ہو؟" سلیمان نے چونک کر اس کی نگاہوں کا تعاقب کیا۔

"کچھ نہیں۔" نیلم نے ٹالنا چاہا۔

لیکن سلیمان رک گیا اور اس کے چہرے کے اتار چڑھاؤ دیکھنے لگا۔ "جو بھی ہے مجھے بتاؤ۔"

"بات صرف اتنی سی ہے کہ ایک بدمعاش ٹائپ آدمی میرا تعاقب کرتا ہے یا اردگرد منڈلاتا رہتا ہے۔ اس وقت بھی میں نے اپنے تعاقب میں اس کی جھلک

خطرناک غلطیاں

☆ اس نیت سے عیب کرنا کہ صرف دو چار مرتبہ کر کے چھوڑ دوں گا۔

☆ اپنا راز کسی دوسرے کو بتا کر اس سے پوشیدہ رکھنے کی درخواست کرنا۔

☆ ہر انسان کے متعلق ظاہری صورت دیکھ کر رائے قائم کرنا۔

☆ کسی کام کو ادھورا چھوڑ کر دوسرے وقت پر مکمل کرنے کی امید رکھنا۔

☆ اس نیت سے عیب کرنا کہ صرف دو چار مرتبہ کر کے چھوڑ دوں گا۔

☆ اپنا راز کسی دوسرے کو بتا کر اس سے پوشیدہ رکھنے کی درخواست کرنا۔

انتخاب: مسعود احمد قریشی...... ڈیرہ غازی خان

دیکھی ہے لیکن وہ بھیڑ میں داخل ہو کر چھپ گیا ہے۔" نیلم نے ایک بار پھر فکرمندی کے ساتھ ماحول پر طائرانہ نگاہ ڈالی۔

"یہ معمولی بات نہیں ڈیئر، تشویشناک معاملہ ہے پولیس کو اطلاع کی یا نہیں۔"

"پولیس کو اطلاع کر چکی ہوں لیکن ابھی تک اس بدمعاش کا کچھ پتا نہیں چلا۔"

"خیر تم مجھے اس کا حلیہ لکھوا دو میں کوشش کروں گا اسے تلاش کرنے کی۔" سلیمان نے پرعزم لہجے میں کہا۔

اس وقت دونوں بڑی جھیل کے سامنے پہنچ گئے ان کا موڈ بدل کر پھر رومانوی ہو گیا وہ باری کا انتظار کرنے لگے ٹکٹ لینے کے بعد ان کا نام پکارا گیا دونوں جھیل کے کنارے چلنے والی الیکٹرک کاروں میں بیٹھ کر لطف اندوز ہونے لگے۔

نیلم اپنے باپ کی جائیداد کی اکلوتی وارث تھی۔ بالغ

ہونے تک اس کی دیکھ بھال کی ذمہ داری اس کے چچا کے ذمہ تھی لیکن جب وہ بالغ ہوئی تو اس نے اپنے باپ کی جائیداد کا کنٹرول سنبھال لیا۔

سلیمان بھی اپنے والدین کی اکلوتی اولاد تھا لیکن اس کے والدین زندہ تھے۔ سلیمان کے والدین نیلم کو اپنی بہو بنانے کے لیے تیار تھے۔ سلیمان سی اے کرنے کے بعد شادی کرنا چاہتا تھا فی الحال دونوں ایک دوسرے کو جانچنے اور پرکھنے میں مصروف تھے۔

❀......۞......❀

نیلم علی الصبح اپنی کوٹھی کے عقبی باغ میں واقع سوئمنگ پول میں تیراکی کر رہی تھی۔ یہ اس کا پسندیدہ مشغلہ تھا۔ یہاں اسے دیکھنے والا کوئی نہیں ہوتا تھا۔ اس کا یہ معمول گرمیوں کے علاوہ سردیوں میں بھی جاری رہتا۔ سوئمنگ پول سے باہر آ کر اس نے تولیے سے اپنا جسم خشک کیا۔ مگر جیسے ہی کی اس کی نگاہ اس جگہ پر گئی جہاں اس نے کپڑے اتار کر رکھے تھے تو وہ سٹپٹا کر رہ گئی۔ پھر غصے سے چاروں طرف دیکھنے لگی کیونکہ اس کے کپڑے اس جگہ موجود نہیں تھے۔ وہ اسی کشمکش میں مبتلا تھی کہ اس حالت میں کوٹھی کے اندر کیسے جائے کیونکہ ملازم جاگ چکے تھے۔ مہمان بھی آئے ہوئے ہیں۔ وہ بڑبڑا کر الیکٹرک پول سے ٹیک لگا کر سامنے آم کے گھنے درخت کو دیکھنے لگی۔ شاخ پر دیکھتے ہی اس کے تن بدن میں آگ لگ گئی۔ ایک بڑا سا بندر کیمرے سے اس کی تصاویر اتار رہا تھا اور اس کے کپڑے شاخ پر لٹک رہے تھے۔

اسی لمحے ملازم سلیمان کو ساتھ لیے چلا آیا۔

''بیٹا اب نیچے آ جا اور میڈم سے معافی مانگ۔''

''کیا مطلب۔'' نیلم ہکا بکا سلیمان اور بندر کو دیکھنے لگی اتنی دیر میں بند چھلانگ لگا کر نیچے آ گیا اور نیلم کے سامنے آ کر مرغا بن کر کان پکڑ لیے۔ نیلم نے سلیمان کے چوڑے سینے پر مکے مارتے ہوئے کہا۔

''اوہ تو میں اب سمجھی یہ آپ کی شرارت تھی۔''

''ہاں بس شغل کا ایک انداز سمجھ لو، اس سے بندر کی ٹریننگ بھی کامیاب ہو گئی۔''

''لیکن اس کی ضرورت کیوں پیش آئی؟'' نیلم نے استفسار کیا۔

''میں بندر اور انسان کی مشابہت پر تحقیق کر رہا ہوں۔'' سلیمان نے معصومیت سے جواب دیا۔

سلیمان اور نیلم چند دن اور سیر و تفریح میں مگن رہے دو تین فلمیں بھی انہوں نے سینما میں جا کر دیکھیں۔ سلیمان اپنے والد کے کاروبار کو وسعت دینے میں مصروف رہا اور نیلم اپنے نئے شادی ہال کی تعمیر میں دن رات ایک کرتی رہی تھی۔

پچھلے دو دن سے اس کے چچا شوکت بیگ بھی نیلم کے ہاں منتقل ہو چکے تھے انہیں شوگر بلڈ پریشر اور دل کے امراض لاحق ہو چکے تھے ان کا ایک ہی بیٹا تھا بہو سے وہ لڑ بیٹھے تھے چنانچہ انہیں نیلم کی کوٹھی میں نچلی منزل پر دو ملازموں کے ساتھ ایک کمرا دے دیا گیا تھا۔

سلیمان رات کے بارہ بجے نیلم کے بیڈ روم میں موجود تھا۔ دونوں جذباتی کیفیت میں ایک دوسرے سے بغل گیر ہونے ہی والے تھے کہ بیڈ روم کی کھڑکی سے ایک سیاہ پوش اندر کودا۔ اس کے ہاتھ میں ریوالور چمک رہا تھا۔

''وہیں رک جاؤ۔'' ایک بارعب آواز نے سلیمان اور نیلم پر سکتہ طاری کر دیا۔ چچا شوکت بیگ کے ہاتھ میں ریوالور دیکھ کر دونوں غصے سے سرخ ہو گئے۔

''چچا یہ کیا بے ہودگی ہے۔'' نیلم نے گرج کر پوچھا۔

''اس کا مطلب ابھی سمجھ میں آ جائے گا۔'' چچا نے ہنس کر کہا۔

"تمہارے جوان ہوتے ہی میرا دل تم پر آ گیا تھا۔ لیکن وصیت کے مطابق تم الگ ہوگئیں جو بھائی نے مرتے وقت لکھوائی تھی۔ وکیل بڑا چالاک تھا وہ میری نگرانی کراتا تھا لیکن اب وہ ہارٹ اٹیک سے مر چکا ہے عارضہ دل مجھے نہیں اسے تھا۔ اب میں اپنے دل کی پیاس بجھاؤں گا پھر تمہیں ختم کر کے تمہارے عاشق کو بھی ختم کردوں گا۔ جس خنجر سے تمہیں ختم کیا جائے گا وہ تمہارے عاشق کے ہاتھ میں دے دیا جائے گا۔ میرا یہ بیان ہوگا کہ نیلم کی چیخیں سن کر میں ادھر کمرے میں آ گیا تو یہ درندہ نیلم سے زیادتی کر کے اسے قتل کر چکا تھا۔ وہ مجھ پر چاقو پھینکنا چاہتا تھا کہ میں نے اپنے پستول سے قاتل کو ختم کردیا۔ میرا وکیل مجھے صاف بچالے گا اور تمہاری ساری جائیداد مجھے منتقل ہوجائے گی۔"

"چچا آپ انتہائی بے غیرت اور لالچی انسان ہیں۔ آپ کو شرم نہ آئی اپنی بھتیجی کے بارے میں ایسا پلان بناتے وقت۔" نیلم گرج کر بولی۔

نیلم گارڈ کو بلانے کے لیے بیل بجانا چاہتی تھی کہ چچا نے میز پر لگی بیل فائر کر کے اڑادی۔ فائر بے آواز تھا پھر دونوں کو ہاتھ سروں سے اوپر کرنے کا حکم دے کر بیڈ روم کا اکلوتا دروازہ اندر سے کھول دیا۔ اس کے دو معاش ساتھی اندر داخل ہوگئے اور سلیمان کو جکڑ لیا۔ اس وقت نیلم نے تیز سیٹی بجائی۔ اسی لمحے چچا کی بازی الٹ گئی۔ بد معاش بیڈ روم کا دروزہ اندر سے بند کرنا بھول گئے تھے۔ دروازہ تھوڑا سا کھلا اور نیلم کا پالتو تربیت یافتہ وزنی کتا ٹائیگر اندر داخل ہو کر چچا کی طرف لپکا۔ چچا نے پستول سے پے در پے فائر کیے لیکن کتا بہت پھرتیلا تھا پھر بدحواسی میں چچا سے نشانہ بھی صحیح نہ لگا۔ کتے نے چچا پر حملہ کردیا دوسرے ہی لمحے کمرے میں چچا کی خوفناک چیخیں گونجنے لگیں سلیمان نے موقع پا کر بدمعاشوں کو گھونسوں پر رکھ لیا وہ باکسنگ کی مشق کیا کرتا تھا اور جسم بھی توانا تھا۔ وہ صرف چچا کے پستول سے بے بس تھا۔ کچھ ہی دیر بعد ٹائیگر اور سلیمان فاتحانہ انداز میں نیلم کے سامنے کھڑے تھے نیلم ان کی بہادری پر مسکرا اٹھی۔

اسی کے ساتھ دوسرا حصہ بھی اپنے اختتام کو پہنچا۔ اب تیسرا اور آخری حصہ شروع ہوا جس کا عنوان تھا "محبت کے تار۔"

محبت کے تار آپس میں جڑتے ہی رہتے ہیں۔ کبھی صحیح اور کبھی غلط لیکن وہاں تو غلط ہی جڑے تھے۔ وہ اسکول ٹیچر تھی منیرہ ہائی اسکول کی پرنسپل اور وہ اس کا شاگرد فاروق احمد تھا۔ وہ میٹرک میں منیرہ کے پاس پڑھتا تھا اسکول لڑکیوں اور بچوں کے لیے تھا۔

لیکن فاروق احمد چونکہ ساتویں کلاس سے ہی منیرہ کو دوسروں سے مختلف، حساس اور اپنا ہمدرد معلوم ہوتا تھا۔ چنانچہ اس نے اسے صبح کے وقت لڑکیوں اور بچوں کے درمیان پڑھانا شروع کردیا۔ رفتہ رفتہ ان کا سلوک دوستی میں بدل گیا۔ فاروق نے اسکول میں کبھی کوئی غیر اخلاقی یا غیر ذمہ دارانہ حرکت نہ کی اور مزید اعتماد حاصل کرلیا۔ منیرہ اور ناصرہ دو بہنیں تھیں۔ جن کا کوئی بھائی نہ تھا۔ اس طرح فاروق احمد چار بھائی تھے ان کی کوئی بہن نہ تھی یہ محرومی بھی باعث کشش تھی۔ منیرہ کے والد پرائیویٹ ملازمت کے بعد اب اسکول میں ہی پڑھاتے تھے اور ناصرہ بھی بچوں کی کلاس لیتی تھی۔

دونوں لڑکیوں کی والدہ بھی بہت اچھی پر خلوص خاتون تھیں۔ جو فاروق کو اپنے بیٹے کی طرح سمجھتی تھی۔ کیونکہ اس کے ہاں دو بیٹے پیدا ہو کر فوت ہوگئے تھے۔

پہلے وہ لوگ اسکول سے باہر کرائے کے الگ مکان میں رہتے تھے لیکن پھر مالک مکان نے مکان خالی کرایا تو وہ اپنا زیادہ سامان کسی عزیز کے ہاں رکھوا کر تھوڑے سامان کے ساتھ نیلم بلاک میں واقع اسکول میں رہائش

پذیر ہو گئے۔

منیرہ کافی شغل پسند اور زندہ دل بھی تھی اگرچہ دوسرے اسٹوڈنٹس کے ساتھ وہ نرم اور اچھے برتاؤ کے ساتھ سخت مزاج بھی تھی لیکن فاروق پر اس کی شفقت مسلسل برستی رہی وہ تھا بھی بے چارہ نرمی کے ہی قابل گھر میں بھی کبھی والدین نے اس کے ساتھ سخت رویہ نہیں اپنایا تھا نہ کبھی ہاتھ اٹھایا تھا منیرہ نے بھی یہی کیا چنانچہ فاروق کی دلچسپی بھی اس کی ٹیچر منیرہ کی شخصیت میں ہی تھی۔

ایک دن فاروق منیرہ کے والد سے انگریزی پڑھنے کے بعد نیچے آفس میں منیرہ کے پاس اسلامیات اختیاری اور جنرل سائنس پڑھنے کے لیے آیا تو ایک عورت منیرہ سے ملنے کے لیے آ گئی۔ فاروق، منیرہ کے قریب ہی کرسی پر ٹیبل کے کنارے بیٹھا تھا۔ وہ عورت میز کے دوسرے کنارے کرسی پر موجود تھی۔ اس نے دو تین رسمی باتیں کیں پھر کچھ کہتے کہتے رک گئی۔ منیرہ نے کہا۔

''باجی کہو رک کیوں گئیں؟'' وہ عورت فاروق کی طرف دیکھ کر بولی۔

''آپ نے نوجوان لڑکوں کو پاس بٹھا رکھا ہے اس کے سامنے ہی بتا دوں۔'' منیرہ نے ہنستے ہوئے کہا۔

''ہاں اس کے سامنے ہی کہہ دو بے چارے کے کان خراب ہیں سن نہیں سکتا۔'' اس عورت کا اطمینان تو ہو گیا لیکن فاروق کو ہنسی ضبط کرنا مشکل ہو گئی۔ اس عورت نے خون کی کمی کا مسئلہ ڈسکس کیا۔

منیرہ نے اسے مشورہ دیا کہ اچھی طرح کھایا پیا کرو تا کہ نیا خون جلد از جلد بنتا رہے۔

ایک بار نیچے کلاس رومز میں نیا رنگ روغن کیا جا رہا تھا اسکول کی چھت پر تمام لڑکیاں اور بچے جمع تھے۔ منیرہ کے سامنے فاروق موجود تھا اور پڑھ چکا تھا۔ فاروق نے کتابیں لے کر اٹھنے کی کوشش کی تو منیرہ نے اسے ہنستے ہوئے کہا کہ بیٹھ جاؤ ابھی اتنی جلدی بھی کیا ہے، تم نے گھر جا کر ہانڈی روٹی کرنی ہے۔'' چھت پر موجود ساری لڑکیاں زور زور سے ہنس پڑیں۔ فاروق کا منہ لٹک گیا۔

اسکول میں میٹرک کی کلاس میں ایک بہت موٹی لڑکی داخل ہو گئی ایک دن اسکول کی لڑکیاں سردیوں کی دھوپ سینکنے کے لیے چھت پر جمع تھیں فاروق نے موٹی لڑکی انیلا کو مخاطب کرتے ہوئے کہا۔ ''تم صبح ناشتے میں شتر مرغ کا انڈہ کھا کر آتی ہو۔'' سب لڑکیاں اور بچے ہنس پڑے۔ موٹی لڑکی رونے لگی۔

منیرہ کو اسکول اور گھر کے چھوٹے موٹے کام کرانے کے لیے فاروق کی ضرورت پڑتی رہتی تھی کیونکہ ہر کام اس کے والد کے کرنے والا نہیں ہوتا تھا۔ رفتہ رفتہ منیرہ اور فاروق کا تعلق پیار میں بدل گیا لیکن دونوں ہی مدعا زبان پر نہیں لا سکتے تھے اسے استاد ہونے کا احترام اور اسے شاگرد ہونے کا احترام کرنا پڑتا تھا لیکن دلوں میں پرواز جاری رہتی تھی۔

میٹرک کے زمانے میں انسان زیادہ میچور نہیں ہوتا۔ فاروق نے حسب عادت کتابوں پر کاغذ چڑھاتے وقت عورتوں کی خوب صورت تصاویر والا کاغذ چڑھا دیا۔ سر نے وہ کتاب دیکھ لی انہوں کتاب لے کر اس کی ورق گردانی کی کتاب اسلامیات اختیاری کی تھی سر نے غصیلی نظروں سے فاروق کو گھورتے ہوئے کہا۔

''تمہیں شرم نہ آئی اسلامیات کی کتاب کے اوپر نیم عریاں تصاویر والا اخبار چڑھاتے ہوئے۔''

''سر گھر جا کر اتار دوں گا۔''

''نہیں ابھی اتارو۔'' فاروق کا موڈ بگڑ گیا اور اس نے کہہ دیا۔

''سر اسلامیات اختیاری آپ کا پیریڈ نہیں یہ تو

پرنسپل کا پریڈ ہے وہ کہے گی تو اتار دوں گا۔" سر کے چہرے پر غصے کے آثار پیدا ہوئے۔

"یہی تمہاری بدمعاشی ہے کہ کوئی معقول بات تم مانتے نہیں اور ہر بات میں اس کو بیچ میں لے آتے ہو۔"

اتنے میں منیرہ نے فاروق کو آواز دے دی۔ منیرہ نے فوراً بھانپ لیا کہ فاروق کا موڈ خراب ہے اس نے پوچھا۔

"کیا ہوا ہے کیوں منہ لٹکایا ہوا ہے؟" فاروق نے اسے صورت حال سے آگاہ کرتے ہوئے کہا کہ

"غلطی سے عورتوں کی تصاویر والا یہ کاغذ اچڑھا دیا ہے سر میرے پیچھے پڑ گئے ہیں کہ اسے اتارو۔"

اتنے میں سر جو منیرہ کے والد تھے سیڑھیاں اترتے ہوئے نیچے آئے منیرہ نے اپنے باپ کو مخاطب کرتے ہوئے کہا۔

"ابا جی یہ خود ہی تصاویر والا کاغذ اتار دے گا آپ اس کے پیچھے نہ پڑیں۔ یہ پریشان ہو جائے گا۔" سر نے خفگی سے اپنی بیٹی کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

"اور سر پر چڑھاؤ پہلے ہی دماغ خراب ہے نواب صاحب ہر کام اپنی مرضی سے کرتے ہیں اور تمہاری حمایت کا فائدہ اٹھاتے ہیں۔" منیرہ نے ہنستے ہوئے کوئی جواب نہ دیا۔

چھت پر پڑھنے کے بعد فاروق نیچے اترا تو موسم کافی سرد ہو چکا تھا بادل بھی آ گئے تھے۔ منیرہ الحمد کالونی بازار کسی کام سے جا رہی تھی۔ اس نے فاروق سے کہا کہ میرے آنے تک آفس میں بیٹھو پھر پڑھ لینا۔ فاروق اثبات میں سر ہلاتا ہوا اپنی مخصوص نشست پر بیٹھ گیا۔ اتنے میں آدھی چھٹی ہو گئی منیرہ نے اپنے گھر کے افراد کے علاوہ باہر کی بھی ایک ٹیچر بچوں کو پڑھانے کے لیے رکھی ہوئی تھی۔ وہ ٹیچر تین لڑکیوں کے ساتھ آفس میں آئی اور فاروق سے کہنے لگی۔

"آپ گیراج میں چلے جائیں ہمیں یہاں کچھ باتیں کرنی ہیں۔" فاروق نے کمرے کی مغربی سمت اشارہ کرتے ہوئے کہا۔" آپ اس طرف بیٹھ کر گفتگو کر لیں۔"

"تم اٹھ جاؤ گے تو کیا ہو جائے گا کچھ دیر کے لیے باہر چلے جاؤ۔" ادھیڑ عمر ٹیچر نے قدرے کرخت لہجے میں کہا۔ فاروق نے سرد لہجے میں جواب دیا۔" میرے اٹھنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا میں روزانہ یہیں بیٹھتا ہوں آج پہلی بار نہیں بیٹھا پھر مجھے مس منیرہ نے خود کہا ہے کہ میرے آنے تک یہیں بیٹھو آپ کون ہوتی ہیں اٹھانے والی۔"

"تمہیں کسی کا ادب اور لحاظ نہیں سب کے سر پر چڑھے ہو کسی بڑے کا احترام کرنا بھی سیکھو۔" ٹیچر نے ترش لہجے میں کہا۔

"یہاں احترام کا کیا جواز آپ خوامخواہ بحث کر رہی ہیں مس منیرہ کی میز کے پاس چونکہ سوئی گیس کا ہیٹر لگا ہا ہے اس لیے آپ مجھے اٹھانا چاہتی ہیں۔ لیکن آپ اس میں کامیاب نہیں ہو سکتیں۔" ادھیڑ عمر ٹیچر نے بے حد ناگواری اور خشونت سے اسے گھورتے ہوئے منیرہ کے والد کو بلایا اور انہیں کہا کہ سر ہم کچھ دیر آفس میں یہاں بیٹھنے کا حق نہیں رکھتیں یہ لڑکا ہمیں آنکھیں دکھا رہا ہے۔ اسے یہاں سے اٹھا دیں۔" منیرہ کے والد صورت حال کو اچھی طرح سمجھتے تھے چنانچہ انہوں نے ٹالتے ہوئے کہا۔

"یہ اس کا معاملہ ہے ابھی تھوڑی دیر میں آ جائے تو اسی سے بات کرنا۔" بوڑھی ٹیچر لڑکیوں کے ساتھ منہ لٹا کر آفس کے کونے میں بیٹھ گئی۔

ایک روز صبح کے وقت فاروق جیسے ہی اسکول میں داخل ہوا منیرہ نے اسے خوشگوار لہجے میں کہا۔

"رات کو میں نے خود کھیر بنائی تھی کھاؤ گے۔" فاروق نے مسکراتے ہوئے کہا۔

"اگر آپ نے بنائی ہے تو ضرور کھاؤں گا۔" منیرہ قریب ہی واقع کچن میں داخل ہوئی جب واپس پلٹی تو ایک کٹورے میں کھیر فاروق کے سامنے تھی۔

دو دن بعد جب پھر آمنا سامنا ہوا اور منیرہ کا موڈ خوشگوار تھا تب فاروق نے مسکراتے ہوئے کہا۔

"آپ نے ڈبے کی ساری چینی کھیر میں ڈال دی تھی میں میٹھے کا شوقین ہوں لیکن پھر بھی میٹھا تیز تھا۔" چند روز کے بعد دونوں بہنیں فاروق کے ساتھ ایک فلم کا پہلا شو دیکھنے کے لیے نکلیں تو برابر کے مکان کی چھت جس پر اکثر ایک لڑکی پھرتی رہتی تھی اس نے انہیں ٹوک دیا۔"

"آپ لوگ کہاں جا رہے ہیں۔" منیرہ نے فوراً سر اٹھا کر اس کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

"ایک مرگ ہو گئی ہے کسی کے گھر جا رہے ہیں تم نے چلنا ہے۔" لڑکی کچھ شرمندہ ہو گئی۔

اندر ہی اندر تو محبت بڑھتی گئی لیکن دنیاوی فاصلے بڑھتے گئے یہی پرانا مسئلہ لاحق ہو چکا تھا منیرہ کی شادی ہو رہی تھی اور فاروق کی رگ رگ میں زہر سا دوڑنے لگا تھا۔ محبت کے شیش محل کی دیواریں ٹوٹ کر کرچی کرچی ہو رہی تھیں۔ دل تھا کہ کسی کام میں لگتا ہی نہیں تھا۔ اکتاہٹ، اداسی، پریشانی ڈپریشن نے اس کے دل و دماغ پر قبضہ کر رکھا تھا۔

اس کی شادی ہو گئی فاروق کو اس کے دوستوں حسنین اور راشد نے سنبھالا اسے شہر بھر کی سیر کراتے رہے پھر رفتہ رفتہ اس کی طبیعت سنبھل گئی لیکن کبھی کبھار اچانک ہی دل کے کسی سوراخ سے خون ابلنے لگتا۔ اسی کشمکش میں کئی سال گزر گئے۔ ایک روز فاروق غصے اور اشتعال کے عالم میں منیرہ کے گھر دیوار پھلانگ کر داخل ہو گیا رات کا وقت تھا اس نے چہرہ سیاہ نقاب میں چھپا رکھا تھا اس کے ہاتھوں میں ریوالور تھا۔ وہ آگے بڑھتا گیا اور منیرہ کے سسرال میں موجود تمام افراد موت کے گھاٹ اترتے چلے گئے۔ آخر میں فاروق نے خون اگلتی لاشوں کے درمیان منیرہ کے سامنے اپنے چہرے پر سیاہ نقاب اتار لیا۔

اسی وقت کی آنکھ کھل گئی وہ خواب کو یاد کرتا ہوا بڑبڑانے لگا اس نے تو کبھی چڑیا کا بچہ بھی ہلاک نہیں کیا وہ کس طرح اتنی لاشیں گرا سکتا ہے۔

پھر ایک سال بعد قدرت کا کرنا ایسا ہوا کہ منیرہ کے بچے نہ ہونے کی وجہ سے شوہر سے ان بن ہو گئی جو علیحدگی پر منتج ہوئی۔ وہ واپس لوٹ کر اسکول والے گھر کے دروازے پر پہنچی تو بڑھی ہوئی شیو کے ساتھ اس کی راہ دیکھتا فاروق پتھرائی ہوئی آنکھوں سے انتظار کرتا ہوا دوسری دنیا میں جا چکا تھا۔ وہ اس سنگ دل اور بے رحم دنیا سے منہ موڑ چکا تھا جس میں سچی محبت کو موت کا کفن پہنا دیا جاتا ہے۔ منیرہ اپنے شوہر اور اپنے چاہنے والے دونوں سے محروم ہو چکی تھی۔ اس نے ٹیک لگائے فاروق کا کندھا ہلایا تو فاروق اس کے پیروں میں آ گرا۔

فاروق کا المناک انجام سن کر شگفتہ کی سہیلیوں پر سوگوار سناٹا طاری ہو گیا۔ شگفتہ بھی غمگین تھی۔ مصنف عمران احمد عرف مسٹر دلچسپ کی کتاب ختم ہو چکی تھی جو بے حد دلچسپ ہونے کے ساتھ ساتھ آخر میں ٹریجڈی لیے ہوئے تھی۔

دوسری دنیا

حسیب جواد علی

وہ عالم باعمل' رموزداں' روشن تدبیر'ہوشیار مغز'مفکر حیراں کن حکمت آگاہ صفات کا مالک تھا لیکن زمانہ'کم نظر'کوتاہ قامت دانشور اسے تسلیم کرنے کو تیار نہیں تھے۔ وہ طبیب حاذق تھا مگر اس کے پاس کسی طب کی جامعہ کی سند نہ تھی۔ اس نے طب کی تعلیم اس نیورسٹی سے حاصل کی تھی جہاں سند جاری کرنے کا رواج نہ تھا۔

مصر کے ایک جینئس نوجوان کی دلچسپ روداد' اس نے طب کے بڑے ٹھیکیداروں کو چیلنج کر دیا تھا۔

''میرا ڈاکٹر بیٹا آ گیا...... میرا ڈاکٹر آ گیا......''

محمد عرفہ کی ماں ہذیانی انداز میں چیخ چیخ کر اعلان کررہی تھی پھر وہ گلی سے دروازے میں داخل ہوگئی' اپنے بیٹے سے ایک بار پھر بغل گیر ہوئی۔ اس کا ماتھا چوما اور لپک کر باورچی خانے میں داخل ہوگئی' کچھ اچھا سا کھانا بھی تو اپنے بیٹے کے لیے بنانا تھا اتنے طویل عرصہ کے بعد اس کی واپسی ہوئی تھی' پڑوسی بھی ایک کے بعد ایک گھر میں آنا شروع ہوگئے۔ کچھ تو دروازے میں ہی وہی عربی انداز کا نعرہ لگاتے جس کی آواز ٹیڈی کی وجہ سے ملتی جلتی ہوتی ہے اور پھر ان خوشی کے نعروں سے سارا محلہ گونج اٹھا ایک اچانک سی چہل پہل اور گلی میں بھاگ دوڑ برپا ہوگئی' بچے بڑے سب ہی محمد عرفہ کو دیکھنا چاہتے تھے وہ سات سال بعد آیا تھا جو بچے ابتدائی اسکول سے طالب علم تھے انہوں نے اس کے بارے میں صرف سنا تھا لیکن جوان لڑکے لڑکیوں کو وہ اچھی طرح یاد تھا۔

محمد عرفہ کی ماں کو بیوہ ہوئے ایک عرصہ ہوگیا تھا جب وہ کم عمر میں ہی تھی اور محمد عرفہ تو بہت ہی کم سن تھا دو تین سال کا ام عرفہ نے دوسری شادی کے بارے میں کبھی نہیں سوچا اس کی تمام تر توجہ کا مرکز اس کا بیٹا ہی تھا غنیمت تھا کہ وہ سلائی کڑھائی کی ماہر تھی اور اپنے اس ہنر کے طفیل ضروریات زندگی اور بچے کی تعلیم کے اخراجات ایک حد تک پورے کرنے کی اہل تھی۔ اس کی اہم ترین ضرورت بیٹے کی تعلیم...... بہترین تعلیم کے اخراجات تھے اس نے بیٹے کو اچھی تعلیم دلانے کا مصمم ارادہ کیا ہوا تھا' اس کی نظر میں طب کا پیشہ دنیا کا بہترین پیشہ تھا اور اس نے اپنے بیٹے کے لیے اس پیشے کو چن لیا تھا اور اب وہ تن من دھن سے اس مقصد کو حاصل کرنے میں مصروف ہوگئی تھی۔ وہ ابھی ابتدائی اسکول میں ہی تھا کہ اس کی ماں نے اسے ڈاکٹر کہہ کر بلانا شروع کردیا تھا' فطرتاً وہ نیک اور مذہبی خیالات کی عورت تھی چنانچہ باوجود غربت آس پڑوس میں اس کی عزت بھی تھی اور اہم معاملات میں اس کے مشوروں کی قدرومنزلت بھی۔ چاہے وہ لوگ صوم وصلوٰۃ اور حجاب کے پابند ہوں یا جدید فیشن اور طرز زندگی کے دلدادہ۔

مصر میں اب سے چالیس پچاس سال پہلے بلکہ بہت حد تک اب بھی کچھ ایسا ہی ماحول رہا ہے کہ اگر ایک گھر کے مرد نماز کے وقت مسجد میں اور خواتین گھر میں مصلّے پر ہیں تو عین ممکن ہے کہ برابر کے گھر میں

اونچی آواز میں موسیقی چل رہی ہو اور مکین مختصر کپڑوں میں مغربی دھنوں پر رقص میں مصروف ہوں' اگر مسجدیں آباد ہیں تو دوسری طرف رقص گاہیں بھی۔ طویل عرصہ یورپ کے زیر اثر رہنے کے ردعمل کے طور پر وہ ایسے ہوگئے ہیں کچھ اس تہذیب کے باغی ہوگئے تو پھر اسیر دریا کے دو کنارے ایک دوسرے سے ملتے تو ہیں پر ساتھ ساتھ چلتے ہیں' دریا رواں رہے تو کناروں کا وجود بھی برقرار۔

ہاں کبھی سیلاب ان کناروں کو توڑ بھی دیتا ہے اور دریا ہی خشک ہوجائے تو پھر سب کچھ ختم...... یہاں سب لوگ ساتھ رہتے ہیں باوجود مختلف نظریات اور طرز زندگی' اپنے اپنے طریقوں سے اپنی اپنی کھال میں۔ ام عرفہ ان دونوں طبقوں میں مبقول تھی' ایک طبقے میں اپنے کردار کی وجہ سے اور دوسرے میں اپنے ہنر کی بدولت دراصل یہ فیشن اور جدت پسندی ذرا مہنگا شوق ہے' محدود آمدنی اور خراب معاشی حالات میں اگر کم سے کم لاگت میں اس جدت پسندی کی تسکین ہوجائے' سب کچھ مہیا ہوجائے تو اس سے اچھی بات اور کیا ہوسکتی ہے یہ ضرورت ام عرفہ پوری کرسکتی تھی' درزی کے مقابلے میں نصف لاگت میں۔

بیٹے نے جب ثانوی اسکول میں اچھے درجات میں کامیابی حاصل کی اور پھر میڈیکل کالج میں داخلے کا امتحان بھی پاس کرلیا تو امید ہوئی کہ اچھے کالج میں داخلے کا حق دار ہوجائے گا۔ خواب دیکھنا اور آرزوئیں اور تمنائیں پالنا اور بات ہے اور خوابوں کی تعبیر پانا آرزوؤں کو پورا ہوتے دیکھنا دوسری...... زمینی حقائق کا سامنا ہو تو دلوں کی دھڑکن بڑھتی ہے' بھاگ دوڑ شروع ہوتی ہے اور آگے آنے والی مشکلات کا ادراک ہوتا ہے۔ پہلے اس نے اندازہ نہیں لگایا تھا کہ خرچ کتنا بڑھ سکتے ہیں اب سب کچھ مشکل نظر آنے لگا۔

پڑھائی کے لیے جس یکسوئی کی ضرورت ہے اس کو مدنظر رکھتے ہوئے گھر میں ایک کمرہ مخصوص کرنا ضرور محسوس ہوا' لکھنے پڑھنے کو میز کرسی اور کتابوں کپڑوں کے لیے الماری...... یہ سب چیزیں گھر میں رکھنے کی ضرورت اس کے مرحوم شوہر نے کبھی محسوس ہی نہیں کی تھی' اب یہ سب ضروری ہوگیا تھا۔

کتابوں کی خریداری' کپڑوں کی فراہمی اور کالج کے اخراجات سے متعلق بہت سے مسائل خود رو پودوں کی طرح اُگنے لگے' ان حالات میں ام عرفہ کی شخصیت پر گہرا اثر پڑا' وہ فکرمند اور سنجیدہ رہنے لگی تھی۔

صبح کا گیا محمد عرفہ بعد مغرب واپس آیا تو ماں کو خبر سنائی کہ فہرست میں اس کا نام بہت اوپر ہے' بالکل شروع میں۔ دو ایک روز میں حتمی فہرست کا اعلان ہوجائے گا اور پھر چند دنوں میں پڑھائی شروع۔ ام عرفہ کے لیے یہ خوش خبری دراصل ایک نئی آزمائش کی شروعات تھی' محمد عرفہ کی بات سن کر بیٹے کے لیے دل سے دعا نکلی۔ ساتھ ہی حالات سے نبٹنے کی ہمت اور طاقت پانے کی دعا اس نے اپنے لیے بھی کی۔

محمد عرفہ اندر کمرے میں گیا اور پھر کچھ دیر بعد منہ ہاتھ دھوکر کرسی پر آکے بیٹھ گیا جہاں سامنے میز پر اس کی ماں نے کچھ کھانا اس کے لیے تیار کر کے رکھا ہوا تھا۔ ابھی اس نے ہاتھ بڑھایا ہی تھا کہ دروازے پر دستک ہوئی۔

ماں نے دروازے کی طرف قدم بڑھایا تو محمد عرفہ نے اشارے سے اسے روک دیا اور خود وہاں چلا گیا۔ دروازہ کھلنے اور پھر کچھ دیر بعد بند ہونے کی آواز تو ام عرفہ نے سنی لیکن پھر خاموشی چھاگئی۔ کچھ دیر انتظار کے بعد بھی جب وہ واپس نہیں آیا تو وہ دروازے پر گئی اور باہر جھانکا' گلی دونوں طرف سے تقریباً سنسان تھی۔ سامنے والوں کا کتا بیٹھا ہانپ رہا تھا اور چوتھے

گھر کا مکین کام سے واپسی پر گاڑی بند کرنے کے بعد اسے چاروں طرف سے جانچ رہا تھا اوسط آمدنی والے پرانی کار کے مالک کے مخصوص انداز سے اور دوسری طرف کے چوتھے مکان والوں کی بیٹی اپنے دوست سے گلے مل رہی تھی۔ ام عرفہ کو دیکھ کر اس ضروری کام کو ادھورا چھوڑ کر تیزی سے مکان میں داخل ہوگئی ادھر لڑکا جو تفریح کے بعد اس کو گھر چھوڑنے آیا تھا' سٹپٹا گیا اور جلدی سے موٹر سائیکل گھما کر مخالف سمت میں روانہ ہوگیا۔ دور کچھ لوگ شاید عشاء کی نماز کے بعد واپس آرہے تھے' ام عرفہ نے بیٹے کو زور زور سے آوازیں دیں پھر گاڑی والے سے پوچھا۔

''جب تم گلی میں داخل ہوئے ہوگے اسی وقت محمد عرفہ گھر سے نکلا تھا' تم نے دیکھا ہوگا کون تھا اس کے ساتھ؟''

''میں نے نہیں دیکھا' اس طرف میرا دھیان نہیں تھا۔'' کار والے کا جواب مکمل ہونے سے پہلے وہ نمازیوں کی طرف متوجہ ہوگئی انہوں نے بھی نہیں دیکھا۔

''وہ ذرا پہلے گلی سے نکل گیا ہوگا' کیوں خیریت تو ہے ام عرفہ!'' کسی نے کہا۔

اب اس کی توجہ سڑک کی طرف تھی وہ چلتی ہوئی سڑک تک آگئی' اکثر دکان دار اسے جانتے تھے' سب نے ہی لاعلمی کا اظہار کیا' اس نے تقریباً سب سے ہی فرداً فرداً پوچھ لیا۔ وہ واپس گھر آگئی اور کرسی پر بیٹھ گئی' وہاں سامنے کھانا رکھا تھا جواب ٹھنڈا ہوچکا تھا' وہ ساکت بیٹھی ہوئی تھی اور کان دروازے پر لگے ہوئے تھے۔

جب رات کا زیادہ حصہ گزر چکا اور خاموشی اور سناٹے کا راج ہو تو چاپ' آہٹ اور دستک بلکہ ہر طرح کی آوازیں بہت صاف سنائی دینے لگتی ہیں۔ کافی دور بھی گلی میں آنے جانے والوں کی آوزیں سنائی دے جاتی ہیں لیکن اس رات تو جیسے ساری آوازیں سب آہٹیں سوگئی تھیں۔

صبح فجر کی اذان پر وہ چونک کر اٹھی نماز کی ادائیگی کے بعد وہ باہر نکلی اور سیدھی پولیس اسٹیشن پہنچی' ڈیوٹی پر موجود افسر نے معاملے کی سنگینی کو بالکل محسوس نہیں کیا۔

''تمہارا بیٹا شاید زیادہ پی گیا ہوگا اور کسی سستے نائٹ کلب کی سیڑھیوں پر بے سدھ پڑا ہوگا اگر اس کی جیب میں اس کی شناخت موجود ہوگی تو روشنی ہوتے ہی وہاں کے پولیس والے اسے گھر پہنچادیں گے۔ اماں تم کو معلوم ہوگا کہ رات بھر شرابیوں کی حفاظت کرنے' صبح انہیں گھر پہنچانے اور رات گئے گھومتے داڑھی والوں کو تھانے میں بند کرنے کے خصوصی احکامات ہیں حکومت کی طرف سے۔'' پولیس افسر نے ہنستے ہوئے اپنی بات ختم کی۔

''وہ ایسا نہیں ہے...... میرا ڈاکٹر بیٹا ایسا نہیں ہے اور تم بہت ہی غیر ذمہ دار پولیس افسر ہو۔ بہتر ہے کہ تم اپنے آپ کو بدل لو۔'' ام عرفہ نے اس کو ڈانٹا تو نیم دلی سے اس نے شکایت درج کرلی لیکن انداز بتارہے تھے کہ وہ کچھ کرنے والا نہیں۔

ام عرفہ واپس گھر کی طرف چلی تو اس نے سوچا شاید بیٹا واپس آگیا ہوگا اور دروازے پر حیران کھڑا ہوگا کہ گھر بند کیوں ہے لیکن وہاں ایسا کچھ بھی نہیں تھا وہ نڈھال اور مایوس بہت دیر تک کرسی پر بیٹھی رہی' دوپہر تک سب کو معلوم ہوگیا کہ محمد عرفہ پراسرار طور پر لاپتا ہوگیا ہے۔

ام عرفہ کے لیے اگلے سات سال کا ایک ایک دن بلکہ ایک ایک لمحہ گویا انتظار سے عبارت تھا لیکن یہ انتظار کی کیفیت اس لحاظ سے مختلف تھی کہ اس میں مایوسی کا بالکل کہیں بھی دخل نہیں تھا۔ اسے یقین تھا کہ اس کا ڈاکٹر بیٹا ضرور واپس آئے گا' وہ ضرور ڈاکٹر

گھر کا مکین کام سے واپسی پر گاڑی بند کرنے کے بعد اسے چاروں طرف سے جانچ رہا تھا اوسط آمدنی والے پرانی کار کے مالک کے مخصوص انداز سے اور دوسری طرف کے چوتھے مکان والوں کی بیٹی اپنے دوست سے گلے مل رہی تھی۔ ام عرفہ کو دیکھ کر اس ضروری کام کو ادھورا چھوڑ کر تیزی سے مکان میں داخل ہوگئی ادھر لڑکا جو تفریح کے بعد اس کو گھر چھوڑنے آیا تھا' ٹپٹا گیا اور جلدی سے موٹر سائیکل گھما کر مخالف سمت میں روانہ ہوگیا۔ دور کچھ لوگ شاید عشاء کی نماز کے بعد واپس آرہے تھے' ام عرفہ نے بیٹے کو زور زور سے آوازیں دیں پھر گاڑی والے سے پوچھا۔

''جب تم گلی میں داخل ہوئے ہوگے اسی وقت محمد عرفہ گھر سے نکلا تھا' تم نے دیکھا ہوگا کون تھا اس کے ساتھ؟''

''میں نے نہیں دیکھا' اس طرف میرا دھیان نہیں تھا۔'' کار والے کا جواب مکمل ہونے سے پہلے وہ نمازیوں کی طرف متوجہ ہوگئی انہوں نے بھی نہیں دیکھا۔

''وہ ذرا پہلے گلی سے نکل گیا ہوگا' کیوں خیریت تو ہے ام عرفہ!'' کسی نے کہا۔

اب اس کی توجہ سڑک کی طرف تھی وہ چلتی ہوئی سڑک تک آگئی' اکثر دکان دار اسے جانتے تھے' سب نے ہی لاعلمی کا اظہار کیا' اس نے تقریباً سب سے ہی فرداً فرداً پوچھ لیا۔ وہ واپس گھر آگئی اور کرسی پر بیٹھ گئی' وہاں سامنے کھانا رکھا تھا جو اب ٹھنڈا ہوچکا تھا' وہ ساکت بیٹھی ہوئی تھی اور کان دروازے پر لگے ہوئے تھے۔

جب رات کا زیادہ حصہ گزر چکا اور خاموشی اور سناٹے کا راج ہو تو چاپ' آہٹ اور دستک بلکہ ہر طرح کی آوازیں بہت صاف سنائی دینے لگتی ہیں۔ کافی دور بھی گلی میں آنے جانے والوں کی آوزیں سنائی دے جاتی ہیں لیکن اس رات تو جیسے ساری آوازیں سب آہٹیں سوگئی تھیں۔

صبح فجر کی اذان پر وہ چونک کر اٹھی نماز کی ادائیگی کے بعد وہ باہر نکلی اور سیدھی پولیس اسٹیشن پہنچی' ڈیوٹی پر موجود افسر نے معاملے کی سنگینی کو بالکل محسوس نہیں کیا۔

''تمہارا بیٹا شاید زیادہ پی گیا ہوگا اور کسی سستے نائٹ کلب کی سیڑھیوں پر بے سدھ پڑا ہوگا اگر اس کی جیب میں اس کی شناخت موجود ہوگی تو روشنی ہوتے ہی وہاں کے پولیس والے اسے گھر پہنچادیں گے۔ اماں تم کو معلوم ہوگا کہ رات بھر شرابیوں کی حفاظت کرنے' صبح انہیں گھر پہنچانے اور رات گئے گھومتے داڑھی والوں کو تھانے میں بند کرنے کے خصوصی احکامات ہیں حکومت کی طرف سے۔'' پولیس افسر نے ہنستے ہوئے اپنی بات ختم کی۔

''وہ ایسا نہیں ہے..... میرا ڈاکٹر بیٹا ایسا نہیں ہے اور تم بہت ہی غیر ذمہ دار پولیس افسر ہو۔ بہتر ہے کہ تم اپنے آپ کو بدل لو۔'' ام عرفہ نے اس کو ڈانٹا تو نیم دلی سے اس نے شکایت درج کرلی لیکن انداز بتا رہے تھے کہ وہ کچھ کرنے والا نہیں۔

ام عرفہ واپس گھر کی طرف چلی تو اس نے سوچا شاید بیٹا واپس آ گیا ہوگا اور دروازے پر حیران کھڑا ہوگا کہ گھر بند کیوں ہے لیکن وہاں ایسا کچھ بھی نہیں تھا وہ نڈھال اور مایوس بہت دیر تک کرسی پر بیٹھی رہی' دوپہر تک سب کو معلوم ہوگیا کہ محمد عرفہ پراسرار طور پر لاپتا ہوگیا ہے۔

ام عرفہ کے لیے اگلے سات سال کا ایک ایک دن بلکہ ایک ایک لمحہ گویا انتظار سے عبارت تھا لیکن یہ انتظار کی کیفیت اس لحاظ سے مختلف تھی کہ اس میں مایوسی کا بالکل کہیں بھی دخل نہیں تھا۔ اسے یقین تھا کہ اس کا ڈاکٹر بیٹا ضرور واپس آئے گا' وہ ضرور ڈاکٹر

بنے گا اس کی تعلیم کے لیے وہ سب کچھ کرے گی۔
کچھ دن تو سب ہی اس کے غم میں شریک رہے اور اسے تسلیاں دیتے رہے لیکن وقت گزرنے کے ساتھ کچھ لوگ اس ذکر سے اکتا گئے' ام عرفہ کا بے حساب یقین اور امید اس کے ذہنی توازن بگڑنے کی علامت بن گئے لیکن اس پر لوگوں کی بے زاری اور اکتاہٹ کا کوئی اثر نہیں پڑا۔ وہ تندہی سے کام کرتی رہی اور اپنے بیٹے کی تعلیم کے لیے پیسے جوڑنے میں اس طرح مگن رہی کہ گویا کسی دن بھی وہ آجائے گا اور اپنی تعلیم میں مشغول ہوجائے گا۔ محمد عرفہ کے کمرے کو اس نے بڑی محنت سے ایک آرام دہ کمرے میں تبدیل کردیا تھا جہاں لکھنے پڑھنے اور آرام کا معقول انتظام تھا۔
جب اس دن دروازے پر دستک ہوئی تو یہ وہی دستک تھی جو محمد عرفہ کے کالج سے واپس آنے کی پہچان ہوتی تھی' اس دستک نے ام عرفہ کے ہوش اڑا دیئے وہ بنا سلیپر بھاگ کر گئی اور بغیر نام پوچھے دروازہ کھول دیا۔ اس کا بیٹا...... ڈاکٹر بیٹا...... اس کے سامنے کھڑا تھا' بڑھی ہوئی داڑھی اور تبدیل شدہ قدوقامت کے باوجود اس نے پلک جھپکتے اس کو پہچان لیا اور اس کے چہرے اور پیشانی پر بوسوں کی بوچھاڑ کردی۔ اس کا ہاتھ پکڑ کر اندر لاتے ہوئے اس نے مخصوص عربی انداز کا نعرہ لگایا' وہی نعرہ جو ٹیٹری کی آواز سے مماثلت رکھتا ہے۔ خوشی کی خبر کا اعلان سمجھا جاتا ہے اور مبارک باد وصول کرنے کا اشارہ بھی۔
پڑوسیوں نے سنا تو پہلے تو ان کو یقین نہیں آیا کہ یہ آواز اس گھر سے آئی ہے جہاں سے سات سال کے عرصے میں کوئی آواز آئی ہی نہیں تھی۔ برابر والے تو فوراً آگئے اور پھر آس پڑوس کے تقریباً سب ہی افراد ایک کے بعد ایک آموجود ہوئے۔
بڑی عمر کے تو سب ہی لوگ محمد عرفہ کو فوراً پہچان گئے البتہ چھوٹے بچے جنہوں نے اس کے بارے میں سنا ہی تھا' حیرت اور شوق کے عالم میں اس کو دیکھ رہے تھے۔ سامنے والے خامدی خاندان کے لوگ بھی آگئے جو جدت پسندوں کے سرخیل تھے اور ساتھ ہی ام عرفہ کی ڈاکٹر ڈاکٹر کی رٹ سے بہت بے زار بھی رہے تھے۔
''آخر تم واپس آگئے' کہاں تھے تم اتنے سال؟ یہ تمام وقت تم نے ضائع کردیا' تم عمر کی حد گزار چکے ہو اب کون تمہیں داخلہ دے گا' تم سمجھتے ہو کہ اس گئے وقت کا ازالہ ہوسکے گا؟ اور پھر سوال یہ کہ آئندہ کروگے کیا؟''
یہ وہ سوال تھے جو بہت سے لوگوں نے الگ الگ اور مختلف انداز سے کیے تھے لیکن ابراہیم خامدی وہ شخص تھا جس نے ایک ساتھ ہی سارے سوال کر ڈالے اور یہی بات اس کی تنقیدی فطرت اور حاسد طبیعت کی غماز تھی۔ محمد عرفہ صبروتحمل سے سب کی باتیں سن رہا تھا' اس نے بہت کم کسی کا جواب دیا اگر دیا بھی تو مبہم سا۔ ماں چاہتی تھی کہ پہلے وہ سب کچھ جان لے بعد میں کوئی اور جان پائے لیکن اس کا بس نہیں چل رہا تھا' پڑوسیوں نے ماحول پر مکمل اجارہ داری قائم کرلی تھی یکایک محمد عرفہ کرسی سے اٹھ کر کھڑا ہوگیا' اس نے گلا کھنکار کر گویا سب کو خاموش رہنے کا اشارہ کیا اور اپنی بات کچھ اس طرح شروع کی۔
''میں نے وقت ضائع نہیں کیا' میں ڈاکٹر بن چکا ہے۔ میں نے باقاعدہ طب کی تعلیم حاصل کی......اور ان شاء اللہ بہت جلد اسی محلے میں اپنا مطب شروع کروں گا آپ سب کا شکر گزار ہوں کہ آپ نے مجھے یاد رکھا اور مجھ سے ملنے چلے آئے اور ہاں میری ماں کا بھی آپ سب نے خیال رکھا مجھے تمام وقت اس کی فکر رہتی تھی' اس کی خبر مجھے ملتی رہتی تھی لیکن جس کی فکر ہو جس کی یاد آتی ہو اس کو اپنی آنکھوں سے اپنے سامنے

دیکھنا بھی تو ضروری ہوتا ہے ان سات سالوں میں یہی میری مجبوری تھی' آج میں اللہ تعالیٰ کا مشکور ہوں کہ اس کو اچھی حالت میں دیکھ رہا ہوں۔ مجھے وہ ویسی ہی لگ رہی ہے جیسا میں نے اس کو سات سال قبل چھوڑا تھا شاید اللہ تعالیٰ نے اس کی بے پناہ محبت اور ممتا کے انعام کے طور پر وقت کی رفتار اس کے لیے روک دی میری ماں نے میرا انتظار کیا اسے یقین تھا کہ میں زندہ ہوں' اس نے میری زندگی کی سلامتی اور طویل انتظار کی بے کیفی کو کم سے کم کرنے کی دعائیں کیں اور وقت تیزی سے گزرنے کی دعائیں بھی اور ہاں میرے محلے والے اور میرے عزیز و اقارب اور آس پاس کے لوگ ان سب کا میرے اوپر حق ہے' میں ان سب کی دیکھ بھال اور ان کی صحت کا خیال رکھوں گا۔"

ابراہیم خامدی نے فوراً پینترہ بدل کر دوسرا وار کیا "کیا تم بتاؤ گے کہ تم نے یہ طب کی تعلیم کہاں سے حاصل کی؟ کہاں ہے وہ کالج اسی ملک میں یا کہیں باہر؟"

"میں یہ سب آپ کو کیوں بتاؤں' اس بات کو جاننے کی آپ کو ضرورت نہیں۔ انسان کیا ہے' اس میں کتنی اہلیت ہے یہ اس کے گن اس کے اعمال بتا دیتے ہیں۔" یہ کہہ کر محمد عرفہ نے اپنی بات ختم کر دی۔

اگلے چند روز محمد عرفہ باہر کے کمرے میں اپنا مطب شروع کرنے کی تیاریوں میں مصروف رہا' اس کے لیے ضروری سامان اور دوائیں وغیرہ خریدیں اس کو کوئی مالی پریشانی نہیں ہوئی' ماں نے بہت کچھ پس انداز کیا ہوا تھا ابراہیم خامدی کی عرفہ سے گفتگو کے بعد بیٹے سے کچھ جاننے کی ضرورت ہی نہیں محسوس ہوئی' اس نے ایک بار بھی نہیں پوچھا کہ وہ کہاں چلا گیا تھا اور کس طرح اس نے طب کی تعلیم حاصل کی وہ آ گیا تو اس نے اللہ کا شکر ادا کیا اور جب اس نے کہا کہ وہ ڈاکٹر بن

قلم کی نوک

انسان جب قلم سے کچھ لکھتا ہے تو وہ تحریر کسی کے لیے خوشی تو کسی کے لیے غم کا باعث ہوتی ہے۔ کسی کے لیے امرت تو کسی کے لیے زہر۔ کسی کی تقدیر بدل سکتی ہے تو کسی کا مقدر مٹا سکتی ہے۔ قلم کی نوک سے کسی کا سر قلم ہوتا ہے تو کسی کو سر بلند بھی کیا جاتا ہے۔ قلم کی نوک سے کسی کے لیے آزادی کا سندیسہ ملتا ہے تو کسی کے لیے موت کا فرمان جاری ہوتا ہے۔ قلم سے کسی کے نصیب کو چار چاند لگائے جا سکتے ہیں تو اسی قلم سے کسی نے نصیب پر سیاہی بھی مل دی جاتی ہے۔

خنساء عبد المالک...... راولپنڈی

کر آیا ہے تو اس نے یقین کر لیا کوئی شک کوئی سوال کوئی وسوسہ اور کوئی بے یقینی نہیں تھی۔

چند ہی مہینوں میں محمد عرفہ علاقے میں قابل' مخلص' نبض شناس اور بے لوث خدمت کرنے والے ڈاکٹر کی حیثیت سے جانا جانے لگا اس کی تشخیص اور سستی ترین دواؤں کی خبریں آس پاس کے ڈاکٹروں کے لیے پریشان کن تھیں' پہلے تو وہ انفرادی طور پر کڑھتے اور معاملے کی نوعیت کو سمجھنے کی کوشش کرتے رہے لیکن جب بات بہت بڑھ گئی اور ان کی آمدنی پر منفی اثرات صاف نظر آنے لگے تو ایک مشترکہ محاذ تشکیل دینے کی ضرورت محسوس ہوئی۔ معلومات اکٹھی کی جانے لگیں ان معلومات کا محور یہ تھا کہ مطب پر صرف "ڈاکٹر محمد عرفہ" لکھا ہے اور کچھ بھی نہیں۔ کوئی ایسا ڈاکٹر اس کا ہم عمر جس نے اس کے ساتھ پڑھا ہو نہیں ملا۔ کسی نے اس کو شہر کے کسی کالج میں جاتے نہیں دیکھا نتیجہ یہ اخذ کیا گیا کہ وہ ایک جعلی ڈاکٹر ہے۔ قانون کے مطابق طب کا پیشہ اختیار کرنے کے لیے نا اہل' مجرم......

ضروری ہو گیا کہ اس کے خلاف قانونی کارروائی کی جائے اگر وہ جیل چلا گیا تو مطب بھی بند ہو جائے گا اور یہی ان کا مقصد تھا۔

محمد عرفہ کو عدالت سے حاضری کا نوٹس ملا تو ماں پریشان ہو گئی لیکن وہ مطمئن تھا اس نے ماں کو ہمت دلائی اور اللہ پر توکل کر کے حالات کا مقابلہ کرنے کو تیار ہو گیا۔

عدالت میں جج نے سوال کیا "تم پر بغیر سند طب کا پیشہ اختیار کرنے کا الزام ہے کیا تم اپنی سند عدالت میں پیش کر سکتے ہو۔"

"نہیں جناب! میرے پاس لکھی ہوئی سند نہیں ہے لیکن طب کی تعلیم میں نے یقیناً حاصل کی ہے۔" محمد عرفہ نے جواباً عرض کیا۔

منصف نے کہا "یہ تعلیم تم نے کہاں سے حاصل کی اور یہ کیسا کالج ہے جو سند نہیں دیتا؟"

محمد عرفہ کا وکیل بالکل اندھیرے میں تھا وہ ایک نیا وکیل تھا اور صرف پیر جمانے اور قسمت آزمانے کو اس نے یہ کیس قبول کیا تھا اور اب اپنی غلطی پر پچھتا رہا تھا لہٰذا محمد عرفہ کو اپنا مقدمہ خود ہی لڑنا تھا' اس نے کہا۔

"میں نے جس ادارے سے تعلیم حاصل کی وہ ادارہ اسی ملک بلکہ شاید اسی شہر میں واقع ہے۔ قاہرہ سے باہر قدیم کھنڈرات میں یا پرانے شہر کے زیر زمین قدیم تہہ خانوں میں دراصل مجھے اس مقام کا حدود اربعہ یا ممکنہ جائے وقوع کا صحیح اندازہ نہیں ہے دوران سفر میں راستہ دیکھ نہیں سکا تھا۔ دوسری بات یہ کہ اس ادارے میں لکھی ہوئی سند دینے کا رواج نہیں' دراصل وہ درس گاہ ایک مختلف نظام کے تحت کام کرتی ہے۔"

جج اچانک بہت زیادہ جھنجلا گیا اس کا سر زور زور سے ہلنے لگا۔ اس نے اپنے ہاتھ میز پر مارنے شروع کر دیے اس کا بس نہیں چلتا تھا ورنہ شاید وہ اپنا چوبی ہتھوڑا ملزم کو پھینک کر مار دیتا۔

"تم عدالت کا وقت ضائع کر رہے ہو' جو کچھ تم نے کہا سب بکواس ہے۔ کیوں نہ تمہارے خلاف فریب دہی دروغ گوئی کے مقدمے قائم کیے جائیں اور تم طویل عرصے کے لیے سلاخوں کے پیچھے چلے جاؤ۔" جج نے حد درجہ غصے کے عالم میں یہ الفاظ ادا کیے لیکن محمد عرفہ نے بلا کے تحمل سے جواب دیا' اس نے کہا۔

"جناب عالی ابھی تک وضاحت کی گنجائش باقی ہے شاید عدالت کا ذہن اس طرف گیا نہیں۔" اس نرم لہجے کو بھی ملزم کی طرف سے عدالت اور جج کو نااہل اور بے وقوف سمجھے جانے کا اشارہ مانا گیا۔

"تمہارے پاس وضاحت کے لیے صرف سند ہونی چاہیے جو نہیں ہے اس کے علاوہ اور کیا چیز عدالت کو مطمئن کر سکتی ہے۔ تم مسلسل عدالت کا وقت ضائع کر رہے ہو' کیا تم مجھے اور یہاں موجود دیگر افراد کو فاتر العقل سمجھتے ہو؟" اس بار جج کا لہجہ بہت زیادہ سخت اور آواز اونچی تھی۔

"اونچی آواز مجھے خوف زدہ کر رہی ہے' میں آپ سے التجا کرتا ہوں کہ انصاف کی راہ پر قائم رہتے ہوئے آخری حد تک مجھے انصاف فراہم کیا جائے۔" محمد عرفہ نے یہ الفاظ بہت نرمی اور آہستگی سے ادا کیے۔ یہ انداز جج کو اپنے رویے پر نظر ثانی کرنے میں کامیاب ہوا' وہ اپنے آپ پر قابو پاتے ہوئے یوں گویا ہوا۔

"چلو ٹھیک ہے آخری موقع ہے تمہارے لیے۔ اس معاملے کو سلجھانے کے لیے خود تمہارے خیال میں عدالت کو کیا کرنا چاہیے۔" اپنی طرف سے جج نے بہت زیادہ رعایت ملزم کو دی تھی۔

محمد عرفہ نے چند لمحے سوچا اور ایک لمبی سانس لے کر اپنی بات شروع کی۔

"لکھی ہوئی سند کے علاوہ ایک اور چیز ہے جو طب میں میری اہلیت اور علم کو ثابت کرسکتی ہے' امتحان...... آپ میرا امتحان لیجیے طب سے متعلق سوالات کیجیے اگر میں آپ کو مطمئن نہ کرسکوں تو سزا وار ہو جاؤں گا' اختیار بہرحال آپ کو ہے۔" محمد عرفہ کا جواب جج کے دل کو لگا یا شاید جھوٹے کو گھر تک پہنچانے کا اس نے ارادہ کرلیا' اعلان کیا گیا کہ عدالت میں موجود مدعی ڈاکٹروں میں سے سب سے قابل اور تجربہ کار ڈاکٹر سامنے آئے۔ ان لوگوں نے ایک صاحب کو دھکا دے کر آگے کردیا۔

سوال و جواب کا سلسلہ شروع ہوا علم تشخیص' علم الابدان' علم الدویار کے دقیق ترین سوالات کرلیے گئے' تقریباً ہر سوال کا جامع جواب ملا۔ جج حیرانی اور پریشانی کے عالم میں اپنے ماتھے کا پسینہ پونچھ رہا تھا۔ وہ بار بار ملزم کو گہری نظروں سے دیکھ رہا تھا' یہ نظریں تعریفی تھیں اور کبھی مشکوک بھی' ان میں خوف کی جھلک بھی نظر آتی تھی کیونکہ وہ کمالِ برداشت اور انتہائے صبر کی تصویر بنا ہر سوال کا مدلل جواب دے رہا تھا۔ آخر کار وہ بوڑھا تجربہ کار ڈاکٹر ہتھیار پھینک کر واپس اپنی کرسی پر ڈھیر ہوگیا۔ دراصل اس کے کچھ سوال خود اس کی علمیت اور اہلیت پر شک وشبہ کی وجہ بن گئے تھے۔

اب مدعی ڈاکٹروں کی طرف سے ایک اور تجویز آئی' اطباء کی کونسل کے سامنے یہ معاملہ رکھا جائے۔ بہت بڑے اور تجربہ کار نامور ڈاکٹر جو کالجوں کے ممتحن بھی ہوتے ہیں' تجویز مان لی گئی۔

اگلی تاریخ مقدمہ پر ڈاکٹروں کی ایک جماعت وہاں موجود تھی' زیادہ تر کی تیوریاں چڑھی ہوئی تھیں ان کو اس بات پر بہت غصہ تھا کہ ایک جعلی ڈاکٹر کو آخر کیوں یہ موقع دیا گیا کہ وہ ان کا قیمتی وقت ضائع کرے۔ جج کو آج کسی نتیجے پر پہنچنا تھا لیکن اس نے اپنے لیے خود ہی مشکلات پیدا کرلی تھیں۔ پہلے ہی دن اس ملزم کے خلاف فیصلہ سنا دیا ہوتا تو یہ نوبت آتی ہی نہیں' آج وہ ایک مبصر اور تیسرا فریق زیادہ منصف کم نظر آرہا تھا' وہ ملزم سے خوف زدہ ہوگیا تھا۔

اُدھر اس نے بغیر سند کے ڈاکٹر کو نیچا دکھانے کا پورا انتظام کیا تھا' سوالات نہیں تیروں اور تلواروں کے وار تھے جن کو روکنے کے لیے محمد عرفہ کے پاس علم و دانش کی ڈھال تھی۔ جب سب تیر اور تلواریں کند ہوگئیں تو طبیب نفسیہ یعنی سائیکاٹرسٹ کو سامنے لایا گیا' اس نے ایسے ایسے سوالات کیے کہ جن میں سے بعض کے جوابات خود اس کو بھی معلوم نہیں تھے وہ محمد عرفہ کو فاترالعقل ثابت کرکے معاملے کو ختم کردینے کے درپے تھا۔

سائیکاٹرسٹ نے کہا "تم میں ڈاکٹر بننے کی شدید خواہش موجود تھی جو شاید تمہاری ماں کی آرزوؤں کے سہارے پروان چڑھی لیکن تم میں اہلیت نہیں تھی۔ تم اس قابل نہیں تھے ذہنی طور پر بھی اور مالی طور پر بھی...... لہٰذا تم نے ایک اور راستہ اختیار کیا اور ایک کہانی گڑھ لی اور پھر تم انسانوں کی زندگیوں سے کھیلنے لگے۔ ایسی کوئی درس گاہ دراصل موجود ہی نہیں ہے جہاں طب کی تعلیم تو دی جاتی ہو لیکن سند نہیں۔ تم جھوٹے ہو اور ایک مستقل جھوٹ اور فریب کے ساتھ تم اپنی ماں کی خواہشات کی تسکین کرتے رہے ہو' مجھے تمہاری ماں پر ترس آتا ہے۔ جس کو تم نے دھوکے میں رکھا اور آس پاس کے لوگوں کو بھی۔"

محمد عرفہ نے کہا "آپ اپنے ماحول کی قیدی ہیں' آپ کی پرورش اور تعلیم اس ماحول میں ہوئی جہاں قدم قدم پر جھوٹ اور فریب سے آپ کا واسطہ پڑا۔ خدا کو حاضر و ناظر جان کر بتایئے کہ آپ ناکام ہوجانے یا کم درجات حاصل کرپانے کے خوف میں کبھی مبتلا نہیں رہے۔ آپ اپنے استادوں اور ساتھی ذہین طلباء سے

کبھی خوف زدہ نہیں کرہ۔ گمان ہوتا ہے آپ نے کبھی دل سے استادوں کی عزت نہیں کی ہمیشہ خوف اور خوش آمد اس عزت کے پیچھے کارفرما رہی۔"

"ہرگز نہیں...... کبھی بھی نہیں، کیا بکواس کر رہے ہو تم؟" سائیکاٹرسٹ زور سے چیخا۔

محمد عرفہ نے اپنا دھیما لہجہ برقرار رکھا "جہاں تک میرے علم اور میری اہلیت کا تعلق ہے وہ تو آپ کے ساتھی جانچ چکے اور اس بات کا فیصلہ آ ہی جائے گا لیکن آپ کی گفتگو میں مسلسل جھوٹ، فریب اور کہانیاں بنانے کا ذکر آتا ہے۔ اس سے گمان ہوتا ہے کہ زندگی کا ایک حصہ اس طرح کے ماحول میں گزارنے کی وجہ سے آپ کی سوچ کا دائرہ بہت محدود ہو گیا ہے آپ کے بے معنی الزامات مجھے بالکل پریشان نہیں کر رہے البتہ عدالت کا وقت ضرور ضائع ہو رہا ہے۔" یہاں جج کے لیے دخل اندازی ضروری ہو گئی۔

"ڈاکٹر صاحب! آپ الزامات کے بجائے مثبت قسم کی بات کیجیے اور عدالت کو جلد کسی نتیجے پر پہنچنے میں مدد کیجیے۔"

یہ سن کر ڈاکٹر کو بہت غصہ آیا اس نے کہا۔ "میں سائیکاٹرسٹ ہوں اور یہ آپ کا میدان نہیں اور مجھے معلوم ہے کہ اس شخص سے اور خود عدالت اور جج سے کس طرح نبٹنا ہے۔" اس بار جج غصے سے بپھر گیا۔

"میں تمہیں توہین عدالت کے جرم میں جیل بھیج سکتا ہوں۔"

ڈاکٹر اس سے بھی زیادہ غصے میں آ گیا۔ "میں تم کو پاگل قرار دے سکتا ہوں، تمہاری نوکری ختم ہو جائے گی کیوں کہ کوئی پاگل جج یا منصف نہیں بن سکتا۔ ذرا مجھے موقع تو ملے تو میں تمہیں بتاؤں کہ تم کیا ہو۔" یہ سن کر جج آپے سے باہر ہو گیا اس نے پولیس والوں کو حکم دیا کہ اس ڈاکٹر کو نفسیاتی مریضوں کے اسپتال فوری طور پر پہنچایا جائے۔ عدالت کا ماحول حد درجہ خراب ہو گیا۔

کونسل کو بالآخر اشارہ کیا گیا کہ وہ اپنی رپورٹ پیش کریں جو مختصراً کچھ یوں تھی۔

"محمد عرفہ کے پاس علم طب ہے، بے سقم اور مکمل ہے لیکن سند نہیں ہے لہٰذا وہ پریکٹس کا اہل نہیں ہے۔" اس عبارت کے آخری جملے کو حذف کر دیا جائے۔ جج نے خشمگیں نظروں سے کونسل کے اس ممبر کو دیکھا جو یہ رپورٹ یا نتیجہ پڑھ کر سنا رہا تھا اس نے کہا۔

"فیصلہ سنانے کے لیے میں ہوں، آپ نہیں۔ آپ کا کام ہو گیا اب عدالت اپنا کام کرے گی اور دیکھے گی کہ ملزم سزاوار ہے یا اس کو بری کر دیا جائے۔"

اب سب کی نظریں جج کی طرف تھیں جو کونسل کے ممبر کو ڈانٹنے کے بعد اپنی عینک ناک پر آگے کی طرف سرکا کے کچھ لکھنے میں مشغول ہو گیا تھا، اچانک اس نے قلم قلمدان میں رکھ دیا۔ عینک کو ناک پر اوپر کی طرف کھسکانے کے بعد رومال سے پیشانی کا پسینہ صاف کیا اور یوں گویا ہوا۔

"اس سے پہلے کہ فیصلہ سنایا جائے عدالت چاہتی ہے کہ ملزم چند باتوں کی وضاحت کرے، جوابات واضح ہونے چاہئیں کیونکہ یہ جوابات فیصلے پر اثر انداز ہو سکتے ہیں۔ تم ایک رات کھانے کی میز سے اٹھ کر باہر دستک دینے والے کو دیکھنے گئے اور سات سال کے لیے لاپتا ہو گئے۔ تم کہاں تھے اس دوران اور تمہارے ساتھ کیا واقعات پیش آئے؟ سب کچھ تفصیل سے بتاؤ۔"

محمد عرفہ چند لمحے خاموش رہا وہ اپنے خیالات کو مجتمع کر رہا تھا، اپنا ماضی الضمیر مناسب طریقے سے سمجھانے کے لیے پھر اس نے کہا۔

"جناب عالی! میں جب باہر نکلا تو وہاں ایک

بزرگ ہستی موجود تھی انہوں نے مجھ سے کہا "تمہاری ماں تم کو ڈاکٹر بنانا چاہتی ہے اس کی خواہش شدید ہے اور تم ایک ذہین آدمی ہو اور اس پیشے کی طرف مائل بھی ہم لوگ تمہیں جانتے ہیں کیونکہ ہم تمہارے آس پاس ہی رہتے ہیں ہم نے تمہاری ماں کی خواہش اور تمہاری آرزوؤں کو پورا کرنے اور ان کو حقیقت کا روپ دینے کا ارادہ کرلیا ہے یہ سب اس طرح ہوگا کہ تم لوگوں پر کوئی مالی بوجھ نہ پڑے اور تمہاری ماں کی دیرینہ آرزو بھی پوری ہو جائے تم ہماری بات سمجھ ہوگئے۔" میں نے اثبات میں سر ہلایا انہوں نے کہا۔ "طویل عرصے کے لیے اپنی ماں سے علیحدگی کے لیے تیار ہو جاؤ ہمارا سفر شروع ہوتا ہے میرے قدموں سے قدم ملا کر سفر شروع کردو۔" میں نے ان کے قدموں پر نظر ڈالی انہوں نے قدم بڑھائے تو میں نے بھی بڑھا دیئے وہ صاحب تیز چلے تو میں بھی تیز چلنے لگا۔ ہم کب گلی سے باہر نکلے اور کب سڑک پر آئے ہم کس طرف چلے اور پھر کہاں پہنچے کتنی دیر چلے مجھے نہیں معلوم میری منزل ایک بہت بڑی نیم تاریکی عمارت تھی۔

وہاں اور بھی لوگ تھے شاید وہ سب طالب علم تھے بہت بڑی تعداد میں وہاں بہت عمر رسیدہ استاد تھے شاید پچھلی صدی کے لوگ میں ذہین تھا لیکن وہاں تو گویا میری ذہانت کو چار چاند لگ گئے میں اپنے اساتذہ کا پسندیدہ طالب علم بن گیا انہوں نے میری رہائش اور خوراک کا معقول انتظام کیا تھا وہ لوگ آپس میں ایک اجنبی زبان میں بات کرتے تھے لیکن میری تعلیم کا ذریعہ میری اپنی زبان تھی اور اس طریقے سے کہ گویا پڑھایا ہوا میرے ذہن پر نقش ہو جاتا تھا میرے اساتذہ نے مجھے بتا دیا تھا کہ یہاں ہر طالب علم کو اس کی اپنی زبان میں تعلیم دی جاتی۔ اس زبان میں کہ جس میں وہ سوچتا ہے خواب دیکھتا ہے اپنے ماں باپ اور آس پاس کے لوگوں سے بات کرتا ہے مجھے وہاں وہ تمام مضامین پڑھائے گئے جن کا کسی بھی طرح سے علم طب سے تعلق ہو سکتا ہے میں نے جراحی سیکھی تو ساتھ ہی فلسفہ اور نفسیات کا بھی مطالعہ کیا پڑھائی میں کچھ اس طرح مشغول رہا کہ گویا میرا سارا جسم دماغ بن گیا تھا اور اِدھر اُدھر کی کوئی بات کوئی خیال میرے ذہن میں آتا ہی نہ تھا۔ علم کی وہ دنیا اتنی وسیع اور اتنی پُر رونق تھی کہ اپنی اس دنیا کے خیال کی گنجائش ہی نہیں تھی ہاں ایک خیال جو میری توجہ اور محویت پر اثر انداز ہوتا تھا وہ میری ماں کا خیال تھا اس کی یاد جب مجھے آتی تو مجھے بتایا جاتا کہ وہ خیریت سے ہے اور اس کے بارے میں فکر کرنے کی ضرورت نہیں بالآخر ایک دن مجھے چند جید اساتذہ کے سامنے پیش کیا گیا انہوں نے باری باری مجھ سے بہت سارے سوالات کیے۔ وہ ایک سخت آزمائش تھی میرے لیے مجھے اپنا دماغ کھرچ کھرچ کر جواب نکالنے پڑے وہ سوالات اتنے ہی دقیق اور مشکل تھے تب بالآخر ایک بزرگ استاد جو ایک نمایاں جگہ پر براجمان تھے اپنی جگہ سے اٹھے انہوں نے کہا۔

"طبیب ایک ذی روح کا مادی یا غیر مادی جسم کی تکالیف اور دکھ درد دور کرنے کا ذمہ دار ہوتا ہے۔ اس کی مہارت مریض کو دکھ سے نجات دلا سکتی ہے تو دوسری طرف اس کی نااہلی اور کم علمی مزید دکھ اور تکلیف کا باعث بھی بن جاتی ہے۔ لہٰذا طب کی تعلیم میں محنت درکار ہے اور اس کے امتحان میں حد درجہ کی سختی کی ضرورت ہے محمد عرفہ طبیب کہلانے کے لیے اس درس گاہ کے معیار پر پورا اترا ہے اس کے بعد انہوں نے میری ماں پڑوس کے لوگوں اقرباء اور عام انسانوں کے بارے میں کچھ نصیحتیں کیں جس طرح عالم بے

خبری میں وہ مجھے لے کر گئے تھے اسی طرح ان ہی صاحب نے مجھے میرے گھر تک پہنچادیا۔ میں نے یہ باتیں کسی کو نہیں بتائی تھیں لیکن بہر حال اس قضیے میں پڑنے کے بعد مجھے سب کچھ بتانا پڑا' مجھے مجرم گردانا گیا۔ شکوک وشبہات ظاہر کیے گئے میری ذات اور میری تعلیم کے بارے میں' صرف میری ماں نے مجھ پر شک نہیں کیا ورنہ کسی نے نہیں بخشا۔ میرے ہم پیشہ لوگوں نے تو شک کو دشمنی تک پہنچادیا' میرا مطب بند پڑا ہے میرے مریضوں کو کتنی تکلیف ہوئی ہوگی میری غیر حاضری سے اس کا کسی کو اندازہ نہیں' میرے بارے میں کیا فیصلہ ہوگا مجھے نہیں معلوم لیکن جناب منصف! میں جن لوگوں میں رہ کر آیا ہوں وہ ہم سے مختلف ہیں وہاں کے قوانین اور وہاں کے طریقے سب کچھ مختلف ہیں یہاں سے۔ وہاں علم دیانت سے مشروط ہے' وہاں سند نہیں ہوتی لکھی ہوئی سند...... وہاں دباؤ ڈال کے رشوت یا سفارش کرواکے یا استادوں کی خوش آمد کر کے درجات بڑھوانے کا بھی رواج نہیں۔ بغیر سند طب کا پیشہ اختیار کرنا یہاں جرم ہے تو سند ہوتے ہوئے علم نہ رکھنا تو بہت بڑا جرم ہونا چاہیے' سنگین جرم۔ وہاں انہوں نے مجھے جو علم دیا وہ میرے سینے میں ہے' دماغ میں ہے۔ اپنی سند میں خود ہوں' میرا علم اور میرا عمل ہے' آپ لوگ مجھے پڑھ لیجیے مجھے جو کچھ کہنا تھا میں نے کہہ دیا۔"

محمد عرفہ کی بات ختم ہوئی تو جج نے اپنی عینک دوبارہ اوپر کھسکا کر فیصلہ پڑھنا شروع کیا۔

"محمد عرفہ ڈاکٹر ہے ایک مکمل ڈاکٹر......اس کے پاس سند نہیں لیکن اس کو بے سند جعلی ڈاکٹروں کی صف میں کھڑا نہیں کیا جاسکتا اور نہ ہی سند رکھنے والے نااہل اور کم علم ڈاکٹروں کی صف میں۔ وہ کہتا ہے کہ اس نے کسی اور دنیا میں ایک مختلف نظام کے تحت طب کی تعلیم حاصل کی تو عدالت اس نتیجے پر پہنچی ہے کہ اس نے تعلیم تو یقیناً حاصل کی ہے۔ وہ کیا دنیا تھی اور کیسے استاد تھے' یہ عدالت کی سمجھ سے بالاتر ہے لیکن اس کی علمیت اور اہلیت کا اعتراف طبی کونسل نے کرلیا ہے۔ وہاں سند نہیں ملتی لہٰذا محمد عرفہ کے پاس سند نہیں ہے لیکن عدالت نے اور تمام لوگوں نے جو یہاں موجود ہیں اس دنیا میں اتنا ذی علم طبیب کبھی نہیں دیکھا۔ یہ بھی تو ایک حقیقت ہے طبی کونسل کی رپورٹ میرے سامنے ہے' محمد عرفہ نے تعلیم کسی اور مخلوق سے کسی اور دنیا میں کسی اور نظام تعلیم کے تحت حاصل کی لہٰذا اس دنیا کے قوانین...... یعنی ہمارے موجودہ نظام تعلیم اور طریقہ امتحان کے قوانین اور ضابطے اس پر لاگو کرنا مناسب نہیں ہوگا۔

عدالت اس نامعلوم اور غیر واضح دنیا کی تفصیل میں جائے بغیر دوسرے تمام عوامل کو مدنظر رکھتے ہوئے محمد عرفہ کو ڈاکٹر تسلیم کرتی ہے اور اس پر عائد پابندیاں ختم کرنے کا حکم دیتی ہے۔ اب طبی کونسل کی رپورٹ ہی اس کی سند ہے جس علم کو حاصل کرنے میں اس کی لامتناہی جدوجہد اور اس کی ماں کا یقین منت اور دعائیں کارفرما رہی ہیں اس پر شک کرنے اور اس سلسلے میں سخت رویہ رکھنے پر عدالت اور میں اپنی ذاتی حیثیت میں معذرت خواہ ہیں۔"

محمد عرفہ آئندہ چالیس سال قاہرہ کے محلے شرقاویہ میں عام انسانوں اور غریب طبقے کے مریضوں کا علاج کرتا رہا اور پھر اپنی یادیں چھوڑ کر راہی ملک عدم ہوا۔

پتایا میں تین دن

آلیشبہ مخدوم

آلیشبہ مخدوم نئے افق کی معروف لکھاری ہیں۔ انہوں نے اپنے اندازِ تحریر سے قارئین کو خاصا محظوظ اور مطمئن کیا ہے۔ ان کے کردار ہمیں اپنے معاشرے میں چلتے پھرتے نظر آتے ہیں۔ ہم نے دلچسپ نمبر کے لیے ان سے کہانی لکھنے کی فرمائش کی تھی لیکن انہوں نے سفر نامہ بھجوادیا۔ ان کا دعویٰ ہے کہ اس سفرنامہ کو قارئین کسی بھی کہانی سے زیادہ دلچسپ پائیں گے۔ گو سفرنامے شائع کرنا نئے افق کی پالیسی اور روایات میں شامل نہیں لیکن پھر بھی ہم یہ تحریر نذر قارئین کر رہے ہیں۔
اس ملک کی روداد جسے امریکی سامراج نے بین الاقوامی قحبہ خانہ میں تبدیل کر دیا ہے۔

تھائی لینڈ کے دارلحکومت بنکاک کے ''سُوَرنا بھاؤ مائی'' ائرپورٹ پر اُترتے ہی مجھے ناک سکوڑنا پڑی۔ عجیب قسم کی بُو نتھنوں میں گھسی چلی آئی تھی، جو نہ اتنی تیز تھی کہ ناک بند کرنا پڑے اور نہ ہی اتنی دھیمی کہ اس کا احساس نہ ہو۔ تھائی لینڈ سے میرا پہلا تعارف یہی تھا۔ میں نے گھوم کر پیچھے دیکھا، نینا اور ماریہ کا بھی حال میرے جیسا ہی تھا۔

''یہ کیسی چراند ہے؟'' ماریہ نے فضا میں سونگھتے ہوئے بڑبڑاتے ہوئے کہا تو نینا اپنی منی سی ناک پر انگلی رکھے بڑے سکون سے بولی۔

''اصل میں تجھے یہ بُو کچھ زیادہ ہی محسوس ہوگی، کیونکہ تیرا ناک عام ناک سے کافی بڑا ہے۔''

''فضول بولنے سے باز نہیں آنا تو نے، یہاں تو شرم کر۔'' اُس نے بھنّاتے ہوئے کہا۔

''کیوں یہاں زبان پر آٹو لاک لگ جائے گا یا میرے جذبات اور احساسات میوٹ ہو جائیں گے۔'' وہ تیزی سے بولی۔

''تجھ سے تو بات کرنا ہی فضول ہے۔'' وہ اُکتاتے ہوئے لہجے میں بولی اور اپنا ہیوی پرس سنبھالتے ہوئے آخری سیڑھی بھی اُتر آئی۔

صبح کا وقت تھا۔ سورج ابھی نکلا نہیں تھا۔ نیلگوں آسمان کے نیچے تیز روشنیاں پھیلی ہوئی تھیں۔ ائرپورٹ کا ڈیزائن مجھے گنبد نما لگا تھا۔ میں اردگرد دیکھ کر مناظر کو آنکھوں میں محفوظ کر رہی تھی کہ نینا نے میری کمر پر ہاتھ رکھ کر بس کی جانب دھکا دیا۔

''اب چلو بھی۔'' ماریہ نے کہا۔

''یار، یہاں کا منظر تو دیکھنے دو، ممکن ہے مجھے کبھی سفرنامہ لکھنا پڑے۔'' میں نے کہا تو وہ تڑخ کر بولی۔

''اُو بس میں بیٹھ، بڑی آئی ابن بطوطہ۔ رجڈل سے تو آنے کو تیار نہیں ہو رہی تھی۔''

''تیری محبت میں آگئے ورنہ، ہمیں ذلیل ہونے کا کوئی شوق نہیں ہے پیاری۔'' نینا نے تبصرہ کرنے کے لئے وہ موقعہ بھی ہاتھ سے نہیں جانے دیا۔ اس پر ماریہ نے کہا کچھ نہیں بس چہرے پر تناؤ آ گیا، جس سے اس کے چہرے پر اکتاہٹ پھیل گئی۔ میں نے آنکھوں ہی آنکھوں میں نینا کو سمجھایا کہ ابھی اسٹارٹ مت لو۔ وہ مسکرا کر رہ گئی۔ جس سے مجھے اندازہ ہو گیا کہ وہ اب خاموش رہے گی۔ ہمارے سامنے بس تھی،

ہم اس میں سوار ہو گئیں۔
ہم تینوں آپس میں فرسٹ کزن تھیں۔ ماریہ اور نینا برطانیہ میں رچڈل میں رہتی تھیں۔ میں اپنے بھائی کے ساتھ ان کے ہاں گئی ہوئی تھی۔ ہم نے مل کر بہت سیر کی، وہاں لوگوں سے ملے۔ دوسرے رشتے داروں سے ملے۔ بہت مزا رہا۔ ماریہ برطانیہ کے مسلم نوجوانوں کی ایک انسانی حقوق کے لئے بنائی این جی او کی رکن تھی۔ ان کی طرف سے ماریہ کو تیار کیا گیا کہ وہ تھائی لینڈ کے شہر پتایا جائے۔ وہاں تین دن کے لئے عورتوں کے حقوق پر ایک سیمینار تھا۔ ماریہ کو اس سیمینار کے ساتھ وہاں کی خواتین کے بارے میں دی گئی ہدایات کے مطابق مشاہدہ کرنا تھا اور پھر اس کی رپورٹ بنا کر دینا تھی۔ اس کے لئے بنکاک کی ایک این جی او کا تعاون انہیں حاصل تھا۔ اس کام کے لئے اسے اس لئے چنا گیا کہ وہ اس کا خاص سبجیکٹ تھا اور دو مہینے پہلے اس نے اپنی ''رضا مندی'' اپنی این جی او کو دی ہوئی تھی۔
''یار تم دونوں بھی میرے ساتھ چلو۔ مزہ آجائے گا۔'' ایک شام ماریہ نے مجھے اور نینا کو بٹھا کر ساری تفصیل بتائی اور پتایا جانے کے لئے تیار کرنے لگی۔
''ہمیں یہ سزا کیوں اور کس خوشی میں؟'' نینا نے اس کے چہرے پر دیکھتے ہوئے پوچھا۔
''یار تم لوگوں کو ایک دوسرے ملک کی سیر کروانے لے جا رہی ہوں اور تم اسے سزا کہہ رہی ہو۔ کوڑھ مغز کہیں کی۔'' اس نے باقاعدہ ناراض ہوتے ہوئے کہا۔
''دیکھو، میری پیاری کزن، کم از کم مجھے وہاں لمبی لمبی تقریریں سننے کا کوئی شوق نہیں، باقی رہے عورتوں کے حقوق، وہ ہم اچھی طرح جانتی ہیں۔'' اس نے چڑانے والے لہجے میں کہا۔
''تم کیوں نہیں بولتی ہو آلیشبہ، یہ تو یونہی بونگیاں مارتی رہے گی۔'' ماریہ نے میری مدد چاہی۔ میرا دل تو کر رہا تھا، لیکن میں نے تھائی لینڈ کی جو شہرت سنی تھی وہ اچھی نہیں تھی۔ کوئی بھی شخص جو تھائی لینڈ سے ہو کر آتا، نجانے کیوں اس کے بارے میں اچھا خیال ذہن میں نہیں ابھرتا تھا۔ اسی لئے میں اسے یہی دلیل دی تو اس نے کہا ''دیکھو! کوئی دوسرا ملک ہوتا تو تم چلی جاتیں؟ کیا وہاں پر یہ سب کچھ نہیں ہے، یہاں برطانیہ میں ایسا نہیں ہے، کیا تمہارے پاکستان میں ایسا نہیں، فرق صرف یہ ہے کہ جس نے جو کرنا ہے، وہ ہزار راستے ڈھونڈھ لیتا ہے، اور جس نے نہیں کرنا، وہ آزادی ہونے کے باوجود کچھ نہیں کرتا، بندے کا اپنا من صاف ہونا چاہئے۔''
''لیکن پھر بھی......'' میں نے دامن بچانا چاہا۔
''یہی تو، میں دنیا کو بتانا چاہتی ہوں کہ وہاں عورت کی کتنی تذلیل ہو رہی ہے۔ تم وہ دیکھنا، جو میں نہ دیکھ سکوں۔'' اس نے بڑے جذباتی لہجے میں قائل کرتے ہوئے کہا۔
''گھر والوں سے اجازت اور خرچ تمہارے ذمے، اس کے بعد چلو جہاں جانا ہے۔'' نینا نے ماریہ کی بے چارگی دیکھتے ہوئے اپنی رائے دے دی تو مجھے کچھ حوصلہ ہوا۔ کچھ دیر بعد اس نے مجھے بھی منا لیا۔ نینا اس شرط پر مانی کہ تقریریں نہیں سننی۔
''او کے ڈن۔'' وہ ایک دم مان گئی۔ سو ایک ہفتے کے اندر اندر ہم ہیتھرو ائرپورٹ سے یہاں آ پہنچے۔
ائرپورٹ کے مراحل سے گزر کر اپنے چھوٹے سوٹ کیس لئے جیسے ہی ہم باہر آئیں تو گلابی پلے کارڈ پر انگریزی میں ماریہ کا پورا نام دیکھ کر خوشگوار احساس ہوا۔ وہ پلے کارڈ ایک چھوٹے قد کے ادھیڑ عمر تھائی مرد نے اٹھایا ہوا تھا اور اپنی کنجی آنکھوں سے

ہر آنے جانے والی لڑکی کو تاڑ رہا تھا۔ ہم اس کے قریب گئیں تو ماریہ نے جا کر اسے مخاطب کیا۔

''ہائے مسٹر......''

''وائی پی، آپ مس ماریہ حسین'' اس نے تھائی لہجہ اور انگریزی زبان میں یہ کہتے ہوئے جھک کر ''وائی'' کیا۔ (اس تعظیم کو وہ ''وائی'' کہتے ہیں) پھر اپنا ہاتھ بڑھایا تو نینا طنزیہ بولی۔

''اب ملا ہاتھ، دکھا اپنی خوش اخلاقی۔''

ماریہ شاید کنفیوژ ہوگئی تھی۔ اس نے نینا کی بات پر توجہ نہیں دی بلکہ بڑے سوبر انداز میں اس کا بڑھا ہوا ہاتھ نظر انداز کر کے انگریزی میں بولی۔

''شکریہ مسٹر وائی پی۔''

''میں آپ کو تھائی لینڈ میں خوش آمدید کہتا ہوں۔ کیا آپ ناشتہ کرنا پسند کریں گی یا پتایا کی بس لینا۔'' وہ اپنا ہاتھ سمیٹتے ہوئے خالصتاً پروفیشنل انداز میں بولا

''ہم بس لینا چاہیں گے، کتنا وقت لگتا ہے یہاں سے پتایا کا؟'' میں نے پوچھا۔

''جی ڈھائی سے تین گھنٹے کا۔ آئیں میں آپ کو بس تک لے جاؤں۔'' یہ کہہ کر اس نے پلے کارڈ کو لپیٹا، اپنے پاؤں کے ساتھ دھرے بیگ کو اٹھایا۔ پلے کارڈ اس میں رکھا اور کسی روبوٹ کی طرح مڑ کر چل دیا۔ ہم تینوں بھی اس کے پیچھے پیچھے چل دیں۔

''اسے ذرا بھی شرم نہیں آئی کہ ہمارا سامان ہی بس تک پہنچانے کا بندوبست کر دیتا۔ ہمیں گھسیٹنا پڑ رہا ہے۔ دیکھو کس طرح ربوٹانہ انداز میں جا رہا ہے۔'' نینا حسب معمول بڑبڑاتے ہوئے چلنے لگی۔

''اے لڑکی، یہ پاکستان نہیں، جہاں لڑکیوں کی مدد کو کئی نوجوان لپک پڑتے ہیں۔'' ماریہ نے سڑے ہوئے انداز میں کہا۔

ائرپورٹ کی عمارت کے باہر ہی بسیں کھڑی تھیں۔ ان میں ہلکے نیلے رنگ کی بسوں پر پتایا لکھا ہوا تھا۔ یہ ائرپورٹ کے اندر ہی تھا لیکن ٹرمینل سے کافی آگے تھا۔ وائی پی، نگاہوں کے سامنے نہیں تھا، وہ اچانک ہی غائب ہو گیا تھا۔ کچھ دیر بعد وہ ایک دم سے نمودار ہوا، اس نے ہمارا سامان رکھوایا اور ماریہ کی طرف ٹکٹ بڑھاتے ہوئے بولا۔

''یہ آپ کے ٹکٹ ہیں۔ یہ بس ایکامائی اسٹاپ سے سواریاں لے گی، اور ذرا سی دیر ٹھہرے گی پھر یہ پتایا جا کر ہی رکے گی۔'' یہ کہہ کر اس نے اپنے بیگ میں سے تین فائلیں اور تین پیکٹ نکال کر ہمیں دیتے ہوئے بولا'' یہ کچھ نقشے، ہدایات، سیمینار کے بارے میں معلومات ہیں۔ اس کے علاوہ بھی دلچسپی کے لئے کچھ ہوگا۔ اور یہ پیکٹ ہیں جس میں پانی، جوس اور بسکٹ ہیں۔ مجھے امید ہے آپ کو پسند آئیں گے۔'' یہ کہہ کر وہ ذرا سا جھکا اور بالکل کسی روبوٹ کی مانند فوراً پلٹ گیا۔ ہم نے گہری سانس لی اور بس میں سوار ہو گئے، جو آدھی سے زیادہ خالی تھی۔ بس میں بیٹھنے کا ایک فائدہ ہوا کہ وہ جو دھیمی دھیمی ناخوشگوار بو تھی وہ ختم ہوگئی۔ بس میں خوشگوار فضا تھی۔

☆......☆......☆

پتایا شہر میں داخل ہونے کے بعد بس کافی دیر چلتی رہی اور بالآخر ایک ٹرمینل پر آ کر رک گئی۔ بس ٹرمینل کا رنگ بھی بس جیسا ہی تھا۔ یہاں تک کہ وہاں کرسیوں، دیواروں، ہورڈنگ وغیرہ کا رنگ وہی ہلکا نیلا تھا۔ ہم بس سے نیچے آئیں۔ ماریہ نے میزبان این جی او سے درخواست کی تھی کہ انہیں ایک لڑکی دے دی جائے، جو ہماری رہنمائی کرتی رہے۔ دوسرے لفظوں میں گائیڈ تھی۔ اس کا ماریہ نے الگ سے معاوضہ ادا کیا تھا۔ ہم ایسی ہی کسی متوقع لڑکی کو دیکھ رہے تھے کہ ایک لمبی سی لڑکی جس نے سیاہ

سوٹ، سفید شرٹ پر میرون ٹائی لگائی ہوئی تھی۔ اس کے بال کافی حد تک سنہرے اور بوائے کٹ تھے، شکل سے تھائی لگ رہی تھی۔ چہرے پر ہلکا میک اپ تھا۔ اس نے اپنی چھوٹی چھوٹی آنکھوں سے ہماری طرف دیکھا اور آگے بڑھ کر ماریہ سے صاف انگریزی میں بولی۔

"پتایا میں خوش آمدید۔ میں ہوں......" اس نے اپنا لمبا سارا نام بتایا۔ وہ نام ہمیں یاد تو کیا ہوتا، وہ سمجھ ہی میں نہیں آیا تھا۔ ہمارے چہروں پر حیرت دیکھ کر وہ مسکراتے ہوئے بولی، "آپ مجھے 'تائی جو' کہہ سکتی ہیں۔ میں یہاں آپ کی میزبان ہوں گی۔"

"اوکے۔" میں نے اپنی ہنسی دباتے ہوئے اسے اطمینان دلایا کہ ہم اسے اسی نام سے پکاریں گی۔

"لو جی پتایا آتے ہی تائی مل گئی، اب خالہ چاچی نجانے کہاں ہوں گی۔" نینا نے بڑبڑاتے ہوئے کہا جس پر کسی نے توجہ نہ دی۔

"آئیں، چلیں۔" اس نے مہذبانہ انداز میں ہاتھ کے اشارے سے چلنے کو کہا تو ہم اپنے سامان کے ساتھ اس کے ساتھ چل پڑیں۔ سامنے سیاہ رنگ کی کار تھی، اس کی ڈگی میں ہم نے سامان رکھا، وہ ڈرائیونگ سیٹ پر بیٹھی، ماریہ اس کے ساتھ، ہم دونوں پیچھے بیٹھے تو اس نے کار بڑھا دی۔

"یہ نارتھ پتایا روڈ ہے جس پر ہم جارہے ہیں اور ہم بیم ینگ ڈسٹرکٹ میں ہیں۔" اس نے ہماری معلومات میں اضافہ کیا تو نینا جلدی سے میری طرف دیکھ کر بولی۔

"ابن بطوطہ صاحبہ نوٹ فرمالیں۔ کل کلاں ہوسکتا ہے ضرورت پڑے۔" یہ کہہ کر وہ ہنس دی۔

"کیا کوئی خاص بات ہوئی؟" تائی جو نے پوچھا

"سیاحت کی بات کررہی ہیں کہ پتہ نہیں ہمیں وقت ملے گا بھی یا کہ نہیں۔" ماریہ نے سنبھالا دیا۔

"تین دن، سیمینار ہے، آج پہلا دن ہے۔ دوپہر لنچ کے بعد آپ فری ہوں گے۔ اس میں آپ سیاحت کریں، شاپنگ کریں، یا جو مرضی، وائی پی نے آپ کو معلوماتی بروشر دیا ہے۔ آپ نے اس میں دیکھ لیا ہوگا۔"

"نہیں ابھی نہیں دیکھا۔ فریش ہو کر دیکھیں گے۔" ماریہ نے اسے کہا تو ہمارے درمیان خاموشی چھا گئی۔ پتہ نہیں تائی جو کی ہمارے بارے کیا رائے تھی۔ کیونکہ پھر اس نے بات نہیں کی تھی۔ یہاں تک کہ تقریباً آدھا گھنٹہ چلتے رہنے کے بعد وہ ہمیں ایک فائیو سٹار ہوٹل میں لے آئی۔

وہ ہوٹل ساحل سمندر کے کنارے بیچ روڈ پر تھا۔ سفید عمارت کی کئی منزلیں تھیں۔ وہ ہوٹل ہی نہیں ارد گرد کا سارا علاقہ سرسبز اور شاداب تھا۔ مختلف طرح کے درخت، پودے اور پھول وافر مقدار میں تھے۔ ہم جیسے ہی کار سے باہر آئیں، میری نگاہ اس بڑے سے بینر پر پڑی، جو سیمینار سے متعلق تھا اور شرکاء کو خوش آمدید کہا گیا تھا۔ اتنے میں کچھ باوردی لڑکے پورچ میں آئے اور انہوں نے ہمارا سامان اٹھالیا۔ ہم ہوٹل کے اندر گئے۔

ہوٹل میں پہلا تاثر میرون، سنہرا، اور سفید رنگ کا تھا۔ سامنے استقبالیہ تھا، جس پر تین تھائی لڑکیاں ایک جیسے یونیفارم میں کھڑی تھیں۔ میرون کوٹ، پتلون، آف وائٹ شرٹ، ایک جیسا ہیر اسٹائل اور چہرے پر مسکراہٹ بھی ایک جیسی ہی تھیں۔ تائی جو نے آگے بڑھ کر ان سے تھائی میں بات کی۔ ایک نے فوراً اپنے سامنے رکھے کمپیوٹر میں ماریہ کا نام تلاش کیا۔ پھر تھائی ہی میں پوچھا۔ جس کا ترجمہ تائی جو نے کیا۔

''آپ تینوں کے لئے کمرہ ایک ہی ہوگا؟''
''جی، اس کی پیمینٹ کردی گئی ہے۔'' ماریہ نے کہا اور اس کے ساتھ ہی دوسری تھائی لڑکی نے چابی کاونٹر پر رکھ دی۔ تو نینا تیزی سے بولی۔
''یہ لڑکیاں ہیں یا چابی کی گڑیا؟''
''یہ کام کرنے والی پروفیشنل لڑکیاں ہیں اور یہاں صرف پیسے کی زبان سمجھی جاتی ہے۔'' اس نے ہنستے ہوئے کہا۔ اس وقت تک ہمارا سامان لے کر ویٹر دائیں جانب لفٹ کے پاس جا پہنچے تھے۔
کمرے میں سامان رکھتے ہی وہ ویٹر واپس چلے تو تائی جو، ماریہ سے مخاطب ہو کر بولی۔
''ابھی ساڑھے دس ہو رہے ہیں۔ ٹھیک گیارہ بجے پہلا تعارفی سیشن ہوگا۔ پانچ منٹ پہلے میں آپ کو ہال تک لے جاؤں گی آپ تیار رہیں۔'' اس نے کہا اور کوئی بات سنے بغیر واپس مڑ گئی۔
''یہ سلوک ہوتا ہے مہمانوں کے ساتھ، یار ابھی کچھ دیر بیٹھے نہیں، سکون کا سانس نہیں لیا اور چل دیں سیمینار کو۔'' ماریہ نے جلے ہوئے لہجے میں کہا۔
''یہ تبصرہ بعد میں کریں گے، تم بس جلدی سے فریش ہو جاؤ اور چپ چاپ اس کے ساتھ چلی جانا کیونکہ ہم لمبی تان کر سونے والے ہیں۔'' نینا نے سوٹ کیس سے تولیہ نکال کر اس کی جانب اچھالتے ہوئے کہا اور سیدھی بیڈ پر جا لیٹی۔ ماریہ ہمیں گھورتی ہوئی باتھ روم کی طرف چلی گئی۔
گیارہ بجنے میں پانچ منٹ ہی رہتے تھے، جب دروازے پر ہلکی سے دستک ہوئی اور تائی جو آ گئی۔ ماریہ تیار تھی، ہمیں بھی نیند نہیں آئی تھی، سو کوئی بات کیے بغیر، ہم بھی اس کے ساتھ چل دیں۔ وہ ہال دوسری منزل پر تھا۔ ہال میں داخل ہوتے ہی ایک استقبالیہ تھا۔ جہاں پر میزبان خواتین پر جوش انداز میں استقبال کر رہی تھیں۔ چند فقروں کے تبادلے کے بعد ہم آگے بڑھیں۔ وہاں زیادہ تر خواتین ایشین تھیں۔ باقی میڈیا کے لوگ تھے۔ ملک کے نام کے انگریزی حروف تہجی کے مطابق سیٹیں تھیں۔ تائی جو نے ماریہ کو اس کی سیٹ پر بٹھایا تو ہم واپس پلٹ آئیں۔
وہاں سیمینار میں دو گھنٹے لگے۔ کیونکہ اسی وقت ماریہ کا فون آ گیا۔ ہم وہاں چلی گئیں تو مسلم فوڈ والے کارنر میں کافی ساری خواتین میں ماریہ بیٹھی دکھائی دی۔ وہ دوسری خواتین سے باتیں کر رہی تھیں۔ ہم بھی وہیں جا کر بیٹھ گئے۔ یہ انٹرنیٹ نے تعلق کو کئی ملکوں تک پھیلا دیا تھا۔ وہ جو اسکرین پر ملتی تھیں۔ اس وقت آمنے سامنے بیٹھی ہوئی تھیں۔ کچھ دیر بعد کھانا سرو کر دیا گیا۔ کھانے کے بعد ہم واپس کمرے میں آ گئیں۔
''ملکہ عالیہ۔ اب کیا پروگرام ہے آپ کا؟'' نینا نے غیر متوقع طور پر طنزیہ بات بڑے ادب واحترام سے کہی تو ماریہ نے اسے چونک کر دیکھا پھر مسکراتے ہوئے بولی۔
''لگتا ہے، آب وہوا اور ماحول کی تبدیلی کے باعث نینا کی طبیعت ٹھیک نہیں رہی۔''
''نہیں ایسی کوئی بات نہیں۔ میں نے آپ کا پروگرام پوچھا ہے، یہیں پساروں گی یا باہر نکل کر جل تھل ہونے کا ارادہ ہے۔'' وہ ایک دم پٹڑی ہی سے اتر گئی۔ اس پر ماریہ نے اسے تکیہ دے مارا۔
''اوکے اوکے۔'' اس نے صلح کے لئے ہاتھ اٹھا دیئے تو ماریہ نے کہا۔
''کچھ دیر آرام کرتے ہیں۔ اس دوران یہ جو ہمارے پاس بروشر ہیں، ان سے کوئی جگہ پسند کر کے نکل پڑتے ہیں۔ صبح تک وقت ہمارا ہی ہے۔''

اوکے ڈن ہوگیا۔" نینا نے کہا اور سکون سے لیٹ گئی۔ تبھی میں نے اس کی طرف دیکھتے ہوئے پوچھا۔

"ہن آرام ای۔"

اس نے کوئی جواب نہیں دیا۔

☆......☆......☆

ٹھیک چار بجے ہمارے دروازے پر دستک ہوئی۔ ماریہ نے دروازہ کھولا تو تائی جو اندر آ گئی۔

"کیا تم لوگ باہر جانے کے لئے تیار ہو؟" اس نے ہمیں ابھی تک کسلمندی سے پڑے ہوئے دیکھ کر حیرت سے کہا۔ ماریہ نے اسے بیٹھنے کو کہا اور خود تیار ہونے لگی۔ ہم نے بھی منہ پر پانی کے چھینٹے مارے اور تیار ہو گئیں۔ پندرہ منٹ بعد ہوٹل کی لابی میں آ گئے تو تائی جو نے پوچھا۔

"کہاں جانا پسند کریں گے آپ؟

"بولو، لڑکیو! کہاں جانا ہے؟" ماریہ نے بزرگ بننے کی ناکام کوشش کرتے ہوئے پوچھا۔

"یہاں سے نکلو باہر، پھر سوچتے ہیں۔" نینا نے کہا اور قدم بڑھا دیئے۔ اس پر ماریہ کاندھے اچکا کر رہ گئی تو تائی جو نے چلنے کا اشارہ کیا تو ہم سب پارکنگ تک گئیں وہاں سے کار میں چل دیں۔

کم رفتار میں چلتے ہوئے تقریباً بیس منٹ بعد ہم ساحل سمندر پر جا پہنچے۔ وہاں کافی رونق تھی۔ نوجوان جوڑے کافی تعداد میں تھے۔ لکڑی سے بنایا ہوا جیٹی نما راستہ دور سمندر تک چلا گیا تھا۔ وہیں مختلف رنگوں کی پلاسٹک کی کرسیاں رکھی ہوئی تھیں اور اسی رنگ اور سائز کے چھوٹے چھوٹے میز تھے۔ تائی جو کار پارک کر کے آ گئی۔ تب تک ہم وہاں موجود لوگوں کو دیکھتے رہے۔ وہاں زیادہ تعداد جوڑوں ہی کی تھی۔ موسم گرم ہونے کے باعث لڑکیاں بہت حد تک کم لباس میں تھیں۔ ہم ٹہلتے ہوئے کافی آگے جا کر ایک میز کے اردگرد آمنے سامنے بیٹھ گئیں۔ تبھی وہ بولی۔

"اس جگہ کا نام شمالی پتایا یا چاؤن بوری ہے۔ یہ اوپن ایئر ریستوران بہت اچھا ہے، یہاں کی لوکیشن بھی اچھی ہے، خاص طور پر "لو برڈز" کے لئے یہ خاصی پرسکون جگہ ہے، وہ یہاں آ کر زیادہ خوشی محسوس کرتے ہیں۔"

"ہوں۔" میں نے مصنوعی روشنیوں سے ماحول کو پرکشش بنانے کی کوشش کو دیکھتے ہوئے کہا جو سر شام ہی جل اٹھیں تھیں۔ سمندر پر تیرتی ہوئی روشنی، بے چین لہریں، سرور بخش ہوا اور موسم کی خوشگواریت کافی مزہ دے رہی تھی۔

"کیا کھاؤ گے۔" اس نے میز پر دھرے مینو کو اٹھاتے ہوئے کہا میرے سامنے جو ایک کمزور سی ویٹرس وہاں رکھ گئی تھی۔

"تائی جو! ہم نہیں جانتیں کہ یہاں سے حلال کیا کچھ ملے گا، میرا خیال ہے تم حلال کا مطلب سمجھ سکتی ہو گی؟" میں نے اس کی جانب دیکھتے ہوئے کہا۔

"میں سمجھتی ہوں اور آپ کی ہدایات میں بھی لکھا ہوا تھا۔ اسی لیے یہاں لے کر آئی ہوں۔ یہاں سی فوڈ بنتا ہے اور چکنائی کے لیے پام آئل استعمال ہوتا۔ یہاں پر زیادہ تر انڈین ہی آتے ہیں۔" اس نے کہا تو میں مینو دیکھنے لگی۔ پھر کھانے کا آرڈر دے کر ماریہ سے پوچھا۔

"دیکھو۔ مجھے نہیں معلوم کہ آپ یہاں پتایا سیر کرنے کے لئے کس جگہ کو اہمیت دیں گی۔ اگر آپ مجھے تھوڑا آئیڈیا دے دیں تو میں بہتر گائیڈ کر سکوں گی۔ میرا مطلب، یہاں ہر طرح کی تفریح ہے جو تم لوگ سوچ سکتے ہو۔" اس نے مسکراتے ہوئے کہا۔

"مثلاً......" نینا نے زیر لب مسکراتے ہوئے

پوچھا تو وہ بتانے لگی۔

''یہاں آپ کو ہر جگہ ''چارلی'' ملیں گے، مطلب چارلی انہیں کہا جاتا ہے جن کے پاس رابطہ ہوگا کہ وہ آپ کو آپ کی پسند کی لڑکی فراہم کرسکتا ہے۔ اور اسی طرح لڑکے بھی ان کے رابطے میں ہوتے ہیں۔ اس کے علاوہ تفریحی مقامات ہیں۔ شاپنگ سنٹر ہیں، تھیٹر، سب کچھ۔'' اس نے بتایا۔

''دیکھو، جہاں تک مجھے اس شہر کی معلومات ہے، یہ کوئی اتنا تاریخی نہیں، سارے ہی تفریحی مقامات نئے بنائے گئے ہیں۔ چونکہ ہمارا ایک مقصد بھی ہے ہم عام لوگوں کو دیکھیں گے، پھر شاپنگ کے ساتھ لوگوں کا انداز دیکھیں گے، خاص طور پر عورتوں کا۔ باقی کوئی تفریح ہمیں نہیں چاہیے۔'' نینا نے بات ہی ختم کردی تو میں نے کہا۔

''تائی جو، مجھے تھوڑی بہت یہاں کے بارے میں معلومات ہے، تم کیا بتانا چاہوگی؟''

''تمہیں پتہ ہوگا کہ پتایا کبھی ایک چھوٹی سی ساحلی بستی ہوا کرتی تھی۔ جس کے بارے میں دنیا جانتی تک نہیں تھی۔ ایسی بستی کہیں اس دنیا میں موجود بھی ہے یا نہیں۔'' تائی جو نے میرے چہرے پر دیکھتے ہوئے بتایا وہ چند لمحے سانس لینے کو رکی اور پھر کہتی چلی گئی۔ ''دراصل اس شہر کا نام ''پاؤتھایا'' تھا۔ جس کا مطلب ہوتا ہے جنوب مغرب سے شمال مشرق کی جانب چلنے والی وہ ہوائیں جو بارشوں کے موسم سے پہلے شروع ہوتی ہیں۔ وقت گزرنے کے ساتھ یہ فقط پتایا رہ گیا۔ اس شہر کی قسمت اس وقت بدلی، جب 1961ء کے شروع میں سو کے قریب امریکی فوجی یہاں آئے تھے۔ وہ ویت نام کی جنگ میں حصہ لے رہے تھے اور یہاں وہ تفریح کرنے کے لیے آئے تھے۔ پھر بعد میں امریکی بھگوڑے فوجی بھی یہاں آنے لگے۔ جلد ہی یہ علاقہ ترقی کرتا چلا گیا۔ وہ گمنام ساحلی بستی، جسے کوئی جانتا نہیں تھا اب ایک جدید شہر میں بدل چکی ہے۔''

''تمہارا کیا خیال ہے تائی جو! امریکیوں کی یہاں آمد سے اس شہر کی قسمت کا ستارہ چمکا ہے یا ان کی وجہ سے تمہاری آئندہ آنے والی نسلوں تک کی قسمت تاریک اندھیرے میں دفن ہوتی چلی جارہی ہے؟'' میں نے کہا تو اس نے میری جانب غور سے دیکھا اور پھر چند لمحے سوچنے کے بعد بڑے تحمل سے بولی۔

''تم ٹھیک کہہ رہی ہو۔ امریکیوں نے اس شہر کا رخ صرف عیاشی کے لیے کیا تھا۔ وہ سب ذہنی طور پر بیمار اور شکست خوردہ تھے۔ یوٹاپوائر پورٹ ہونے کی وجہ سے امریکیوں نے اس بستی، بلکہ پورے علاقے کو ''آرام اور سکون'' کا علاقہ قرار دے دیا تھا۔ ان کے لیے عورت اور شراب کے لیے علاوہ آرام وسکون کیا تھا۔ پوری قوم کو جنسی بے راہ روی پر لگانے والے یہی امریکی ہیں۔'' تائی جو نے کہا تو اس کے لہجے میں شکست خوردگی تھی۔ جیسے یہ سب کہتے ہوئے اسے اچھا نہ لگ رہا ہو۔ میں خاموشی سے اسے دیکھتی رہی تو وہ کہنے لگی۔ ''یہ جو شہر میں اونچی عمارتیں ہیں، ترقی ہے یا چھوٹی چھوٹی ماہی گیروں کی کشتیاں، اب عیاشی کرنے کے ٹھکانے بنے ہوئے ہیں۔ یہ سب فقط دولت کمانے کے لیے ہیں۔ میں نہیں سمجھتی کہ یہاں بدھا کی عبادت ہوتی ہے بلکہ میں یہ جانتی ہوں اور دیکھتی بھی ہوں کہ یہاں دولت کی عبادت کی جاتی ہے۔ بدھا کے مجسمے پر جو ہار ڈالا جاتا ہے، اس میں بھی نوٹ پروئے ہوئے ہوتے ہیں۔''

''ایسا کیوں ہے؟'' میں نے سوال کیا۔

''یقیناً! مرجانے کا خوف اس قدر گہرا ہے کہ ان کے اندر ہر طرح کی بھوک چمک اٹھی ہے۔ یوں تو

تھائی لینڈ کا مطلب آزاد لوگوں کی سرزمین ہے۔ یہ ملک کبھی بھی نوآبادیت کا شکار نہیں ہوا ہمیشہ آزاد رہا ہے، ہم کسی کے غلام نہیں رہے۔" وہ قدرے فخر سے بولی۔ میں نے اس کے جذبات کا احترام کرتے ہوئے کہا۔

"اپنے وطن سے ہر انسان کی محبت فطری بات ہے لیکن اگر دوسرے لفظوں میں کہا جائے تو یوں ہوگا کہ تم لوگوں نے مزاحمت نہیں کی اور امریکیوں نے اپنی مرضی کا سب کچھ یہاں کرلیا۔"

"شاید ہم میں دولت کمانے کا شعور بیدار کردیا۔" اس نے کہا تو میں اسے سمجھاتے ہوئے بولی۔

"دیکھو۔ جہاں تک میں سمجھتی ہوں، بدھ ازم میں مادیت پرستی نہیں تھی۔ ان کے طرز زندگی میں روحانیت پر زور دیا جاتا تھا لیکن اب ہر شخص روحانیت سے دور ہوتا چلا جارہا ہے اور وہ مادیت کا پوری طرح شکار ہو چکا ہے۔"

"ہاں! میں سمجھتی ہوں، ایسا ہی ہے۔" اس نے تسلیم کرتے ہوئے کہا تو میں نے ماریہ کو توجہ دلائی

"یہ نکتہ نوٹ کرو کہ یہاں مادیت کو زیادہ ترجیح دی جاتی ہے، کیا واقعی دی جاتی ہے۔ اس کا مشاہدہ کرنا۔" میرے یوں کہنے پر وہ سر ہلا کررہ گئی۔

وہاں سے ہم اٹھے تو اندھیرا کافی حد تک پھیل چکا تھا۔ ہمارا رخ بیچ روڈ کی طرف تھا۔ تائی جو نے کار ایک جگہ پارک کی اور ہمارے ساتھ پیدل ہی چل پڑی۔ ہمارے دائیں ہاتھ پر مصروف روڈ تھا، اس سے آگے کافی ساری خالی جگہ پر پام کی طرز کے درختوں کی قطاروں میں بہتات اور اس سے آگے ساحل اور پھر سمندر تھا۔ بائیں ہاتھ پر تاحد نگاہ چھوٹی بڑی دکانیں ہی دکانیں اور مارکیٹیں تھیں۔ دنیا بھر کا سامان وہاں لدا ہوا تھا۔ غیر ملکی برانڈ کی شاخیں بھی تھیں۔ ریسٹوران، ٹک شاپس اور ٹھیلے۔ رنگ روشنیاں، شور، پیدل چلنے والوں کا ہجوم، خرید و فروخت اور ہلا گلا۔ بہت رونق تھی۔ ہم ایک کپڑے کی دکان میں گھس گئیں۔ وہاں پہلے ہی کافی خریدار تھے۔ کاؤنٹر پر سیلز گرلز اور سیلز مین بڑی تیزی گاہکوں کے ساتھ مصروف تھے۔ ایک خالی کاؤنٹر پر ہم بھی جا کھڑی ہوئیں۔ جہاں زنانہ چہرے والا سیلز مین اپنی کنجی آنکھوں سے دیکھ رہا تھا۔ تائی جو نے اسے تھائی زبان میں جا کر کچھ کہا تو اس نے انگریزی میں جواب دیتے ہوئے کہا۔

"آپ جیسا بھی کپڑا پسند کریں۔" اس نے وہیں کھڑے کھڑے ایک لڑکی کو اشارہ کیا۔ وہ تیر کی طرح اس کے پاس آ گئی۔ اس نے مسکاتی آنکھوں اور مسکراتے ہوئے لبوں کے ساتھ ہمیں گڈ ایوننگ کہا اور تھان پر تھان کھولنے لگی۔ میں اس کی تیزی اور مشقت پر حیران ہورہی تھی۔ نینا کو وہاں کی سفید سلک بہت پسند آئی تھی۔ لیکن اگلے ہی لمحے منہ بسورتے ہوئے بولی۔

"مگر مصیبت یہ ہے آلیشبہ، مجھے اصل سلک کی پہچان نہیں ہے، اتنی مہنگی سلک اور بعد میں مذاق کروائیں۔"

"تم بازار سے کوئی پھل خریدنے جاؤ تو وہ اچھے نہیں لاسکتی، یہ تو پھر سلک ہے۔" ماریہ نے طنزیہ انداز میں کہا۔

"کیا آپ مجھے اپنا مسئلہ بتا سکتی ہیں؟" تھائی سیلز گرل نے ہماری طرف دیکھ کر پوچھا تو ماریہ نے اسے بتا دیا کہ وہ کیا کہہ رہی ہے۔ اس نے یہ سن کر مسکراتے ہوئے بتایا۔ "دیکھیں۔! آپ سلک کے کپڑے سے تھوڑی سی دھجی لیں اور اسے آگ لگا دیں۔ اگر وہ پلاسٹک کی طرح جل کر پانی کی مانند

پگھلے تو وہ اصل سلک نہیں ہے اور جو جل کر راکھ ہو جائے تو وہ اصل سلک ہوگی۔"

"واؤ! تو میں دیکھوں۔" نینا نے تیزی سے کہا۔ سیلز گرل نے کپڑے سے ایک دھجی دے دی اور ساتھ میں ایک لائٹر تھما کر کہا۔

"برائے مہربانی باہر جا کر دیکھیں۔"

ماریہ اور نینا باہر چلی گئیں اور میں نے اس سیلز گرلز سے پوچھا۔

"کیا تم اپنی اس جاب سے مطمئن ہو؟" میرے یوں پوچھنے پر پہلے تو اس نے مجھے غور سے دیکھا، پھر جو اس کے چہرے پر ایک خاص قسم کا درد پھیلا، وہ ناقابل بیان تھا۔ اس کی یہ کیفیت چند لمحوں تک رہی۔ پھر وہ ایک دم سے نارمل ہوتے ہوئے بولی۔

"ٹھیک ہوں۔ زندگی بہت اچھی گذر رہی ہے۔"

"اوکے، میں تم سے مزید کوئی سوال نہیں کروں گی۔ تمہارے لفظوں سے زیادہ تمہارے چہرے پر پھیلی لمحاتی تاثرات نے ساری کہانی سنادی ہے۔ وش یو گڈ لک۔" میں نے کہا تو اس کی آنکھوں میں اداسی تیر گئی۔ وہ اس کا ناقابل بیان دکھ تھا۔ وہ مادیت پرستی، سرمایہ دارانہ نظام کے درخت کا دُکھتا ہوا پھل تھا۔ جس کی کڑواہٹ اسے دیکھ کر ہی ہو رہی تھی۔ نینا واپس آگئی۔ راکھ اس کی انگلیوں پر تھی۔ اس نے ایک تھان پسند کیا۔ اسے دیکھا اور بھاؤ تاؤ کر کے خرید لیا۔ جس پر وہ سیلز گرل اس کی بہت شکر گذار تھی اور اس کو دوبارہ آنے کی دعوت دیتی رہی تھی۔

ہم وہاں سے نکلے تو ایک جوتوں کی دکان میں داخل ہو گئے۔ وہاں پر رنگ برنگے مختلف قسم کے جوتے ایک شوروم میں سجے ہوئے تھے۔ ایک ادھیڑ عمر خاتون دکاندار کے ساتھ دو معاون نوجوان لڑکیاں بڑی تیزی سے مرد، عورتوں اور بچوں کو جوتے پہنا رہی تھیں۔ ہمیں تھوڑی دیر انتظار کرنا پڑا تھا۔ اس دوران، ہم شوروم میں لگے جوتے پڑے دیکھتی رہیں۔

کچھ دیر بعد وہ ادھیڑ عمر خاتون ہماری طرف متوجہ ہوگئی۔ تائی جو نے اسے ہمارا تعارف کرایا کہ برطانیہ سے ہیں۔ یہ سنتے ہی اس کے چہرے پر ایک خاص قسم کا تاثر ابھر آیا۔ وہ پوری طرح متوجہ ہوگئی۔ ہم جوتے خریدنے کے ساتھ اس سے باتیں بھی کرتی رہیں۔ ایک لڑکی باہر سے کولڈ ڈرنک لے آئی۔

"پی لو۔ پیسے تو انہی جوتوں میں پورے کرلے گی۔" نینا نے کولڈ ڈرنک پکڑتے ہوئے کہا اور سکون سے پینے لگی۔ تبھی میں نے اس دوکاندار خاتون سے پوچھا۔

"میں نے پہلی بار یہاں پتایا میں کسی خاتون کو یوں دکان چلاتے ہوئے دیکھا ہے۔ کیا ایسا مجبوری میں کر رہی ہیں؟"

اس نے میرے سوال کے جواب میں میری طرف یوں دیکھا جیسے میں نے کوئی احمقانہ سوال کیا ہو۔ کچھ ہی دیر بعد اس نے نارمل ہوتے ہوئے کہا

"میرا خیال ہے ابھی تم لوگوں نے پتایا گھوم پھر کر نہیں دیکھا۔ یہاں بنیادی طور پر عورتیں ہی کام کرتی ہیں۔ سمجھ لو کہ عورتوں پر ہی یہ ذمہ داری ہے کہ وہ کام کریں اور کمائیں۔ تم لوگوں کو یہاں ہر جگہ عورتیں ہی کام کرتی دکھائی دیں گی۔"

"عورتوں کے اپنے مخصوص مسائل ہوتے ہیں، وہ انہیں کس طرح قابو کرتی ہیں۔" میں نے پوچھا

"کرنا ہوتے ہیں۔ یہ ہمارے لئے کوئی انہونی بات نہیں، عام بات ہے، ہماری تربیت اور ماحول ہی ایسا ہے۔ اصل میں تم لوگ اسے اسی طرح انہونا سوچ رہی ہو، جیسے ہمارے لئے تمہارے اسلامی ملک میں کسی عورت کا "غلاف" میں لپٹا ہوا ہونا اور اس کا باہر

نکلنا اور دیگر کام انجام دینا۔'' اس نے کہا اور ہمارے خریدے ہوئے جوتے اس نے ایک شاپنگ بیگ میں ڈال کر ہمیں تھمادیئے۔

ہم دکان سے باہر آگئیں۔ دکان دار خاتون کی باتیں میرے ذہن میں تھیں۔ یوں سمجھ لیں کہ اس نے مجھے ایسی عینک پہنادی جس سے میں وہاں کی عورتوں کو دیکھنے لگی۔ ذرا سا آگے گئیں تو ایک جلے ہوئے رنگ والی موٹی سی عورت ایپرن باندھے برگر بنانے میں مصروف تھی۔ ان نے اپنے بال سفید رنگ کے کپڑے میں باندھے ہوئے تھے۔ مخصوص تھائی لباس میں وہ تیزی سے ہاتھ چلاتے ہوئے برگر تیار کررہی تھی۔

پتایا بیچ روڈ پر ہم نے کوئی تین گھنٹے گذار دیئے تھے۔ ہمیں وقت گزرنے کا احساس ہی نہیں ہوا۔ جب پیدل چلتے ہوئے ہماری ٹانگیں تھک گئیں تو واپس چلنے کا قصد کیا۔

اسی بیچ روڈ پر رات کے وقت مجھے عجیب وحشت ناک مناظر دیکھنے کو بھی ملے۔ ساحل کے ساتھ ایک چھوٹی سی منڈیر بنی ہوئی تھی۔ اس کے ساتھ پام قسم کے درختوں کے درمیان اینٹوں سے بنا ہوا راستہ تھا۔ سڑک کے اس پار نیم برہنہ، دعوت گناہ دیتی لڑکیاں، یوں اُمڈتی چلی آرہی تھیں۔ جیسے وہ اپنی دکان خود لگا کر گاہک کے انتظار میں بیٹھی ہیں۔ زیادہ تر لڑکیاں شارٹس اور سلیولیس ٹی شرٹ میں تھیں۔ واپسی پر کار کی طرف جاتے ہوئے نینا نے ان پر اپنے انداز میں جو تبصرہ کیا، اس سے میرے لبوں پر ذرا سی مسکراہٹ نہ آسکی۔ میں سوچ رہی تھی کہ یہ جسم فروش لڑکیاں یہاں کے ماحول کی پیداوار ہیں۔ کیسی ہے وہ قوم جو اپنی عورتوں کو یوں سر بازار نیلام ہونے کے لئے اجازت دے دیتی ہے۔ ایسی مادیت کا کیا کرنا، ایسی ترقی جائے بھاڑ میں۔ مجھے یاد آرہا تھا کہ اسی شہر میں جی ایٹ کانفرنس ہونے والی تھی، جو کسی وجہ سے نہیں ہو پائی تھی۔ کیا جی ایٹ والے ایسی لڑکیوں کو تحفظ دے سکتے تھے؟

ہم گاڑی میں بیٹھ گئیں اور واپسی کے لئے تائی جو ہمیں لے جارہی تھی۔ نجانے کس طرح کا راستہ تھا اور اس دوران کیا آیا لیکن میں پاکستان میں اپنے گھر کے ساتھ ان کے بارے میں سوچ رہی تھی کہ جن کی عورتیں سارا دن بھیک مانگ کر لاتی تھیں، بچے پیدا کرتی تھیں اور سارا دن ان جھونپڑیوں میں اینڈ ھتے نشہ باز مردوں سے مار بھی کھاتی تھیں۔ وہ مرد سارا دن مرغے لڑاتے جوا کھیلتے یا پھر گاتے بجاتے رہتے تھے۔ ایسا ہی عکس میں نے پتایا میں دیکھا۔ یہ ذرا جدید قسم کے خانہ بدوش تھے۔ ماریہ اور نینا، تائی جو کے ساتھ باتیں کرتی رہیں۔ وہ آنے والے کل کا پروگرام بناتی رہیں۔ وہ ہمیں ہوٹل چھوڑ کر واپس چلی گئی۔

''یہ تمہارے منہ پر بارہ کیوں بج رہے ہیں آلیشبہ، کیا ہوا ہے تمہیں۔'' ماریہ نے ہوٹل کے کمرے میں واپس آتے ہی پوچھا۔

''میں بھی کافی دیر سے نوٹ کررہی ہوں۔'' نینا نے اپنا پرس ایک طرف پھینکتے ہوئے اپنی رائے دی تو میں نے انہیں اپنے احساسات پوری ایمان داری سے بتادیئے۔

''او جذباتی نہیں ہوتے چندا، یہ دنیا ہے۔ ہر جگہ عورت کا استحصال ہورہا ہے لیکن اس کی صورتیں مختلف ہیں۔'' ماریہ نے دکھی لہجے میں کہا۔

''ایسا شاید اس لئے ہورہا ہے کہ ان لوگوں کو اپنے تحفظ کا احساس نہیں، خوف زدہ لوگ ہیں، بھوک کے مارے ہوئے۔'' میں نے کہا۔

"یہاں مجھے ایمان کی پختگی کا احساس ہوتا ہے۔ اسلام کے اصولوں پر فخر ہوتا ہے۔ ہماری سوچ کی بنیاد میں جو اپنے پروردگار اور پالنے والے پر اعتقاد ہی نہیں اعتماد بھی ہے، وہی ہمیں ایک باوقار قوم بناتا ہے۔ ایک پکا اور سچا مسلمان اپنی عورت کی نہ صرف حفاظت کرتا ہے بلکہ اسے احترام بھی دیتا ہے۔" ماریہ پر جوش لہجے میں کہا تو میرا موڈ ایک دم سے بحال ہونے لگا۔

"آپ دونوں دانشور خواتین سے گذارش ہے کہ یہ فلسفیانہ گفتگو کو تھوڑی دیر کے لئے ٹال دیں اور میرے سونے کے بعد کرتی رہیں، فی الحال کھانے پینے کا سوچیں۔" سدا کی بھوکی نینا نے عجیب سے لہجے میں کہا تو میں ہنس دی۔

ہوٹل کی عمارت کے ساتھ ساحل سمند تک ایک سرسبز لان تھا۔ دھیمی دھیمی اور خواب ناک روشنی ہر طرف پھیلی ہوئی تھی۔ ہم تینوں وہیں ڈنر کے لئے بیٹھ گئی تھیں۔ سیمینار میں آنے والی دوسری خواتین بھی تھیں۔ ڈنر کے بعد وہ سب آپس میں گھل مل گئیں۔ رات گئے تک، مختلف موضوعات پر ہم وہیں بیٹھی گپ شپ کرتی رہیں۔

☆......☆......☆

میری آنکھ کھلی تو کھڑکی میں سے آتی ہوئی روشنی سے کمرہ بھرا ہوا تھا۔ میں کچھ دیر پڑی رہی۔ پھر اٹھ کر بالکونی کی جانب بڑھ گئی۔ میں نے پردے ہٹائے تو میرے سامنے قدرے سبزی مائل نیلگوں سمندر پھیلا ہوا تھا۔ نیلے آسمان پر چمکتا ہوا سورج، ریت اور سمندر دونوں کو چمکا رہا تھا۔ نیچے ہوٹل کے سوئمنگ پول کے شفاف پانی میں نیلے رنگ کی تہہ صاف دکھائی دے رہی تھی۔ اس پول کے اردگرد ایک قطار میں لوگ لیٹے ہوئے سن باتھ لے رہے تھے، ظاہر ہے لوگوں میں عورتوں اور مردوں کا شمار ہوتا ہے۔ میں نے ادھر سے نگاہیں ہٹالیں اور دور تک پھیلے ہوئے طویل ساحل کو دیکھا۔ میری نگاہیں ساحل پر موجود اس مندر نما پگوڈا پر رک گئیں، جس میں ایک خاص کشش تھی۔ میں اسے دیکھتی رہی۔ میں اس وقت پلٹی، جب میرا فون بجنے لگا۔ میں نے جلدی سے فون پک کر لیا کہ کہیں نینا کی آنکھ نہ کھل جائے۔ دوسری طرف ماریہ تھی۔

"جاگ گئی ہو۔" اس نے پوچھا۔

"جی، نیند میں تو بات نہیں کر رہی۔" میں نے کہا تو وہ ہنستے ہوئے بولی۔

"اچھا ہوا تمہارا موڈ بحال ہو گیا۔ اچھا خیر سنو، آج تائی جو نہیں آئی، اسے کوئی کام تھا، اس نے اپنی کزن "شین یا" کو بھیج دیا ہے۔ میں اس سے ملی ہوں، تمہارے مطلب کی ہے۔ وہ یہاں بور ہو رہی ہے۔ میں اسے تمہارے پاس بھیج رہی ہوں۔ اس کے ساتھ گپ شپ کرنا، کچھ کھلانا پلانا، میرے خیال میں ابھی اس نے ناشتہ نہیں کیا ہوگا۔ صبح سے یہیں ملی تھی۔"

"شین یا، اوکے بھیج دو۔" میں نے کہا اور فریش ہونے چل دی۔ میں ابھی بالکونی ہی میں کھڑی باہر کے نظارے سے لطف اندوز ہو رہی تھی کہ دروازہ بجا، میں نے بڑھ کر دروازہ کھولا اور اسے اندر لے آئی۔

اگرچہ تھائی لڑکیاں سبھی ایک جیسی ہی دکھائی دیتی ہیں۔ چھوٹی چھوٹی آنکھیں، چپکا ہوا ناک، قدرے موٹے ہونٹ اور سفید رنگ جس میں چینیوں کی مانند پیلاہٹ سی ہوتی ہے لیکن شین یا کے نین نقش خالص تھائی لڑکیوں کے جیسے نہیں تھے۔ میں نے بہت غور کرنے کے بعد اس کے نین نقش کو یوں سمجھا تھا کہ جیسے اس کے بنیادی خدوخال تو تھائی لڑکیوں جیسے ہی

تھے مگر ان کی بناوٹ میں مغربی نقوش کی ہلکی سی جھلک تھی جیسے ناک تیکھا ہونے کا احساس، کھلی سی بادامی صورت آنکھیں جن پر بھویں فطری تھیں اور پتلے سے لبوں کے ساتھ گالوں کا ابھار، گوری رنگت میں گلابی پن تھا۔ سفید قمیص کے ساتھ منی سکرٹ گہرے رنگ کی تھی، جس میں اس کی گلابی پنڈلیاں واضح دکھائی دے رہی تھیں۔ سفید رنگ کی ہلکی سی چپل، ہلکا سا میک اپ اور شانوں تک تراشے ہوئے گہرے براؤن بال پہلی نگاہ میں یہی کچھ دکھائی دیتا تھا۔ ان سب کے مجموعے میں وہ مجھے ایک لاابالی لڑکی لگی تھی۔ مجھے وہ پہلی نگاہ میں اچھی لگی۔

''آؤ، شین یا بیٹھو۔'' میں نے کہا تو نینا بھی اٹھ گئی۔ کچھ دیر بعد ہم تیار ہو کر بیٹھ گئیں۔ اس کے ساتھ ہی ناشتہ بھی آ گیا۔ جسے ہم تینوں نے ڈٹ کر کیا۔ اس دوران مجھے اندازہ ہوا کہ وہ نہ صرف انگلش زبان سے اچھی طرح واقف ہے بلکہ گائیڈ بننے کی تربیت کے باعث بہت زیادہ معلومات بھی رکھتی ہے۔ اس حوالے سے وہ مجھے تائی جو سے زیادہ بہتر لگی۔ میرے ذہن میں وہ پگوڈا نما عمارت تھی۔ میں نے اسے اپنے ساتھ آنے کو کہا اور بالکونی میں چلی گئی۔ شین یا میرے پیچھے آ کر کھڑی ہو گئی۔ تب میں نے اس پوچھا۔

''وہ کیا چیز ہے، مطلب کیسی عمارت ہے وہ؟''

''وہ!'' اس نے اشارہ کر کے تصدیق چاہی پھر بولی''وہ کہنے کو تو پگوڈا ہی ہے، جسے یہاں واٹ کہتے ہیں لیکن یہاں باقاعدہ عبادت نہیں ہوتی، یہ لکڑی سے بنایا گیا ہے، سمجھیں ایک ماسٹر پیس ہے جو یہاں کے فنکاروں نے سیاحوں کی توجہ کے لیے بنایا ہے۔ اسے سینکچری آف ٹرتھ کہتے ہیں۔

''سینکچری آف ٹرتھ......! یہ کیا ہوا؟'' میں نے زیر لب دہرایا تو وہ بولی۔

''یہ تو اگر آپ وہاں جا کر دیکھیں تو میں آپ کو کافی معلومات دے سکتی ہوں۔'' اس نے میرے چہرے پر دیکھتے ہوئے کہا تو میں نے ایک دم سے وہاں جانے کا فیصلہ کر لیا۔

''چلو، نینا، وہاں تک چلیں۔''

''وہ ماریہ؟'' اس نے صرف اتنا کہا پھر خود ہی شین یا کی طرف دیکھ کر بولی''ہم اس وقت واپس آ جائیں گے نا؟''

''بالکل، وہ اتنا زیادہ دور نہیں ہے۔'' شین یا نے کہا تو کچھ ہی دیر بعد ہم ہوٹل سے نکل پڑے۔ شین یا اپنے ساتھ تائی جو کی کار لے آئی تھی۔ یونہی باتوں کے دوران ہم لکڑی سے بنے ہوئے اس پگوڈے کے باہر والے دروازے تک آ پہنچے۔

کار پارکنگ میں لگا کر وہ دونوں ٹکٹ لینے کے لئے چل دیں۔ میں اردگرد کے ماحول کا جائزہ لینے لگی۔ مجھے لگا کہ وہ واٹ یا پگوڈا یا جو بھی تھا، سیاحوں کی کشش کے لئے بنایا گیا تھا، اس میں باقاعدہ عبادت نہیں ہوتی تھی۔ اس کا احساس مجھے باہر ہی سے ہو گیا۔ وہ ٹکٹ لے آئی تھی۔ تو میں نے شین یا سے یہی بات پوچھی تو کہنے لگی۔

''ازلی سچائی! کوئی بھید نہیں بلکہ روشن حقیقت ہے، جسے کوئی بھی انسان معلوم کر سکتا ہے۔ اسے کوئی تسلیم کرے یا نہ کرے، اس سے ازلی سچائی کو ذرا بھی فرق نہیں پڑتا۔ عبادت گاہیں اپنی جگہ بالکل ٹھیک ہیں۔ وہاں جا کر پوری توجہ سے عبادت کی جاتی ہے، لیکن ایسی جگہیں جہاں ازلی سچائی کے بھید کو پانے کی خواہش من میں ابھرے، میرے خیال میں وہ عبادت سے کم نہیں۔''

ہم چلتے ہوئے گہرے درختوں کی چھاؤں میں

لکڑی سے بنے ہوئے بینچ کے پاس آن ٹھہرے۔ وہ میری جانب متوجہ تھی۔ تب میں نے کہا۔

"اس دنیا ہی کی نہیں، اس پوری کائنات کی ازلی سچائی وہ ہے، جس نے یہ سب کچھ تخلیق کیا اور پھر اس کا نہ صرف نگہبان ہے بلکہ اس سارے نظام کو چلا بھی رہا ہے۔ یہاں تک کہ مادی وجود کے چھوٹے سے چھوٹے ذرّے سے لے کر غیر مادی احساس تک، اس کی رسائی ہے اور یہی اس کا ثبوت ہے۔"

"آف کورس، یہ تمہارے خدا کے بارے میں تمہارا نظریہ ہے۔ میں اس کے قطعاً اختلاف نہیں کر سکتی اور نہ ہی کرنا چاہیے۔ میں کہانیوں، روایتوں اور گھڑی ہوئی باتوں پر یقین نہیں رکھتی، بدھا کے بارے میں بھی بہت کچھ کہا گیا، لیکن اسے عقل تسلیم نہیں کرتی، یہ کیسے ممکن ہے کہ ہر مادی ذریعے اور غیر مادی احساس تک کو وہ قوت دیکھ رہی ہے لیکن ہمیں اس کا احساس تک نہیں۔ اصل میں یہ مذہب کی تشکیل میں جو کہانیاں یا دوسرے لفظوں میں مائتھالوجی ہوتی ہے وہ ایک خاص قسم کا فلسفہ ہوتا ہے۔ جس کی بنیاد میں انسانی ذہن کو اپنے حصار میں لے لیا جاتا ہے اور اپنے من پسند خیال اس میں ٹھونس دیئے جاتے ہیں۔ اب جیسے انڈین مائتھالوجی میں کیسی عجیب و غریب کہانیاں ہیں۔ جو کسی بھی کسوٹی یا معیار پر پورا نہیں اترتیں۔" وہ اپنی رو میں کہتی چلی گئی تھی مگر میں نے اسے ذرا سا بھی نہ ٹوکا بلکہ انتہائی تحمل سے اس کی بات سنتی رہی۔

"اصل میں تم ایک ہی سانس میں بہت ساری باتیں کہہ گئی ہو۔ میں تمہارے خیالات کو رد نہیں کرتی، میں تمہارے خیالات کا پورا پورا احترام کرتی ہوں۔ مجھے اس سے انکار نہیں ہے لیکن کسی بھی چیز کو پرکھنے کے لئے کوسوٹی یا معیار تو ہوتا ہے نا۔ آخر کسی پیمانے پر کوئی چیز پرکھی جاتی ہے نا؟"

"بالکل، معیار یا پیمانہ تو ہوتا ہے۔" اس نے کہا

"کیا میں جان سکتی ہوں کہ وہ پیمانہ یا معیار کیا ہو سکتا ہے۔" میں نے اس کی جانب دیکھتے ہوئے کہا، پھر اس کی طرف سے کچھ کہنے کا انتظار کیے بغیر کہا۔ "اور دوسری بات، یہ حقیقت ہے کہ دنیا میں ہر طرح کے نظریات، افکار اور فلسفے موجود ہیں۔ سبھی سچائی کا دعویٰ کرتے ہیں۔ لیکن بات پھر وہیں آ جاتی

خزانہ معلومات

⌘ برصغیر کے پہلے اردو اخبار کا نام جہاں نما ہے۔

⌘ آزاد نظم کی ابتدا پہلے فرانس سے ہوئی۔

⌘ جاسوسی کہانیوں کی ملکہ ادیبہ اگاتھا کرسٹی کو کہتے ہیں۔

⌘ دہلی کا پہلا اردو اخبار "اردو اخبار" کے نام سے 1837ء میں شائع ہوا۔

⌘ دہلی کے سب سے پہلے اردو ماہنامہ کا نام "ماہنامہ زبان" تھا۔

⌘ اردو کا سب سے پہلا ناول "مراۃ العروس" ہے۔

⌘ علامہ اقبال کا پہلا مجموعہ کلام بانگ درا 1924ء میں شائع ہوا۔

⌘ اردو کی سب سے پہلی تنقیدی کتاب مقدمہ شعرو شاعری ہے۔

⌘ اردو کی سب سے پہلی ناول نگار خاتون "رشید النساء بیگم" ہیں۔

⌘ اردو کے پہلے جاسوسی ناول نگار "ظفر عمر" تھے۔

⌘ دنیا کی سب سے پہلی کتاب 1457ء میں شائع ہوئی۔

⌘ پاکستان میں سب سے پہلا سفرنامہ بیگم اختر ریاض الدین نے لکھا۔

امجد حسین بابر.....فیصل آباد

ہے کہ وہ کونسا معیار ہے جس پر کسی بھی نظریے، فکر یا فلسفے کی سچائی کو پرکھ سکیں۔“

”یہ ناممکن ہے کہ ہم اپنے طور پر کوئی معیار بنائیں اور وہ ٹھیک ہو۔“ وہ بولی۔

”اس کی وجہ؟، ہم ایسا کیوں نہیں کر سکتے؟“ میں نے پوچھا۔

”ہم ہر طرح کے علم پر عبور نہیں رکھتے، بلکہ اپنے وجود تک کا ادراک نہیں ہے ہمیں۔ لیکن جب بھی ہم کسی بھی نظریے کو دیکھتے ہیں، اسے پرکھتے ہیں تو آخر میں کچھ نہیں ہوتا، سوائے چند نفسیاتی اصولوں اور خوفزدہ کر دینے والے خیالات کے۔“ اس نے میری جانب دیکھتے ہوئے کہا۔

”شین یا! دراصل تم تک حقیقت پہنچی ہی نہیں اور نہ ہی تم نے کوشش کی ہے تمہارے تمام تر خیالات و نظریات کی بنیاد وہ سب کچھ ہے جو تم تک زبردستی پہنچتا رہا ہے یا تم اپنے طور پر سوچتی رہی ہو۔ کچھ ایسا مسئلہ ہم انسانوں کے ساتھ ہے جو خود حقیقت تک پہنچنے کی کوشش نہیں کرتے بلکہ سنی سنائی باتوں پر یقین کر لیتے ہیں۔“ میں نے اس کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

”کیا ایسا ہر مذہب کے ماننے والے کے ساتھ ہوتا ہے؟“ اس نے پوچھا۔

”میں اس پر ایک لفظ بھی نہیں کہوں گی کیونکہ میں کسی کا رد نہیں کرتی، لیکن حقیقت کے سامنے آجانے کے بعد، روشنی میں ہر بندہ خود اندازہ لگا سکتا ہے کہ وہ کہاں کھڑا ہے۔“ میں نے صاف لہجے میں کہا۔

”کیا تمہارے پاس ازلی سچائی تک رسائی کا کوئی طریقہ ہے؟“ شین یا نے پوچھا۔

”ہاں! تم جس راستے پر بھی چلو، میں تمہیں اسی راستے پر چلتے ہوئے ازلی سچائی تک لے چلوں گی۔ وہ راستہ سائنس کا ہو، فلسفے کا ہو یا کوئی بھی مذہبی حوالہ ہو۔“ میں نے دل ہی دل میں اللہ سے توبہ استغفار کرتے ہوئے کہا۔ وہ لمحہ ہی ایسا تھا جہاں میں کمزور انداز میں بات نہیں کر سکتی تھی۔ اس کے سامنے مجھے پورے اعتماد سے کہنا تھا لیکن اپنی کم مائیگی کا احساس بھی تھا۔

”سائنس کا راستہ ٹھیک ہے، مذہبی حوالے یا فلسفہ بہرحال اپنی پسند ناپسند پر استوار ہوتا ہے کیا تم اس کے ذریعے مجھے ازلی سچائی تک پہنچا سکتی ہو؟“ شین یا نے آنکھیں پٹپٹاتے ہوئے دلچسپی سے پوچھا۔

”کیوں نہیں؟“ میں نے اسے یقین دلایا۔

”تو ٹھیک ہے، ہم اس پر بات کریں گے۔ فی الحال تو آؤ اندر چلیں، تمہیں شاہکار دکھاؤں۔“ شین یا نے آگے بڑھتے ہوئے کہا تو ہم بھی اس کے ساتھ میں چل دیں۔

ایک سو پانچ میٹر اونچے ”سینکچری آف ٹرتھ“ کو تھائی زبان میں جو بھی کہا جاتا ہوگا تاہم اردو میں اس کا ترجمہ یہی ممکن ہے ”سچائی کی مقدس جگہ۔“ لکڑی سے بنے اس پگوڈا نما مندر کے بارے میں شین یا بتاتی چلی گئی۔ اس کے بارے میں شین یا نے بہت کچھ بتایا۔ تاہم مجھے اتنی ہی سمجھ آ سکی کہ سرد جنگ کے بعد سے دنیا بہت تیزی کے ساتھ مادیت پرستی کی جانب مائل ہونا شروع ہوگئی اور ہنوز اس میں ترقی آتی چلی جا رہی ہے۔ ہر انسان مادیت پرستی کے اس رجحان کو اولیت دیتا ہوا دکھائی دیتا ہے۔ یہ صورتِ حال جو بھی ہے اور جیسی بھی ہے اس میں یہ محسوس کیا گیا کہ وہ اقدار اور روایات جن میں روحانیت کا عنصر پوری طرح شامل ہوتا ہے وہ دھیرے دھیرے مفقود ہوتی چلی جا رہی ہیں۔ انہی روایات کو زندہ رکھنے اور اگلی نسلوں تک منتقل کرنے کے لیے یہ مقدس جگہ تعمیر

کی گئی تھی۔ تا کہ اپنی روایات کو جو بہرحال اس قوم کی سچائی ہے انہیں محفوظ کرنے کے علاوہ اس کے احساس کو دوسروں تک منتقل کیا جائے۔ اسے مقدس جگہ اس لیے کہا گیا ہے کہ یہاں ہر قوم کا ضمیر اور اس کی اصل سچائی ظاہر کی گئی تھی۔ اس میں مذہبی اور سماجی روایات کو مدنظر رکھا گیا تھا جو مشرقی فلسفے کو ظاہر کرتی تھی۔ اس کی تعمیر، ایک تھائی ارب پتی لیک ولریا پھائی نے شروع کروائی تھی جو اپنی تہذیب، روایات اور انداز سے عشق کرتا تھا۔ 1981ء سے بنائی جانے والی یہ عمارت ابھی تعمیر ہو رہی ہے جس میں فقط لکڑی ہی استعمال ہو رہی ہے، جس کے بارے میں یہ امید کی جا رہی ہے کہ 2025ء تک مکمل ہو جائے گی۔

میں نے وہاں مجسموں کے انداز اور ان کے اسٹائل سے جب یہ اندازہ لگایا کہ اس میں ہندو دیوتاؤں کا پرتو بھی دکھائی دیا ہے تو شین یا نے بتایا کہ یہ انڈیا، چین، کمبوڈیا اور تھائی لینڈ کی مائتھالوجی کو سامنے رکھ کر ڈیزائن کیا گیا ہے۔ اس پگوڈا کی ساخت بھی ایسی ہی تھی اس کے چار کونے تھے۔ میں خاموشی سے اس پگوڈا کے اندر پھرتا رہا، جس میں اپنے طور پر مشرقی تہذیب اور مائتھالوجی کی روایات کو سمونے کی کوشش کی گئی تھی۔ میں اس پر کوئی فیصلہ نہیں دے سکتی تھی کہ آیا وہ مکمل طور پر کامیاب رہے ہیں یا نہیں کیونکہ میں اس کے بارے میں پوری طرح نہیں جانتی تھی اور نہ ہی مجھے جاننے کی ضرورت تھی۔ لہٰذا! میں شین یا کے ساتھ قدم سے قدم ملا کر چلتی رہی۔ نینا کو بھی اس میں خاصی دلچسپی محسوس ہوئی۔ یہاں تک کہ ہم نے پگوڈا اندر اور باہر سے دیکھ لیا۔

اس کے اطراف میں ایک جانب سمندر تھا، جس کی لہریں پگوڈے سے کافی دور پڑے پتھروں سے ٹکرا کر واپس چلی جاتی تھیں، اس کے ساتھ ساتھ اور آس پاس گھنے درخت اور سبزہ تھا جو ایک پارک کی صورت دکھائی دے رہا تھا۔ جب ہم تھک گئیں تو واپس اس پارک میں ایک بنچ پر آ بیٹھیں، تبھی اس نے چونکتے ہوئے کہا۔

''ہاں! ایک بات میں تمہیں بتانا بھول گئی۔ اس میں تخلیق کے ان سات عوامل کو بھی پیش کیا گیا ہے جن کے بغیر انسان پیدا نہیں ہو سکتا۔''

''کون سے؟'' میں نے پوچھا تو اس نے چند لمحے سوچا اور پھر بولی۔

''جنت، زمین، باپ، ماں، چاند، ستارے اور سورج...... ان سات تخلیقی عوامل کو بھی اس میں جگہ دی گئی ہے۔'' اس نے کہا تو میں مسکرا دی۔

''گرلز اب واپسی کی تیاری کرو، ایک تو بھوک لگ گئی ہے، دوسرا ماریہ انتظار کر رہی ہوگی۔ ایک بج گیا ہے۔'' نینا نے احساس دلایا تو ہم واپسی کے لئے چل پڑیں۔

☆......☆......☆

ماریہ ہمارے انتظار میں بیٹھی ہوئی دوسری شرکاء سے باتیں کر رہی تھی۔ ہم نے جاتے ہی لنچ کیا اور وہاں سے کمرے میں آ گئیں۔

''ابھی میں نے ایک دوست سے سنا ہے کہ یہاں ایلیفنٹ ولیج ہے۔ وہاں کافی مزہ ہے، جانا چاہو گی وہاں تم دونوں؟'' ماریہ نے ہم دونوں سے پوچھا تو میں نے شین یا کی طرف دیکھ کر کہا۔

''تمہیں معلوم ہے یہ کہاں ہے؟''

''بالکل، میں سارے پتایا کے بارے میں ایک ایک چیز جانتی ہوں، یہی میرا جاب ہے۔'' اس نے مسکراتے ہوئے بتایا۔

''چلو چلیں، لیکن ہم شام سے پہلے واپس آ جائیں گے، اس کے بعد میں تم لوگوں کو بہت اچھی

چیز دکھانا چاہوں گی۔'' ماریہ نے تجسس چھوڑتے ہوئے کہا۔

''کیا ابھی بتا سکتی ہو؟'' نینا نے پوچھا۔

''نہیں، یہ بعد میں۔'' ماریہ نے کہا اور اٹھ گئی۔

تقریباً آدھے گھنٹے میں ہم ہاتھی گاؤں پہنچے جو سیام کنٹری کلب کے عقب میں واقع تھا۔ بانسوں سے بنے ہوئے ہال کمرے کے باہر براؤن رنگ کے تختے پر زرد رنگ سے تھائی اور انگریزی میں لکھا ہوا تھا۔ ہم اس ہال میں چلے گئے۔ جہاں سے ٹکٹ لیا گیا۔ وہاں اور بہت سارے سیاح آئے ہوئے تھے۔ شین یا وہاں کے بارے میں بتانے لگی۔

''یہ ہاتھی گاؤں 1973ء میں ہاتھیوں کی دیکھ بھال کے لئے بنایا گیا تھا۔ یہاں تقریباً تیس ہاتھی ہیں اور ہزاروں کام کرنے والے کارکن، یہاں ہاتھی کسی کو نقصان نہیں پہنچاتے، ہاتھی پر سواری دو طرح کی ہے......'' اس نے ہمیں کافی کچھ بتایا۔ ہم نے وہاں سے ٹکٹ لئے اور اس پلیٹ فارم پر آ گئے، جہاں سیر کے لئے ہاتھی پر سوار ہوا جاتا تھا۔ ہاتھی پر دو افراد ہی بیٹھتے تھے اور تیسرا مہاوت تھا۔ پہلے ماریہ اور نینا اور پھر شین یا اور میں دوسرے ہاتھی پر بیٹھ گئیں۔ ہاتھی چل دیا۔ انہی ہچکولوں کے درمیان ہم باتیں کرنے لگے۔

''یہاں آ کر مجھے لگا کہ لوگ ہاتھی کی بہت دیکھ بھال کرتے ہیں۔'' میں نے یونہی باتوں کی ابتداء کی۔

''بس یہ تھائی روایات میں اس کی اہمیت ہے اور وہ بھی جنگی حوالے سے۔ اب جبکہ دنیا بدل چکی ہے، ہاتھی کی اہمیت یہی کھیل تماشے کی سی رہ گئی ہے۔ ہم جو آج بھات خرچ کر کے ہاتھی پر سواری کر رہے۔ کوئی وقت تھا، عام آدمی ایسے تجربے سے نہیں گزر سکتا تھا۔ یہ زمانے کی ترقی ہے کہ جو سہولیات کبھی بادشاہوں، شہنشاہوں یا شہزادیوں کو حاصل تھی، وہ آج ایک عام آدمی کو بھی حاصل ہے۔'' اس نے مسکراتے ہوئے کہا۔

''یہ ایک فطری امر ہے شین یا، وقت کے ساتھ ساتھ شعور بڑھتا ہے، زمانے کے انداز و اطوار بدلتے ہیں، رہن سہن سے لیکر خیالات تک میں تبدیلی آتی ہے۔ یہی تبدیلی ہی تو آگے ہی آگے لئے جا رہی ہے۔'' میں نے ہلکورے لیتے ہوئے کہا۔ تب چند لمحے خاموش رہنے کے بعد وہ بولی۔

''کوئی چیز ایسی بھی ہے جو نہیں بدلتی۔'' اس کا لہجہ ایسا تھا کہ جیسے وہ بہت سوچ کر بات کر رہی ہے۔

''ہاں ہے! اور وہ ہے حق و باطل کی کشمکش۔ یہ ازل سے ہے اور ابد تک رہے گی، اس کشمکش میں زندگی ہے، قوموں کا عروج و زوال بھی ہے۔'' میں نے کہا تو وہ بولی۔

''یہ حق و باطل کیوں؟'' شین یا نے پوچھا۔

''تاکہ وہ کردار پیدا ہو سکے جو خدا چاہتا ہے۔ اچھائی اور برائی ہونے ہی سے کردار واضح ہوتا ہے، اس کے علاوہ کوئی اور صورت ہی نہیں ہے۔ اگر دنیا سے مل کر برائی ختم کر دی جائے تو اچھائی کے کردار کا تصور ہی بے معنی ہو جائے گا۔ اب دنیا میں تم دیکھ رہی ہو کہ جو کچھ بھی ہو رہا ہے، کیا اس میں انسان کے اپنے اعمال نہیں ہیں کہ دنیا امن کا گہوارہ نہیں رہا۔ اہل باطل طرح طرح کے ہتھکنڈوں سے حق کی قوتوں کو ختم کرنے کی تگ و دو میں ہیں۔ یہ انسانی اختیار ہے جسے منفی طریقے پر استعمال کیا جاتا ہے۔ ان ہتھکنڈوں کے مختلف نام رکھے ہوئے ہیں، ان میں مغربی طرز جمہوریت سب سے بڑا جھوٹ ہے، جہاں ایک طرف یہ کہا جاتا ہے کہ جمہوریت کا مذہب سے کوئی تعلق نہیں اور حلف بائیبل پر لیتے ہیں؟

انسانیت کے ساتھ کتنا بڑا مذاق ہے۔ جس نظام کی بنیاد ہی منافقت پر ہے وہ انسانیت کی فلاح کیا چاہے گا۔" میں کسی قدر جذباتی لہجے میں کہا تو اس نے میرا دھیان بٹانے کے لئے پائن ایپل کے درختوں کی جانب اشارہ کیا۔

"دیکھو۔ وہ کتنے خوبصورت لگ رہے ہیں۔"

"بالکل یہ فطرت ہمیشہ سے ہی خوبصورت رہی ہے، ہم انسان ہی اسے برباد کرنے پر تلے ہوئے ہیں۔" میں نے کہا تو انہی لمحوں میں مہاوت نے ہاتھی کو ایک چھوٹی سی ندی میں ڈال دیا اور پانی کا شور ہونے لگا۔ اس کے ساتھ ہی ہلکورے ذرا کم ہوئے تو سکون سا محسوس ہوا۔ تب میں نے شین پا سے کہا "اس مہاوت سے پوچھو، ابھی کتنی دیر تک یونہی سفر میں گزرے گا؟"

"کیوں تمہیں اچھا نہیں لگ رہا۔" اس نے پوچھا پھر ہنستے ہوئے بولی۔" تصور کرو اس وقت کا جب ہاتھیوں پر بیٹھ کر جنگیں لڑی جاتی تھیں۔ لوگ شاہانہ انداز میں اس پر سفر کرتے تھے۔ وہی تجربہ تمہیں ہو رہا ہے تو تمہیں اچھا نہیں لگ رہا ہے۔"

"اگر تم انجوائے کر رہی ہو تو میں صبر کر لیتی ہوں، ورنہ......" میں نے اپنا فقرہ ادھورہ چھوڑ دیا تو اس نے مہاوت سے پوچھا، وہ معلومات دیتا رہا تو شین پا نے مجھے بتایا۔ "تقریباً ایک گھنٹے کا سفر ہے، جس میں ابھی صرف بیس منٹ ہی گزرے ہیں، اس راستے میں دیہاتی علاقے، پائن ایپل اور ربر کے درختوں کے درمیان سے ہوتے ہوئے سلک بنانے والے کارخانے سے قریب سے گزریں گے، چاولوں کے کھیت بھی ہوں گے اور بہت کچھ ہوگا۔" اس نے ایک خاص طرح سے مسکراتے ہوئے کہا۔

"اور کچھ سے کیا مراد ہے؟"

"وہی جو تنہائی میں جوڑے کرتے ہیں۔" یہ کہہ کر وہ ہنس دی۔ میں سوچنے لگی کہ یہ شین پا بالکل ہی پرو فیشنل ہے۔ وہ اپنے کلائنٹ کے مزاج کے مطابق باتیں کرتی ہے۔ اس میں اس کے جذبات، احساسات اور نظریات کا کوئی تعلق نہیں۔ اس وقت وہ مجھے بالکل بے ضرر لگی۔ ایک گھنٹے سے زیادہ وقت گزر گیا تھا۔

مہاوت نے پھر سے ہاتھی کو ندی میں اتار دیا تھا، شاید وہ اب واپسی کے سفر میں تھا، یہاں تک کہ ہم واپس اس چبوترے پر آ گئے جہاں سے چلے تھے۔ وہیں سے ہم ایک ہال میں چلے گئے، جہاں لکڑی کی بنچ اور میز پر بیٹھ کر موسمی پھل کھائے اور چائے پی۔ سبھی کے موڈ خوشگوار تھے۔

"بس یہی کچھ تھا یہاں پر؟" نینا نے پوچھا تو سین پا نے بتایا۔

"نہیں! یہاں ہاتھی شو بھی ہوتا ہے اگر وہ آپ دیکھنا چاہیں۔"

ہم نے اس شو کو دیکھنے کا فیصلہ کیا۔ لکڑی سے بنے اس ہال میں بیٹھے ہم ماحول وغیرہ کے بارے میں باتیں کرتے رہے۔ یہاں تک کہ ہاتھی شو کا وقت ہو گیا اور ہم اس جانب بڑھ گئے۔

ہاتھی گاؤں سے واپسی پر ہم باہر نکل رہے تھے تو ماریہ نے کار میں بیٹھتے ہوئے بتایا۔

"اب ہم جائیں گے، پتایا کی مشہور اور مصروف جگہ اور وہ ہے واکنگ سٹریٹ۔"

"جی، وہ دیکھنے کی جگہ ہے۔" میری توقع کے مطابق اس نے اس جگہ کی تعریف کر دی۔ ہم پتایا کی جس جگہ کا بھی ذکر کرتے وہ اسی کی تعریف کرنے لگتی۔ یہ اس کی پیشہ ورانہ مہارت تھی۔ جسے ابھی وہ سیکھ رہی تھی۔ وہ ہمیں ہاتھی گاؤں سے شہر کے مختلف

حصوں میں سے لے کر "بالی ہائی پھیر" کے علاقے میں آ گئی۔ ایک مصروف پارکنگ میں اس نے کار کھڑی کی۔ ہم باہر نکل آئیں تو اس نے کہا۔

"اگرچہ یہ شہر کا محفوظ ترین علاقہ ہے لیکن یہاں پر جیب تراشی کے مسئلے کو حل نہیں کیا جاسکا، اس لیے بہت محتاط رہنا۔ یہاں پر گوگو بارز، نائٹ کلب، بیئر بار اور وہ سب کچھ جو ایک مرد اپنی تسکین کے لیے چاہتا ہے، وہ سب موجود ہے۔" اس نے یوں خاص انداز میں کہا جیسے وہ ہمارا تجسس ابھار رہی ہو۔ میں اندازہ لگا سکتی تھی کہ وہاں کیا کچھ ہوسکتا ہے یا مجھے کیا دیکھنے کو ملے گا۔ چونکہ ماریہ خاص طور پر یہ "واکنگ اسٹریٹ" دیکھنے آئی تھی، سو میں خاموش رہی۔

واکنگ اسٹریٹ میں داخل ہوتے ہی رنگوں بھری روشنیوں سے آنکھیں چکا چوند ہونے لگیں۔ وہاں یوں دکھائی دے رہا تھا کہ سارا پتایا ہی یہاں اُمڈ آیا ہے اور یہاں ابھی کچھ دیر پہلے دن چڑھا ہے۔ انہی لمحات میں شین یا میرے ساتھ چلنے لگی۔ کچھ قدم چلنے کے بعد بولی۔

"تم دیکھ نہیں رہی ہو یہاں قدم قدم پر لڑکے اور زیادہ تر لڑکیاں کھڑی ہیں، جن کا "عصمت فروشی" دھندہ ہے۔ اس گلی کے آخر تک یہ سب دیکھنے کو ملے گا۔ اس کے علاوہ یہاں پر ایک اور بہت بڑا دھوکا ہے اور وہ ہیں لیڈی بوائے، وہ ہیں تو مرد لیکن عورت دکھائی دیتے ہیں، وہ دیکھو!" اس نے ایک جانب کھڑے ہیجڑوں کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا تو میں ہنس دی۔

یہ مخلوق بھی شاید پوری دنیا میں پائی جاتی ہے۔ اس نے سچ کہا تھا، بھانت بھانت کے لوگ تھے، مختلف ملکوں اور قوموں سے تعلق رکھنے والے، دعوت گناہ دیتی بے لباس لڑکیاں کسی متوقع گاہک کی تلاش میں انتہائی مختصر لباس میں عورتیں، اسٹور، کھانے پینے کی دکانیں، زندہ اور تعفن زدہ گوشت بکنے کے لیے تیار تھا، میں انہیں دیکھتی رہی، ان لمحات میں مجھے دو لوگ بہت یاد آئے، ایک ساحر لدھیانوی جس کی نظم ہے، "ثنا خوانِ تقدیسِ مشرق کہاں ہیں؟" وہ نظم مجھے اپنے کچھ ٹکڑوں سمیت یاد آنے لگی اور دوسرا افسانہ نگاری کا امام سعادت حسن منٹو، جو اگر یہاں ہوتا تو شاید اسے اپنا معاشرہ بہت پردہ دار معلوم ہوتا۔ اس کے ہاں مجبور طوائف پائی جاتی ہے، لیکن یہاں ایک نگاہ دیکھنے کے بعد اسے اپنے خیالات میں ضرور تبدیلی کرنا پڑتی، وہ جو مشرق کو خالص انداز میں دیکھنا چاہتا تھا، اس پر کچھ اور ہی ملمع کاری ہو چکی تھی، جس کا میں مشاہدہ کر رہی تھی، یورپ، جس نے خاص طور پر صلیبی جنگوں کے بعد پوری دنیا کی ثقافت اور مذہب تبدیل کرنے کے لیے "عظیم کھیل" کا منصوبہ بنایا ہوا ہے۔ یہاں اِن لوگوں نے مزاحمت نہیں کی تو اس کا اظہار گلیوں اور بازاروں میں کھڑی ننگی عورتیں دعوت نگاہ دے رہی ہیں۔ لیکن جہاں مزاحمت ہوئی، وہاں پر آگ اور بارود ہے۔ کوئی بھی مسلمان اپنی خواتین کو یوں نہیں دیکھ سکتا جس طرح یورپ والے عورت کو بنانا چاہتے ہیں۔ ان کے ہاں تو یہ بھی نہیں معلوم کہ ان کا باپ کون ہے؟ یا وہ کس کی اولاد پیدا کر رہی ہیں۔ افسوس تو اس بات کا ہے کہ جنہیں اپنی نسل کی شناخت نہیں وہ دنیا کا کلچر تبدیل کرنے کی کوشش میں ہیں۔

"اے آلیشبہ! کہاں کھو گئی ہو؟" نینا نے مجھے جھنجوڑا تو میں اپنے خیالات سے باہر آ گئی۔

"کہیں نہیں، بس یہ دیکھ رہی تھی۔" میں نے ارد گرد اشارہ کرتے ہوئے کہا تو وہ مجھے لیتی ہوئی ایک

بار کی جانب بڑھ گئی۔

"کوئی واکنگ اسٹریٹ آئے اور وہ ایک آدھ پیگ نہ لگائے، ایسا نہیں ہو سکتا۔ کیا میں ایک آدھ پیگ لگا سکتی ہوں۔" شین یا نے ماریہ سے کہا تو اس نے ہماری طرف دیکھا۔ نینا نے کاندھے اچکا دیئے تو وہ میرا ہاتھ پکڑ کر ایک بار میں داخل ہو گئی۔

اندر بہت شور تھا، بہت سارے لوگ تھے، ننگ دھڑنگ مرد و عورتیں جو دوسرے لوگوں سے بے نیاز تھے۔ ہم بھی ایک میز کے گرد بیٹھ گئیں۔ فوراً ہی ایک ویٹرس ہمارے سر پر آدھمکی تو شین یا نے بیئر کا آرڈر دے دیا۔

"یہ الکحل والی ہوں گی یا بغیر الکحل کے؟" میں نے پوچھا۔

"بغیر الکحل کے پینے کا کیا مزہ، کیا تم شراب نہیں پیتے ہو؟" اس نے انتہائی حسرت سے کہا۔

"نہیں ہم نہیں پیتے۔" میں نے مسکراتے ہوئے کہا۔ "لیکن اگر تم پینا چاہو تو میں منع نہیں کروں گی۔"

"اوہ یار! تم لوگ زندگی کس طرح گزارتے ہو، یہاں ہم مزے اور لطف کے لیے آتے ہیں اور تم بالکل کسی مونک کی مانند ہو۔ بالکل بھی انجوائے نہیں کر رہی ہو۔" وہ جھنجلاتے ہوئے بولی۔

"تم انجوائے کرو، میں تمہیں تو منع نہیں کر رہا۔" میں نے کہا تو وہ چونکتے ہوئے بولی۔

"نہیں، میں بھی نہیں پیوں گی۔ میں اس وقت کام پر ہوں۔"

"چلو جو تم نے منگایا ہے، وہ پی لو۔" ماریہ نے کہا تو وہ پاس کھڑی ویٹرس کو سادہ سوڈا لے آنے کا آرڈر دے دیا۔

کچھ دیر بعد ہم بار سے نکل آئے۔ مجھے وہ جگہ اچھی نہیں لگ رہی تھی۔ اس کی وجہ یہ نہیں کہ وہاں جنس کا بازار تھا یا عام دعوت گناہ تھی۔ وہاں کے مرد بھی اسی کام میں ان کے شانہ بشانہ کھڑے تھے۔ مجھے وہاں سے گھن آ رہی تھی۔ ماریہ تو بڑے مزے سے وہاں کی لڑکیوں سے باتیں کر رہی تھی جو خود کو طوائف نہیں بلکہ "سیکس ورکر" زیادہ کہنے پر فخر محسوس کر رہی تھی۔ مجھے اس پر اعتراض نہیں تھا کہ وہ قوم اپنی عورتوں کے ساتھ کیا کرتی ہے، بلکہ میں سوچ رہی تھی کہ وہ انسانیت کے دائرے ہی میں ہیں، یا حیوانیت کے دائرے میں جا پہنچے ہیں۔

ہم واکنگ سٹریٹ سے باہر نکل آئے تھے۔ تب مجھے پتہ چلا کہ ہم ایک طرف سے آئے ہیں اور دوسرے سرے پر آ گئے ہیں۔ وہاں سے دور کہیں پر سرخ نیون سائن میں بڑے بڑے حرفوں میں پتایا لکھا ہوا تھا۔ سامنے سمندر تھا۔ اس میں چھوٹی بڑی کشتیاں کھڑی تھیں۔

"یہ کون سی جگہ ہے؟" میں نے شین یا سے پوچھا

"بولی ہائی پیر ہی ہے۔" یہ کہہ کر اس نے یوں کہا جیسے اسے اچانک یاد آ گیا ہو۔ "دراصل یہیں قریب ہی ایک جزیرہ ہے۔ کوہ لرن، یا دیگر جزیروں کے لیے یہاں سے کشتیاں جاتی تھیں۔"

"وہ جزیرہ تو ضرور دیکھنا چاہئے۔" نینا نے ایک دم سے خواہش کا اظہار کیا۔

"ابھی شام ہو چکی۔ وہاں دن میں جایا جاتا ہے۔ میں نے بھی دیکھنا ہے۔" ماریہ نے بتایا۔ تو کل کے لئے ہم نے وہاں جانے کا فیصلہ کر لیا۔ ہم وہاں سے ایک ویگن میں بیٹھ کر واپس اس جگہ آئے جہاں کار پاک کی تھی۔ پھر بیچ روڈ پر ہی ایک انڈین ریسٹوران میں ڈنر کے لئے جا بیٹھے۔

آرڈر دینے کے بعد ماریہ نے اپنی معلومات ہم سے شیئر کرتے ہوئے کہا۔

''یہاں سی فوڈ بھی ملتا ہے۔ مچھلی، سانپ مینڈک، جھینگے انہوں نے ایکیورم میں زندہ رکھے ہوتے ہیں۔اپنی پسند کا سانپ، مچھلی......''

''بکواس بند کرو۔'' نینا نے زور سے آنکھیں بند کر کے دھیمے لہجے میں کہا۔

''کیا ہوا؟'' وہ معصومیت سے بولی۔

''یہ بھی کھانا کھانے دے گی یا نہیں، آخر یہ بتا کر تم کیا ثابت کرنا چاہتی ہو۔'' نینا نے برا سا منہ بناتے ہوئے بولی تو ماریہ نے کہا۔

''یہی کہ تم سادہ ہی بری لگتی ہو، یا اس طرح منہ بناتے ہوئے۔''

اس پر میں تو ہنس دی جبکہ وہ خاموش ہو کر رہ گئی۔ کھانے کے دوران یہ فیصلہ ہو گیا کہ ابھی ہوٹل واپس نہیں جائیں گے۔ بلکہ تھائی ثقافتی شو دیکھیں گے۔

وہ ایک ایلگرین تھیٹر تھا۔ وہ شاید چون بوری کا علاقہ تھا۔ وہ ایک طرح سے کمپلیکس تھا، جس میں بچوں کے لئے ایک ونڈر لینڈ بنایا ہوا تھا، شاپنگ سنٹر اور ریستوران بھی تھا۔ تھیٹر ہال کافی بڑا تھا۔ تقریباً دو گھنٹے تک وہ شو چلتا رہا۔ اس میں کہانی جو بھی تھی، لیکن مجھے اس میں جدید تکنیک میں رنگ دار روشنیوں کا استعمال بہت اچھا لگا تھا۔ وہاں اسٹیج پر ہاتھیوں سمیت جنگ کے مناظر دکھائے گئے۔ تھائی ڈانس تھا۔ اور بہت کچھ۔ شین یا نے بتایا تین ایکٹ کے اس شو میں پرانی تھائی تہذیب کو دکھانے کی کوشش کی گئی تھی۔ تھائی آرٹ اور ثقافت کے نمونے، علاقائی عکاسی اور جدید تھائی لینڈ کے بارے میں اظہار وغیرہ۔ بہر حال جو بھی تھا، اچھا تھا۔ شین یا ہمیں ہوٹل چھوڑ کر چلی گئی۔

☆......☆......☆

اگلے دن ماریہ کا سیشن گیارہ بجے کے قریب ختم ہو گیا۔ ان کی اختتامی تقریب رات کے وقت ہونا تھی، جس میں انہوں نے سٹی میئر کے علاوہ کوئی اعلیٰ حکومتی شخصیت کو بلایا ہوا تھا۔ اگر ہم نے کہیں جانا تھا تو شام سے پہلے واپس لوٹنا بھی تھا۔ تقریباً اسی وقت شین یا بھی آ گئی۔ ناشتے کے دوران اس نے ہمیں بتایا کہ کوھ لرن تک کیسے جانا ہے۔ شین یا نے اپنی کار میں ہمیں بٹھایا اور سیدھے بولی ہائی پیر جا پہنچے۔

ساحل پر سے دور اندر سمندر تک جیٹی بنی ہوئی تھی، جس کے سرے پر کشتیاں کھڑی تھیں۔ ہم پیدل ہی وہاں تک پہنچے۔ شین یا اور نینا ٹکٹ لینے چلی گئیں۔ میں نے ارد گرد دیکھا۔ وہاں کی خاص بات یہی تھی کہ سامنے بڑے بڑے نیون سائیں میں پہاڑی پر پتایا لکھا ہوا تھا۔ یقیناً یہ وہی تھا جو رات کے وقت جگمگا رہا تھا۔ وہ ٹکٹ اور ماریہ کھانے پینے کو کافی کچھ لے آئی۔ ماریہ کے پاس ایک چھوٹا بیگ تھا۔ میں پوچھ ہی نہ سکی کہ اس میں کیا ہے۔ ہم کشتی کی جانب بڑھے، جہاں پہلے بھی کچھ سواریاں تھیں۔ بڑی آرام دہ رنگین کرسیاں جمائی گئی تھیں۔ ہم وہیں بیٹھ گئیں۔

''وہاں کی خاص بات کیا ہے شین؟'' میں نے بیٹھتے ہی پوچھا۔

''سفید ریت، شفاف پانی، چاہو تو شور شرابا اور چاہو تو پرسکون جگہ۔'' اس نے کہا۔

''میں سمجھی نہیں؟'' میں نے یونہی بات بڑھانے کے لئے پوچھا۔

''خود ہی دیکھ لینا۔'' یہ کہہ کر وہ خاموش ہو گئی۔ تھوڑی دیر تک یونہی بیٹھی رہی پھر میری بوریت کا احساس کرتے ہوئے کہنے لگی، ''کوھ لرن تھائی زبان میں شفاف ساحل کو کہتے ہیں کیونکہ وہاں کا پانی بہت شفاف ہے۔ وہ جزیرہ سات کلو میٹر لمبا اور تقریباً دو کلو

میٹر چوڑا ہے۔ بہت سرسبز، جنگل نما، شور شرابا چاہو گے تو ساحل پر ہر طرح کی سپورٹس ہے، سکون چاہو گے تو جنگل میں چلے جاؤ، اس جزیرے کے ہر جانب تقریباً چھ ساحل ہیں۔"

"کیا یہ قدرتی ساحل ہیں یا انہیں بنالیا گیا ہے؟" میں نے معلومات چاہیں۔

"ہماری نگاہ میں خوبصورتی اسے کہتے ہیں جہاں سے دولت ملے، جتنی زیادہ دولت اتنی زیادہ خوبصورتی، سو، قدرتی ہو یا مصنوعی، ہم نے دولت بنانے کے ذرائع پیدا کر لیے ہیں۔" اس نے کھوئے ہوئے لہجے میں کہا تو میں خاموش ہو گئی۔ مجھے لگا کہ آج شیین یا کچھ ڈسٹرب ہے۔ میں نے جزیرے پر جا کر اس کے بارے میں بات کرنے کا سوچا۔ کھڑی کشتی میں دیگر عورتیں اور مرد سوار ہو رہے تھے۔ ان میں مقامی باشندے کم اور ٹورسٹ زیادہ تھے۔ یہاں تک کہ کشتی چل پڑی اور ہمارے درمیان خاموشی بھی اتنی ہی گہری ہو گئی۔

پتایا کے ساحل سے چلے تھے تو بیچ سمندر میں سے بلڈنگیں، فائر ہاؤس اور بہت کچھ دھیرے دھیرے چھوٹا ہوتا گیا۔ اس طرح کوھ لرن جزیرہ واضح ہونے لگا۔ ویسی ہی ایک جیٹی وہاں پر تھی جو لکڑی سے بنی ہوئی تھی لیکن ہمیں تھوڑا دور اتارا۔ ہم چھوٹی کشتی میں سوار ہوئے اور پھر جیٹی تک جا پہنچے۔ وہاں سے چلتے ہوئے ہم ساحل کے اوپر سے جزیرے پر پہنچ گئے۔ تبھی شیین یا نے بتایا۔

"یہ نیا بان ساحل ہے۔ یہاں گاؤں بھی ہے اور ریستوران بھی۔"

ہم پیدل ہی آگے بڑھتے چلے جا رہے تھے۔ سامنے ہی سرخ چھت والا ایک ریستوران تھا۔ ہم اس میں جا بیٹھے۔ یخ ٹھنڈا سوڈا پینے کے بعد ہم جزیرے کی سیر پر نکل گئے۔

موسم بڑا خوشگوار ہو رہا تھا۔ تیز ہوا چل رہی تھی۔ بادل سورج سے آنکھ مچولی کھیل رہے تھے۔ اس دوران اگر دھوپ نکلتی تو وہ اچھی لگتی تھی۔ ماریہ اور نینا آگے آگے جا رہی تھیں اور میں اور شیین یا دھیرے دھیرے قدموں سے چلتی جا رہی تھیں۔ میرے ذہن میں تھا کہ اس سے پوچھوں کہ آج اس کا موڈ آف کیوں ہے، لیکن پھر مناسب وقت کے لئے چھوڑ دیا۔

ہمارے سامنے سفید ریت اور شفاف پانی والا ساحل تھا۔ جہاں پر رش تو نہیں لیکن لوگوں کی خاصی تعداد دکھائی دے رہی تھی۔ ماحول ایسا ہی تھا جیسے ان ساحلوں پر ہوتا ہے۔ لوگ انتہائی مختصر لباس میں تھے۔ کئی عورتیں تو محض ایک ہی دھجی میں تھیں۔ ساحل پر آتے ہی شیین یا نے کہا۔

"آلیشبہ! اس وقت کوئی فلسفہ نہیں، صرف انجوائے کرنا ہے۔ بولو کیا خیال ہے؟" وہ انتہائی بے چارگی سے بولی۔

"جس طرح تمہاری مرضی، میں تمہارے ساتھ انجوائے کروں گی۔" میں نے اس کی ہاں میں ہاں ملائی تو وہ ایک دم سے یوں خوش ہوئی جیسے بچے کو اپنا کوئی پسندیدہ کھلونا مل گیا ہو۔ وہ ایک جانب بڑھ گئی جہاں ادھیڑ عمر تھائی بیٹھا ہوا تھا، شیین یا نے چند نوٹ نکالے اور اسے دے دیئے۔ اس نے اشارے سے کرسیوں کی جانب اشارہ کیا جو وہاں ساحل پر موجود تھیں۔ میں سمجھ گئی کہ وہ انہی کرسیوں پر بیٹھنے کا کرایہ ادا کر کے آئی ہے۔ وہ ہمیں لیتی ہوئی ان کرسیوں پر آ بیٹھی۔ ماریہ اور نینا ساحل پر ایک طرف بڑھ گئیں تھیں۔ وہ ہم سے ذرا فاصلے پر تھیں۔

"یہاں سے ساحل کا نظارہ کرو، دیکھو لوگ کس

طرح مست ہیں۔'' اس کے لہجے میں حسرت تھی۔

''دیکھ رہی ہوں اور یہاں کی ہواؤں میں چھپے پیغام کو بھی سمجھنے کی کوشش کر رہی ہوں۔'' میں نے یونہی بات چھیڑ دی تو اس نے پوچھا۔

''تمہارے خیال میں کیا ہے پیغام ان میں؟''

''جدائی! بچھڑ جانے کا پیغام، لہر آتی ہے، ساحل سے ملتی ہے اور پھر پلٹ جاتی ہے۔ دیکھو لہر میں کتنا اضطراب ہے اور کتنی مستقل مزاجی۔'' میں نے لہروں کی جانب دیکھتے ہوئے کہا۔

''ایسا کیوں ہے؟'' وہ خواب آگیں لہجے میں بولی۔

''کیونکہ اس کی فطرت میں ایسا ہے، ہر شے کی اپنی فطرت ہے۔ یہاں تک کہ انسان کی بھی۔'' یہ کہتے ہوئے میں نے قہقہہ لگایا اور کہا۔ ''پھر تم کہوگی فلسفہ کہتی ہوں۔ اب میں مزید بات نہیں کروں گی۔''

''اچھی بات ہے۔'' اس نے کہا۔ پھر پلٹ کر دیکھا تو ایک طرف سے تھائی لڑکا آتا ہوا دکھائی دیا۔ اس کے ہاتھ میں پکڑی ٹرے میں چار ناریل تھے، جن میں اسٹرا لگے ہوئے تھے۔ وہ ہمیں دے گیا۔ میں نے ان دونوں کو بھی بلا لیا۔ بہت ہی لذیز پانی تھا۔ طبیعت خوشگوار ہوگئی۔

''ایک بات پوچھوں؟'' اس نے ہم تینوں کی طرف دیکھ کر عجیب سے لہجے میں کہا۔

''بولو!'' نینا نے اس کی جانب غور سے دیکھا تو وہ ہونٹ سکیڑتے ہوئے بولی۔

''تم لوگوں کا دل نہیں چاہ رہا کہ دوسرے لوگوں کی طرح ساحل پر بھاگو، سمندر میں جاؤ، واٹر سکوٹر سے لطف اندوز ہو۔''

''تم چاہ رہی ہو؟'' میں نے پوچھا۔

''آف کورس، لیکن اگر تم لوگ چاہو اور ساتھ دو۔'' اس نے پوچھا۔

''دیکھو، ہم یہ بکنی والا لباس پہننے کا سوچ بھی نہیں سکتیں۔ تم چاہو تو کھیلو۔''

''بغیر بکنی پہنے بھی کھیلا جا سکتا ہے۔'' نینا نے کہا تو سبھی تیار ہوگئیں۔

''وہ کیسے، کپڑے گیلے نہیں ہو جائیں گے؟'' میں نے پوچھا۔

''گیلے کپڑے؟'' میں نے پوچھا۔

''میں کپڑے ساتھ لائی ہوں۔ مجھے پتہ تھا کہ ساحل پر جانا ہے تو یہاں......'' اس نے کاندھے پر جمائے بیگ کی جانب اشارہ کرتے ہوئے کہا اور مسکرادی۔ مطلب ماریہ پہلے ہی سوچ کر آئی تھی۔

''چلو۔'' میں نے کہا تو وہ پھر سے کھل گئی۔ وہ تیزی سے اٹھی اور واپس اسی ادھیڑ عمر تھائی تک گئی، اس سے باتیں کرتی رہی اور پھر کتنے سارے بھات نکال کر اسے دے دیئے۔ ان کی آوازیں مجھے سنائی نہیں دے رہی تھیں، اگر سنائی بھی دے رہی ہوتیں تو مجھے ان کی کیا خاک سمجھ آنی تھی۔ وہ واپس آئی، اس نے اپنی ساری چیزیں، سیل فون وغیرہ ماریہ کے بیگ میں ڈالے، ہمیں بھی ایسا ہی کرنے کو کہا۔ پھر سب اکٹھا کر کے وہ واپس چلی گئی۔ تھوڑی دیر بعد جب وہ آئی تو میں پہچان ہی نہ سکی، وہ بکنی میں تھی، جو وہاں سے کرائے پر مل گئی تھی۔

''آؤ سمندر میں چلیں۔'' اس نے ہاتھ بڑھاتے ہوئے کہا تو میں نے بادل نخواستہ اس کا ہاتھ پکڑ لیا اور اس کے ساتھ چل دی۔ ہم وہاں کچھ دیر تک کھیلتی رہیں۔ پھر ایک تھائی وہاں پر سکوٹر بوٹ اور جیکٹ لے آیا۔ اس نے ہمیں پہنائیں اور واپس چلا گیا۔ شین یا کو سکوٹر بوٹ چلانا آتا تھا، اس نے مجھے پیچھے بیٹھنے کو کہا اور سمندر کے پانی میں چلی گئی۔ اس طرح

نینا اور ماریہ کو بھی اس نے سیر کرائی۔
شین یا جی بھر کے کھیلی۔ ہم نے بھی اس کے ساتھ کافی انجوائے کیا۔ اسے بالکل احساس نہیں ہونے دیا کہ اگر وہ نہ ہوتی تو شاید ہم ساحل سے ہی لوٹ گئی ہوتیں۔ تقریباً دو گھنٹے بعد ہم واپس آئیں اور پھر ہم انہی کرسیوں پر آن بیٹھیں۔ ہم تھک چکی تھیں۔ سہ پہر ہو جانے والی تھی۔
"کچھ کھانا پینا ہے یا پھر آرام کرو گے۔" اس نے مجھ سے پوچھا۔
"ابھی کچھ بھی کرنے کو جی نہیں چاہ رہا ہے۔ سوائے اس کے کہ ہم نہا لیں۔" میں نے اپنی خواہش ظاہر کی، مجھے وہاں کا پانی عجیب سا لگ رہا تھا۔
"اگر فوراً نہانا چاہتی ہو تو پھر یہاں کوئی بندوبست دیکھتے ہیں۔ لیکن اگر دو تین گھنٹے انتظار کر لو تو ہوٹل کے کمرے میں ہی جا کر نہا لینا۔" اس نے میری جانب دیکھتے ہوئے کہا۔
"وہیں ہوٹل میں نہائیں گی لیکن یہ گیلے کپڑے اتارنے ہیں۔" ماریہ نے کہا۔ ہم نے وہیں ایک جگہ بنی ہوئی جھونپڑی میں کپڑے بدلے۔ جزیرے کی سیر کو نکل پڑیں۔
تقریباً آدھے گھنٹے تک ہم جیٹی تک پہنچ گئے، کشتی جانے کے لیے تیار تھی، ہم اس میں بیٹھے جس نے ہمیں بڑی کشتی تک پہنچانا تھا۔ واپسی کے سفر میں شین یا مدہوش اور خاموش تھی۔ کشتی رواں دواں تھی۔ تبھی میں نے اس سے پوچھا۔
"شین یار! صبح جب تم آئیں تو خوش تھیں، جزیرے پر آ کر تم اداس ہو گئی۔ پھر خوش ہوئی اور پھر اب اداس ہو، کیا بات ہے؟"
وہ چند لمحے سوچتی رہی پھر حسرت آمیز لہجے میں بولی۔
"اسی جزیرے پر مجھے پہلی بار احساس ہوا تھا کہ محبت بھی ہو جاتی ہے۔ یہیں ہم بچھڑ بھی گئے۔ بس وہ مجھے بہت یاد آتا ہے۔"
سورج ڈھلنے لگا تھا۔ دور سے دھیرے دھیرے پتایا شہر نمودار ہو رہا تھا، سمندر میں کشتیوں کے ریستوران جگمگانے لگے تھے۔ جب ہم نے واپس پتایا کے ساحل پر قدم رکھا تو قمقمے روشن ہو گئے تھے۔ پہاڑی پر لگے ہوئے حرفوں کے نیون سائن جگمگا رہے تھے۔ جلد ہی ہم کار میں بیٹھے اور ہوٹل کی جانب چل دیئے۔ جہاں اختتامی تقریب شروع ہونے والی تھی۔
ماریہ تیار ہو کر چلی گئی۔ اسے ڈنر وہیں کرنا تھا۔ ہم تینوں بھی فریش ہو کر بیڈ پر آ بیٹھیں تو نینا نے انگڑائی لیتے ہوئے کہا۔
"بہت تھک گئی ہوں۔"
"اگر تم کہو، تو تمہاری تھکن کچھ ہی دیر میں ختم ہو جائے گی اور تم بالکل فریش ہو جاؤ گی۔"
"کیسے؟" اس نے پوچھا۔
"مساج سے۔" شین یا نے سکون سے کہا۔
"اوہ! کوئی بات نہیں، میں بس اب سونا چاہوں گی اور پھر مجھے کبھی بھی مالش کی ضرورت نہیں پڑی کیونکہ میں نے اس کی عادت ہی نہیں ڈالی تھی۔" نینا نے یوں خوف زدہ انداز میں کہا کہ میرے ذہن میں پاکستانی مالشیے آ گئے کہ جو رگ دبا کر بندے کو بے ہوش بھی کر دیتے ہیں۔
"تمہیں شاید یہاں کے روایتی مساج کے بارے میں معلوم نہیں ہے۔ تھائی مساج محض مالش ہی نہیں ایک فلسفہ اور آرٹ بھی ہے۔ جو تقریباً پچیس سو سال سے اس سرزمین پر موجود ہے۔ یہ بدھ مت، بدھا ٹمپل اور یہاں تک کہ بدھ کے زمانے میں سے

ہے۔ جب جسم، روح اور دماغ کمزور پڑتے ہیں تو انہیں مساج ہی سے دوبارہ طاقتور کیا جاتا ہے۔ شکستہ اعصاب میں قوت بھر دینے کے لیے ہی مساج یہاں پر موجود ہے۔ انسان کی مدافعتی قوت بحال کرنے کے لیے اعصاب میں جہاں بھی، کسی بھی قسم کی کوئی رکاوٹ ہوتی ہے اسے دور کر دیا جاتا ہے۔ لہٰذا تم مساج کراؤ تو دیکھنا اس میں کتنا مزہ اور سکون ہے۔" شین یا نے مساج کے حق میں زبردست تقریر کر دی۔ نینا پھر بھی نہیں مانی، بلکہ اسے کہا کہ ہم ڈنر کے لئے نیچے جاتے ہیں۔

ہم ہوٹل ہی میں ساحل کی جانب کھلی فضا میں آ بیٹھے تھے۔ ایک جانب پام کے درختوں کی قطاریں تھیں جس پر روشنی کے چھوٹے چھوٹے قمقمے لگے ہوئے تھے۔ سبز سبز لان میں ذرا فاصلے پر کرسیاں رکھی گئیں تھیں۔ تھوڑی دور سوئمنگ پول تھا، دھیمی روشنی میں بڑا رومان پرور ماحول تھا۔ وہاں بیٹھنے کے تھوڑی دیر بعد کھانا آ گیا۔ جب ویٹر کھانا سرو کر کے چلا گیا تو میں نے شین یا نے مجھ سے پوچھا۔

"کیسا رہا آج کا دن؟"

"بہت شاندار۔" میں نے مسکراتے ہوئے کہا۔

"کل تم لوگوں کا آخری دن ہے یہاں، امید ہے کہ آپ تینوں کو میری خدمت پسند آئی ہوگی۔" وہ بولی۔

"مجھے اچھا لگا کیونکہ تم باتیں اچھی کرتی ہو۔ تمہارے پاس معلومات ہیں، تم اچھا گائیڈ کر سکتی ہو۔" میں نے اپنی رائے دی اور چند لمحے بعد پوچھا "شین یا یہ لڑکیاں بلکہ اتنی ساری لڑکیاں پتایا میں ہیں کیا یہ رات ہوتے ہی ساری گھروں سے نکل آتی ہیں؟"

وہ چند لمحے سوچتی رہی، پھر ٹھہرے ہوئے لہجے میں بولی۔

"یہاں بہت لڑکیاں ہیں۔ غیر ملکی سیاح جب یہاں آتے ہیں تو ان کے ذہن میں یہی ہوتا ہے کہ کسی بھی تھائی لڑکی سے وہ اپنی خواہش کا اظہار کر دیں گے تو انہیں مثبت جواب ملے گا۔ اس میں سیاحوں کا قصور بھی نہیں ہے۔ یہاں ٹورازم والوں نے پتایا کا تاثر ہی یہی دیا ہے کہ یہاں پر چار "ایس" ہیں، مطلب سمندر، ریت، سورج اور جنس۔ حالانکہ ایسا ہے نہیں۔"

"اوکے! میرا مطلب ہے کہ سب یہاں کام کرتی ہیں اور جنس کو برا نہیں سمجھا جاتا۔ کیا سب ایسی ہی ہیں؟ اور......" میں نے کہنا چاہا تو اس نے میری بات کاٹتے ہوئے کہا۔

"یہاں کا ایک اپنا نظام ہے۔ یہاں زیادہ تر تھائی لڑکیاں گاؤں وغیرہ سے لائی جاتی ہیں۔ کچھ لڑکیوں کا تعلق پتایا کے ان خاندانوں میں سے ہے جو یہاں بہت پرانے ہیں۔ وہ یہ جنسی کام نہیں کرتے ہیں، جیسے میں ہوں۔ شاید اس لیے بھی کہ ہم محنت کر ترجیح دیتے ہیں۔ سب ایسی نہیں ہیں، لیکن زیادہ تر ایسی ہی ہیں۔ انہیں قانونی تحفظ حاصل ہے۔"

"کیسا قانونی تحفظ؟" میں نے پوچھا۔

"مطلب جو رجسٹرڈ سیکس ورکر ہیں، ان کا مفت چیک اپ ماہانہ بنیاد پر ہوتا ہے، ان کا علاج فری ہوتا ہے۔ وغیرہ۔" یہ کہہ اس نے میرے چہرے کی طرف دیکھ کر پوچھا "کیا تم جنس کے بارے میں اپنا نظریہ بتا سکتی ہو؟"

"بالکل، میرا وہی نظریہ ہے جو میرے مذہب کا ہے۔" میں نے کہا

"کیا ہے؟" اس نے پوچھا

"اسلام نے فیمیل (Female) کو "عورت"

کہا ہے، جس کا مطلب ہے، ڈھکی ہوئی، چھپی ہوئی، اسلام عورت کو ڈھانپ کر پردے میں اس لیے رکھنا چاہتا ہے کہ وہ بہت قیمتی ہے، جنس کا عمل بہت قیمتی ہے، اس قدر قیمتی کہ تم اس کا تصور بھی نہیں کرسکتی ہو۔ یہاں تک کہ یہ ہمارے لئے تقدس کی حیثیت رکھتا ہے، اس کی وجہ یہ ہے کہ ہمارے ہاں یہ لذت یا عیاشی کے لیے استعمال نہیں ہوتا بلکہ افزائش نسل جیسے مقدس فریضے کے لیے ہوتا ہے۔ عورت جو اس دنیا میں تخلیق کا عمل پورا کرتی ہے، اس کی حفاظت کرنی چاہیے یا نہیں؟، کیا اسے ایسا ماحول نہیں دینا چاہیے جو جنسی بیماریوں اور غلاظتوں سے پاک ہو۔ جو جگہ جگہ ذلیل ہونے کی بجائے، ایک مرکز پر رہتے ہوئے تخلیق وتربیت جیسا اہم فریضہ ادا کرتی جائے۔ ہم عورت کے اس مقام کو ''عصمت'' کہتے ہیں، پاک بازی جس کا اصل حسن ہے۔ میری بات کا برا مت ماننا، چند نوٹوں کے عوض اس عمل سے گزر جانے والی عورت تو نہیں رہتی، اس نے اس مقدس فریضے کے عوض ایک وقت کی روٹی لے لی، اس روٹی نے اسی پیٹ میں جانا ہے، جہاں کچھ دیر بعد پھر سے بھوک کا احساس جاگ اٹھے گا۔''

''میں نے سنا ہے کہ آپ کے ہاں چار شادیاں ہوتی ہیں، کیا اس طرح عورتوں کا استحصال نہیں ہوتا'' اس نے میری جانب دیکھ کر کہا۔

''اسلام میں چار شادیوں کا کوئی قانون نہیں بلکہ رعایت ہے۔ وہ بھی ماحول اور حالات کے باعث۔ یہ عیاشی نہیں ہے بلکہ ضرورت ہے، جب عورتیں زیادہ ہو جائیں تو کیا کریں، انہیں مویشیوں کی طرح منڈیوں تک لے آئیں۔ جیسا میں نے واکنگ سٹریٹ میں دیکھا۔ وہ عورت جو خود کو پاک باز با عصمت اور اپنی تخلیق کی حفاظت کرنا چاہتی ہو وہ کیا کرے؟ وہ لوگ جو اپنے تخلیقی اعضاء کی حفاظت کرنے والے ہیں، وہ چاہے مرد ہوں یا عورتیں اسلام میں ان کا اعلیٰ مقام ہے۔ انہیں مومنین کہا گیا ہے۔ اور اس کا دوسرا پہلو یہ ہے کہ جہاں یہ اجازت موجود ہے، وہاں اس کے ساتھ یہ کہا گیا ہے کہ عدل کرسکو تو۔ اگر عدل نہیں کرسکنے کا خوف ہو تو ایک ہی شادی کرنے کا حکم ہے۔ جب معاشرہ ہی اپنی عورت کی حفاظت نہیں کرے گا تو پھر دوسری قوم کے لوگ آ کر انہیں بے آبرو کریں، یا پامال کریں یا محض جنسی کھلونا بنائیں۔''

''تمہارے مذہب نے عورت کے بارے میں کیا کہا ہے؟'' اس نے انتہائی سنجیدگی سے پوچھا

''وہ میں تمہیں ایک ہی نشست میں نہیں بتا سکتا کیونکہ یہ کوئی تھوڑا بہت نہیں ہے۔ ہاں مگر ایک بات ضرور سمجھا دیتی ہوں کہ اسلام نے عورت کو جنسی کھلونا نہیں بنایا بلکہ باوقار انسان کا مقام دیا ہے۔ عیسائیوں، یہودیوں اور ہندوؤں کی طرح اپنی عبادت گاہوں میں رکھ کر انہیں جنسی استحصال کرنے کی قطعاً اجازت نہیں دیتا، تمہارے مونک براہِ راست تم لوگوں سے کوئی شے کیوں نہیں لیتے، عورت سے مس ہونے کا مطلب ہے کہ وہ پلید ہو جائیں گے، کیا یہ عورت کی توہین نہیں ہے۔ عورت معاشرے کا باوقار رکن ہے۔ اسے تنہا نہیں چھوڑا گیا۔ بلکہ ایک مرد کو اس کا نگران بنایا گیا تا کہ اس کی تمام تر ضرورتیں پوری ہوں اور وہ افزائش نسل کے پاک فریضہ کو سرانجام دیں۔'' میں نے کہا تو وہ سوچ میں پڑ گئی، پھر بولی۔

''اگر ان باتوں کے تناظر میں دیکھیں تو جنس بڑا گھٹیا سا کام نظر آیا ہے میرا مطلب ہے، یہ جو میں اپنے اردگرد دیکھ رہی ہوں۔'' اس نے کہا۔

"مجھے تم سے باتیں کر کے بہت اچھا لگا۔ مجھے امید ہے کہ آپ جب دوبارہ آئیں گی تو مجھ سے ضرور ملیں گی۔" اس نے اپنی پیشہ وارانہ مجبوری کے تحت کہا۔

"ٹھیک ہے ملیں گے۔" میں نے یونہی کہہ دیا۔ ہم انہی باتوں کے دوران کھانا کھا چکے تھے۔ ویٹریس برتن بھی لے چکی تھی۔

"آؤ چلیں۔" نینا نے اٹھتے ہوئے کہا۔ ہم اٹھے اور نیم تاریک ماحول میں پتھروں سے بنی پگڈنڈی پر چلتے ہوئے وہاں سے ہوٹل کے اندر آ گئے۔ جہاں ان کی تقریب ابھی تک جاری تھی۔ شین یا جانا چاہتی تھی۔ ہم نے تائی جو کو ادائیگی کر دی ہوئی تھی۔ پھر بھی میں نے تین سو بھات شین یا کو دے دیئے۔ اس نے مجھے کافی معلومات دی تھیں۔ وہ خوشی خوشی چلی گئی۔

☆......☆......☆

اسی رات ہم نے بارہ بجے کے قریب ہوٹل چھوڑ دیا۔ پتایا سے بنکاک جانے کے لئے خصوصی بس وہیں ہوٹل میں آ گئی تھی۔ جس کا انتظام این جی او والوں نے کیا تھا تاکہ ہم سکون سے بنکاک ائرپورٹ پہنچ جائیں۔ ہم دونوں کو الگ سے ٹکٹ دینا پڑا تھا۔

تقریباً تین گھنٹے کے سفر کے بعد ہم ایکا مائی بس ٹرمینل بنکاک جا پہنچے۔ وہاں کافی سارے لوگ اتر گئے۔ خیال تھا کہ وہ لوگ ابھی بنکاک میں ٹھہریں گے۔ بس والوں نے باقی مسافروں کو ائرپورٹ چھوڑ دیا۔ ہمیں الوداع کہنے والا کوئی نہیں تھا۔

ہمارا جہاز دو گھنٹے بعد جانے والا تھا۔ اس لئے ہمیں وہ وقت وہیں گذارنا تھا۔ جس طرح ائرپورٹ پر ہوتا ہے۔ بھانت بھانت کے لوگ تھے وہاں۔ وہیں اچانک میری نگاہ ایک مساج سنٹر پر پڑی۔ تو مجھے اچانک یاد آیا۔

"نینا، تم نے شین یا کے کہنے پر مساج کیوں نہیں کروایا؟"

"پتہ نہیں، جس طرح اس نے تقریر کی تھی، مجھے تو لگا وہ ہمیں لوٹ ہی لے گی۔"

"چل یہاں مساج کروا لے۔" میں نے ایک سنٹر کی طرف اشارہ کیا، جہاں صرف پاؤں کا مساج کیا جاتا تھا۔ پیسے بھی تھوڑے سے تھے۔ ہم ماریہ کو سامان کے پاس بٹھا کر خود اس سنٹر میں چلی گئیں۔ وہاں ویسی ہی تھائی لڑکیاں تھیں۔ انہوں نے پیروں کا مساج کیا تو لگا شین یا سچ کہہ رہی تھی۔ ایک دم سے ساری تھکن اتر گئی تھی۔

جہاز کی روانگی کا اعلان ہونے لگا تو ہم ایئرپورٹ کے مراحل سے گزر کر لاؤنج میں جا بیٹھے۔ اس وقت نجانے کیوں دل ہمکنے لگا تھا کہ میں جلد از جلد برطانیہ کی بجائے پاکستان پہنچ جاؤں۔ آخر ہم لاؤنج سے نکل کر بس میں بیٹھیں اور جہاز کے قریب اتر گئیں۔ تبھی مجھے یاد آیا۔

"نینا کوئی بُو آ رہی ہے؟"

اس پر ماریہ اور نینا نے احساس کیا۔ پھر کھلکھلا کر ہنس دیں۔ میں ان سے پہلے اپنی سیٹ پر جا بیٹھی تھی۔ اس وقت میں نے سکون کا سانس لیا جب جہاز نے اڑان بھر لی اور اعلان ہونے لگا کہ اپنی سیٹ بیلٹ کھول دیں۔ میں سکون سے سو گئی۔

عزت نفس

ریحانہ سعیدہ

ایک جواں ہمت لڑکی کی جہد مسلسل کا احوال' چمکتی دھمکتی دنیا کے تاریک راستوں پر وہ اپنی عزت کا دفاع کرنے کے ساتھ اپنے گھر والوں کے خوابوں کی تعبیر ڈھونڈ رہی تھی۔
دلچسپ نمبر کے لیے ایک اچھوتی تحریر جسے پڑھ کر آپ کی پلکوں پر ستارے چمکنے لگیں گے۔

''بیٹا! تم نے کیا سوچا ہے اب تمھارے باپ کا چالیسواں بھی ہوگیا ہے۔ ہمیں تمھارے ماموں کے ساتھ رہنا ہے یا تایا کے ساتھ۔ بیٹا! تم بڑی ہو جو فیصلہ کروگی وہی ہوگا۔ میرا جوان بچیوں اور چھوٹے بچے کے ساتھ اکیلے رہنا مشکل ہوگا۔ اماں نے زنوبیہ کے پاس بیٹھتے ہوئے کہا۔

''ہم اپنے گھر رہیں گے باپ کی موت کی صورت میں جو سائباں ہمارے سر سے ہٹا ہے اس نے ہمیں وہ شعور اور سمجھ عطا کردی ہے جو اس سے پہلے نہیں تھی۔''

''امی! آپی ٹھیک کہہ رہی ہیں ابو کی وفات کے بعد جب بھی ہم ماموں کی طرف گئے ممانی ہمیں دیکھتے ہی مہنگائی پر لیکچر دینے لگ جاتی تھیں کہ آج کل تو اپنے بچے پالنے مشکل ہوگئے ہیں' جیسے ہمیں پالنے کی ذمہ داری ان پڑی ہو جبکہ ہم تو اپنا غم بھلانے ان کی طرف جاتے تھے۔ رافعہ نے زنوبیہ کے پاس بیٹھتے ہوئے کہا۔

''آپی! کل جب میں تایا ابو کے گھر گیا' فزکس کے ٹاپک پر شارق بھائی سے کچھ پوچھنا تھا تو تائی امی نے صاف انکار کردیا کہ وہ گھر پر نہیں ہیں اور ہو بھی تو اتنا مصروف ہوتا ہے کہ ہمارے لیے بھی اس کے پاس وقت نہیں ہوتا۔ تم کوئی ٹیوٹر لگوالو جب کہ ابو کی وفات کے بعد وہ جانتی ہیں کہ کرائے کا گھر ہے اور ابو کی پرائیویٹ نوکری کی پنشن بھی نہیں ہوتی اور اب ہمارا گزارا پتہ نہیں کیسے ہوگا؟'' رمیز نے دکھی لہجے میں کہا۔

''آپی! مجھے تو لگتا ہے تائی شارق بھائی کا رشتہ بھی آپ سے توڑ کر کہیں اور کررہی ہیں۔ میری فرینڈ نے بتایا تھا کہ آپ کے تایا اور تائی شارق بھائی کا رشتہ دیکھنے میری کزن کے گھر آئے تھے۔ میں نے اس لیے نہیں بتایا کہ شاید اسے غلط فہمی ہوئی ہو۔'' رافعہ نے کہا۔

''گڑیا! تم فکر نہ کرو اللہ رازق ہے کیڑے کو بھی رزق دیتا ہے ہم تو اشرف المخلوقات ہیں' بس ہمت اور حوصلہ کرنا پڑے گا۔ میں پرائیویٹ ایم اے کرلوں گی' کل سے نوکری تلاش کرتی ہوں۔ میرے مضامین سائنس کے ہیں ان شاء اللہ اچھے اسکول میں جاب مل جائے گی۔ ابو کی جگہ میں ہوں نا' اب تم سب کو پریشان ہونے کی ضرورت نہیں۔ امی ایک کمرہ خالی کردیں' میں اس میں بچوں کو ٹیوشن پڑھایا کروں گی کیونکہ آج کل ٹیچرز کی تنخواہ بہت کم ہے اس میں تو کرایہ اور مشکل سے رافعہ اور رمیز کی اسکول' کالج کی فیس ہی نکل سکتی ہے۔'' زنوبیہ نے دونوں بہن بھائیوں کو گلے لگاتے ہوئے کہا۔

''بیٹا! اگر تم کہو تو میں تمھارے ماموں اور تایا سے بات کروں کہ وہ ہر مہینے تھوڑی بہت مدد کریں۔''

''نہیں امی! بھیک مانگنا مجھے گوارہ نہیں' چاہے وہ تایا یا ماموں ہی کیوں نہ ہوں اور جب اللہ نے انہیں ہمارا وارث قرار دیا ہے تو انہیں خود اس بات کا احساس ہونا چاہیے' آپ کے کہنے پر اگر کسی مہینے انہوں نے کچھ مدد کر بھی دی تو تائی اور مامی تمام خاندان میں اس بات کے

چرچے کریں گی۔ میں ابو کی وفات کے بعد اپنے لیے رافعہ اور رمیز کے لیے لوگوں کی آنکھوں میں ہمدردی اور خدا ترسی نہیں دیکھنا چاہتی بلکہ میں اپنی خودداری اور عزتِ نفس کے ساتھ سر اُٹھا کے جینا چاہتی ہوں۔ زنوبیہ نے ماں کو حوصلہ دیا۔

......☆☆☆......

''زنوبیہ! اب تو تمہیں تنخواہ مل گئی ہے۔ دو چار اچھے سوٹ سلوالو۔'' مائرہ نے اسٹاف روم میں بیٹھی ٹیچرز کے درمیان زنوبیہ کو مخاطب کیا۔

''مائرہ جی! آپ میرے لیے فکر مند نہ ہوں' میں سادگی پسند ہوں۔ بچوں کو جب ہم سادگی پر لیکچر دیتے ہیں اور خود ہم ماڈلز کی طرح ہوں تو ہمارے لیکچر ان پر اثر نہیں کریں گے۔ دو جہاں کے سردار پیوند لگے کپڑے پہن لیتے تھے تو ہم بھی ان کی اُمت ہیں......''

''اچھا اچھا' لیکچر بچوں کو دینا' مجھے مت دو' میں نے تو تمہارے بھلے کے لیے کہا تھا۔ مائرہ نے کہا۔

''کنٹین کے لیے کس کس کو آرڈر دینا ہے جلدی بتائیں۔ زنوبیہ بی بی تو اچار پراٹھا کھائیں گی کہ جی گھر کا کھانا ہی اچھا۔'' حنا نے مذاق اُڑاتے ہوئے باقی ٹیچرز کو مخاطب کیا۔

''زنوبیہ! میں بھی تمہارے ساتھ لنچ شیئر کروں گی۔ تمہاری امی کے بنائے کھانوں میں وہ ذائقہ ہوتا ہے کہ میں پیزا، برگر اور شوارما وغیرہ تقریباً بھول ہی گئی ہوں۔ ٹیچرز ہو کر ان کے یہ نظریات ہیں۔ بچوں کے لیے یہ کیسے ماڈل ہو سکتی ہیں۔ تم اس کی باتیں ایک کان سے سن کر دوسرے سے نکال دیا کرو۔ یہ اپنے فیشن جیولری اور اسٹائل کی وجہ سے سر کی بھی منظورِ نظر تھیں اور بچوں کی بھی فیورٹ جبکہ تم محنت اور محبت سے بچوں کو پڑھا کر ان کی فیورٹ ہو گئیں اس لیے یہ تم سے جیلس ہو کر یہ سب کہتی ہیں۔'' کرن اپنی جگہ سے اُٹھ کر زنوبیہ کے پاس آ گئی۔

''تم اسے چھوڑو اور میرے ساتھ آلو کے پراٹھے کھاؤ۔ امی نے ایک پراٹھا تمہارے لیے علیحدہ سے بنایا ہے۔'' زنوبیہ نے لنچ بکس سے پراٹھا نکالتے ہوئے کہا۔

''سوسویٹ مدر' کیا بات ہے زنوبیہ! تم بہت پریشان لگ رہی ہو۔'' کرن نے نوالہ لیتے ہوئے کہا۔

''کرن! سمجھ نہیں آتا کہ گھر کا خرچ کیسے چلاؤں۔ ابو کی تنخواہ تھی تو اچھا گزارا ہوتا تھا۔ مکان کا کرایہ' ہم سب کی فیس۔ بہت خوشحالی نہ تھی تو اتنی تنگدستی بھی نہیں تھی لیکن اب اس تنخواہ سے کرایہ مشکل سے نکلتا ہے۔ اب مالک مکان کرایہ بڑھانے کا کہہ رہا ہے۔ ورنہ خالی کرنے کا نوٹس دے دے گا۔ دو تین دن سے میں سیکنڈ ٹائم آفس جاب تلاش کر رہی ہوں لیکن جس آفس میں بھی جاتی ہوں وہ میری کوالیفکیشن کم اور شکل زیادہ دیکھ کر جاب کا میرٹ بناتے ہیں۔ مجھے اپنی عزت کھو کر روپیہ نہیں کمانا۔ تمہارے حالات یوں تو میرے جیسے ہیں لیکن تمہارے کپڑے جوتے کھانا پینا یہ سب کیسے مینج کرتی ہو تم؟'' زنوبیہ نے پوچھا۔

''میں تنخواہ گھر میں دیتی ہوں اور یہ میری اوپر کی کمائی ہے۔'' کرن نے بتایا۔

''یار! ٹیوشن تو میں بھی پڑھا رہی ہوں لیکن یہ اوپر کی کمائی تو بس ہوائی روزی ہے بچے نکمے ہوئے تو بھیج دیا جیسے ہی پڑھنے لگے اُٹھا لیا۔ ہمارے محلے کے لوگ بھی ہمارے جیسے ہوتے ہیں جو سبزی دال کی طرح سو روپے سے شروع ہو کر اینڈ تین سو' چار سو روپے تک ہی دے سکتے ہیں تو پھر کیا تم اپنی......''

''کچھ غلط مت سوچو مجھے بھی تمہاری طرح اپنی عزت بہت پیاری ہے بس یہ تو عزتِ نفس کا سودا ہے۔'' کرن نے کہا۔

پھر اس نے جو کچھ بتایا اسے سن کر زنوبیہ کی آنکھیں اور منہ کھلے کا کھلا رہ گیا۔

''اگر تمہیں یہ آئیڈیا پسند آیا تو تم بھی میرے ساتھ

شامل ہو سکتی ہو۔"
"نہیں نہیں' میں یہ سب نہیں کر سکتی۔" زنوبیہ نے انکار کرتے ہوئے کہا۔

......☆☆☆☆......

"امی! آج ہمیں دال کھاتے ہوئے پورا ہفتہ ہو گیا ہے امی' گوشت کی فرمائش میں نہیں کرتا۔ کوئی سبزی بھنڈی وغیرہ پکا لیں۔ تائی کے گھر تو روز مزے مزے کے کھانے پکتے ہیں جن کی خوشبو مجھے اتنا مست کر دیتی ہے کہ میں پڑھائی چھوڑ کر خوشبو سونگھتا رہتا ہوں۔ آپی! پیٹ بھوکا ہو تو پرفیوم سے زیادہ مست خوشبو پلاؤ بریانی کی لگتی ہے نا۔" رمیز نے کھانا کھاتی ہوئی زنوبیہ کو مخاطب کرتے ہوئے کہا۔

"بیٹا! حق حلال کی دال بھی مرغ مسلم پر بھاری ہے۔" اماں نے رمیز کو سمجھایا۔

"امی! میں جانتا ہوں' آپی ہمارے لیے بہت محنت کرتی ہیں۔ میں تو ایسے ہی مذاق کر رہا تھا۔"

"امی! میں نے کچھ پیسے آپ سے لیے تھے' وہ میرے پاس ایسے ہی پڑے ہوئے ہیں' وہ میں آپ کو دے دیتی ہوں۔ کل گوشت اور پلاؤ پکا لیجیے گا۔" زنوبیہ نے کہا۔

"لیکن بیٹا! وہ پیسے تو تم نے مجھ سے اپنی جوتی خریدنے کے لیے لیے تھے کہ جوتی پھٹ گئی ہے۔"

"امی! اب تو چھٹیاں ہونے والی ہیں بعد میں لے لوں گی۔ رافی! آج کالج نہیں جانا۔"

"آپی! آج کالج میں فن فیئر ہے اور پڑھائی نہیں ہوتی۔"

"تم فن فیئر پر چلی جاتیں۔" زنوبیہ نے کہا۔

"آپی! یہ سب امیروں کے چونچلے ہیں۔ میں نوٹس کمپلیٹ کروں گی۔" زنوبیہ کی نظروں میں رافعہ کا کھلکھلاتا چہرہ آ گیا جب وہ پچھلے سال فن فیئر پر کپڑوں جوتوں کے لیے ابو سے پیسے مانگ رہی تھی اور دلائل دے رہی تھی کہ اچھی پڑھائی تو تبھی ہوتی ہے نا جب کالج کی سرگرمیوں میں بھرپور حصہ لیا جائے اور آج رافعہ کی یہ سوچ...... ابو کی وفات نے ہم سب کو کتنا بدل دیا ہے سب کتنے میچور ہو گئے ہیں ان کی معصومیت ختم ہوتی جا رہی ہے اللہ مجھے اتنا مضبوط کر دے کہ میں اپنے بہن بھائی کی معصومیت انہیں لوٹا سکوں۔

"زنوبیہ! تمھیں جاب کرتے سال نہیں ہوا اس لیے تمھیں دو ماہ کی چھٹیوں کی سیلری نہیں ملے گی تم چھٹیوں میں گھر کے خرچے پورے کرنے کے لیے کون سے کام کرو گی؟ دیکھو اگر کپڑے سیتے ہیں تو پلیز میرے کپڑے بھی سی دینا۔" مائرہ نے طنز کرتے زنوبیہ پر گویا پریشانیوں کا ایک اور بم گرا دیا۔ مائرہ کے جانے کے بعد زنوبیہ نے آس بھری نظروں سے کرن کو دیکھا۔

"ہمیں پے ملے گی نا؟" زنوبیہ مائرہ کی بات سن کر فکر مند ہو گئی تھی۔

"نہیں ایسا ہی ہے جیسے مائرہ نے کہا۔" کرن نے مائرہ کی بات کی تائید کی۔

"لیکن سر بچوں کی فیس تو لے رہے ہیں تو پھر ہمیں کیوں نہیں دیں گے؟" اف میرے اللہ میں کیا کروں اب تنخواہ کے بغیر گھر کا خرچ کیسے چلے گا۔

"سر اپنی فیملی کے ساتھ فارن ٹرپ پر جو جا رہے ہیں' وہ ہم غریبوں کی تنخواہیں ہی تو ہیں۔ ہماری محنت پر عیش کرنے والے سرمایہ دار کیا جانیں کہ یہ تھوڑے پیسے بھی ہم جیسے لوگوں کی ضروریاتِ زندگی کے لیے کتنے اہم ہوتے ہیں جنھیں وہ بے دردی سے شاپنگ مالز اور ہوٹلز میں اڑاتے ہیں۔ خیر مجھے تو پروا نہیں کیونکہ میرا دوسرا کام اچھا خاصا چل رہا ہے۔" کرن نے تفصیلی جواب دیا۔

"کل سے میں بھی تمھارے ساتھ چلوں گی۔" زنوبیہ نے کرن کا ہاتھ پکڑتے ہوئے کہا۔

"رافی! کل سے تم سارے بچوں کو آپ پڑھانا کیونکہ میں نے سیکنڈ ٹائم کے لیے جاب ڈھونڈ لی ہے۔

گرمیوں کی چھٹیوں میں فل ٹائم جاب ہوگی لیکن ابھی تو شام میں جایا کروں گی۔"
"بیٹا! اپنے اوپر اتنا بوجھ مت ڈالو۔"
"امی! آسان کام ہے چھٹیوں کی تنخواہ بھی نہیں ملتی اسی لیے ابھی سے کام شروع کیا ہے تاکہ بیلنس ہوجائے۔"
"موئے اسکول والے اتنا کام لیتے ہیں اور تنخواہ بھی پورے سال کی نہیں دیتے۔"
"چھوڑیں امی! اللہ نے سبب بنا دیا نا۔" زنوبیہ نے ماں کو تسلی دی۔
"ذرا ٹھہرو کرن! میں اچھی طرح ہاتھ منہ دھولوں کل بھی امی پوچھ رہی تھیں کوئی پارٹی تھی؟ میک اپ کیا ہوا ہے۔" زنوبیہ نے رگڑ رگڑ کر منہ دھوتے ہوئے کہا۔
"اسلام علیکم!" زنوبیہ نے اندر داخل ہوتے ہوئے اونچی آواز میں سلام کیا۔
"لو پوچھو اپنی لاڈلی سے کون سی جاب کرتی ہے؟ یہ چہرے پر لیپا پوتی کر کے خالی بیگ لے کے جاتی ہے اور واپسی پر نوٹوں سے بھر کے لاتی ہے۔" تائی امی نے کہا۔
"بیٹا! تم کیا کرتی ہو؟" اماں نے زنوبیہ کو جھنجوڑتے ہوئے کہا۔ "امی! میں جو بھی کر رہی ہوں اپنے گھر کے لیے کر رہی ہوں۔ کسی کو مجھ پر انگلی اٹھانے کا کوئی حق نہیں۔ جب ہم بھوکے تھے تو یہ لوگ شرعی وارث نہیں بنے۔ اب ہم پیٹ بھر کے کھا رہے ہیں تو ان کے پیٹ میں درد شروع ہوگیا۔"
"پیٹ کا درد تو اب تمھیں ہوگا کیونکہ میں شارق کی بات ایک شریف خاندان میں کر آئی ہوں اب اس کی طرف آنکھ اٹھا کے بھی نہ دیکھنا۔" تائی امی نے گویا اسے دھمکی دی۔
"مجھے بھی آپ کے روبوٹ نما لڑکے میں کوئی دلچسپی نہیں ہے۔ جس کی چابی اس کی اماں کے ہاتھ میں ہے میں تو اپنے باپ کی وجہ سے رشتہ نبھا رہی تھی۔"
"بیٹا! تم چپ کر جاؤ بھابی آپ بیٹھیں یہ تو بچی....."
"ہنہ اب تمھارا ہمارا کوئی رشتہ نہیں۔" تائی امی نے گویا اپنا اٹل فیصلہ سنا دیا تھا۔
"یہ کیا کہہ گئی ہیں۔ امی! تائی جی نے رشتہ توڑنا تھا سو توڑ دیا۔ آپ آپی کو پریشان نہ کریں مجھے یقین ہے یہ ابو کی عزت اور آپ کی تربیت پر حرف نہ آنے دیں گی چلو رمیز اٹھو کھانا کھائیں۔" رافعہ نے کہا۔
تائی نے آپی کو ایسا کیوں کہا' آپی کیا جاب کرتی ہیں' آپی بتاتی کیوں نہیں؟ ساری رات رمیز کروٹیں بدلتا رہا۔
"زنوبیہ! ناشتہ کرو ورنہ دیر ہوجائے گی۔" امی نے کچن سے آواز لگائی رمیز فوراً اُٹھ کے بیٹھ گیا آج میں آپی کا آفس دیکھ کے آؤں گا کہ وہ کیا کام کرتی ہیں پھر تائی کو بتاؤں گا' جو میری آپی کے لیے فضول باتیں کرتی ہیں۔ دوست کی موٹر سائیکل پر زنوبیہ کا پیچھا کرنے لگا۔ زنوبیہ اور کرن دونوں اسٹاپ پر کھڑی وین میں بیٹھ گئیں۔ رمیز بھی اُن کے پیچھے تھا۔ وین ایک گھر کے آگے رکی' دونوں اندر چلی گئیں۔ رمیز چھپ گیا' دوبارہ گھر سے دس بارہ لڑکیاں شوخ چمکتے کپڑوں میں گہرا لال گلابی میک اپ کیے نکلیں ان میں زنوبیہ اور کرن بھی تھیں جو ڈھول پیٹ رہی تھیں کھسروں اور مراثنوں کا یہ گروپ جیوے بنڑا کی صدائیں لگاتے ہوئے گلی میں پھیل گیا۔ رمیز کے کانوں میں آپی کی آواز گونجنے لگی امی ہم کسی رشتہ دار سے مدد نہیں مانگیں گے مجھے اپنی عزتِ نفس بہت پیاری ہے میں خوددار باپ کی بیٹی ہوں اور نہ میں آپ کے رمیز اور رافعہ کے لیے خاندان کے لوگوں کی آنکھوں میں ترس اور حقارت دیکھنا چاہتی ہوں لوگوں سے بیلیں اور پیسے اکٹھے کرتی لال گلابی میک اپ اور چمکتے کپڑوں اور کھلے بالوں میں زنوبیہ آسماں سے اُتری کوئی دیوی لگ رہی تھی رمیز نے گیلی آنکھوں سے اپنی بہن کو دیکھا آپی نے عزت نہیں عزتِ نفس کا سودا کیا تھا۔

روحانی مسائل

حافظ شبیر احمد

سید محمد افنان...... قصور

جواب:۔ سورۃ عصر 21 مرتبہ صبح وشام پانی پردم کر کے پلائیں روزانہ۔ دونوں کو۔

ک ر...... ہری پور

جواب:۔ سورۃ عصر 21 مرتبہ اول وآخر 3,3 مرتبہ درود شریف۔ پانی پر دم کر کے روزانہ پلائیں۔ نیت بھی ہو۔

راحیلہ...... جہلم

جواب:۔ بعد نماز عشاء سورۃ قریش 111 مرتبہ۔ اول وآخر 11,11 مرتبہ درود شریف روزانہ۔

شوہر اور گھر کے معاشی حالات کے لیے دعا کریں۔

آصف یا والدہ اس کی نوکری کے لیے بھی پڑھیں روزانہ۔

ک ز...... سرگودھا

جواب:۔ وظیفہ جاری رکھیں۔ صدقہ دیں (گوشت)۔ (عمل کی مدت 6 ماہ)

روزانہ ایک تسبیح درود شریف پڑھ کر دعا کریں۔

عظمت ناز...... گوجرانوالہ

جواب:۔ 0321-2450019 حکیم صاحب سے رابطہ کریں۔

شبانہ عرفان...... قصور

جواب:۔ وتنزل من القرآن ماھو شفاء و رحمتہ اللمومنین. روزانہ قرآن پڑھیں۔ جتنا بھی پڑھیں۔ پانی پہ پھونک کر پئیں۔ انشاء اللہ شفاء ہوگی۔

طاہرہ ساجد...... نیو کراچی

جواب:۔ سورۃ الفلق اور سورۃ الناس۔ فجر اور مغرب کی نماز کے بعد 21,21 مرتبہ پڑھ کر اپنے اوپر دم کیا کریں۔

علاج کرائیں۔

ماہیر ظفر...... گجرات

جواب:۔ سورۃ قریش بعد نماز عشاء 21 مرتبہ روزانہ۔ اول وآخر درود شریف۔ 3,3 مرتبہ۔ کامیابی کے لیے۔

ہر نماز کے بعد سر پر ہاتھ رکھ کر یا قوی 11 مرتبہ پڑھا کریں۔

نازیہ خالد...... گوجرانوالہ

جواب:۔ سورۃ العصر روزانہ سرہانے کھڑے ہو کر 21 مرتبہ پڑھا کریں جب بچہ سو جائے۔

عائشہ زاہد...... لاہور

جواب:۔ گھر میں جنات ہیں۔

سورۃ الفلق اور سورۃ الناس 1,1 تسبیح روزانہ۔ اول وآخر 11,11 مرتبہ درود شریف۔ اپنے اوپر دم کیا کریں۔

طاہرہ جبیں...... راولپنڈی

جواب:۔ سورۃ اخلاص' سورۃ الفلق' سورۃ الناس 11,11 مرتبہ صبح وشام پانی پر دم کر کے پیا کریں، روزانہ۔ اول وآخر 3,3 مرتبہ درود شریف۔

بھائی کو بھی پلائیں۔

شمائلہ رفیق...... سمندری

جواب:۔ سورۃ فرقان والا وظیفہ جاری

رکھیں۔ ساتھ ہی بعد نماز عشاء سورۃ الفلق اور سورۃ الناس کی 1,1 تسبیح بھی کریں۔ بندش سخت ہے رشتے آتے ہیں تو رکاوٹ آجاتی ہے۔ صدقہ دیں' گوشت کا ہر ہفتہ۔
جن کا مسئلہ ہے ان کا نام مع والدہ کے نام کے ساتھ بتائیں۔

مسرت جبیں...... چیچہ وطنی

جواب:۔سورۃ مزمل 3 مرتبہ چینی پر دم کرلیں۔چینی گھر کے تمام افراد کے استعمال میں آئے۔ اول و آخر 3,3 مرتبہ درود شریف۔ گھر کے لڑائی جھگڑے کے لیے۔
سورۃ القریش 111 مرتبہ بعد نماز عشاء اول و آخر 11,11 مرتبہ درود شریف۔ تنویر خود پڑھے اپنے کام کے لیے روزانہ۔
نویدہ پر تعویزات ہیں، علاج کروائیں۔

ت س...... کوہاٹ

جواب:۔(۱) آیات شفا 101 مرتبہ تیل پر دم کرلیں اور روزانہ مالش کریں۔ اول و آخر 11,11 مرتبہ درود شریف۔
(۲) سورۃ القریش 111 مرتبہ اول و آخر 11,11 مرتبہ درود شریف، روزانہ۔
جائیداد/ کاروبار/ امتحان تینوں کے لیے دعا کریں۔

شازیہ فاروق احمد...... خان بیلہ

جواب:۔ بعد نماز عشاء سورۃ عبس 3 مرتبہ۔ پانی پر پڑھ کر دم کیا کریں، روزانہ۔
(۱) پورے گھر میں چھڑکا کریں (حمام کے علاوہ)
(۲) کاروبار والی جگہ پر جب کام شروع کریں۔
(۳) گھر کے تمام افراد کو پلائیں۔
روزانہ یہ عمل کرنا ہے۔ اسی حساب سے پانی رکھیں۔

اقصیٰ اسلم

جواب: استغفار اور درود شریف کی 1/1 تسبیح روزانہ عشاء کی نماز کے بعد۔

نوٹ

جن مسائل کے جوابات دیے گئے ہیں وہ صرف انہی لوگوں کے لیے ہیں جنہوں نے سوالات کیے ہیں۔ عام انسان بغیر اجازت ان پر عمل نہ کریں۔ عمل کرنے کی صورت میں ادارہ کسی صورت ذمہ دار نہیں ہوگا۔
ای میل صرف بیرون ملک مقیم افراد کے لیے ہے۔
rohanimasail @ gmail.com

روحانی مسائل کا حل کوپن برائے نومبر 2014ء

نام.................... والدہ کا نام.................... گھر کا مکمل پتا....................

....

گھر کے کون سے حصے میں رہائش پزیر ہیں..

ذوقِ آگہی

عفان احمد

کائنات کی بہار

''ربیع الاول'' حضورِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی ولادت باسعادت کا مہینہ ہے۔ ربیع بہار کو کہتے ہیں۔ بلاشبہ کائنات کی تاریخ میں انسانیت کے خزاں رسیدہ چمن کے لیے حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی آمد سے بڑھ کر کوئی بہارِ نو نہیں آئی۔ وہ دانائے سُبل، ختم الرسُل ہیں، ان کی ہستی وجودِ کائنات کا سبب بنی۔ ان کی وجہ سے انسانیت کو بلندی اور تہذیب کی ترقی ملی۔ ایک مومن کا دل حضورِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی محبت کے چراغ ہی سے روشن رہتا ہے اور اس کا باغِ آرزؤ عقیدتِ رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی خوش بوؤں ہی سے مہکتا اور لہلہاتا ہے۔ آج بھی اپنی تمام تر کمزوریوں اور پستیوں کے باوجود امت مسلمہ کی خاکستر میں عشقِ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی چنگاریاں پوری حرارت کے ساتھ موجود ہیں اور سرورِ کائنات صلی اللہ علیہ وسلم کی ناموس کی حفاظت کے لیے امت کا ایک گناہ گار سے گناہ گار فرد بھی اپنی جان کی قربانی اپنے لیے باعثِ فخر و عزت سمجھتا ہے۔ بداعمالیوں اور کوتاہیوں کے عادی روسیاہ بھی جب اس در کا رُخ کرتے ہیں تو ادب کے اعلیٰ مقام کے لیے ان سعادت مندوں کا انتخاب کیا' جو عمدہ انسانی اوصاف کی بلندیوں کے جگمگاتے ستارے تھے' جنھوں نے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے اٹھنے بیٹھنے' چلنے پھرنے' سونے جاگنے' اوڑھنے' پہننے غرض یہ کہ زندگی کی ایک ایک ادا' ایک ایک طریقے اور ایک ایک نکتے کو اس طرح محفوظ کیا' اس طرح قبول کیا کہ تاریخِ عالم میں اس کی نظیر نہیں ملتی۔ رنگ بدلتی کائنات کو نظامِ تازہ بخشنے والا یہ پاک باز قافلہ ان سنتوں اور طریقوں کو اپنی زندگی میں ڈھال کر وقت کی باطل تہذیبوں کو مٹانے کے لیے نکلا اور جہاں جہاں سے گزرا' صدیوں وہاں سے صدا آتی رہی

وہ ایک بار اِدھر سے گئے مگر اب تک
ہَوائے رحمتِ پروردگار آتی ہے

سرورِ دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم کے طرزِ زندگی کے مقابلے میں دنیا کی کوئی تہذیب' کوئی تمدن' کوئی ثقافت' ان کی آنکھوں کو خیرہ اور ان کے دلوں کو فریفتہ نہ کر سکی۔ سرورِ کائنات صلی اللہ علیہ وسلم کی صحبت اٹھانے والی اس بے مثال جماعت نے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے ایک ایک عمل' ایک ایک قول اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی مبارک زندگی کے ایک ایک معمول کو محفوظ کرنے کا اس قدر اہتمام فرمایا کہ وہ نہ کسی کی خاطر اسے ترک کرنے کے قائل تھے اور نہ اس میں کمی بیشی کے روادار۔ ماہِ ربیع الاول کا پیغام آج کے مسلمان کے لیے اگر کوئی ہو سکتا ہے تو یہ کہ وہ اپنے معمولات اور طرزِ حیات میں سرکارِ دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم کے ان طریقوں اور سنتوں کو زندہ کرے' جن سے وہ اپنی زندگی کے مرجھائے ہوئے نقوش میں رنگ بھر سکتا ہے' دل کی تاریکیوں میں اجالا کر سکتا ہے اور جنھیں چھوڑ کر خود اس نے اپنی بربادی کا سامان کیا ہے۔

انتخاب:: زبیر اختر...... کراچی

کیا آپ جانتے ہیں......؟

تاریخ کے حساس انسانوں نے اپنی زندگی کا زیادہ تر حصہ اداس رہ کر گزارا ہے۔ کیونکہ زندگی میں خوش رہنے کے لیے بہت زیادہ ہمت بلکہ بہت زیادہ بے حسی کی ضرورت ہوتی ہے۔ (جون ایلیا)

برے جذبات انسان کو سچائی اور دیکھنے کے اہل نہیں رہنے دیتے اور غلط عقائد برے جذبات کو مزید

جواز فراہم کرتے ہیں۔ (برٹرنڈرسل)

ریاض بٹ...... حسن ابدال

غلاف خانہ کعبہ

❖ یہ ہر سال ذی الحج کے مہینے میں تبدیل کیا جاتا ہے۔

❖ اس کی قیمت دو کروڑ ریال ہے۔

❖ اس کا وزن 670 کلوگرام ہے۔

❖ یہ خالص ریشم کے کپڑے کا بنتا ہے۔

❖ اس کی تیاری میں 150 کلوگرام خالص سونا' چاندی لگتا ہے۔

❖ اس کا سائز 658 مربع میٹر ہے۔

❖ یہ 47 حصوں پر مشتمل ہے۔

❖ ہر حصہ 14 میٹر لمبا اور 95 سینٹی میٹر چوڑا ہے۔

❖ اس کو تبدیل کرنے میں 4 گھنٹے لگتے ہیں' سبحان اللہ

روبی علی...... سیدوالہ

کھانا

حضرت ابوایوب انصاریؓ نے ایک دفعہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم اور حضرت ابوبکر صدیقؓ کی دعوت کی اور صرف اتنا کھانا پکوایا جو کہ آپ دونوں کے لیے کافی ہو جائے۔ کھانے کے وقت حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ ''انصار میں سے تیس معززین کو بلا لاؤ۔'' جب وہ تیس کھانا کھا کر چلے گئے تو کھانا اتنا ہی موجود تھا۔ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے پھر ارشاد فرمایا کہ ''ساٹھ آدمی اور بلا لاؤ۔'' چنانچہ وہ بھی بلا لیے گئے پھر ارشاد فرمایا کہ ''ستر آدمی اور بلا لاؤ'' وہ بھی آئے اور پیٹ بھر کر کھا گئے لیکن کھانا پھر بھی اتنا ہی موجود تھا' یہ دیکھ کر سب لوگوں نے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے دستِ مبارک پر بیعت کر لی۔ حضرت ابوایوب انصاریؓ کے ہاں اس دن ایک سو اسّی آدمیوں نے کھانا کھایا۔

انتخاب: ندیم قادری...... جہلم

نونہال

مجھے بچوں کی پانچ عادتیں بہت پسند ہیں:۔

◉ وہ رو رو کر مانگتے ہیں اور اپنی منوا لیتے ہیں

◉ وہ مٹی سے کھیلتے ہیں یعنی غرور و تکبر خاک میں ملا دیتے ہیں۔

◉ جھگڑتے ہیں' لڑتے ہیں پھر صلح کر لیتے ہیں یعنی دل میں حسد' بغض اور کینہ نہیں رکھتے۔

◉ جو مل جائے وہ کھاتے ہیں اور کھلاتے ہیں زیادہ جمع کرنے کی حرص نہیں کرتے۔

◉ مٹی کے گھر بناتے ہیں کھیل کر گرا دیتے ہیں یعنی بتاتے ہیں کہ یہ دنیا مقام بقا نہیں بلکہ مقام فنا ہے۔

بشریٰ طاہر...... لیاقت آباد' کراچی

بچے ہمارے عہد کے

بچہ: ''میڈم میں آپ کو کیسا لگتا ہوں؟''

میڈم: ''بہت ہی پیارے۔''

بچہ: ''تو میں امی ابو کو بھیجوں؟''

میڈم: ''وہ کیوں؟''

بچہ: ''تا کہ ہماری بات آگے چلے۔''

میڈم: ''یہ کیا بکواس ہے؟''

بچہ: ''ٹیوشن پڑھانے کے لیے میڈم بس! آپ بھی کیبل کے ڈرامے دیکھ دیکھ کر خراب ہو گئی ہیں۔''

اقراء لیاقت...... حافظ آباد

خوشبوسخن

عمر اسرار

نیا سال

ہر نئے سال میں
یہ دعا کرتی ہوں
خدا کرے
یہ سال ہماری محبتوں کا
امین ہو
اور آسمان پر کوئی ستارہ
ہمارے ملن کے لیے
جگمگائے
اور
لوح ازل پر میرا نام
تمہارے نام کے ساتھ لکھا جائے

ریحانہ سعیدہ.....لاہور

دسمبر

ٹھہر جاؤ نہ
اے! دسمبر ٹھہر جاؤ نہ
ابھی لمحے نہیں بکھرے
ابھی موسم نہیں بچھڑے
میرے کمرے کی ٹھنڈک میں ابھی کچھ دھوپ باقی
ہے
میرے آنگن کے سب پودے ابھی گنگناتے ہیں
میرے بے چین ہونٹوں پہ ابھی مسکان ویسی ہے
کسی کے لوٹ آنے کا ابھی امکان باقی ہے
دسمبر
ایک بات بولوں میں
اگر تم مان جاؤ تو
دسمبر ٹھہر جاؤ نہ
سنو!
دسمبر ٹھہر جاؤ نہ

ایم جے قریشی.....ڈی آئی خان

غزل

میرے پاس امانت ہے اب بھی
سب موسم تیری یادوں کے
کچھ خوشبو تیری باتوں کی
میرے پاس امانت ہے اب بھی
سب موسم تیری یادوں کے
کچھ خوشبو تیری باتوں کی
اک دنیا تیرے وعدوں کی
اور ٹوٹے پھوٹے کچھ سپنے
میرے پاس امانت ہے اب بھی
میرے دل میں اب تک زندہ ہے
اک آس تیرے لوٹ آنے کی
الفت کے سبھی نغمے جاناں
میں اب بھی گنگناتا ہوں
تیرے نام سے جوڑ کر اپنا نام
سو بار میں لکھتا اور مٹاتا ہوں
اور اپنا دل بھلاتا ہوں
میں نے سنبھال کر رکھے ہیں
کچھ خواب تیرے ان آنکھوں میں
کچھ اجڑے پھول کتابوں میں
تیرے نام کے خط اور افسانے
جو لکھے ہجر کی راتوں میں
میرے پاس امانت ہے اب بھی

کاشف محمود.....ترنول

انتظار

رت پلٹ جائے گی روپ ڈھل جائے گا
وقت ہاتھوں سے آ کر نکل جائے گا
آ سکو تو چلے آؤ ایسے میں تم
ورنہ کل یہ زمانہ بدل جائے گا
پھول کھلنے لگے ہم سے ملنے لگے

دل میں ہیں شوخیاں ہونٹ ہلنے لگے
چاندنی رات میں چاند ہے کہہ رہا
جو نہ اب آسکا وہ نہ کل آئے گا
سن اے بادِ صبا ان کے تو شہر جا
میری بے تابیاں جا کے ان کو بتا
دل کی بے باکیاں، شوخ شہزادیاں
کتنے موسم گئے کتنے ساون گئے
ان کے وعدہ پر کب تک جئے گا چمن
یاد ہی یاد میں دم نکل جائے گا
رت پلٹ جائے گی روپ ڈھل جائے گا
وقت ہاتھوں سے آ کر نکل جائے گا
ادیب سمیع چمن......حیدرآباد

غزل

ہر طرف اک جمال ہے تیرا
خوب جاناں کمال ہے تیرا
کس قدر آپ مجھ کو چاہیں گے
کتنا مشکل سوال ہے تیرا
یہ جو آتے ہیں خواب راتوں کو
ہم سے رشتہ بحال ہے تیرا
زندگی کو سکون ملتا ہے
کتنا سندر خیال ہے تیرا
بستی بستی تجھے تلاش کیا
ملنا شاید محال ہے تیرا
تو نے تقسیم کی وفا رانا
کام یہ بھی بے مثال ہے تیرا
قدیر رانا......راولپنڈی

غزل

ہے مثال انساں ترے انجام کی
ڈوبتا سورج اداسی شام کی
اپنا بویا خود ہی کاٹیں گے سبھی
کیا حقیقت ہے ترے الزام کی
چھوڑ کر شہروں کو جنگل میں رہیں
ایک ہی صورت ہے یہ آرام کی
کیا جلے گا اب چراغِ زندگی
آندھیاں چلنے لگیں آلام کی
مے کشی کا اس پر بھی الزام ہے
جس نے صورت بھی نہ دیکھی جام کی
آج گلشن میں نہ جانے کیا ہوا
چار سو ہے کیفیت کہرام کی
گو قمر دیوانگی کی زد میں ہے
بات کر جاتا ہے پھر بھی کام ہے
ریاض حسین قمر......منگلا ڈیم

غزل

مہکتے غنچے کچھ وصل کے پھول شام سے پہلے
روز مہکتے ہیں تیری امیدیں شام سے پہلے
ریزہ ریزہ ہو کر بکھر گئے راہوں میں پھر
جتنے پھول کھلے تھے گلشن دل میں شام سے پہلے
میرے گھر میں بھی آجائے کبھی تو بہار
بھٹکے سے آجاؤ تم یوں ادھر شام سے پہلے
پھر سے یوں نظر نہیں آئے سب لوگ آج
جو دم بھرتے تھے محبت کا شام سے پہلے
تیرے بغیر فضا ساری اداس ہے ہم سفر
زندگی بہت با رونق تھی شام سے پہلے
زیست وہ نہیں رہی جو نظر آتی ہے تجھے
اے میرے ہم نفس یوں شام سے پہلے
تجھے بھلا ہوا نہ کہیں گے ہم جاوید
لوٹ آؤ جو ذرا اگر شام سے پہلے
محمد اسلم جاوید......فیصل آباد

قسط نمبر 18

جگت سنگھ

شمیم نوید

تاریخ کے صفحات میں محفوظ سرزمین پنجاب کی ایسی دلگداز داستان جو کلاسک داستانوں میں شمار ہوتی ہے..... جوروجبر کے خلاف بغاوت کی آتشیں آندھیوں کا احوال' جو حاکمانہ غرور کے کوہساروں کے ساتھ پورے جاہ و جلال سے ٹکراجاتی ہیں۔ یہ کہانی ان لوگوں کے لیے بھی فسانۂ عبرت ہے' جو آنے والی نسلوں کو انتقام اور دشمنی کے جذبات منتقل کرتے رہتے ہیں اور سیدھے سادھے نوجوان "جگت سنگھ" بن جاتے ہیں اور پھر حالات کسی کے قابو میں نہیں رہتے۔ اس کہانی کا مرکزی کردار "جگت سنگھ" ایک ایسا ڈاکو ہے جس کا نام سن کر بڑے بڑے بہادروں کا پتہ پانی ہو جاتا تھا۔ دراصل فطری طور پر امن و آشتی کا پیامبر ہے۔ "جگت سنگھ" کے کردار کا رومانی پہلو' جو شروع سے آخر تک "چندن" اور "ویرو" کی صورت میں اس کہانی میں رچا بسا نظر آتا ہے اس بات کا معتبر ترین گواہ ہے کہ لطیف جذبات رکھنے والا نوجوان جسے دنیا خطرناک ڈاکو کے طور پر جانتی ہے اندر سے کتنا نرم اور محبت کرنے والا ہے۔
"جگت سنگھ" کہاں سے چلا اور کہاں پہنچا' آئیے قارئین یہ جاننے کے لیے ہم بھی زیر نظر کہانی میں "جگت سنگھ" کے ساتھ ساتھ گاؤں کے سرسبز کھلیانوں' اونچے نیچے ٹیلوں اور پر خطر کھنڈرات کے نشیب و فراز میں سفر کرتے ہیں۔

جیل کے بڑے فولادی دروازے کے برابر ملاقات کا کمرہ تھا۔ اسے کمرہ نہیں پنجرہ کہا جاسکتا تھا۔ جنگلی درندے کی طرح اس پنجرے میں قیدی کو لایا جاتا اور جالی کی دوسری جانب اس کا رشتے دار کھڑا رہتا۔ خیر خیریت معلوم کر کے' کچھ آنسو بہانے کے بعد اطمینان دلا کر انہیں الگ ہو جانا پڑتا۔ دور دور سے گھنٹوں مسافت طے کر کے جیل میں آ کر نمبر لگایا جاتا۔ تکلیف اٹھا کر کارندوں اور چوکیداروں کا احسان لے کر بدلے میں کیا ملتا؟ گھڑی دو گھڑی کی ملاقات۔ آنکھوں آنکھوں میں ملن' پھر جدائی۔ اگلے دروازے میں پانچ سات ملاقاتیوں کو داخل کر کے باقی لوگ جالی کے ایک جانب قطار میں کھڑے رکھے گئے۔ ان میں چندن کور بھی شامل تھی۔

عقبی دروازے سے قیدیوں کے نام پکارے گئے اس طرح ایک کے بعد ایک قیدی داخل ہو کر اپنے رشتے داروں کے سامنے کھڑا ہوتا رہا۔ دونوں ہاتھوں میں بچے کو اٹھا کر چندن نزدیک آتے ہوئے جگت سنگھ کو بے چین نظروں سے دیکھنے لگی۔ اس نے اندر آنے سے پہلے دل مضبوط کر لیا تھا۔ اس نے سوچا تھا کہ ان کے سامنے نہیں روؤں گی۔ جس سے ان کا دل دکھے ایسی کوئی بات نہیں کروں گی۔ جگت کو دیکھ کر جیسے اس کا یہ فیصلہ ختم ہو گیا۔ اس کے ہاتھوں میں کپکپاہٹ ہوئی۔ پھر بھی چندن کور نے آنکھوں میں امڈتے ہوئے آنسوؤں کو روک لیا۔ پورے سال بعد شوہر سے ملاقات ہو رہی تھی۔ بہت کچھ کہنا اور سننا تھا۔ اس کی فولادی بانہوں میں سمٹ جانا تھا۔ اس کے چوڑے سینے پر سر رکھ کر رو لینا تھا مگر نہیں...... وہ یہ سب کچھ نہیں کر سکتی تھی۔ اس کے ہاتھ پیر زنجیروں

میں جکڑے ہوئے تھے۔ اس کے ارد گرد قیدی اور عقب میں چوکیدار تھے۔ چندن کے گرد بھی ملاقاتی تھے اور ان کے درمیان زنگ آلود فولادی جالی۔ دونوں کی نظریں ملیں۔ چار آنکھوں کی چمکتی سطح کے نیچے محبت کا سمندر جوش مارنے لگا۔ الفاظ لبوں تک آتے آتے جیسے لوٹ جاتے تھے۔ خاموش جگت نے چندن کے ہاتھوں میں ننھے ننھے پیر اچھالتے ہوئے بیٹے کو دیکھا۔ اپنے پہلے بیٹے پر نظر پڑتے ہی باپ کی محبت کی روشنی جالی کے سوراخوں سے بہنے لگی۔

''رنگ تو ماں سے زیادہ گورا ہے۔''

''مگر طوفانی تمہارے جیسا ہے۔'' چندن کور نے کبھی بیٹے کی جانب کبھی جگت کی جانب دیکھ کر فخریہ لہجے میں کہا۔ وہ جگت سے ملی اس سے زیادہ باپ بیٹے کا ملاپ ہوا۔ اس سے اس کا دل بھر آیا جگت کو بیٹے کے سر پر ہاتھ پھیرنے کی زبردست خواہش ہوئی مگر درمیان میں جالی تھی۔ صرف انگلی کا ایک حصہ باہر نکل سکتا تھا۔ لحہ بھر کے لیے اسے جنون سا سوار ہوگیا۔ جی چاہا جالی کو ہلا کر گرا دے اور بچے کو سینے سے لگالے۔ اس کے نرم سرخ رخساروں پر بوسوں کی بارش کردے۔ اس کی نرم ہتھیلیاں اپنے چہرے پر پھرالے۔ باپ کی محبت کا جوش پہچان کر چندن کور قریب آ گئی۔ بیٹے کا سر جالی سے لگادیا۔ اس کے بالوں کو جگت کے دائیں ہاتھ کی انگلیوں کا لمس ملا تو تب لب کپکپائے۔ بھیگے الفاظ باہر آئے۔

''بیٹا......! وہ گلوگیر آواز میں بولا۔ پھر آواز میں جوش لا کر بولا۔ ''بڑا ہو کر ماں کا خیال رکھنا۔ باپ کے نام کو نیچا نہ کرنا۔'' چندن کور کا دل دہل رہا تھا۔ وہ سوچ رہی تھی یہ بول ملاپ کے ہیں یا جدائی کے؟ اس کا دل اس طرح دھڑک رہا تھا جیسے وہ ہمیشہ کے لیے جدا ہونے والے ہوں۔

''پھر آؤں گی تو اسے لیتی آؤں گی۔'' چندن کور نے سوچا' کچھ تو کہنا چاہیے۔ ''تب تک بیٹھنا سیکھ جائے گا ممکن ہے زبان بھی کام کرنے لگے۔''

''پھر......'' جگت نے آہ بھری' مگر آگے کے الفاظ دل میں بولا۔ ''اب پھر ملاقات ہوگی۔ جیل توڑ کر آؤں گا یا پھانسی پاتے وقت بیٹے کو کھلانے کی خواہش کا اظہار کروں گا۔''

''چلو......چلو! ملاقات ختم ہوگئی۔'' ایک سخت آواز سنائی دی۔

''صرف اتنی سی دیر میں؟'' کوئی چیخ کر بولا۔ آخری نظریں ملنے لگیں۔ دل نہ چاہنے کے باوجود قیدیوں کو زبردستی ہٹنا پڑتا تھا اور ملاقاتیوں کو لوٹ جانا پڑتا تھا۔ چندن کور آخر تک جگت کو جاتے دیکھتی رہی۔ پھر اس کی آنکھیں بھیگ گئیں۔ اس جانب سے ملاقاتی اندر گھسے آرہے تھے' دوسری جانب سے قیدی جھانک رہے تھے۔ گھر واپس لوٹنے تک راستے بھر ماں جی چندن کور سے جگت کے متعلق بار بار معلوم کررہی تھیں۔

''بیٹے کو دیکھ کر اس نے کیا کیا؟ وہ خوش تو تھا؟ تم اس کے سامنے روئی تو نہیں تھیں؟ میرے لیے کیا کہہ رہا تھا؟ اب بھی ناراض تو نہیں؟''

بیٹے سے ملنے کے لیے تڑپتی ہوئی ماں کا دل بے چینی کا اظہار کررہا تھا۔

''تمہیں کچھ کہنا ہے؟'' جج نے آخری بار جگت سے پوچھا۔ جگت نے سر ہلا کر انکار کیا اور جج نے فیصلہ سنادیا۔

''ایک ساتھ دو انسانوں کو قتل کرنے والے گنہگار پر کسی طرح سے رحم نہیں ہوسکتا۔ قانون میں

موجود اصولوں کے مطابق میں اسے زیادہ سے زیادہ سزا کرر ہاہوں۔ موت کی سزا......!''

عدالت میں ایک سناٹا چھا گیا۔ سوہن سنگھ' ہزارہ اور کرتارا کی گردنیں جھک گیں۔ کسی نے آہ بھری۔''بے چارہ......!''

''صاحب! مجھے کچھ کہنا ہے۔'' سب چونک گئے' مجرم کیا کہنا چاہتا ہے؟ فیصلے کے بعد کسی کی بات نہیں سنی جاتی۔ جج صاحب کھڑے ہونے کی تیاری کررہے تھے۔

''اب تمہارے بولنے کو نوٹ نہیں کیا جائے گا۔نہ ہی سزا میں کمی بیشی ہوگی۔''

''میں کمی بیشی نہیں چاہتا۔'' جگت نے کہا۔ ''آپ کی اطلاع کے لیے عرض ہے کہ پہلے مجھے ایک پھانسی ہوچکی ہے۔ایک شخص کو بے چارے جیل والے دوبار پھانسی کیسے دے سکیں گے؟''

''نان سنس......!'' جج غصے میں کھڑا ہوگیا اور ہاتھ ہلا کر پولیس والوں کو اشارہ کیا۔''اسے لے جاؤ۔''

○......❖......○

موت کی سزا پانے والے قیدیوں کا سیل' جیل میں سب سے آخر میں تھے۔ان قیدیوں کا چھوٹی بڑی سزا کاٹنے والے دوسرے قیدیوں سے ملنا نہیں ہوتا تھا' اس وجہ سے جگت اور چنا الگ ہوگئے تھے۔جگا کے ساتھ مل کر ڈاکا ڈالنے والے کیس میں چنا کو آٹھ سال قید ہوئی تھی۔امرتسر کی چھاؤنی کے قتل میں چنا ملوث نہیں تھا اس لیے اسے عدالت میں اس کے ساتھ نہیں لایا جاتا تھا۔

''چنا ابھی عدالت سے لوٹا نہیں ہوگا۔'' اندھیرے سیل میں ٹہلتے ہوئے جگت بڑبڑایا۔اس کی بڑبڑاہٹ سن کر چوکیدار کوئی اطلاع فراہم کرے گا اس خیال سے وہ بولا تھا۔''چنا سنگھ کے قتل کا آج فیصلہ ہونے والا تھا۔'' چوکیدار دو ہتھیلیوں کے درمیان بیڑی چھپا کر خاموشی سے دم لگا رہا تھا۔اس نے قیدی کے بولنے پر دھیان نہیں دیا تو جگت کو غصہ آ گیا۔

''بیڑی کے دم لگانے میں اتنا لطف آ رہا ہے مہندر سنگھ؟'' یہ سن کر وہ چونکا۔ جگت یہی چاہتا تھا۔''سکھ ہو کر بیڑی پیتے ہو اس سے مجھے اختلاف نہیں مگر اس میں چرس کی بو کیوں آ رہی ہے؟ سپرصاحب کو یہ پتہ چل گیا تو تمہاری ملازمت چلی جائے گی۔'' چوکیدار مہندر نے گھبراہٹ اور ناراضگی سے آدھی پی ہوئی بیڑی جوتے کے نیچے مسل دی۔ اس کے چہرے کے تاثرات کہہ رہے تھے کہ جگت کو چرس کی بدبو کہاں سے آئی؟

''میرے بیٹے کی ناک بڑی تیز ہے۔'' چوکیدار نے سوچا۔

''مجھ سے چھپانے کی ضرورت نہیں۔'' جگت نے اسے بہلانا شروع کیا۔''چغلی کھانے والوں سے مجھے نفرت ہے۔'' پھر آہستہ سے بولا۔''مگر وہ مسلی ہوئی بیڑی ہٹادے ورنہ وہ چغلی کھاجائے گی۔'' چوکیدار کی آنکھوں میں سختی کم ہونے لگی۔ اسے یہ قیدی دوستی کے لائق نظر آنے لگا۔ابھی تک وہ اس سے الگ رہتا تھا۔ رہنا پڑتا تھا۔ چھوٹے سوپر سے جگت نے جھگڑا کیا تھا اس لیے اسے سخت حکم ملا تھا کہ جگت سے کوئی ایک لفظ نہیں بولے گا مگر بڑے افسران پر چھوٹے چوکیداروں کو ایک طرح کا غصہ ہوتا ہے جس کا وہ اظہار نہیں کرسکتے۔ کوئی قیدی صاحب کو تنگ کرے تو چھوٹے چوکیدار دل میں خوش ہوتے ہیں اور کہتے ہیں کہ ہم پر حکم چلاتے ہو مگر اس سر پھرے قیدی نے تمہارا ناک میں دم کردیا۔ مہندر نے خود اپنی آنکھوں سے چھوٹے سوپر کو جگا کے ہاتھوں بے عزت ہوتے دیکھا تھا۔

اسی لیے اس کے دل میں قیدی کے لیے چھپے ہوئے خوف کے ساتھ احترام بھی تھا۔
''ہے تو رعب دار۔ ورنہ اتنے ڈاکے اور قتل کس طرح کر سکتا؟'' مہندر نے سوچا۔ اس نے اتنے دن سے دل میں دبائے ہوئے احترام کو ظاہر کرتے ہوئے کہا۔
''جگا! تم نے اس دن چھوٹے صاحب کو کافی تنگ کر دیا تھا۔'' پھر متجسس انداز میں پوچھا۔ ''فرض کرو تمہارے ہاتھ میں رائفل آ جاتی پھر؟''
''پھر......'' جگت نے سوچا اس شخص کو باتوں میں بہلا کر اپنا بنانے کا موقع ہے پھر وہ ہلکی سی مسکراہٹ کے ساتھ بولا۔ ''پھر تھوڑی دیر رائفل واپس دینے کے سلسلے میں سوپر کو پریشان کرتا۔''
''تم فائر کرتے یا نہیں؟'' ہلکی سی ہچکچاہٹ کے ساتھ پوچھا گیا۔
''ایک کارتوس ضائع کرنے سے کچھ فائدہ نہ ہوتا۔'' جگت نے دھیمے لہجے میں کہا۔ ''خواہ مخواہ ایک قتل سے ہاتھ رنگنا مجھے پسند نہیں تھا پھر میری چھوٹے صاحب سے پرانی دشمنی بھی نہیں ہے۔''
''میرا سانس تو اوپر کا اوپر رہ گیا تھا۔'' پھر کچھ دیر رک کر بولا۔ ''اگر رائفل تمہارے ہاتھ میں پہنچ جاتی اس صورت میں سب سے پہلے میں باہر چلا جاتا۔''
''کیوں......اتنا ڈر لگا تھا؟''
''کیا کہا جا سکتا ہے بھائی؟ اس وقت تمہارا چہرہ بپھرے ہوئے شیر کی طرح نظر آ رہا تھا' تم ٹرائیگر دبا دیتے تو میرے بال بچے یتیم ہو جاتے۔'' چوکیدار اب دل کھول کر باتیں کر رہا تھا۔ اس کا جگت کو یقین ہو گیا۔
''آج تک میرے ہاتھ سے کسی بے گناہ کا قتل نہیں ہوا اور کبھی ہو گا بھی نہیں۔'' جگا نے کہا۔

''پھر تو بہت اچھی بات ہے۔'' مہندر کو جگت کے الفاظ پسند آئے۔ جگت کو چنا کی فکر تھی۔ اس کے لب کھلنے والے تھے۔ اسی لمحے چوکیدار پھرتی سے کھڑا ہو گیا اور ٹہلنے لگا۔ باہر کا دروازہ کھلنے کی آواز سنائی دی۔ سوپر کے راؤنڈ کو ابھی دیر تھی پھر کون آ رہا تھا؟ چوکیدار یہ سوچ کر اٹینشن ہو گیا ممکن ہے پھانسی کا کوئی نیا قیدی ہو اور اس کا اندازہ صحیح تھا۔ اسی وقت چنا کو لے کر پہریدار داخل ہوئے۔ چوکیدار نے جگا کی جانب دیکھا۔ چنا کے فیصلے کی خبر لینے کو جی چاہا مگر اس کی ضرورت پیش نہیں آئی۔ پہریدار چنا کو اسی طرف لا رہے تھے۔ اسے یاد آیا کہ ایک کے علاوہ تمام سیل بھرے ہوئے تھے۔ ایک خالی سیل جگا کے برابر میں تھا۔ ''ابھی خود بخود پتہ چل جائے گا۔'' جگا نے سوچا۔ بیڑی کی کھڑکھڑاہٹ قریب آ رہی تھی۔ ہر نئے قیدی کی آمد جیل کی فضا میں ارتعاش پیدا کر دیتی تھی۔ کون آیا؟ کیوں آیا؟ یہ جاننے سے کچھ تازگی آ جاتی۔ دوسرے قیدیوں کو راحت ہوتی کہ ہمارے جیسے دوسرے بھی ہیں جن کے گلے میں پھانسی کا پھندا پڑنا ہے۔
چنا ہر کوٹھری کے دروازے کو دیکھ رہا تھا۔ جگا کہاں ہے؟ وہ یہ جاننے کو بے تاب تھا۔ اچانک اس کے پیر رک گئے۔ بیڑیاں کھنکھنا کر خاموش ہو گئیں۔ اسے فولادی سلاخوں کے پیچھے کھڑا ہوا جگا نظر آیا۔ چنا اس کی جانب دیکھ کر مسکرایا مگر یہ کیا؟ جگت کے لبوں پر مسکراہٹ نہیں تھی۔ اسے یہ دیکھ کر صدمہ ہوا۔ اس کی کلائیوں کی زنجیر جھنجنا اٹھی۔
''چنا! تمہیں......تمہیں پھانسی؟'' اسے جگت کے الفاظ سنائی دیئے۔
''ہاں......اب میں بھی تمہارے ساتھ مل گیا۔''

چنا خوش ہو کر بولا۔ ''آخر تک تمہارا ساتھ دینے کا میرا ارادہ تھا وہ پورا ہو گیا۔ میں نے جیلر صاحب سے کہا ہے کہ پھانسی بھی ہمیں ایک ساتھ پانا ہے اتنی مہربانی کرنا۔'' پیچھے کھڑے ہوئے چوکیدار نے چنا کے حلق پر بندھی ہوئی رسی کھینچ کر آگے بڑھنے کا اشارہ کیا۔ جاتے ہوئے چنا نے گردن گھما کر دیکھا...... جگت سلاخوں کے پیچھے سر ٹکا کر آہیں بھر رہا تھا' تاکہ اس کی بھیگی آنکھیں کوئی دیکھ نہ لے۔

O...... ❖ ......O

دوسرے دن جگت کو پتہ چلا کہ چنا کو چار چھ دن کے لیے برابر والا سیل مل گیا ہے۔ دونوں پرانے ساتھیوں کو برابر رکھنے میں چھوٹے سوپر صاحب کو خطرہ محسوس ہوا ہوگا کیونکہ چار دن بعد ایک کو پھانسی ہونی تھی' اس قیدی کے خالی سیل میں چنا کو بھیجنے کا پروگرام تھا۔

''اب جلدی کچھ کرنا پڑے گا۔'' جگت سوچنے لگا۔ چنا برابر میں ہے' اس کے سیل چھوڑنے سے پہلے فرار کا راستہ اختیار کرنا پڑے گا۔ اسے آزاد کرائے بغیر وہ اکیلا کس طرح فرار ہو سکتا تھا؟

''مہندر! تم نے بہت دن سے نشہ نہیں کیا؟'' جگا نے آہستہ سے چوکیدار کو مخاطب کیا۔ ''کچھ انتظام ہو سکتا ہے؟''

جگت کی آواز سن کر چوکیدار' اس طرح چونکا جیسے بچھو نے ڈنک مار دیا ہو۔ وہ جگا سے نظر نہیں ملا پا رہا تھا۔ وہ اسے جواب دینے کی بجائے ٹہلنے لگا۔ جگت اس کی بے چینی سمجھ گیا۔ اس نے تو صاف انکار کا اندازہ لگایا تھا۔ اس کی بجائے وہ شخص خاموش رہا تھا۔ جگا نے نتیجہ اخذ کیا کہ اسے پگھلایا جا سکتا تھا۔ ایسے مطالبے پر اکثر چوکیدار خوف سے بھڑک جاتے ہیں۔ کبھی کبھی کام کرنے پر تیار بھی ہو جاتے ہیں' ایسے تجربات اسے جیل میں ہو چکے تھے۔ اسے تو ابتدا کرنی تھی۔

چوکیدار کے ذہن میں جگت کے الفاظ گونج رہے تھے۔ ایسے لین دین میں پکڑے جانے کی صورت میں ملازمت سے ہاتھ دھونے پڑتے ہیں۔ جمع کیا ہوا فنڈ بھی چھن جانے کا خطرہ تھا اور ملازمت جانے کی صورت میں ریٹائرمنٹ کی پینشن کا حق بھی ختم ہو جاتا۔ وہی زندگی کے آخری ایام کا سہارا تھا۔ ایک بار اس نے کسی کو بیڑی سپلائی کرنے کی حماقت کر ڈالی تھی۔ پھر بات کھل جانے پر اسے بھگتنا پڑا تھا۔ اس وقت تو وہ شراب مانگ رہا تھا۔ ذہنی الجھنوں کو دبانے کے لیے اسے چرس کی بیڑی کا سہارا لینا پڑا۔ اس کے نشے سے ذہن کو راحت ملی۔

''ایسی کوئی خاص بات نہیں ہے۔'' اس کے ذہن نے پلٹا کھایا۔ بیڑی میں پکڑا گیا تھا مگر دوسرے نشے باز کو اس نے چھ ماہ تک گانجا پہنچایا تھا۔ پھر بھی کچھ نہ ہوا اور لمبی کمائی ہو گئی۔ اب وہ سنبھل کر شراب والا کام کرے تو اس صورت میں دوبارہ آمدنی شروع ہو جائے گی۔ بیڑی کے ٹوٹے کو پیر کے نیچے کچل کر وہ جگت کی جانب دیکھنے لگا۔

''تم نشے کے عادی ہو؟'' جواب میں جگت مسکرایا۔ بے چارہ لالچ کے جال میں پھنس رہا تھا۔

''نشے کے بغیر میں ایک دن نہیں رہ سکتا پیارے دوست۔ ایک سال سے روزہ رکھ رہا ہوں۔ اب دل نہیں رہتا۔'' پھر افسوس کرنے والے لہجے میں بولا۔ ''اب زیادہ دن زندگی بھی نہیں رہے گی۔ یار! ہم پھانسی پانے سے پہلے تمہارے افسران سے آخری خواہش پوری کرنے کی شرط میں یہی کہیں گے کہ جی بھر کر پلا دو۔''

ایک نشے باز کو دوسرے نشے باز سے ہمدردی

ہوتی ہے۔ چوکیدار پگھل گیا پھر بھی اس نے ہاں کہنے میں جلدی نہیں کی۔ ”جگت فی الحال سخت انتظام ہے۔ خطرہ ہے۔“

”ہم تو خطرے میں ہی ہیں یار۔“ جگت نے بے پرواہی سے کہا۔ ”تم کام نہیں کرو گے تو دوسرا کرلے گا۔“ مہندر تھوڑا ناراض ہوا۔ جگت صحیح کہہ رہا تھا۔ اگر اس نے اس موقع سے فائدہ نہیں اٹھایا تو رات کی شفٹ والا کما لے گا۔

”مگر مال لانے کے پیسے؟“ جگت اسی لمحے کے انتظار میں تھا۔ اس نے فرش پر بچھے ہوئے کمبل کے نیچے سے دس کا نوٹ نکال کر دکھایا۔

”چھ روپے کی بوتل آتی ہے۔ باقی تمہارے۔“ نوٹ دیکھ کر چوکیدار کی آنکھوں کی چمک نے لالچ کا جواب دے دیا۔ اس بات کا یقین ہوجانے کے بعد جگت نے دس کا نوٹ اس کی جانب اچھال دیا۔

”ارے...... کوئی دیکھ لے گا۔“ یہ کہتے ہوئے چوکیدار نے نوٹ پر جھپٹا مارا اور اطراف میں دیکھ کر نوٹ جیب میں ٹھونس لیا۔

”اور نوٹ بھی ہیں پیارے۔“ جگت نے کہا۔ ”ہفتے میں ایک بار پینا پلانا ہوتا رہے گا۔“

”مگر ایک بات کا خیال رکھنا پڑے گا۔“ چوکیدار نے اسے خبردار کیا۔ ”صاحب کا صبح شام راؤنڈ ہوتا ہے اس سے پہلے نہ پینا۔ اور میٹ روٹی دینے آئے اس وقت منہ سے بدبو نہیں آنی چاہیے۔“

”ارے! تم مجھے ہوشیار رہنے کے لیے سمجھا رہے ہو؟“ رشوت دینے کے بعد جگت اسے دبا سکتا تھا۔ ”اتنے سال ڈاکا زنی کی ہے میں اس طرح اناڑی پن نہیں کرسکتا۔“ مہندر کا ڈر ختم ہوگیا۔ شام ڈیوٹی تبدیل ہونے سے پہلے جگت نے اسے یاد دلایا۔

”کل صبح ڈیوٹی پر آؤ تو ساتھ لیتے آنا۔“

”بہتر ہے۔“ چوکیدار نے کہا۔ پھر پر مذاق لہجے میں بولا۔ ”کافی پیاسے معلوم ہوتے ہو۔“

اسی رات موسم کی پہلی بارش ہوئی اور جگت کی پیاس بڑھ گئی۔ اس نے پوری رات پیاس سے تڑپتے ہوئے گزار دی۔ آنکھیں بند ہونے سے پہلے وہ فرار ہونے کے منصوبے اپنے ذہن میں مرتب کرچکا تھا......!

O......❖......O

صبح شام نصف گھنٹے قیدیوں کو سیل سے باہر بنے ہوئے برآمدے میں ٹہلنے کی اجازت ملتی تھی۔ اس برآمدے میں دونوں جانب دیوار تھی اور اوپر فولادی سلاخوں کا جال جس کے درمیان سے ہوا اور روشنی آتی تھی۔ سیل کے تالے کھولنے بند کرنے کے لیے دوسرا سنتری آتا تھا۔ ہر سیل کا تالا کھول کر قیدی کو برآمدے میں نکالا جاتا تھا پھر برآمدے کی جالی کو تالا لگا کر سنتری دوسرے سیل کو کھولنے چلا جاتا۔ جب سنتری یہ کام انجام دے رہا ہوتا اس وقت ایک رائفل بردار چوکیدار ساتھ رہتا تاکہ کوئی اس پر حملہ نہ کردے۔ اس طرح برآمدے کا دروازہ بند ہونے پر کوئی فرار نہیں ہوسکتا تھا۔ جگت ان تمام چیزوں کو چیک کر رہا تھا۔ شراب کی بوتل صبح کے وقت سیل میں داخل ہوجانے کے باوجود اس نے پینے میں جلدی نہیں دکھائی تھی۔ بلکہ بوتل کپڑے میں لپیٹ کر رکھ دی تھی۔ سیل کھولنے کے لیے سنتری آیا۔

”کیسا مزاج ہے جناب کا؟“ کچھ قیدی جیل میں بادشاہوں جیسا مزاج رکھتے ہیں۔ سنتری نے اس وجہ سے جگا کو ”جناب“ کہا تھا۔

”جب تم آتے ہو تو ”جناب“ کو خوشی ہوتی

ہے۔'' جگت نے اسی لہجے میں جواب دیا۔ اس کے ارادے سنتری بھانپ نہ جائے اس لیے وہ چوکنا رہا۔ سنتری نے تالا کھولا' فولادی دروازہ کھلا۔ عام قانون یہ ہے کہ سنتری جب تک اپنا کام پورا کرکے برآمدے کے باہر نہیں چلا جاتا اس وقت تک قیدی سیل کا دروازہ نہیں کھول سکتا مگر ہر قانون کی گرفت آگے جاکر کمزور ہو ہی جاتی ہے یا نرمی اختیار کر لیتی ہے۔ ابھی سنتری پشت پھیر کر جا ہی رہا تھا کہ اسی لمحے جگت نے پھرتی سے سیل کا دروازہ کھولا۔ سنتری نے کچھ چونک کر گردن گھمائی۔ جگت نے ہنستے ہوئے کہا۔

''سیل میں دم گھٹتا ہے۔ جلدی سے باہر جانے کی بے چینی قابو میں نہیں رہتی دوست۔'' اس کی حرکت سنتری کو عام قسم کی نظر آئی۔ وہ قیدیوں کو نصف گھنٹے کھلی ہوا میں لاتا ہے یہ سوچ کر اسے کچھ فخر محسوس ہوا۔ وہ برابر والا سیل کھولنے چلا گیا۔ پہلی ریہرسل کامیاب رہی اس خوشی میں ٹہلتا ہوا جگت مسکرانے لگا۔ برابر والے برآمدے میں چنا بھی ٹہل رہا تھا' جگت نے اس کے پیروں کی زنجیر کی کھنک سے یہ اندازہ لگایا۔ سنتری کام ختم کرکے چلا گیا تو چوکیدار آپس میں مل بیٹھ کر گپیں ہانکنے لگے۔ جگت لمحے دو لمحے انتظار کرتا رہا' پھر دیوار کے قریب جاکر ہلکے سر میں سیٹی بجائی اور غور سے سننے لگا۔ چنا کے پیر کی زنجیر کی آواز تھم گئی۔ وہ سمجھ گیا چنا نے سیٹی سن لی ہے۔

''جو میں کہہ رہا ہوں سنتے جاؤ! اور ٹہلنا جاری رکھو۔'' اتنا کہہ کر جگت ٹہلنے لگا۔ چنا نے بھی ایسا ہی کیا۔ دونوں پھر دیوار کے درمیان رک گئے تو جگت بولا۔ ''پرسوں شام......'' اتنا کہہ کر وہ پھر آگے بڑھ گیا۔ ''جب میرا سیل کھلے......'' وہ پھر کچھ دور جاکر پلٹا۔ ''تم کو اس طرح شور مچانا ہے جیسے تمہیں سانپ یا بچھو نے کاٹا ہو۔ پھر چوکیدار دوڑ کر تمہارے پاس آئے گا اور میں سنتری پر قابو پالوں گا۔ تم نے سنا؟''

چنا کی جانب سے جواب نہ ملا تو اس نے پوچھا۔ ''تمہیں منظور ہے......؟ ٹھیک رہے گا؟''

تب دیوار کی دوسری جانب سے سیٹی کی آواز سنائی دی۔ جگت کو جواب مل چکا تھا۔ اسی لمحے چوکیدار مہندر نے جھانکا۔ ''آٹھ سو بیالیس تنہائی میں کیا بڑبڑا رہا ہے؟''

''یار کیا کروں؟'' جگت نے دانت نکالے۔ ''تم لوگ گپیں ہانکتے ہو اور ہمیں دیواروں سے باتیں کرنی پڑتی ہیں۔''

''تمہاری بات صحیح ہے۔'' چوکیدار نے ہمدردی دکھائی۔ ''بیرک کے قیدیوں کو یہ سکھ ہے کہ وہ آپس میں گپیں ہانک سکتے ہیں۔'' پھر مزید بولا۔ ''کل سے میری ڈیوٹی تبدیل ہو رہی ہے۔ میں جی وارڈ میں چلا جاؤں گا۔'' جگت کو یہ بات پسند آئی۔ کیونکہ وہ جو قدم اٹھانے والا تھا اس میں مہندر کی ذات نہ پھنسے یہ اس کی خواہش تھی۔ اس بیچارے نے بوتل لاکر اس کی مدد کی تھی اس لیے دکھاوے کی خاطر افسوس کا اظہار کیا تو چوکیدار بولا۔

''ہفتے پندرہ دن میں واپس آجاؤں گا۔ تمہارا مال تمہیں ملتا رہے گا۔''

''پھر تو اچھی بات ہے۔'' جگت محسوس کر رہا تھا کہ فرار ہونے کے حالات موافق ہوتے جا رہے ہیں......!

O......❖......O

دوسرے دن ٹہلنے کی خاطر سنتری نے سیل کھولا' اس وقت تک جگت ریہرسل پکی کر چکا تھا۔ سنتری کو اس میں کوئی خاص بات نظر نہ آئی۔ ان دو دنوں

میں اس نے شراب کی بوتل خالی کردی تھی۔ تیسرے دن اسے اسی خالی بوتل کا استعمال کرنا تھا' سنتری کو قابو میں کرنے کے لیے ......جگت دوپہر سے سارے منصوبے پر نظر ثانی کر رہا تھا۔ سنتری جیسے ہی دروازہ کھول کر پشت پھیرے گا میں جھپٹ پڑوں گا اور اس کی پشت سے بوتل کا منہ لگا کر دھمکی دوں گا۔ ''خبردار! اگر آواز نکالی تو پھونک دوں گا۔'' وہ حیرت میں ڈوب جائے گا' ممکن ہے گھبرا جائے۔ اسی لمحے چنا کی جانب سے چیخ سنائی دے گی جو قریب کا چوکیدار سنے گا۔ چوکیدار وہاں دوڑ جائے گا۔ میں سنتری کو دھکا دے کر باہر نکال دوں گا اور باہر سے دروازہ بند کر دوں گا۔ چوکیدار یہ سمجھے گا کہ سنتری باہر آیا ہے۔ میں عقب سے اس پر ٹوٹ پڑوں گا۔ اس کی رائفل چھین لوں گا۔ ضرورت پڑنے پر رائفل کا بٹ اس کے سر پر مار کر اسے بے ہوش کر دوں گا۔ اسے یہاں ایک بات یاد آئی' چنا کے سیل کا دروازہ کھولنے کے لیے چابی چاہیے۔ اس لیے سنتری کو بھی بے ہوش کر دوں گا اور چابی حاصل کرنی پڑے گی پھر چنا کو باہر نکالا جا سکتا ہے۔ رائفل کے بل پر دوسروں کو شور کرنے سے روکنا بھی ضروری ہے۔ البتہ دوسرے قیدیوں کو آزاد کیا جائے یا نہیں......؟ اس خیال نے کچھ دیر کے لیے اسے الجھن میں ڈال دیا۔ اگر موقع ہو تو ایسا کرنا برا بھی نہیں۔ جس قدر قیدی ساتھ ہوں گے ان کا زور بڑھے گا اور حالات سے نمٹا جا سکے گا۔ اس فیصلے پر پہنچتے ہوئے اس کا خون گرم ہو گیا۔ اگر یہ سازش کامیاب ہو گئی تو سنسنی پھیل جائے گی۔ وہ سوچنے لگا۔

اگر کسی کو پتہ چل گیا اور الارم بج اٹھا پھر؟ دوڑ بھاگ اور افراتفری مچ جائے گی۔ جیل کے گرد پہرہ لگ جائے گا اور فرار ہوتے ہوئے قیدیوں پر فائرنگ ہو گی۔ اس نکتے پر جگت رک گیا۔ اس کی بجائے چنا کے علاوہ ایک آدھ قیدی آزاد کیا جائے۔ انہیں باقی قیدیوں کے سیل کھولنے کا کام سپرد کرنا چاہیے۔ اس عرصے میں وہ دونوں دیوار کود سکتے ہیں۔ مگر دیوار کس طرح پار کی جائے؟ پچیس تیس فٹ بلند دیوار پار کرنے کے لیے کوئی چیز چاہیے۔ یہاں پھر گاڑی اٹکنے لگی۔ ذہن کہنے لگا کچھ دن پہلے پھانسی گھر میں رسی کے بنڈل رکھتے دیکھا گیا تھا۔ اسے یہ بات یاد آ گئی۔ پھانسی گھر کی دیوار اتنی بلند بھی نہیں تھی۔ وہ اندر کود کر رسی لا کر آسانی سے دیوار تک پہنچ سکتا تھا مگر پھر آخری سوال یہ تھا کہ بلند دیوار کے اوپری حصے تک رسی کس طرح باندھی جائے؟ جگت نے پیشانی پر ہاتھ مارا۔ باہر کی مدد کے بغیر ایسا کوئی ایڈوانچر بیکار تھا۔ وہ مایوس ہونے لگا۔ اسے پورا منصوبہ ترک کر دینے کی خواہش ہوئی۔

''مگر نہیں......اب جو کچھ ہو گا دیکھا جائے گا۔ منصوبے پر عمل تو کرنا ہی ہے۔ چوکیداروں کی دو تین رائفلیں قبضے میں کرنے کے بعد پھر کوئی مشکل نہیں ہو گی۔ ضرورت پڑنے پر دو تین لاشیں گرا دے گا۔ جب دوبارہ پھانسی کا حکم ہو چکا ہے تو اب قتل کی کیا سزا ملے گی؟ ہو سکتا ہے اس میں کام ہی آ جائے۔ اگر ایسی موت مل جائے تو وہ پھانسی سے بہتر ہو گی۔ جگت نے بیڑیوں کی جھنکار میں اپنے فیصلے پر آخری مہر ثبت کر دی۔ آخر ہر سیل کے دس پندرہ قیدیوں کو آزاد کر کے ایک کے بعد ایک کے شانے پر سوار ہو کر اوپر رسی باندھ دینا کون سا مشکل ہے؟ فرار ہونے میں وہ اور چنا آگے رہیں گے۔

اس نے دل میں فیصلہ کرلیا......!

دوسرے دن شام کو ٹہلنے کی خاطر سنتری سیل کھولنے آیا تو جگت نے بوتل ہاتھ میں تھامی ہوئی تھی...... وہ ہنسنا چاہتا تھا مگر ہنس نہیں سکا۔ جذبات کی وجہ سے اس کا چہرہ سخت ہو رہا تھا۔ تالے میں چابی داخل ہوئی اور اس کی رگیں کھنچ گئیں۔ کھلتے دروازے کی سلاخوں پر ایک ہاتھ کی مٹھی کس گئی۔ سنتری نے جیسے چٹخنی اٹھائی وہ باہر آنے کے لیے تیار ہو گیا۔

''تم بہت جلد باز ہو یار۔'' ایسا کہتے ہوئے سنتری نے جانے کے لیے پشت پھیری اور جگت نے دھکا دے کر دروازہ کھول دیا۔ اسی لمحے چنا نے برابر سے چیخ ماری۔

''مر گیا...... میری ماں...... مجھے کسی جانور نے کاٹ لیا ہے۔'' چیخ کے ساتھ ہی باہر کھڑا ہوا چوکیدار چنا کے سیل کی جانب جھپٹا۔ سنتری برآمدے کے دروازے تک پہنچا تھا اسی لمحے جگت نے بوتل کا منہ اس کی پشت سے لگا کر کہا۔

''خبردار......'' اور دوسرا ہاتھ اس کے حلق کے گرد کس دیا۔ اسی لمحے دوسرا چوکیدار دوڑتا ہوا ادھر آ نکلا۔ وہ چنا کی چیخ سن کر آ گیا تھا۔ رائفل اس کے ہاتھ میں تیار تھی۔ اس نے پہلے جگت کے سیل میں جھانکا۔ کچھ عجیب سا منظر دیکھ کر اس کی آنکھیں پھیل گئیں رائفل کی نال تن گئی۔ جگت کی پیشانی پر پسینہ بہنے لگا۔ اس کے ہاتھ سے بوتل نیچے گر گئی۔ شیشہ ٹوٹنے کی آواز پیدا ہوئی اور جگت کا دوسرا ہاتھ سنتری کی گردن سے نکل کر میکانکی انداز میں نیچے گر گیا۔ سنتری تیزی سے باہر نکلا او پوری قوت سے باہر کا دروازہ بند کر دیا پھر اس کی توجہ ٹوٹی ہوئی بوتل کے شیشے کے پاس پڑے ہوئے چابیوں کے گچھے کی طرف گئی۔ اب سارے چوکیدار وہاں جمع ہو چکے تھے۔ چنا کی چیخیں رک گئی تھیں۔

''دوسرے سیل کے قیدی کو کیا ہوا...... کیا ہوا؟''

وہ یہ کہتے ہوئے اپنے اپنے دروازے پر آ گئے تھے۔ دو چار لمحے تک سنتری اور جگت کی نظریں ملی رہیں اس کے خطرناک ارادے کا خیال آتے ہی سنتری کے پیر کپکپانے لگے۔ جگت کو بھی اپنی حماقت پر غصہ آ گیا۔ اب بازی پلٹنی پڑے گی۔

دروغہ جی! آپ کی چابیاں دوں؟'' جگا بولا۔ پھر بھی سنتری کچھ بول نہیں سکا۔ چوکیدار سنتری کے پسینے سے تر چہرے کی جانب اور جگت کے چہرے کی جانب عجیب سی نظروں سے دیکھ رہے تھے۔ 'چنا نے چیخ کر مجھے گھبرا دیا تھا۔'' جگت نے ہنسنے کی کوشش کرتے ہوئے کہا۔ ''مجھے ڈر سا لگا میں باہر نکلنے کے لیے دوڑا اور تم سے ٹکرا گیا۔'' اتنا کہہ کر اس نے آنکھیں نکالیں۔ ''اتنے گھبرا کیوں رہے ہو؟ مجھے گھور کیوں رہے ہو تم لوگ......؟''

سنتری اس کی سختی سے دہل گیا۔ یہ قیدی یقیناً خطرناک ہے۔ اس نے اس طرح اسے دھمکی دی ہے کہ اس کی شکایت نہیں ہونی چاہیے نہیں تو اس کی خیر نہیں۔'' سنتری سوچنے لگا۔ جگت نے چابیوں کا گچھا اٹھا کر دروازے کے باہر پھینکا۔ سنتری نے چپ چاپ اٹھا لیا۔ صورت حال سنجیدہ ہو گئی تھی۔ اسی لمحے وزن دار جوتوں والے قدموں کی آواز سنائی دی۔ کوئی بولا۔

''چھوٹے سو پر آ رہے ہیں۔'' سنتری سر تا پا لرز گیا۔ اتنی دیر میں جگت نے بے پروائی طاری کر لی۔ چھوٹا سو پر اس کے سیل کے قریب آ کر گرجا۔

''کیا گڑبڑ ہو رہی تھی؟ کس نے چیخ ماری تھی؟'' اس سے پہلے کہ کوئی جواب دیتا اس کی نظر

برآمدے میں پڑے ہوئے شیشے کے ٹکڑوں پر مرکوز ہوگئی۔ وہ سمجھ گیا۔ "شراب کی بوتل کہاں سے آئی؟" جگت خاموشی سے مسکراتا رہا۔ چھوٹے سوپر نے دانت پیس لیے۔ "تیری یہ مجال۔" پھر زور سے چلایا۔ "دیکھنا! میں تجھے ٹھیک کردوں گا۔" ہاتھوں کی مٹھیاں کستے ہوئے اس نے چوکیداروں کو حکم دیا۔ "اسے میرے آفس میں لے جاؤ' مجھے رپورٹ کرنا پڑے گی۔"

چھوٹے سوپر کے جانے کے بعد جگت نے سنتری کی جانب دیکھا۔ "خبردار! اگر میرے خلاف کچھ کہا تو۔"

سنتری کی شکل پر بارہ بج گئے۔ جگت نے جو کچھ کیا اگر وہ سچ مچ لکھا دے تو اس صورت میں اسے جیل کی سب سے بھیانک سزا ہوگی۔ اس خیال سے وہ لرز کر رہ گیا۔

O......❖......O

"بول شراب کی بوتل کون لایا؟" چھوٹے سوپر نے دانت پیس کر پوچھا مگر جگت خاموش رہا۔ چوکیدار اور سنتری بھی اس طرح خاموش کھڑے تھے جیسے چھوٹے صاحب کا غصہ برداشت نہ کرسکتے ہوں۔ "جرم کرنے کی سزا سے جرم قبول نہ کرنے کی سزا بھیانک ہوتی ہے یہ تم نہیں جانتے۔"

"پہلے میں جیل میں رہ چکا ہوں۔" جگت نے سکون سے جواب دیا۔ چھوٹے سوپر نے میز پر ہاتھ مارا۔

"میں جو پوچھ رہا ہوں وہی جواب دو۔ زیادہ ہوشیاری نہ کرو۔ سمجھے؟"

"اس کا جواب نہیں ملے گا۔"

"نہیں ملے گا؟" چھوٹا سوپر اچھل پڑا۔ کرسی پر سے وہ اسپرنگ کی طرح اچھل کر کھڑا ہوگیا تھا۔ غصے سے اس کی مٹھیاں بھنچی ہوئی تھیں۔ اس نے ایک ہاتھ بلند کیا مگر جگت کی پھیلی ہوئی آنکھیں اور مضبوطی سے بند ہونٹ دیکھ کر اس نے ارادہ بدل دیا۔ کچھ دن پہلے رائفل چھیننے کا واقعہ اسے یاد آ گیا گھونسے کے جواب میں یہ شخص اس کا سر پھاڑ سکتا تھا اتنی طاقت اس میں تھی۔ اس بات کا چھوٹے صاحب کو یقین تھا' اگر وہ اس کے سر میں ہتھکڑی مار دے پھر؟ اس نے جگا کو ٹھیک کرنے کا کام چوکیداروں کے سپرد کرنے کا فیصلہ کیا۔

"تمہیں اندھیری کوٹھری میں ٹھونس دوں گا تب پتہ چلے گا۔" پھر بھی جگت پر اثر نہیں ہوا۔ "تم نے فرار ہونے کا جو جرم کیا ہے اس کی سزا جانتے ہو؟"

"یہ تو جب تم سزا دو گے تو دیکھ لوں گا۔" مختصر سا جواب دیا گیا۔

"اچھی بات ہے۔" چھوٹے سوپر کے لیے اس قیدی کی ضد میں عزت جانے کا خطرہ معلوم ہوتا تھا۔ بڑے صاحب تک یہ معاملہ نہ پہنچایا جائے' سخت سے سخت قیدی بھی اس کے سامنے جھک جاتا تھا۔ اس سخت گیر صاحب کے نام سے قیدی کانپتے تھے۔ دوسری جیلوں میں بھی اس کی سخت گیری کی شہرت تھی۔

"اسے بڑے صاحب کے آفس کی کھڑکی کے قریب لے آؤ۔" چھوٹے سوپر نے چوکیداروں کو حکم دیا۔ جگت کو وہ لوگ باہر لے گئے۔ اس کے بعد اس نے سنتری سے کہا۔ "اپنی رپورٹ لکھاؤ۔" سنتری کو جگت کی دھمکی یاد آ گئی۔ اس خطرناک قیدی کے خلاف رپورٹ لکھواتے ہوئے اسے خوف آ رہا تھا۔ دوسرا خیال یہ بھی آیا کہ جگا نے شراب کی بوتل لانے والے کا نام بھی نہیں بتایا۔ اپنی مدد کرنے والے شخص کی خاطر وہ مضبوط رہا تھا اس لیے سنتری کے دل

میں اس کا احترام بھی تھا۔ حالانکہ یہ مضبوطی جلد یا بدیر ختم ہو جائے گی، سنتری یہ جانتا تھا پھر بھی جگا کے خلاف کچھ نہ کہنے کا اس نے ارادہ کر لیا تھا۔

"خاموش ہی رہو گے یا کچھ بھونکو گے بھی؟" چھوٹے سوپر کو غصہ کرنے کا موقع مل گیا۔ "بیوقوف گدھا! سیل کا دروازہ کھولتے وقت اتنا بے پروا رہا۔ ہاتھ باندھ کر کھڑا ہوا ہے۔"

"صاحب! غلطی ہوگئی۔ معاف کر دیں۔"

"پہلے یہ بتاؤ! کہ شراب کی بوتل لانے میں کس کا ہاتھ ہے؟" سنتری اس بات سے بے خبر تھا وہ گڑگڑانے لگا۔

"صاحب! میں اپنے باپ کی قسم کھا کر کہتا ہوں مجھے کچھ خبر نہیں ہے۔"

"تمہارا باپ جائے نرک میں، مجھے دو دن میں اس کا پتہ چاہیے نہیں تو میں بے پروائی کی رپورٹ کر دوں گا۔"

"صاحب! میں اس کے لیے کوشش کروں گا، مگر اس میں میرا کوئی قصور نہیں ہے۔ میرا نام شامل ہوگا تو اتنے سالوں کی سروس پر پانی پھر جائے گا جناب!" سنتری تقریباً رونی صورت بنا کر بولا۔

"مجھے تمہاری ملازمت کی نہیں، اپنی ملازمت کی فکر ہے۔" چھوٹا سوپر بڑبڑایا۔ "جیل میں سخت پابندی کے باوجود شراب کی بوتل آ سکتی ہے تو کل پستول بھی آ سکتا ہے۔" سنتری خاموش رہا۔ رپورٹ میں اس نے نصف سچ اور نصف جھوٹ لکھوایا تھا۔ مگر اسے پتہ نہیں تھا کہ صاحب نے اپنے مطلب کی بات اس رپورٹ میں لکھ دی تھی۔ فرار ہونے کی کوشش میں اس نے جگا کے برابر والے قیدی کو بھی ملوث کیا تھا۔ یہ کام ختم کرنے کے بعد اس نے سنتری سے کہا۔

مہکتی کلیاں

میں اپنے حریفوں میں اکثر اس لیے غالب آتا ہوں کہ وہ چار منٹ کی کچھ حقیقت نہیں سمجھتے لیکن میں اس تھوڑے وقت کی قدر و قیمت اور اہمیت سے بخوبی واقف ہوں (نپولین)

اللہ تعالیٰ ہمارے مقدر میں پتھریلے راستے لکھتا ہے تو ہمیں مضبوط جوتے بھی بخشتا ہے۔ (کیری بون)

انتخاب: اسد علی...... لاہور

"جاؤ! شراب کی بوتل والی بات خوب یاد رکھنا۔ سیل کے پانچ سات چوکیداروں میں سے کس نے یہ کام کیا؟ اس کا نام مجھے ملنا چاہیے۔" پھر وہ بڑے سوپر کے آفس میں آیا۔ بڑے صاحب کے آنے سے پیشتر وہ جگا کو چیک کرنا چاہتا تھا۔ جیل سوپر کے آفس میں قیدیوں سے پوچھ گچھ کرنے کے لیے ایک خاص کھڑکی تھی۔ اس کھڑکی میں فولادی جالی لگی ہوئی تھی قیدی کو جالی کی دوسری طرف کھڑا کر کے سوپر صاحب آرام کرسی پر بیٹھے اس سے سوال جواب کر سکتا تھا۔ چھوٹے سوپر نے جگا سے اس جالی کی آڑ میں بات کرنا مناسب سمجھا۔ چوکیداروں کو دور ہٹا کر اس نے جگا سے پوچھا۔

"اب تمہارے اور میرے سوا کوئی نہیں جان سکے گا۔ بتاؤ! کس نے تمہارا ساتھ دیا تھا؟"

"تم خواہ مخواہ وقت ضائع کر رہے ہو۔ یہ اطلاع تم مجھ سے کبھی حاصل نہیں کر سکو گے۔"

چھوٹے سوپر نے غصہ نکالنے کی خاطر اسے دو چار گالیاں دیں۔ جگت کا خون گرم ہو گیا۔ اس نے دانت پیس کر مٹھیاں بلند کیں۔ "جالی کی آڑ میں بیٹھ کر زنخے کی طرح گالیاں دے رہا ہے؟" پھر زور سے جالی پر گھونسے مارنے لگا۔ "زبان سنبھال! ورنہ گلا کاٹ دوں گا۔"

صاحب سرخ ہو گیا۔ ایک قیدی اس سے اس

طرح بات کرے؟ گلا دبانے کی دھمکی دے؟ اس کا جسم غصے سے جلنے لگا۔ ''چوکیدار! اسے لے جاؤ۔ اب میں اس کی کھال اتار دوں گا۔ سالا بدمعاش۔'' چوکیدار خوف زدہ ہو گئے۔

''بدمعاش تیرا باپ......'' جگت اب بپھر گیا۔ ''میری کھال اتارنے والا ابھی پیدا نہیں ہوا۔'' رائفل بردار چوکیداروں نے جگت کو گھونسے مار کر دور ہٹایا۔ چھوٹا سوپر آفس سے باہر آیا' بڑا امیدان پارکر کے سیل ڈیپارٹمنٹ میں داخل ہوا۔ پھر صاحب نے چوکیداروں کو روکا۔

''اس کی ذرا سی مرمت کردو۔'' جیل میں ساری سزائیں تحریر میں ہوتی ہیں۔ مگر اسی قانون کو صاحب لوگ نہیں مانتے۔ کبھی کبھی قیدی کو ٹھیک کرنے کے لیے غیر قانونی ترکیبیں بھی آزمانا پڑتی ہیں۔ ''سالے کے بال کھینچ لو۔'' صاحب نے راستہ دکھایا۔

آگے کھڑے ہوئے چوکیدار نے جگت کی داڑھی پکڑی اور پیچھے والے چوکیدار نے اس کے سر کے بال تھام لیے اور زور سے کھینچنے لگے۔ جگت اس حملے کے لیے تیار نہیں تھا۔ سخت تکلیف کی وجہ سے اس کی چیخ نکل گئی۔ اسے چوکیداروں پر غصہ آیا۔ اس نے سامنے کھڑے ہوئے شخص کے سینے میں گھونسہ مارا۔ چھوٹا سوپر چیخا۔ اس نے قریب کھڑے ہوئے چوکیدار سے کہا۔

''اس بیوقوف کی پشت سہلاؤ!'' تیسرے چوکیدار نے رائفل نال کی جانب سے تھام لی اور جگت کی گردن کے پاس بٹ مارنے لگا۔ دو طرف سے بال کھینچے جا رہے تھے اور تیسری جانب سے مار پڑ رہی تھی۔ جگت نے پیچھے والے چوکیدار کو لات مارنے کے لیے پیر اٹھایا مگر وہ چوکنا تھا۔ دور ہٹ گیا' پھر بھی جگت کے بال اس نے نہیں چھوڑے۔ ظلم ہوتا رہا۔ جگت نے پورا زور آزمایا مگر بال کھینچے جانے کی تکلیف نے اسے مجبور کر دیا۔

چوکیداروں نے صاحب کے حکم پر اسے چھوڑ دیا تو دونوں مٹھی میں جگت کے کچھ بال نظر آرہے تھے۔ اس کی آنکھوں میں کافی جلن ہو رہی تھی۔ ہانپتے ہوئے اس نے سوپر سے کہا۔

''دوسری بار تمہیں ایسا موقع نہیں دوں گا۔ یہ بات یاد رکھنا۔''

صاحب اس کی بات کا مطلب نہیں سمجھ سکا۔ اس نے دوسرا حکم دیا۔ ''اس بدمعاش کو تین دن تک اندھیری کوٹھری میں بند کردو' پھر اس کا دماغ درست ہو جائے گا۔''

جگت کو اندھیری کوٹھری کا یہ پہلا تجربہ تھا۔ اس کوٹھری میں چوبیس گھنٹے کے اندر بہت سے قیدی ہاتھ جوڑ دیتے تھے۔ ''بھائی صاحب! اس جہنم سے نکالو۔ تم جو کچھ کہو گے قبول کرنے کو تیار ہیں۔ مگر یہ سزا برداشت نہیں ہوتی۔''

روشنی کی لکیر بھی اس میں داخل نہیں ہو سکتی تھی اور اس قدر تنگ تھی کہ اس میں بمشکل ایک آدمی لیٹ سکے۔ ہوا کے لیے دیوار میں تین سوراخ تھے اس کے علاوہ باہر کی دنیا سے کسی قسم کا رابطہ نہیں رہتا تھا۔ دو چار قدم چل کر دیوار سے ٹکرا جانا لازمی تھا۔ وہاں قیدی کو اتنی گھبراہٹ ہوتی کہ دن کو تو الگ بات ہے رات کو بھی وہ سو نہیں سکتا تھا۔ مضبوط بند دروازے کے نیچے ایک تختہ تھا جو دن میں دو تین بار تین چار انچ اوپر اٹھتا۔ جسم کو پاخانے کی صفائی کے لیے دوپہر اور شام کھانا اندر رکھنے کے لیے ان دو منٹوں میں قیدی کے جسم میں کچھ حرکت آجاتی تھی۔ اسے باہر کی دنیا کا اجالا دیکھنے

کو مل جاتا تھا۔ باقی وقت اسے جہنم کی تکلیف برداشت کرنی پڑتی تھی۔ اس کے علاوہ کوٹھری کے متعلق ایک عجیب سی کہانی مشہور تھی۔ انگریزوں کے زمانے میں ابھی چار پانچ سال پہلے اس کوٹھری میں ایک قیدی کو سانپ نے ڈس لیا تھا۔ وہ تڑپ تڑپ کر مر گیا۔ اندھیری کوٹھری کا چوکیدار کان بہرے کر کے اپنا فرض پورا کرتا رہا۔ زیادہ تر قیدی اندر چیختے دھاڑتے رہتے تھے جن پر چوکیدار کوئی توجہ نہیں دیتا تھا۔ سانپ کے ڈسنے کے بعد اس قیدی نے کافی چیخ پکار کی تھی مگر سنے کون؟ بارہ گھنٹے بعد اس کا کھانا اندر سرکاتے وقت چوکیدار کو لاش کی بدبو آئی تو اس کم نصیب کی موت کا پتہ چلا۔ تب سے اس کو کالی کوٹھری کے نام سے یاد کیا جاتا تھا۔ دیوار کے سوراخ میں سے سانپ اندر آنے کی افواہ مشہور ہو گئی تھی۔ جیل کے افسران کے لیے یہ فائدہ مند تھی۔ اندھیری کوٹھری میں سزا کا ڈر اب قیدی کو خوفزدہ کر دیتا تھا۔ کوئی کوئی تو یہ بھی کہتا کہ جیل والے جان بوجھ کر زہریلے سانپ کو کوٹھری میں داخل کرتے ہیں۔

سانپ کا ڈر قیدی کو پل پل بے چین رکھتا تھا۔ ذرا سی سرسراہٹ پر اس کی رگیں تن جاتیں اور وہ اندھیرے میں آنکھیں پھاڑ کر دیکھنے لگتا کہ کہیں سانپ اندر تو نہیں آ گیا؟ سوراخوں پر بار بار نظر گھومتی رہتی، کیسی خطرناک سزا تھی۔ خوف کا یہ پنجہ قیدی کے دل کو مسلسل دبائے رکھتا تھا۔

جگت بارہ گھنٹے میں اس سزا سے توبہ کر گیا۔ ابھی تو ڈھائی دن اس ظالم کوٹھری میں کاٹنے تھے۔ سانپ کا خوف اسے اتنا نہیں تھا۔ کبھی دل دھڑکنے لگتا، اس وقت اس کا ہاتھ گلے میں لٹکتے ہوئے تعویذ پر پڑ جاتا اور اسے اطمینان سا ہو جاتا۔ تعویذ کا لمس اسے ویرو کی یاد سے بے چین کر دیتا تھا۔ ویرو کہاں ہو گی؟ اسے میری پھانسی کی سزا کا پتہ چل گیا ہو گا۔ اس کا دیا ہوا تعویذ جگت کی حفاظت کرے گا، یہ اسے اب بھی یقین ہو گا؟ فرار کی ترکیب ناکام ہوئی، اس کا اسے بارہا افسوس ہوتا تھا۔ اس پر اب بڑا سخت پہرہ ہو گا ممکن ہے وہ کبھی فرار نہ ہو سکے۔ پھانسی کے تختے کی جانب بڑھتے ہوئے اس کے دل میں کون سی خواہش ہو گی؟ آخری خواہش وہ کیا کرے گا؟ ویرو سے ملنے کی یا اپنے اکلوتے پیارے معصوم بچے کے سر پر ہاتھ پھیرنے کی؟ کال کوٹھری کا اندھیرا اسے موت جیسا محسوس ہو رہا تھا۔ پھر بھی تین دن کی سزا اس نے مضبوط دلی سے بھگت لی۔ تیسرا دن پورا ہوا اور کوٹھری کا دروازہ کھلا۔ ایسا نظر آ رہا تھا جیسے ان تین دنوں میں اس کی عمر میں اضافہ ہو گیا ہو۔ داڑھی پر ہاتھ پھیرتے ہوئے اس نے پوچھا۔

''جیل میں نائی کا کون سا دن ہوتا ہے؟'' چوکیدار کچھ سمجھا نہیں، سکھ قیدی نائی کے دن کا کبھی خیال بھی نہیں کرتا اس لیے اس سوال پر اسے تعجب ہوا۔

''کل اتوار ہے...... نائی آئے گا۔''

''پھر کل مجھے اس کے پاس بیٹھنا ہے۔ داڑھی اور سر کے بال منڈواؤں گا۔''

نصف گھنٹے میں یہ بات ساری جیل میں پھیل گئی۔ جگا بال اتروا دے گا۔ سکھ کے لیے یہ مذہب کے حکم کے خلاف بات تھی۔ سکھ عقیدے کے مطابق یہ بڑا گناہ تھا۔ یہی وجہ تھی کہ سب کو تعجب ہوا۔ خود نائی نے بڑی مشکل سے بال کاٹنے کی ہامی بھری تھی۔

''میرے ہاتھوں ایسا کام کیوں کروا رہے ہو؟''

مگر جگت نے ضد نہیں چھوڑی۔

''یہ میرے بال ہیں، جس طرح میری مرضی ہوگی اسی طرح کروں گا۔''

سب نے اس کا یہی مطلب لیا کہ آخری وقت میں اس کی عقل ماری گئی ہے۔ داڑھی، مونچھوں اور سر منڈواتے وقت خود جگت بھی لرز گیا تھا۔ دل میں اس نے گرو گوبند سے معافی چاہی تھی۔ ''میرا جرم معاف کرنا، یہ سب جیل والوں کا مقابلہ کرنے کے لیے کرنا پڑ رہا ہے۔ تمہارے سیوک کے اس طرح بال کھنچے جائیں یہ تمہارا اپمان ہے گرو! میرے اس گناہ کو معاف کر دینا۔''

بوٹالہ کیس میں دی گئی پھانسی کی سزا کے خلاف اپیل کا فیصلہ سننے جگت عدالت میں گیا تھا تو اس کے باپو بھی اسے فوراً نہیں پہچان سکے تھے۔ بغیر داڑھی مونچھ والے جگت کے متعلق انہوں نے سوچا بھی نہیں تھا۔ جگت سنگھ عرف جگا کا نام پکارا گیا اور وہ مجرموں کے کٹہرے میں آ کر کھڑا ہوا تو انہیں پہلے تو یہی محسوس ہوا کہ غلط آدمی آ گیا ہے، دونوں پارٹیوں کے وکلاء بھی اسے غور سے دیکھنے لگے۔ کرتارا افسوس کے ساتھ بڑبڑایا۔ ''جگا! تم نے یہ کیا کیا؟''

سوہن سنگھ نے ناراضگی کے ساتھ بیٹے کی جانب دیکھا اور آہ بھری۔ ''سکھ مذہب کے خلاف تم نے یہ گناہ کر دیا۔ ڈاکو تو تھا ہی اب ناستک بن گیا۔''

تین گھنٹے تک فیصلہ پڑھا جاتا رہا۔ اس درمیان انہوں نے ایک بار بھی جگت کی جانب نہیں دیکھا۔ ان کا سر شرم سے جھکا ہوا تھا۔ دل میں یقین ہو گیا کہ اب جگا کو یقیناً پھانسی ہو جائے گی۔ گرو گوبند یہ گستاخی معاف نہیں کریں گے۔ ارے پھانسی ہی پانا تھی تو کچھ دن کے لیے دھرم کے حکم کا پالن کیوں نہیں کیا؟ اس کے ساتھ جج نے فیصلے کے آخری الفاظ پڑھے۔

''نچلی عدالت کی دی ہوئی پھانسی کی سزا ختم کر کے میں اسے عمر قید کی سزا دیتا ہوں۔''

یہ سن کر سوہن سنگھ کی گردن جھٹکے سے بلند ہو گئی۔ سوہن سنگھ کو اپنے کانوں پر یقین نہیں آ رہا تھا۔

''کیا سچ مچ پھانسی کی سزا ختم ہو گئی؟'' مگر برابر بیٹھے ہوئے کرتارا کے چہرے پر جھلکتی ہوئی مسرت اس بات کی گواہ تھی، جگت پھانسی سے بچ گیا تھا۔ سوہن سنگھ کی آنکھوں سے آنسو بہنے لگے۔ انہوں نے کن انکھیوں سے یکبارگی جگت کی جانب دیکھا وہ مسکرا رہا تھا۔

''چلیے بزرگ! ہم جگا کے پاس جا کر اسے مبارکباد دیں۔'' کرتارا نے کھڑے ہو کر کہا۔

مگر سوہن سنگھ بیٹھے رہے۔ ''نہیں...... مجھے اس کی جانب نہیں دیکھنا۔ اس ناستک سے کہنا کہ بال منڈوا کر اس نے پورے خاندان کو پاپ میں ڈالا ہے۔''

کرتارا چپ چاپ چلا گیا۔ پولیس چیف پورن سنگھ، جگا کو کینہ توز نظروں سے گھورتا ہوا ہونٹ چبا رہا تھا۔ ''سالے کو شک کا فائدہ مل گیا۔'' پھر دانت پیس کر بڑبڑایا۔ ''مگر بیٹا تم دوسری پھانسی کی سزا سے کسی طرح بچ نہیں سکو گے۔''

○......❖......○

''جناب! آٹھ سو بیالیس کی پھانسی کی سزا عمر قید میں بدل گئی۔'' کسی نے چھوٹے سوپر کو اطلاع دی۔ عام طور پر قیدی کو پھانسی کی بجائے عمر قید ہوتی ہے تو اس خبر کو سن کر جیل کے حکام رحم آمیز راحت محسوس کرتے ہیں مگر جگا کی سزا کی کمی چھوٹے سوپر کو کھٹکی۔ وہ منہ ہی منہ میں بڑبڑایا۔ ''تب تو اس خوشی میں مجھے کچھ انعام دینا پڑے گا۔'' پھر اس نے جگت کا جیل کارڈ طلب کیا۔ جیل کارڈ پر کچھ لکھتے ہوئے صاحب کا چہرہ سخت ہو گیا تھا پھر وہ بڑبڑایا۔ ''تیس کوڑوں کی

سزا۔'' نیچے لکھا ہوا تھا۔''جیل سے فرار ہونے کی کوشش کرنے کے جرم میں۔''

''کل صبح سزا پر عمل ہونا چاہیے۔اس بدمعاش کو احساس ہو جائے گا کہ پھانسی کے مقابلے میں کوڑوں کی سزا بھاری ہے۔'' پھر ہاتھ مسلتا ہوا بولا۔''کوڑے مارنے والے محی الدین سے کہنا تیار ہو جائے۔کل اسے خوب زور لگانا پڑے گا۔''

صاحب کے چہرے پر بے رحمانہ مسرت دیکھ کر چوکیدار کو اس سے نفرت محسوس ہوئی۔انگریز چلے گئے مگر ہم ابھی نہیں بدلے۔اس نے سوچا۔

کوڑوں کی سزا سننے کے باوجود جگت گہری نیند سو گیا۔مگر چنا نے ساری رات پہلو بدل کر گزار دی۔ چوکیدار مہندر کو بھی چین نہیں آ رہا تھا۔ وہ جانتا تھا کہ اندھیری کوٹھری میں بند ہونے کے باوجود جگا نے شراب کی بوتل لانے والے کا نام نہیں بتایا تھا اس کی وجہ سے صاحب بھنا گیا تھا اور اس سلسلے میں کوڑوں کی سزا ہوئی تھی۔ رات کو پہرہ دیتے ہوئے اسے خیال گزرا۔''میں اگر قبول کرلوں تو جگا شاید سزا سے بچ جائے گا۔'' مگر اس کا دل کمزور تھا۔چھوٹے سوپر کے خطرناک چہرے کا تصور اسے لرزا دینے کے لیے کافی تھا۔ ملازمت سے ہاتھ دھونے کا ڈر اور بال بچوں کے پریشان ہو جانے کے خوف نے اسے مجبور کر دیا تھا۔

''بھگوان! جگا کو سزا برداشت کرنے کی ہمت دینا۔'' وہ دعائیں مانگ رہا تھا مگر اسے اپنی دعا پر یقین نہیں تھا تیس کوڑوں کو برداشت کرنے کی طاقت کسی فولادی قیدی میں ہی ہوتی ہے۔ زیادہ تر تو دسویں ضرب پر بے ہوش ہو جاتے ہیں۔

جگا کو سیل سے باہر لے جایا گیا تو جیل کے قیدی اسے ہمدردانہ نظروں سے دیکھ رہے تھے۔ بے چارے کی مصیبت آ گئی۔مہندر کے پاس سے گزرتے ہوئے اس کا غمگین چہرہ دیکھ کر اسے خوش کرنے کی خاطر وہ مسکرایا مگر مہندر نے شرم سے سر جھکا لیا چھوٹے سے چوک میں جگت کو لایا گیا۔ دونوں جانب فولادی کھمبے زمین میں گڑھے ہوئے تھے۔ان کے درمیان اسے کھڑا کیا گیا۔

''لباس اتار دو......'' جگا نے لباس اتار کر پھینک دیا۔''دونوں ہاتھ بلند کرو۔'' جگت نے ہاتھ بلند کیے جنہیں کھمبے میں کس دیا گیا۔اسی لمحے چھوٹا سوپر آ گیا۔

''تیار ہو......؟'' اس نے منہ ٹیڑھا کر کے پوچھا۔

''بالکل تیار ہوں مگر ہاتھ باندھنے کی کیا ضرورت ہے؟''

''یہ تو دو چار کوڑوں کے بعد سمجھ میں آ جائے گا''

جواب میں جگت حقارت آمیز انداز میں ہنسا۔ دونوں ہاتھ کھمبے سے باندھ دینے کے بعد لنگی کی جگہ چھوٹا سا کپڑے کا ٹکڑا باندھ دیا گیا۔ جہاں کوڑے مارے جانے تھے وہاں کولہے کا حصہ کھلا رکھا گیا۔ تیاری مکمل ہونے کے بعد چھوٹے سوپر نے پکارا۔''محی الدین کہاں ہے؟''

اب تک کونے میں بیٹھ کر شکاری نظروں سے جگت کو دیکھتا ہوا محی الدین کھڑا ہو کر سامنے آ گیا۔ بھاری جسم، بگڑا ہوا چہرہ، بڑی اور سرخ آنکھوں میں شکاری درندے جیسی چمک......اسے طویل عرصے سے کوڑے مارنے کا موقع نہیں ملا تھا اس لیے اس کی حالت بھوکے درندے کی طرح تھی۔ اس نے مضبوط ہاتھوں کو فضا میں دو چار بار گھما کر بازو پھیلائے، پھر جبڑے سخت کر کے جگت کی جانب دیکھا جیسے کہہ رہا ہو تمہارے جیسے بہت سوں کا پانی

میں نے اتار دیا ہے۔

محی الدین نے چھوٹے سوپر کی جانب دیکھا۔ اس نے آنکھوں سے اجازت دی۔ پھر اس نے پاس پڑا ہوا ہنٹر اٹھایا اور فضا میں ہنٹر کا کڑا کا کر کے مغرورانہ انداز میں جگت کی جانب دیکھا مگر جگت پر کسی قسم کا اثر نہ ہوا۔ وہ اسی طرح بے پروا رہا۔ بے ڈول پہلوان محی الدین تیزی سے جگت کے پیچھے آ کر کھڑا ہو گیا۔ چھوٹے سوپر نے کھمبے کے درمیان کھڑے ہوئے جگت پر سخت نظریں ڈال کر تالی بجائی' اسی لمحے محی الدین کا ہنٹر والا ہاتھ فضا میں بلند ہوا اور جگت کی کھلی پشت پر پہلی ضرب لگی...... جیل کی خاموش فضا لرز گئی۔ جگت کی جلد سوج گئی۔ اسے کوڑے کی ضرب اندازے سے زیادہ سخت محسوس ہوئی تھی۔ اس نے آنکھیں بند کر لیں۔ دوسری ضرب لگی۔ ''تڑاک......'' چنا اپنے سیل کے دروازے کی سلاخوں پر مٹھی باندھے کھڑا تھا جیسے ہر ضرب اس کے دل پر لگ رہی تھی۔ جیل کے دوسرے کونے پر چوکیدار مہندر دونوں کانوں میں انگلیاں ٹھونسے بیٹھا تھا۔ کوڑوں کی آواز سن کر اس کا دل بیٹھ رہا تھا۔ تین...... چار...... پانچ...... ایک کے بعد ایک ضرب لگ رہی تھی۔

جگت کی برہنہ جلد پر ضربیں لگ رہی تھیں' ہر ضرب پر جگت کی چیخ حلق تک آ کر لوٹ جاتی تھی۔ وہ دل مضبوط کر رہا تھا۔ اس کی بند آنکھوں میں گرو گوبند کی مورت ابھرنے لگی۔ دشمنوں نے جلتے توے پر بٹھایا تھا لیکن انہوں نے تکلیف کا ایک لفظ نہیں کہا تھا۔ وہ بھی کچھ ایسی ہی حالت سے گزر رہا تھا۔ میں بھی ضبط کے ساتھ برداشت کروں گا۔ اس نے سوچا' دس کوڑے پورے ہونے پر بھی جگت پر اندازے کے مطابق اثر نہیں ہوا۔ ایک ہی جگہ ضربیں لگنے کی وجہ سے اس کی جلد ادھڑ رہی تھی۔ خون بہہ رہا تھا' حلق خشک ہو گیا تھا۔ اس کے جسم کا جوڑ جوڑ ٹوٹنے لگا۔ پسینے میں نہا گیا' اسے سخت اذیت ہو رہی تھی۔ مگر وہ چٹان کی طرح کھڑا ہوا تھا۔ یہ دیکھ کر محی الدین کو جوش آ گیا۔ اسے اپنا زور ختم ہونے کا ڈر لگا۔

''آج جسم میں سے طاقت کیوں ختم ہو گئی ہے؟'' اس نے دل ہی دل میں اپنے آپ کو گالیاں دیں۔ چھوٹے سوپر نے اس کے کان میں سرگوشی کی۔ ''اسے پندرہ کوڑوں میں گرا دینا۔'' یہ یاد کر کے اس نے زور بڑھایا۔ کھلے سینے پر پسینہ صاف کر کے اس نے سینہ پھلایا اور دگنی قوت سے کوڑے مارنے لگا۔

پندرھویں کوڑے پر اس کے منہ سے چیخ نکل گئی...... چھوٹا سوپر خوش ہو گیا اور محی الدین کو جوش آ گیا۔ جگت کے جسم پر لپٹا ہوا کپڑا خون سے تر ہو گیا۔ اب اس کے پیر بھی کھڑے رہنے کی طاقت کھوتے جا رہے تھے۔ گردن آہستہ آہستہ نیچے جھک رہی تھی۔ پیشانی پر تکلیف کی وجہ سے لکیریں بن گئی تھیں۔ اس کا دل کئی گنا تیزی سے دھڑک رہا تھا۔

بیس...... اکیس...... بائیس...... جگت نے گرو گوبند کے دھیان میں دل کو لگایا۔ چھوٹا سوپر ہونٹ چباتا ہوا محی الدین کو گھور رہا تھا۔ یہ قیدی بائیس کوڑوں میں بھی ہوش میں تھا۔ اس نے چیخ تک نہیں ماری یا کوڑے روکنے کے لیے التجا نہیں کی۔ اس میں اسے اپنی ہار نظر آ رہی تھی۔ اس نے دیکھا کہ اب محی الدین ہانپ گیا تھا۔ آخری سات کوڑوں میں وہ زور نہیں آزما سکے گا اس کا چھوٹے سوپر کو افسوس تھا...... اٹھائیس...... انتیس اور

تیس...... سناٹا چھا گیا۔ جگت کے پیر گھٹنوں کے پاس سے ٹھہر گئے۔ وہ بندھے ہوئے ہاتھوں پر لٹک گیا۔ وہ سر جھکائے پیر موڑے کھڑا ہوا تھا۔ چار چھ لمحوں تک ہنٹر نہیں لگا تو اسے یقین ہو گیا کہ تیس کوڑے پورے ہو چکے ہیں۔ وہ امتحان سے پار اتر گیا تھا۔ بمشکل اس نے سر اٹھایا چھوٹے سوپر کی جانب دیکھا۔

''بس...... ختم ہو گئے کوڑے؟'' اس کی یہ بات سوپر کو لگ گئی۔ محی الدین ایک کونے میں جا کر بیٹھ گیا۔ وہ بری طرح ہانپ رہا تھا۔ صاحب کی جانب نظر اٹھانے کی اس میں ہمت نہیں رہی' خون بہتی ہوئی حالت میں چار آدمی اسے اٹھا کر سیل میں لے آئے۔ الٹا لٹایا۔ ہانپتی ہوئی حالت میں اس نے پانی مانگا۔ دو گھونٹ حلق سے نیچے جاتے ہی اس کی آنکھوں میں اندھیرا چھانے لگا۔ ذہن ہوش کھونے لگا۔ بے ہوش ہونے سے پہلے اس نے سنا' کوئی کہہ رہا تھا۔

''اس شخص نے محی الدین کا پانی اتار دیا۔''

تیس کوڑے برداشت کرنے والے جگا کے لیے تمام قیدیوں میں احترام جاگا...... آخر صاحب سے کوئی سر پھرا ٹکرایا تو سہی۔

O...... ❖ ......O

پہلی پھانسی ختم ہوئی تو جگت کے گھر والوں کو کچھ راحت ملی۔ ایک سالہ ست پال کو کھلاتی ہوئی چندن بڑبڑائی۔ ''بیٹا! تیرے متعلق جو اندازہ تھا تو اتنا کم نصیب نہیں ہے۔''

مگر جگت کے باپو کا غصہ ابھی کم نہیں ہوا تھا۔ بار بار وہ کہتے۔ ''سکھ کے بچے نے بال اتروا دیئے۔ گرو گوبند اسے کبھی معاف نہیں کریں گے۔ ارے وہ معاف بھی کریں گے' تب بھی میں معاف نہیں کروں گا۔''

ہائی کورٹ نے جب دوسری پھانسی کے لیے فیصلہ دیا' اس وقت انہیں اپنی بات سچ ہوتی نظر آئی۔ غصے میں بھرے ہوئے وہ گھر آئے۔

''میں کہہ رہا تھا ناں مذہب کی توہین کرنے والا بے موت مرے گا۔'' ماں جی اور چندن کور سمجھ گئیں کہ موت کی سزا برقرار رہی ہے۔ ''بھگوان کے رحم کی بھی ایک حد ہوتی ہے۔''

جگت کی زندگی اب آخری موڑ پر تھی۔ پھر بھی چندن نے آنسو نہیں بہائے۔ دل بھر آتا تو وہ رونے کی بجائے بھگوان کی پرارتھنا میں لگ جاتی۔ سوہن سنگھ کے ساتھ گھر آئے ہوئے کرتارا نے دلاسہ دینے کی کوشش کی۔ ''ابھی آخری عدالت ہمارے لیے کھلی ہوئی ہے۔ ممکن ہے وہاں چھٹکارا ہو جائے۔'' مگر یہ دلاسہ سب کے لیے سراب جیسا تھا۔ پے در پے فیصلوں نے انہیں تھکا دیا تھا۔ جگت کی ماں کبھی کبھی بڑبڑاتیں کیونکہ وہ تقدیر سے لڑتے ہوئے عاجز آ چکی تھیں۔

''بیٹا جب سے ڈاکو ہوا اپنا نہیں رہا۔ اچھا ہے اس کے کرم' وہی بھگتے گا۔'' کرتارا نے ماں جی کی موجودگی میں جگت کے باپو سے کہا۔

''بزرگ! میرے پاس جو رقم تھی۔ وہ تمام خرچ کر چکا ہوں۔ ابھی وکیل کو پانچ سو روپے دینے ہیں اس کا انتظام میں کر لوں گا۔'' کرتارا کچھ دیر رکا۔ سوہن سنگھ اور ماں جی اس کی جانب دیکھے بغیر سن رہے تھے۔ ''آخری کورٹ میں کیس لڑنے کے لیے اچھی خاصی رقم کی ضرورت ہوگی۔'' سوہن سنگھ خاموش رہ گئے۔ اس سال موسم برسات ناکام رہا تھا تب تھوڑی زمین انہوں نے پانی کے مول فروخت کر دی تھی۔ نانا کی موت کے

بعد کچھ خرچ ہو گیا اس کا قرض ابھی سر پر باقی تھا۔ کھیتی پر خاندان کا گزارا چل رہا تھا' اس کے علاوہ آمدنی کا اور کوئی ذریعہ نہیں تھا' وہ بھی اب بوڑھے ہو چکے تھے۔ جگت کے پیچھے کب تک خوار ہوں؟ اب آگے کا خیال کرنا تھا۔ جگت کا اکلوتا بیٹا' اگر جوان ہو گیا تو کیا اسے قرض ورثے میں دیا جائے گا؟ یہ سب خیالات ان کے ذہن میں چکرا رہے تھے' اس لیے جواب نہ دے سکے' مگر ماں جی خاموش نہ رہ سکیں۔

''بس...... بہت ہو گیا' جو کچھ کر سکتے تھے کر چکے' اس ڈاکو نے ہمارے جگر کے ٹکڑے کر دیئے' اب زمین کے ٹکڑے کر کے ہمیں ٹھوکریں نہیں کھانی۔'' پھر غصے کے جوش میں بولیں۔

''پھانسی پر چڑھتا ہے تو بھی ہمیں پروا نہیں۔'' کرتارا نے دیکھا' یہ کہتے ہوئے وہ ہانپ گئی تھیں۔ آنکھوں میں ابھرتے آنسو دکھائی نہ دیں اس لیے وہ فوراً اٹھ کر اندر چلی گئیں۔

''بزرگ! میں تم لوگوں کی حالت سمجھتا ہوں۔ مجھ سے انتظام ہو سکتا تو میں آپ کو فکر کرنے کا موقع نہ دیتا۔ مگر کیا کروں؟'' اس نے سرد آہ بھری۔ ''باپو سے میرا جھگڑا ہو گیا ہے' جگا کے لیے میں یہ دردسری کر رہا ہوں' انہیں یہ بات پسند نہیں آئی' ورنہ پانچ سات ہزار کہیں سے بھی کر لیتا۔'' سوہن سنگھ ہندسہ سن کر ڈر گئے۔ اتنی بڑی رقم خرچ ہو جائے گی؟ بیٹے کی جان بچنے کا یقین ہو تو اپنی زندگی تک بیچنے کو تیار تھے مگر اس میں امید کم تھی اور پچھتانا زیادہ تھا۔ بدنام بیٹے کو پھانسی سے کس طرح بچایا جائے؟

جگت کے باپو کیوں نہیں بولتے؟ کرتارا بے چین ہونے لگا۔ کوئی بڑا وکیل کرنے کے لیے پیسوں کی ضرورت تھی۔ اسے آج شام تک امرتسر پہنچنا تھا۔ ''بزرگ! میرے پاس جگا کی گن ہے۔ فروخت کر کے پانچ سات سو بنا لوں گا۔ مگر جگا کو پتہ چل گیا تو وہ مجھ سے بات کرنا پسند نہیں کرے گا۔''

''کیوں؟'' انہوں نے صرف اتنا پوچھا۔

''جیل سے فرار ہونے کے لیے اس نے دو ایک بار مجھ سے مدد طلب کی تھی مگر میں نے ٹال دیا تھا۔'' کرتارا نے کہا۔

یہ سن کر انہیں دھچکا لگا۔ ''اب بھی جیل سے فرار ہونے کے خواب دیکھ رہا ہے۔'' پھر دل لرز گیا۔

''ایسا کیا تو مارا جائے گا' بیوقوف۔'' باپ کا دل پگھل گیا۔ جیل سے فرار ہونے کے لیے جگت ایک کوشش کر چکا تھا' مگر اب اس نے قدم اٹھایا تو......

''کرتارا! میں تھوڑی زمین فروخت کر کے کیس لڑنے کو تیار ہوں۔'' آخر انہوں نے کہہ دیا۔ ''مگر ایک شرط ہو گی۔''

کرتارا سوالیہ نظروں سے اس کی جانب دیکھنے لگا۔ ''کیا......؟''

''وہ گن تمہیں فروخت کرنا ہو گی۔'' سوہن سنگھ نے کہا۔ کرتارا سوہن سنگھ کا ارادہ سمجھ گیا۔ وہ بھی نہیں چاہتا تھا کہ گن جگت کے ہاتھ لگے۔

''بہتر ہے' آپ زمین فروخت کرنے کا انتظام کریں۔ گن کا گاہک میرے پاس تیار ہے۔'' کرتارا جانے کے لیے تیار ہو گیا' تب سوہن سنگھ نے اس سے کہا۔

''زمین فروخت کرنے والی بات ہم دونوں کے علاوہ تیسرا کوئی نہ جانے' جگت بھی نہیں۔''

''اس کی آپ فکر نہ کریں۔'' کرتارا نے کہا اور چلا گیا۔

O......❖......O

کوڑوں کی سزا جگت نے مضبوط دل سے جھیل لی

مگر پھر اسے درد نے بہت پریشان کیا۔ ہفتہ بھر تک وہ پیٹھ کے بل سو نہیں سکا تھا۔ منہ کے بل لیٹنے سے جسم اکڑ جاتا تھا۔ ذرا سا پہلو بدلنے کی کوشش کرتا تو تکلیف اور بڑھ جاتی، کبھی تکلیف سے اس کی چیخ تک نکل جاتی اور کبھی غصے میں وہ بکنے لگتا۔ چھوٹے سوپر کو یاد کر کے گالیاں بکتا۔ ''اس بیوقوف سے میں بدلہ لوں گا۔ ایک ایک ضرب کا سود کے ساتھ حساب وصول کروں گا۔'' جیل کے ڈاکٹر کو وہ قریب نہیں آنے دیتا تھا۔ ''سالے! تم سب ایک ہو۔ پہلے ظلم کرتے ہو پھر علاج کرنے دوڑے آتے ہو۔ مجھے تمہارے علاج کی ضرورت نہیں ہے۔ جاؤ چلے جاؤ ورنہ......'' وہ دانت پیس کر خونی نظروں سے گھورنے لگتا۔ ڈاکٹر اس کا غضب ناک روپ دیکھ کر ڈر جاتا۔ اسے سمجھانے کی کوشش کرتا تب جگت ایک ہی جواب دیتا۔ ''علاج کرنا ہے تو مجھے اسپتال لے جاؤ۔'' چھوٹا سوپر اس بات پر جھکنا نہیں چاہتا تھا۔ جگا سے اسے بیر تھا، اس کے علاوہ اسپتال سے فرار ہونے کی کوشش کرے گا اسے یہ بھی ڈر تھا۔ جگت بھی حقیقتاً یہی سوچ کر ضد کر رہا تھا۔ اب اگر موقع ملے تو پہلے جیسی غلطی نہیں کرے گا۔ فرار یا موت دونوں میں سے ایک ہونا تھا۔

مگر اسے موقع نہیں ملا۔ تب وہ چھوٹے سوپر پر غصہ کرنے لگا۔ پیٹھ کا گھاؤ آہستہ آہستہ مندمل ہو رہا تھا مگر دل پر انتقام کا گھاؤ اور گہرا ہو رہا تھا۔ دشمن بدلتے جا رہے تھے۔ مگر دشمنی تو ویسی ہی رہی۔ پہلے ویرو کے رشتے دار، پھر پولیس اور اب جیل والے...... فرق پڑا تھا تو صرف حالات کا۔ پہلے جب وہ بھرتا سب کو تنگ کر دیتا۔ ختم کر دیتا مگر اب وہ جیل میں تھا۔ ہاتھ پیر بندھے ہوئے ہونے کے ساتھ اسلحہ بھی دور ہو گیا تھا۔

''اسلحہ......!'' اسے اپنی گن یاد آ گئی اور کرتارا پر غصہ آ گیا۔ وہ کمبخت اب کس بات کا انتظار کر رہا ہے؟ مجھے بچانے کے لئے عدالت میں رقم خرچ کرنے کی بجائے گن کیوں نہیں سرکا دیتا؟ ایک رات کے لیے گن لے جا کر اس نے مصیبت میں ڈال دیا تھا نہیں تو پورن سنگھ کو پھونک دیتا۔ اب بھی دیر نہیں ہوئی، چنا پھانسی کے دن کا انتظار کر رہا ہے، اس سے پہلے گن آ جائے تو ہم فرار ہو سکتے ہیں...... مگر کرتارا کو پیغام کس طرح پہنچایا جائے؟ جگت الجھن میں پڑ گیا۔ اس نے چنا کی ماں کو اس کے سیل کے قریب سے گزرتے دیکھا۔ اس کی گردن جھکی ہوئی تھی، کمر بل کھائی ہوئی تھی اور گود میں چھ ماہ کا بچہ تھا۔ وہ ہانپتی ہوئی بمشکل قدم بڑھا رہی تھی اپنے بیٹے سے ملنے کے لیے۔ ممکن ہے آخری بار ملنے کے لیے آئی ہو...... جگت کے دل میں چبھن ہوئی۔ چنا کی ماں کی حالت پر اسے رحم آیا۔ اسے اطمینان دلانے کو جی چاہا مگر وہ نظروں سے اوجھل ہو چکی تھی۔ جگت نے چوکیدار سے کہا۔

''وہ واپس لوٹے تب اسے یہاں روکنا! دو باتیں کرنی ہیں۔'' چوکیدار نے اثبات میں سر ہلایا۔ تب چنا کی ماں کو کس طرح اطمینان دلائے اس سوچ میں گم ہو گیا۔

چنا کا سیل اب بالکل آخر میں تھا۔ اسے جگا سے بالکل علیحدہ کر دیا گیا تھا۔ اب تو چار آنکھیں بھی نہیں ملتی تھیں۔ چوکیدار کے ذریعے آپس میں خبریں بھیجتے رہتے تھے اوپر والی کورٹ نے چنا کی سزا منظور کر لی تھی۔ اس کے بعد آخری امید تھی وہ تھی رحم کی اپیل۔ سپریم کورٹ میں مقدمہ لڑنے کے لیے چنا کی ماں کے پاس پیسے نہیں تھے اور چنا کی مرضی بھی نہیں تھی۔ اس نے تو رحم کی اپیل پر بھی دستخط کرنے سے انکار کر دیا تھا۔

''مجھے تو جگا کے ساتھ پھانسی پانا ہے۔ میں رحم کی اپیل کیوں کروں؟'' پہلے تو ماں سے ملاقات

کرنے سے انکار کر دیا۔ ''ان سے کہہ دو! میں مزے میں ہوں۔ پھانسی پانے سے پہلے تمہارا چہرہ دیکھنے آخری بار بلاؤں گا۔'' مگر ماں نے ضد کی۔ ''مجھے تو اس سے ابھی ملنا ہے' پھر کسے پتہ کل کیا ہو؟'' آخر چنا کو جھکنا پڑا۔ زندگی کے آخری لمحات میں اس کا دل نہیں دکھانا چاہیے۔ اس نے سوچا۔ ماں سیل کے دروازے پر آ کر رکی اس وقت وہ مسکرا دیا۔ وہ پیار بھرے لہجے میں پوچھنا چاہتا تھا۔ ''ماں! کیسی طبیعت ہے؟'' مگر گود میں بیٹھے ہوئے لڑکے پر چنا کی نظر گئی اور اس کا چہرہ سرخ ہو گیا۔ آنکھوں میں خون اتر آیا۔ ''تم اسے کیوں لائی ہو؟ مجھے جلانے کے لیے؟'' پرم جیت بیٹے کا بپھرا ہوا چہرہ دیکھ کر جھینپ گئی۔ ''ارے سگی ماں کے جنے سے اتنی دشمنی؟''

''تم اسے سگی ماں کا جنا کہتی ہو؟'' چنا جبڑے سخت کر کے بولا۔ ''یہ میرے دشمن کا بیٹا ہے جس کے قتل کے جرم میں پھانسی چڑھ رہا ہوں۔''

''ایسا نہ بول بیٹا چنا!'' پرم جیت گڑگڑائی۔

''پھانسی چڑھنے کی ضد کیوں کر رہا ہے؟ ابھی تو تم بہت چھوٹے ہو۔ زندگی میں تم نے کچھ نہیں دیکھا اور اس طرح ......'' ماں کی آنکھوں میں آنسوؤں کا سیلاب بہنے لگا۔ چنا کچھ دیر خاموش رہا تو پرم جیت کو آس بندھی۔ ایک کاغذ اس نے آگے بڑھایا۔

''لے بیٹا! اس پر دستخط کر دے۔ گورنر صاحب کے دل میں رحم جاگا تو تم پھانسی سے بچ جاؤ گے۔''

''مجھے کسی کا رحم نہیں چاہیے ماں۔'' چنا چیخ اٹھا۔ ''تم مجھے کیوں پریشان کر رہی ہو؟ پھانسی پر چڑھ جاؤں یا زندگی بھر جیل میں سڑوں تمہیں کیا فرق پڑے گا؟''

''تمہیں ماں کے دل کا خیال نہیں بیٹا۔'' پرم جیت آہ بھر کر بولی۔ ''تم میری زندگی کا سہارا ہو۔''

''سہارا......؟'' چنا نے قہقہہ لگایا۔ پھر لمبا ہاتھ کر کے بولا۔ ''ایسا سہارا تو تمہاری گود میں ہے۔ اسے بڑا کرنا مجھے بھول جانا۔''

''بیٹا! تم ایسا کہتے ہو؟ ماں بیٹے کو بھولنے کے لیے جنم دے کر پالتی ہے؟'' پرم جیت آنسو خشک کرنے لگی۔ ''میرے لیے تو یہ اور تم دونوں یکساں ہو۔ ایک بار درخواست پر دستخط کر دو! میں تمہارا احسان زندگی بھر نہیں بھولوں گی۔'' چنا جواب نہ دے سکا۔ اس کے ذہن میں ایک بھیانک خیال آ گیا اور وہ نہ کہنے والی بات کہہ گیا۔

''ماں! تم مجھے زندہ رکھنا چاہتی ہو۔'' اس کے لبوں پر عجیب سی مسکراہٹ دوڑ گئی۔ ''مگر تمہیں پتہ ہے بیس سال بعد میں کیا کروں گا؟''

''تم شادی کرو گے...... گھر بساؤ گے۔ میری خدمت کرو گے۔'' ماں نے اپنے خوابوں کو زبان دے دی۔

''نہیں...... مجھے یہ نہیں چاہیے۔'' چنا گرجا۔ ''جیل سے باہر آ کر پہلا کام میں اپنے دشمن کی آخری نشانی مٹا دینے کا کروں گا۔'' پرم جیت لرز گئی۔ اس کی گود کا بچہ رونے لگا۔ چنا کی آنکھوں سے انتقام کے شعلے نکل رہے تھے۔ ''بولو! اب تم مجھے پھانسی سے بچانا چاہتی ہو؟'' جواب میں پرم جیت نے درخواست والا کاغذ آگے بڑھایا۔ اس کی ممتا بھری آنکھیں کہہ رہی تھیں۔ ''بیٹا! تم جو چاہو کرنا مگر میں تمہیں پھانسی نہیں چڑھنے دوں گی۔ مگر چنا نے درخواست لینے کے لیے ہاتھ نہیں بڑھایا۔ وہ سوچ رہا تھا ''بیس سال تک جیل میں رہ کر انتقام کی آگ میں جلنے سے پھانسی پانا بہتر ہے۔'' ملاقات کا وقت پورا ہوا اور چوکیدار نے چنا

کی ماں کو ہٹ جانے کے لیے کہا۔ پرم جیت نے آخری بار بیٹے کو پرامید نظروں سے دیکھا مگر چنا نے سر جھکا لیا۔ تب وہ آہ بھر کر ہٹ گئی۔ دو چار سیل گزرنے کے بعد اسے کچھ یاد آیا۔ وہ رک گئی۔ چوکیدار سے پوچھا۔

''جگت کا سیل کہاں ہے؟'' چوکیدار کو اس پر رحم آ گیا۔ اس نے انگلی کے اشارے سے جگت کا سیل بتایا مگر پھر بولا۔ ''تم اس سے مل نہیں سکو گی۔'' جگت کے سیل کے چوکیدار نے یہ سنا' اس نے اشارے سے اپنے ساتھی سے کہا۔

''کیوں اس کا دل توڑ رہے ہو؟ اسے مل لینے دو' ہمارا کیا بگڑ جائے گا؟'' پھر پرم جیت سے بولا۔ ''جلدی جلدی فاصلے سے مل لو کسی نے دیکھ لیا تو ہمیں ڈانٹ پڑے گی۔'' چنا کی ماں کا آنسوؤں سے بھیگا چہرہ دیکھ کر جگت سمجھ گیا کہ بیٹے نے اس کی بات نہیں مانی۔ وہ کچھ کہے اس سے پہلے پرم جیت بولی۔

''بھائی! ہاتھ جوڑ کر تم سے التجا کرتی ہوں' چنا کو رحم کی درخواست پر دستخط کرنے کے لیے سمجھاؤ تمہارا احسان زندگی بھر نہیں بھولوں گی۔'' اس نے درخواست والا کاغذ دکھایا۔ جگت اس کا رحم طلب چہرہ دیکھ کر ہل گیا۔ اسے اپنی ماں یاد آ گئی۔ چنا کو پھانسی سے بچانے کی خود اسے بھی خواہش تھی۔ اس نے صرف اتنا کہا۔

''ماں! تم فکر نہ کرو۔ یہ کاغذ چوکیدار کو دے دو! چنا دستخط کر دے گا۔'' احسان مندانہ نظروں سے دیکھتے ہوئے پرم جیت نے کاغذ چوکیدار کے سپرد کیا۔ جاتے ہوئے صرف اتنا بولی۔

''بھگوان تمہارا بھلا کرے۔

تین ماہ بعد چنا کو گورنر جنرل کی جانب سے پھانسی سے رحم دیا گیا اور عمر قید ہوئی مگر جگت سپریم کورٹ میں ہار گیا اور پھانسی قائم رہی۔ یہ جان کر چنا گرج اٹھا۔

''نہیں نہیں...... مجھے عمر قید نہیں چاہیے۔ مجھے پھانسی دو! میری درخواست واپس لے لو۔'' سب نے سمجھایا یہ پاگل ہو جائے گا۔

''نہیں...... نہیں...... میں کسی صورت رحم کی اپیل نہیں کروں گا۔'' چنا کی طرح جگت بھی ضد کرنے لگا۔ سپریم کورٹ میں ہارنے کے بعد اسے موت سے بچانے کا آخری موقع اپیل تھا مگر جگت جھکنے کو تیار نہیں تھا۔ ''آج تک جگا ڈاکو بن کر سر اونچا کیے رہا ہوں۔ اب کیوں میں کسی کے آگے سر جھکاؤں؟''

''اس لیے کہ سر میں پھانسی کا پھندہ نہ پڑے۔ جگت! تمہیں موت کا ڈر نہیں مگر تمہاری موت سے ہم سب کی زندگیاں چلتی پھرتی لاشوں میں تبدیل ہو جائیں گی اس کا خیال کر لے۔'' اس کے باپو نے سمجھانے کی کوشش کی۔

''رحم حاصل کر کے مجھے جیل کی اس بدتر زندگی میں رکھنا چاہتے ہو تم لوگ؟'' جگت نے دلیل دی۔ ''انسان کی زندگی بھی کم پڑ جائے اتنی سزائیں میرے حصے میں آئی ہیں۔ پھانسی سے بچ گیا تو جیل میں زندگی ختم ہو جائے گی۔''

باپو سے نہ مانا تو ماں منانے آئی مگر جگت ضد چھوڑنے کے لیے تیار نہیں ہوا۔

''ماں! ایک بار تم نے ہی کہا تھا کہ پھانسی پر چڑھ جاؤ! ہم سب کا چھٹکارہ تو ہو۔ اب مجھے کیوں منانے آئی ہو؟'' ماں جی رو دیں۔

''بیٹے! تم نے ماں کے سخت الفاظ ہی یاد رکھے؟ تمہاری خاطر اور کیا کیا برداشت کیا وہ

بھول گئے؟ تمہیں بچانا نہ ہوتا تو کورٹ کی سیڑھیاں کیوں گھستے؟ پیسے سے کیوں خوار ہوتے؟'' پھر غصے میں بول گئیں۔ ''جب تک تمہارے گلے میں یہ تعویذ ہوگا اس وقت تک تم سکھی نہیں ہوگے' نہ ہمیں سکھی جینے دو گے۔''

''ماں......!'' جگت کا غصہ بھڑک اٹھا۔''تم دور ہوتی ہو تو تمہاری ممتا یاد آتی ہے۔ مگر جب تم سے ملتا ہوں تو تمہاری سنگدلی کانٹے کی طرح دل میں چبھتی ہے۔ کیونکہ تمہاری آنکھوں میں تعویذ کھٹکتا ہے' اس تعویذ کو دینے والی کو ہی تم نے مجھ سے الگ کر دیا یہ بھی کبھی نہیں بھول سکتا۔'' پھر کچھ دیر رک کر بولا۔ ''میری خاطر پیسے سے خوار ہونے کا طعنہ دینے آئی ہو تو سن لو ماں! آج سے تمہارا پیسہ مجھ پر حرام ہے۔'' بیٹے کی ایسی باتوں نے ماں کا دل توڑ دیا اور جگت کی زندگی کے لیے سب نے آس چھوڑ دی۔

''مجھے ایک بار مل لینے دو! میں کسی طرح انہیں راضی کر لوں گی۔'' چندن ساس سسر سے عاجزی کر رہی تھی۔

''چندن! اب جگت پہلے جیسا نہیں رہا' پہلے اس نے کبھی ایسی بات نہیں کی تھی۔ اس کے ذہن پر شیطان سوار ہو گیا ہے چندن! وہ تمہیں بھی ڈانٹ دے گا۔'' ماں جی ایک ہی سانس میں بول گئیں۔

''ماں جی! مجھے ایسے اپمان کی پروا نہیں ہے۔ ایک بار جانے دو! نہیں تو ساری زندگی افسوس رہے گا۔'' اور چندن دل مضبوط کر کے جگت سے ملنے گئی۔ چھوٹا سوپر چھٹی پر نہ ہوتا تو اتنی بہت ساری ملاقاتوں کی منظوری نہ ملتی۔ جاتے ہوئے کہہ گیا تھا کہ ''چھٹیاں ختم کر کے جب واپس لوٹوں گا تو تمہاری پھانسی کا آرڈر میری جیب میں ہوگا' تیار رہنا!''

چندن کور کے آنسوؤں سے وہ پگھل نہ جائے اس کے لیے جگت نے دل کو تیار کر لیا۔

''تم بھی ماں اور باپو کی طرح مجھے سبق دینے تو نہیں آئی ہو؟''

''نہیں......خبر دینے آئی ہوں۔'' چندن کور نے کہا۔ ''پچھلی بار ست پال کو لے کر آئی تھی تب ایک بات کہنا بھول گئی تھی۔''

''کیا بات؟''

''ویرو کی بات......'' ایک لفظ بول کر چندن رک گئی۔ مگر اس لفظ نے جگت کا چہرہ بدل دیا۔

''ویرو کی......؟'' فولادی سلاخوں پر انگلیاں آپ ہی آپ جم گئیں۔ ''اس کی کیا بات ہے؟''

''مجھے وہ ملی تھی۔''

جگت کے چہرے پر روشنی آ گئی۔ ''ویرو زندہ ہے؟'' وہ بڑبڑایا۔ پھر بولا۔ ''مجھے یقین تھا کہ وہ زندہ ہے۔ میرا دل کہہ رہا تھا کہ وہ زندہ ہے۔'' پھر اسے شک ہو گیا۔ ''چندن! تم میرا دل بہلانے کے لیے تو نہیں کہہ رہی ہو؟''

''ست پال کی قسم کھا کر کہتی ہوں جگت سنگھ!'' چندن کور کی آواز بھیگ گئی۔ ''تمہارے پہلے فیصلے کے وقت ماں جی کے ساتھ دعا کرنے گردوارے گئی تھی تو اس سے ملاقات ہو گئی۔'' جگت کو ابھی یقین نہیں آ رہا تھا۔ وہ غور سے چندن کو دیکھ رہا تھا۔

''مجھے یقین ہو گیا کہ اسے تم سے سچا پیار ہے۔''

''چندن! تم میری ہو کر پرائی عورت کے پیار کی بات کر سکتی ہو؟'' جگت پوچھ بیٹھا۔

''پیار کو میں نے کبھی پاپ نہیں سمجھا سردار جی!'' چندن کور آج اپنے دل کی بات کرنے میں کم نہیں پڑ رہی تھی۔ ''گرنتھ صاحب کے سامنے سر جھکا کر میں تمہارے لیے اور آنے والے بچے

کے لیے دعا مانگ رہی تھی تو ویرو بھی تمہاری زندگی کی حفاظت کے لیے دعا مانگنے آئی تھی۔"

"تم سچ کہہ رہی ہو چندن؟" جگت کے لہجے سے خوشی کا اظہار ہو رہا تھا۔

"جھوٹ کیوں بولوں؟ اس نے تمہاری سلامتی کے بدلے اپنی زندگی دینے کے لیے گرنتھ صاحب سے پرارتھنا کی تھی یہ میں نے سنا تھا۔" یہ بات سنتے ہوئے جگت نے گردن میں بندھے ہوئے تعویذ کو چوم لیا۔ چندن کور رک گئی تو اس نے پوچھا۔

"مگر اتنے عرصے سے وہ کہاں تھی؟ اس پر کیا بیتی؟ اب کہاں ہے یہ سب پوچھا کہ نہیں؟"

"یہی افسوس مجھے ہو رہا ہے۔ مجھے دیکھ کر خوش بھی ہوئی تھی مگر گھبرا رہی تھی۔ اسی طرح جلدی جلدی گردوارے سے باہر نکل گئی۔ میں پیچھے جھپٹی مگر وہ رکی نہیں۔ "لدھیانہ کی بس چلی جائے گی۔" یہ کہتی ہوئی رکشہ میں بیٹھ گئی۔

جگت نے آہ بھری۔ "ویرو نے ایسا کیوں کیا؟"

چندن کور نے ویرو کے ساتھ والے شخص کی بات جان بوجھ کر نہیں بتائی۔ یہ سن کر اس کا ذہن جل اٹھنے کا اندیشہ تھا۔ "ایک بہانہ کر کے میں لدھیانہ ہو آئی۔" چندن کور کہنے لگی۔ "مگر اتنے بڑے شہر میں پتہ کیسے لگے؟"

"میں اس کا پتہ معلوم کروں گا چندن!" جگت نے دروازے کی سلاخوں کو مٹھیوں میں کس کر زور لگایا' جیسے انہیں توڑ دینا چاہتا ہو۔ "مگر اس کے لیے مجھے تھوڑا وقت چاہیے۔" دو منٹ تک دونوں ایک دوسرے کی آنکھوں میں دیکھتے رہے۔ جگت' چندن کو دیکھ رہا تھا مگر اس کے ذہن میں خیالات گردش کر رہے تھے پھر پوچھنے کو جی چاہا کہ چندن! تم یہ سچ کہہ رہی ہو؟ مگر چندن بولی۔ "میں یہی بات کہنے کے لیے آئی ہوں۔"

"پہلے بتاتی تو میں ماں باپو کے آگے ضد نہ کرتا۔" جگت کی آواز نرم ہوگئی۔ "اب وکیل سے کہنا درخواست لے کر آئے۔ میں انگوٹھا لگا دوں گا۔"

......☆☆☆......

رحم کی درخواست پر دستخط کرنے کے بعد جگت کے ذہن میں جیل سے فرار ہونے کے خیالات پوری تیزی سے گردش کر رہے تھے۔ بہت سوچا مگر کوئی راستہ نظر نہ آیا۔ نگرانی نرم ہونے تک ضبط کرنا تھا۔ سختی کم کر کے اس نے اپنا طریقہ بدل دیا تاکہ مہینے دو مہینے میں نگرانی نرم پڑ جائے۔ ویرو کی یاد میں ایک ایک دن سال کے برابر نظر آتا تھا۔ کرتارا کو خبر بھیجنے کی کوشش کی مگر اسے مایوسی ہوئی۔ وہ دہلی گیا تھا۔ کب واپس لوٹے گا؟ یہ پتہ نہیں چل سکا۔ "اب کیا کرنا چاہیے؟"

مگر اچانک اسے امید نظر آئی۔ اسے خبر ملی تھی کہ گنگا ڈاکو پھانسی کی سزا پا کر اسی جیل میں آیا ہے۔ چھ ماہ پہلے دو دن تک پولیس سے مقابلہ کر کے گنگا اپنے گروہ کے ساتھ پولیس کے قابو میں آ گیا تھا۔ یہ سن کر جگت کو صدمہ ہوا۔ وہ سولہ سال تک ڈاکازنی کرنے کے بعد اسلحہ ہونے کے باوجود پولیس کے تابع ہوا۔ پھر پتہ چلا کہ پولیس نے اس سے فراڈ کیا تھا۔ کم سزا کا عہد دے کر پولیس نے اسے پھنسایا تھا۔ گنگا پھانسی پانے آیا ہوگا؟ یہ بات ماننے والی نہیں تھی۔ یقیناً جیل والوں کی آنکھوں میں دھول جھونک کر وہ فرار ہوجائے گا پھر تو ایک سے دو بھلے...... مگر گنگا سے کس طرح ملا جائے؟ وہ چوکیدار مہندر کے علاوہ کسی پر اعتماد نہیں کر سکتا تھا۔ اور مہندر فی الحال بیرک کی ڈیوٹی پر تھا۔

ایک ہفتہ انتظار کرنا جگت کے لیے کٹھن تھا۔ بہت سنبھل کر اس نے گفتگو شروع کی۔

''مہندر! گنگا ڈاکو کو بھی یہیں پھانسی دی جائے گی؟''

''بالکل......اسی لیے اسے لائے ہیں۔''

''وہ اکیلا ہی ہے یا اس کے دوسرے ساتھی بھی ہیں؟''

''پھانسی صرف اسے ہوئی ہے۔ باقی لوگوں کو عمر قید یا پندرہ سال ہوئی ہے۔''

کچھ دیر خاموش رہ کر جگا بولا۔ ''اس کا ایک ساتھی سچا سنگھ زخمی تھا اس کا کیا ہوا؟''

مہندر ہلکے سے مسکرایا۔ ''اسے عمر قید ہوئی ہے۔ وہ یہیں ہے۔ کیا پرانی جان پہچان ہے تمہاری؟''

''ہاں......'' جگت کا دل دھڑکنے لگا مہندر اس کی بات مانے گا؟ مگر آزمائش کیے بغیر رہ نہیں سکتا تھا۔ ''ہم ایک بار ملے تھے۔ کہتے ہیں بڑی عمدہ شاعری کرتا ہے۔''

''ارے ہاں...... پڑھا لکھا ہے۔ لہٰذا اسے بی وارڈ ملا ہے۔'' مہندر کو بھی شاعری کا شوق تھا۔ وہاں ڈیوٹی دینے میں مزہ آتا۔ ''روز شاعری سننے کو ملتی ہے۔ آدمی عمدہ ہے۔''

''تب تو شراب کا شوقین ہوگا؟'' جگت نے آنکھ مار کر پوچھا۔ مہندر ہنسا۔

''پی کر بہت رنگ میں آتا ہے۔ مجھے اس کا انتظام کرنا پڑتا ہے۔''

''یار! ایک کام کرو گے؟'' یہ سن کر مہندر چونکا' جگا شاید شراب لانے کی بات کر رہا ہے۔

''یار! ابھی نہیں۔ بہت سختی ہے۔ کچھ دن رک جا۔''

''میں شراب کی بات نہیں کر رہا۔'' جگت دھیمے لہجے میں کہنے لگا۔ ''اسے میری خبر دینی ہے۔''

''کیا......؟''

''صرف اتنا کہنا کہ میں یہاں ہوں۔'' جگت کچھ دیر رک گیا۔ ''اور جیل سے دل اچاٹ ہوگیا ہے۔ اتنا کہنا ہے۔''

مہندر اس اشارے کا مطلب سمجھ گیا مگر اس طرح بولا جیسے کچھ نہ سمجھا ہو۔ ''ارے اس میں کیا بڑی بات ہے؟ آج ہی خبر کیے دیتا ہوں۔''

جگت کو یہ سن کر سکون ملا۔ مہندر دوسرے دن جواب لے کر آ گیا۔

اتنے عرصے وہ الجھن میں رہا تھا۔ کیا سچا سنگھ اس کی بات پر دھیان دے گا؟ کرتارا نے اس سے جو ملاقات کرائی تھی کیا اسے یاد ہوگی؟

مہندر کی ڈیوٹی شروع ہونے کے بعد کافی دیر تک اسے مہندر سے بات کرنے کا موقع نہیں ملا' اس سے اس کی الجھن بڑھ گئی۔ کچھ دیر بعد مہندر خود ہی ٹہلتا ہوا اس کے پاس آ گیا۔

''تمہاری خبر پہنچا دی ہے۔''

''کیا کہا......؟'' جگت کا تنفس تیز ہوگیا۔ مہندر نے آس پاس نظر گھمائی پھر بولا۔

''جگا تمہارا نام سن کر وہ خوش ہوگیا۔ اس نے مجھے ایک عمدہ شعر بھی سنایا۔''

''شاعری کو گولی مارو۔'' جگا نے کہنا چاہا مگر ضبط کر گیا اور بولا۔ ''پھر؟''

''تمہاری بے چینی دور کرنے کا انتظام ہو رہا ہے۔ انتظام ہونے پر تمہیں خبر پہنچا دی جائے گی۔'' یہ کہہ کر مہندر آگے بڑھ گیا۔ جگت نے محسوس کیا تقدیر یاوری پر ہے۔ ویرو کی زندگی کی خبر اور سچا سنگھ کی جیل میں موجودگی اسے نیک شگون نظر آئے......!

''مہندر! تمہاری دوستی میں کبھی نہیں بھولوں

گا۔" مگر مہندر سننے کے لیے رکا نہیں۔ وہ دوسرے چوکیدار سے باتیں کر رہا تھا۔

O......❖......O

انسان کو پتہ نہیں چلتا کہ تقدیر اس کے ساتھ کیا کھیل کھیل کر رہی ہے؟ جب جگت جیل سے فرار ہونے کے منصوبے بنا رہا تھا اس وقت اس کی تقدیر ایک نئے کھیل کا آغاز کر رہی تھی۔ چوکیدار نے اس کی کوٹھری کا تالا کھولا تو اسے حیرت ہوئی۔

"سوپر صاحب نے تمہیں آفس میں طلب کیا ہے۔" دو چوکیداروں کے درمیان چلتے ہوئے جگت کے دل میں خواہش ابھری کہ جس چوکیدار کے ہاتھ میں رائفل تھی وہ چھین لے مگر چند قدم آگے بڑھتے ہی مخالف سمت سے ایک اور چوکیدار آتا دکھائی دیا۔ جگت نے ہونٹ چبا لیے۔

"کمبخت کو ابھی سامنے آنا تھا۔" اسے آفس کی کھڑکی کے قریب کھڑا کر کے چوکیدار نے کھڑکی پر ہاتھ مارا۔ کھڑکی کا پردہ سرک گیا۔ سوپر آرام کرسی پر دراز سگریٹ پی رہا تھا۔

"جناب! آٹھ سو بیالیس حاضر ہے۔" چوکیدار نے سلیوٹ مار کر کہا۔ سوپر نے کچھ دیر جگت کی جانب دیکھا وہ سگریٹ کا دھواں فضا میں اڑانے کے بعد ہاتھ میں تھاما ہوا کاغذ کھول کر بولا۔

"تمہاری درخواست کا جواب آ گیا۔" جگت ابھی فرار ہونے کے لیے سوچ میں ڈوبا ہوا تھا۔ درخواست نامنظور ہوئی ہے یہ سننے کے لیے وہ وقت ضائع کرنا نہیں چاہتا تھا۔ اب شاید باہر نکلنے کا موقع ہی نہ ملے۔ رائفل بردار چوکیدار چند قدم دور تھا۔ وہ اس پر جھپٹنے ہی والا تھا مگر......

"تمہاری پھانسی معاف ہوگئی ہے۔" جگا کو جیسے اپنی سماعت پر یقین نہیں آیا۔ "تمہارا دھیان کہاں ہے؟" سوپر غصے میں چیخا۔ "پھانسی معاف ہونے کی خوشخبری پر بھی خوش نہیں ہوتا؟ شکریہ ادا نہیں کرنا۔" جگت نے سوچا اس شخص نے اس کے جوش کو ٹھنڈا کر دیا ہے۔ اسے جواب دینا ہی پڑا۔

"میرے لیے سب برابر ہے۔ پھانسی یا عمر قید۔"

سوپر نے ایسا بے پروا قیدی پہلے کبھی نہیں دیکھا تھا۔ "ابھی تک میں سمجھ رہا تھا کہ تقدیر نے تم پر رحم کیا ہے مگر تمہارا مزاج دیکھنے کے بعد مجھے محسوس ہو رہا ہے کہ تمہیں پھانسی ہی ہونی چاہیے تھی۔ لیکن مختلف جیلوں کا پانی پیو گے اور مار کھاؤ گے تو دماغ درست ہو جائے گا۔" تب بھی جگت خاموش رہا مگر سوپر نے کہا۔ "آج سے جیلوں میں تمہاری مسافرت شروع ہوتی ہے۔ تمہیں لدھیانہ جیل میں دھکیل دیا جائے گا۔"

یہ سن کر جگت کو صدمہ ہوا۔ گنگا ڈاکو کے ساتھ مل کر جیل سے فرار ہونے کے منصوبے پر پانی پھر گیا تھا۔ اس کا خون کھول اٹھا۔ اس نے دانت پیس کر مٹھیاں کس لیں اور جالی پر گھونسے مارنے لگا۔ جالی میں بھری ہوئی دھول سوپر کے لباس پر گری اور وہ غصے میں کھڑا ہو گیا۔

"لے جاؤ یہاں سے سالے کو۔" دونوں چوکیداروں نے جگت کو مضبوطی سے پکڑ لیا اور سیل کی جانب گھسیٹ لے گئے۔ ان کی سمجھ میں یہ نہیں آیا کہ پھانسی معاف ہونے پر بھی یہ ڈاکو بے مقصد غصہ کیوں دکھا رہا ہے؟

O......❖......O

وہ عمر قید اور چھوٹی بڑی سزائیں ملا کر پچاس سال کی قید کے ساتھ جگت سنگھ جگا لدھیانہ کی جیل میں آ گیا۔ اس کے کارڈ پر خطرناک قیدی کی مہر لگ چکی تھی۔ اس سے ابتداء ہی میں جیل کے حکام

نے کہا۔ ''تم امرتسر میں جوہر دکھا کر آئے ہو اس لیے چار ماہ کے لیے کسی سے تمہاری ملاقات ختم کردی گئی ہے۔''

لدھیانہ آنے کا جو اطمینان تھا وہ بھی چھن گیا۔ چندن ملنے نہیں آسکے گی اور ویرو کی خبر بھی نہیں ملے گی وہ اور بپھر گیا۔ اس زمانے میں پنجاب کی جیلوں میں قیدیوں کے درمیان دو گروپ ہوتے تھے۔ ایک گروپ ''ماجا'' کے نام سے پکارا جاتا دوسرا ''مالوا'' کہا جاتا تھا۔

امرتسر، گرداس پور اور شیخو پورہ کے ساتھ والے ''ماجا'' گنے جاتے اور فیروز پور، لدھیانہ، جالندھر وغیرہ علاقوں کے قیدی ''مالوا'' کہے جاتے تھے۔ جگت اب تک سیل میں رہا تھا اس لیے قیدیوں کی اس تفریق سے لاعلم تھا۔ اب اسے بیرک میں آکر ہنگامہ کرنے کا موقع مل گیا۔ قیدیوں کے درمیان انتشار سے جیل والے خوش تھے، کبھی کبھی دونوں گروپوں کے درمیان ٹکراؤ بھی ہوجاتا۔ قیدیوں کے درمیان ان بن حکام کو فائدہ پہنچاتی تھی۔ ''ماجا'' گروپ کا قیدی چوری چھپے جیل میں کوئی چیز منگواتا تو ''مالوا'' قیدی اس کی چغلی کھانے سے نہیں چوکتا تھا۔ لدھیانہ جیل میں جگت کے آنے سے ''ماجا'' قیدی جوش میں آگئے۔ ''اب ہمارا جگا آ گیا۔ اب مالوا قیدیوں کو دیکھ لیں گے۔'' مالوا گروپ میں جگت کی آمد نے گھبراہٹ پھیلادی۔ امرتسر جیل میں محی الدین کے تیس ہنٹر برداشت کرنے والے جگا کے متعلق یہاں شہرت پہنچ گئی تھی۔

''اب جگا کا پانی اتر جائے گا۔'' مالوا قیدیوں کے سردار گربچن سنگھ نے فخر سے کہا اور جگت کو چیلنج کیا۔ ''اے! باہر سے آیا ہے تو باہر والوں کی طرح رہنا اور ہماری زد سے بچے رہنا ورنہ......'' جگت نے اسے خوفناک نظروں سے گھورا۔ اس کی آنکھوں میں اترا ہوا خون دیکھ کر گربچن سنگھ کا دل دھڑکنے لگا۔ اس کے باوجود وہ اپنا بھرم رکھنے کے لیے بولا۔ ''آنکھیں کیوں نکال رہا ہے؟ اندھا کردوں گا۔''

جگت نے دور کھڑے اس کی جانب تھوکا، پھر بیرک میں چلا گیا۔ ''ماجا'' قیدیوں نے اسے گھیر لیا۔ ''گربچن کو تم نے ٹھیک جواب دیا۔ وہ سالا یہاں دادا بن بیٹھا ہے۔ تمہارے آنے سے ہمیں سکون ملے گا۔'' ماجا گروپ کا سردار بن جانے کے بعد جگت نے کچھ دن دونوں گروپوں کے درمیان مصالحت کرانے کی کوشش کی۔ قیدیوں کو آپس میں لڑنے کی بجائے اتحاد کرکے جیل والوں سے لڑنا چاہیے۔ اپنے مطالبات پیش کرنے چاہئیں۔ اس نے سمجھایا مگر گربچن سنگھ آڑے آیا۔ جگت کی باتوں میں اسے کمزوری نظر آئی۔

''میری سرداری تمہیں قبول ہو تو میں سوچوں گا۔'' گربچن نے جواب دیا۔

''تمہاری سرداری؟'' جگت بگڑ گیا۔ ''اتنا گھمنڈ؟ تو اب تمہیں دیکھوں گا۔''

پھر دونوں گروپوں کے درمیان داؤ پیچ شروع ہوگئے۔ چھوٹے جھگڑوں نے ایک بار بڑا روپ دھار لیا۔ بیرک کے میدان میں روزانہ تین چار گھنٹے قیدیوں کو چرخا لانے کا کام سپرد کیا جاتا تھا جگا کا کام دوسرے قیدی کردیتے تھے۔ گربچن سنگھ نے اس کے خلاف احتجاج کیا۔

''وہ ڈاکو حرام کھاتا ہے اور دوسروں سے کام کراتا ہے۔''

''اس میں تیرے باپ کا کیا جاتا ہے؟'' جگت اپنی جگہ بیٹھا ہوا گرجا۔ ماجا قیدی ہنس دیئے

تو گربچن سنگھ کو سخت غصہ آ گیا۔

"سالا باپ تک پہنچ رہا ہے؟" یہ کہہ کر وہ جگت کو گالیاں دینے لگا۔ جگت جھٹکے سے کھڑا ہوگیا۔ اس نے برابر پڑا ہوا چرخا کاتنے کا تکلا اٹھایا اور گربچن سنگھ کی جانب جھپٹا۔ وہ جگا کو غضب ناک دیکھ کر گھبرا گیا پھر سامنا کرنے کے لیے اس نے بھی نوک دار تکلا اٹھالیا۔ چرخا گھماتے ہوئے قیدیوں کے ہاتھ رک گئے۔ وہ پھٹی آنکھوں سے یہ منظر دیکھنے لگے۔ اس سے پہلے کہ چوکیدار درمیان میں آئے جگت، گربچن سنگھ کے قریب پہنچ گیا۔

"آج تک جگا نے کسی کی گالی برداشت نہیں کی ہے۔" یہ کہتے ہوئے اس نے دانت پیس لیے اور نوک دار تکلے والا ہاتھ فضا میں لہرایا۔ گربچن سنگھ اب لوٹ نہیں سکتا تھا۔ اس نے جگت کی آنکھوں کا نشانہ لے کر تکلا لہرایا۔ کھچا کی آواز کے ساتھ دونوں کے وار تقریباً ایک ساتھ ایک دوسرے پر پڑے۔ جگت کی آنکھ کے قریب سے خون کا فوارہ بہہ نکلا۔ ماجا قیدی جوش میں آ گئے۔ دونوں گروہوں کے درمیان جھگڑا شروع ہوگیا۔ چوکیدار چیخنے لگے۔ خطرے کا الارم بج گیا۔ پانچ دس منٹ میں رائفل بردار چوکیدار آ گئے۔ دھڑا دھڑ لاٹھی چارج ہونے لگا۔ نصف گھنٹے میں معاملہ قابو میں آ گیا۔ اس وقت تک جگت اور گربچن سنگھ کے زخموں سے کافی خون بہہ چکا تھا۔ دونوں کے چہرے اور لباس خون میں بھیگ چکے تھے۔ چار پانچ چوکیدار ان کے درمیان کھڑے ہونے کے باوجود دونوں ایک دوسرے پر غرا رہے تھے۔ ڈاکٹر نے آ کر دونوں کے زخم دھوئے تو پتہ چلا کہ جگت کی آنکھ بچ گئی تھی مگر بچن سنگھ کا جبڑا چر گیا تھا۔ جھگڑے میں حصہ لینے والے تمام قیدیوں کی سزائیں بڑھ گئیں۔ جگت کی سزا چھ ماہ بڑھ گئی اور اسے لدھیانہ کی جیل سے فیروز پور دھکیل دیا گیا۔ فیروز پور جیل کا سوپر سارے ملک کی جیلوں سے خطرناک سمجھا جاتا تھا۔ خطرناک قیدی اور خطرناک سوپر کا ملاپ ہونے کا وقت آ گیا تھا۔

فیروز پور جیل کے سرپھرے سوپر مٹو کے سامنے جگت کو پیش کیا گیا اس وقت سوپر نئے قیدی کا ریکارڈ چیک کر رہا تھا۔ پڑھتے ہوئے اس کے جبڑے سخت ہو رہے تھے۔ کچھ دیر بعد سوپر نے قیدی کو دیکھنے کے لیے سر اٹھایا۔ چند لمحے تک وہ جگت کو دیکھتا رہا۔ چوکیدار نے گھونسہ مار کر جگت کو سمجھایا۔ "صاحب کو سلام کر۔" مگر اس کی بجائے جگت سوپر کی بڑی بڑی آنکھوں میں دیکھتا رہا۔ دونوں کی نظروں میں ناراضگی جھلک رہی تھی۔

"ہوں...... تمہیں ٹھیک کرنے کے لیے میرے پاس بھیجا گیا ہے۔" سوپر نے گفتگو کا آغاز کیا۔ "یہاں آنے سے پہلے تمہیں میرے بارے میں علم ہوگیا ہوگا۔"

"تمہیں بھی میرے بارے میں علم ہو چکا ہوگا۔ ابھی تم نے کاغذات پڑھ لیے ہیں۔" سوپر نے ہونٹوں کے درمیان دبائی ہوئی سگریٹ پر مزید دباؤ ڈال کر آنکھیں نکالیں پھر دوسرے ہاتھ میں سگریٹ تھام کر گرجا۔

"یہاں زبان چلانے والوں کے منہ میں جلتے ہوئے انگارے بھر دیئے جاتے ہیں سمجھے؟" مگر اسی لمحے دوسرے ہاتھ میں تھامی ہوئی سگریٹ سے اس کی انگلی جل گئی۔ جھٹکے سے اس نے سگریٹ پھینک دی تو جگت نے قہقہہ لگایا۔ سوپر اپنی یہ بے عزتی برداشت نہ کر سکا۔ "لے جاؤ! اس بدمعاش کو کچھ دنوں میں اس کے کس بل نکال دوں گا۔"

نوسو گیارہ نمبر کا تمغہ لگا کر جگت کو بھی سزا والے قیدیوں کی بیرک میں بند کر دیا گیا۔ ستائیس قیدیوں کے درمیان جگت کو دو ایک دن تنہائی میں گزارنے پڑے۔ بیرک کے دوسرے قیدی اسے متجسس نظروں سے دیکھ لیتے تھے لیکن اس کے قریب آ کر بات کرنے کی کوئی ہمت نہیں کرتا تھا۔ جگت کو یہ عجیب سا محسوس ہوا۔ وہ بور ہو کر دو ایک بار بڑبڑایا۔

''اس سے تو سیل ہی بہتر تھا۔ بیوقوف مجھ سے بات تک نہیں کرتے۔''

آخری چھ ماہ سے گھر والوں سے رابطہ ٹوٹ چکا تھا۔ لدھیانہ جیل میں چندن اس سے ملنے آئی تھی مگر جیل والوں نے اسے واپس بھیج دیا۔ اس سلسلے میں چوکیدار نے جو بتایا اس سے جگت کو صدمہ ہوا۔ چندن ضرور ویرو کی خبر لے کر آئی ہوگی۔ یہ سوچ کر وہ پریشان ہو گیا۔ یہاں آ کر اسے ویرو کی یاد بہت ستا رہی تھی۔ صبح کے وقت اس نے خواب دیکھا کہ چندن کور ویرو کو لے کر جیل میں ملنے آئی ہے مگر سوپر مٹو نے ملاقات سے منع کر دیا ہے۔ سوپر نے کہا ہے کہ جب تک جگا اسے آنکھیں دکھاتا رہے گا وہ اس وقت تک جگا کو کسی سے ملنے کی اجازت نہیں دے گا۔

صبح کے وقت دیکھے ہوئے خواب اکثر سچے ہوتے ہیں۔ اس خیال سے جگت کچھ نرم پڑ گیا۔ اس کے دل میں شدید خواہش تھی کہ ویرو سے ایک بار ملاقات ہو جائے۔ صرف ایک بار اسے دیکھ لے۔ اس کے لیے اگر سوپر مٹو کے سامنے سر بھی جھکانا پڑا تو بھی وہ انکار نہیں کر سکے گا۔ اس نے سوچ لیا مگر......

''نوسو گیارہ تمہارا خط ہے۔'' یہ کہہ کر بیرک کا میٹ ایک خط دے گیا۔ لفافہ ہاتھ میں لیتے ہی جگت کو عجیب سا محسوس ہوا۔ چندن نے ویرو کی خبر لکھی ہو گی یہ سوچتے ہوئے وہ لفافہ پھاڑنے کے متعلق سوچ رہا تھا مگر پھر خیال آیا کہ قیدی کی بجائے جیل والے یہ کام انجام دے دیتے ہیں۔ پھاڑے اور پڑھے بغیر قیدی تک خط نہیں پہنچتا۔ جگت جلدی جلدی خط پڑھنے لگا۔

''بیٹے جگت!''

خط کا پہلا لفظ پڑھتے ہی اس کی نصف مسرت ختم ہو گئی۔ خط باپو کا تھا چندن کا نہیں۔

''گرو گوبند کی کرپا سے تمہیں نئی زندگی ملی۔ اس سے ہم سب کا مسرت سے برا حال ہے۔ تمہاری ماں اور بہو تو مسرت سے پاگل ہو گئی ہیں۔'' آگے کچھ سطروں پر روشنائی پھری دیکھ کر جگت سمجھ گیا کہ جیل والوں کی مہربانی ہے۔ ''بیٹا! تمہیں جو نئی زندگی ملی ہے اس کا تم صحیح استعمال کرو گے۔ یہ ہم جانتے تھے مگر افسوس تم نے اپنی حرکتیں کم کرنے کی بجائے بڑھا دی ہیں۔ یہ ہمیں جیل والوں سے معلوم ہوا ہے۔ بے چاری بہو تم سے کتنے پیار سے ملنے آئی تھی اسے واپس ہونا پڑا۔ جگت بیٹے! دوسروں کی محبت کا بھی خیال کرو۔ اچھے چال چلن سے قیدیوں کی سزا کم ہو جاتی ہے اور تم اپنے غلط رویے سے اسے بڑھا رہے ہو۔ ہمارے لیے نہیں تو اپنے معصوم بچے کی خاطر کچھ ٹھیک ہو جاؤ۔''

''یہ لوگ وعظ کرنا ہی جانتے ہیں۔'' جگت بڑبڑایا اور اس نے صفحہ الٹا' مگر نصف کے قریب لکھائی کاٹ دی گئی تھی۔ ''کم بخت جیل والوں نے کاغذ پر کوئی کام کی بات رہنے نہیں دی۔'' جگت کو بڑا غصہ آیا۔ پھر بھی آخری سطریں پڑھنے کو مل گئیں۔

''ست پال اب بولنے لگا ہے۔ ماں تو صحیح

بول رہا ہے۔ باپو کہنا چندن سکھا رہی ہے۔ پھر اسے لے کر تم سے ملنے آئے گی۔ اگر تم نے کوئی نیا کارنامہ نہیں کیا تو ملاقات کا راستہ بند نہیں ہوگا۔"
فقط تمہارے باپو)

جگت کچھ دیر خاموش بیٹھا رہا۔ سرپھرے شخص کو دوسرے کا دیا ہوا مشورہ کبھی پسند نہیں آتا۔ جگت کے ساتھ بھی ایسا ہی تھا۔ خط نہ آیا ہوتا تو بہتر تھا۔ پھر بھی ست پال اب بولنا سیکھ رہا ہے اس بات کو وہ بار بار دل میں دہرا رہا تھا۔ ویرو کے متعلق کچھ جاننے کو ملتا تو بہتر تھا۔ ممکن ہے کٹے ہوئے الفاظ میں دب گیا ہو اس خیال سے اس نے ان الفاظ کو پڑھنے کی کوشش کی مگر کامیابی نہ ہوئی۔ تب کاغذ کو طے کر کے لفافے میں رکھ دیا۔

وہ سارا دن اس نے اسی اداسی میں گزار دیا۔ رات بھی پوری نیند نہیں آئی۔ کبھی باپو کا مشورہ یاد آتا تو کبھی سوپر کی دھمکی یاد آجاتی۔ "ٹھیک کر دوں گا۔" آس پاس تمام قیدی سو رہے تھے۔ اسے غصہ آ گیا۔ "سالے لوگوں کو جیل کی ہوا موافق آ گئی ہے۔" راؤنڈ پر نکلتے ہوئے پہریدار کی آواز سنائی دی۔ "سب سلامت۔" جگت کو اس پر بھی غصہ آ گیا۔ "ساری دنیا سلامتی کے لیے مر رہی ہے۔" فوراً ہی بیڑیوں کی جھنکار سنائی دی۔ شاید کسی قیدی نے پہلو بدلا ہوگا۔ یہ سوچ کر جگا نے آنکھیں بند رکھیں۔ مگر کچھ دیر بعد وہ آواز قریب آنے لگی۔ تب اس نے گردن اٹھائی۔ اندھیرے میں کچھ نظر نہیں آتا تھا۔ سونے کی اداکاری کرتا ہوا آنکھیں کھلی رکھ کر جگت آواز والی سمت دیکھ رہا تھا۔ ایک سایہ اس کی جانب بڑھتا دکھائی دیا۔ سایہ بہت چوکنا ہو کر آ رہا تھا۔ جگت ہوشیار ہو گیا۔ ممکن ہے کوئی چالبازی کھیلی جا رہی ہو۔ سوپر اپنے خاص قیدی کے ذریعے اس سے بدلہ لینا چاہتا ہو۔ اس کے ہونٹ مضبوطی سے بند ہو گئے۔ کلائیوں کی رگیں تن گئیں۔ وہ مقابلہ کرنے کے لیے چپ چاپ لیٹا رہا۔ اب وہ سایہ آمنے سامنے سوئے ہوئے قیدیوں کی لائن سے گزر رہا تھا۔ بیڑیوں کی ذرا سی آواز پر وہ کچھ دیر رک جاتا' پھر دوبارہ آگے بڑھتا۔ اب وہ کافی قریب آ گیا تھا۔

جگت کو یقین ہو گیا کہ وہ اس کے قریب آ رہا ہے۔ اندھیرے میں اس کی چمکتی ہوئی آنکھوں کے علاوہ کچھ نظر نہیں آیا۔ جگت سانس روکے پڑا رہا' یہ معلوم کرنے کے لیے یہ کیا کرنا چاہتا ہے؟ اس نے ضبط کیا۔ اب سانس کی آواز آ رہی تھی۔ وہ بالکل قریب آ گیا تھا۔ اس نے گردن گھما کر آگے پیچھے سوئے ہوئے قیدیوں کی جانب دیکھا۔ جگت اسے غلط فہمی میں رکھنے کی خاطر آنکھیں ادھ کھلی رکھ کر زور سے خراٹے لینے لگا۔ چند لمحے اسے طویل معلوم ہو رہے تھے۔ وہ اپنے اعصاب پر بمشکل قابو پا رہا تھا۔

"جگا......!" بہت مدھم سی آواز آئی جسے کوئی جاگنے والا شخص بھی بمشکل سن سکے۔ ممکن ہے وہ یقین کرنا چاہتا ہو کہ جگا سو گیا ہے کہ نہیں؟ یہ سوچ کر جگت نے زور زور سے سانسیں لینی شروع کر دیں مگر پھر پیر کو چھوا گیا۔ ذرا سی حرکت دے کر اس نے پھر آواز دی۔ "جگا......!"

اور جگت اٹھ کر بیٹھ گیا۔ "کون ہے؟" یہ سوال بیڑی کی جھنکار میں دب گیا۔

"آہستہ بولو!" وہ آہستہ سے جگت کے برابر لیٹ گیا۔

"کیا ہے؟" جگت کو اس کی حرکت پراسرار دکھائی دی۔ "تم کون ہو؟"

"نوسو دو۔" وہ بہت آہستگی سے بولا۔ "میں ہنس راج ہوں۔"

"ہنس راج؟" جگت کو آواز انجانی معلوم ہوئی مگر نام جانا پہچانا تھا مگر ہنس راج کو تو اس نے جوہری بازار کی لوٹ مار کے وقت زخمی کیا تھا اور اس کا ہاتھ کٹا ہوا تھا۔

"تم مجھے پہچانتے نہیں ہو، مگر میں تمہیں پہچانتا ہوں۔" وہ صرف اتنا بولا۔ اسی وقت کسی قیدی کی بیڑیاں کھنکنا اٹھیں اور وہ خاموش ہو گیا۔

"تم اتنا کس سے ڈر رہے ہو؟" جگت کو اس سے بوریت ہونے لگی۔ "اس وقت کیوں آئے ہو؟"

"کچھ باتیں کرنے۔"

"سالے! دن کو مجھ سے بولتے نہیں اور رات کو چپ چاپ باتیں کرنے آ جاتے ہیں۔"

"آہستہ بولو جگا!" اس نے پھر یاد دلایا۔ "تمہیں سب کچھ سمجھا رہا ہوں۔" جگت رک گیا۔ ہنس راج کہنے لگا۔ "تم ماجا ہو اسی طرح میں بھی ماجا ہوں۔ اس بیرک میں نصف قیدی مالوا ہیں۔" جگت سمجھ گیا۔ "تم سے بات کرنے کی سوپر صاحب نے ممانعت کر دی ہے۔ بہت بے رحم ہے مٹو۔" وہ کچھ دیر رک گیا۔ آس پاس دیکھ کر بولا۔ "دو دن سے میں تمہاری بے چینی دیکھ رہا ہوں۔ میں بھی اتنا ہی بے چین ہوں۔"

"کس لیے؟"

"فرار ہونے کے لیے۔" وہ سرگوشیانہ لہجے میں بولا۔ جگت کی آنکھیں جوش سے چمکنے لگیں۔ آخر اس جیسا اور کوئی بھی ہے۔ مگر جگا نے اس پر اعتماد کرنے میں جلدی نہیں کی۔

"کس جرم میں آئے ہو؟"

"قتل کے...... پھانسی ملی تھی مگر بچ گیا۔ اب بیس سال کی سزا بھگت رہا ہوں۔"

"کس کا قتل؟"

"دشمن کا...... زمین کے جھگڑے میں کلہاڑی سے سر پھاڑ دیا تھا۔" اس نے کہا۔

جگت کو اس سے دلچسپی ہو گئی۔ "کس طرح فرار ہونا ہے؟" جگت نے اسے ٹٹولا۔

"ابھی نہیں بتاؤں گا۔"

"اعتماد نہیں؟" جگت نے سختی سے پوچھا۔

"اگر ایسا ہوتا تو تم سے بات نہ کرتا۔ مسئلہ ابھی سوچنے کا ہے۔"

"پھر فرار ہو کر کہاں چھپا جائے یہ بھی سوچنا پڑے گا۔ گھر جانے سے تو محنت بیکار جائے گی۔" جگا نے کہا۔

"گھر تو جانا پڑے گا اسی لیے یہ سب کر رہا ہوں۔" ہنس راج بولا۔

"پھر ختم کرو...... سب سے پہلے تمہارے گھر پر ہی چیک کیا جائے گا۔"

"تب میں پولیس کے ہاتھ نہیں لگوں گا۔ البتہ دو لاشیں پولیس کو ضرور ملیں گی۔" جگت چونکا۔ آخری جملہ کہتے ہوئے ہنس راج کچھ جوش میں آ گیا تھا۔

"کس کی لاشیں؟" جگا نے پوچھا۔

"ایک میری بے وفا عورت کی، دوسری......"

"اس کے عاشق کی۔" جگت نے جملہ پورا کر دیا۔ مگر ہنس راج کو یہ جملہ کھٹک گیا۔

"عاشق نہیں شیطان کہو! میرے جیل میں آنے کے بعد اس بدذات نے غیر قانونی رشتہ کر لیا ہے۔"

"تمہیں کیسے پتہ چلا؟" جگا نے سوال کیا۔

"میرے ایک دوست نے بتایا۔ وہ بیچارہ چار مہینے کی سزا کاٹنے اندر آیا تھا۔" جگت نے آہ بھری اور ہنس راج آگے بولا۔ "اس کی تین ماہ کی سزا

ابھی باقی ہے۔ ممکن ہے ڈھائی مہینے میں رہا ہوجائے۔ پھر فرار کا وسیلہ ہوجائے گا۔"

"وہ وسیلہ پیدا کرسکے گا؟"

"بالکل...... وہ میرا جگری دوست ہے۔ میرے لیے جان قربان کردینے کو تیار ہے۔ ویسے تو ہم نہیں مل سکتے البتہ گنتی کے وقت سرگوشیاں کرلیتے ہیں۔"

"ڈھائی تین ماہ کی ابھی سے فکر کیوں کررہے ہو؟" جگا نے پوچھا۔

"فکر نہیں، ابھی سے منصوبہ تیار کررہا ہوں، تمہارا تو ساتھ رہے گا نا؟"

"اے...... کون باتیں کررہا ہے؟" بیرک کے دروازے کے قریب سے چوکیدار نے آواز دی۔

"سالو سوجاؤ۔" ہنس راج اور جگت چپ ہوگئے۔ پہلی ملاقات میں یہ گفتگو بہت تھی یہ سوچ کر ہنس راج کچھ دیر بعد سرک کر اپنی جگہ پہنچ گیا۔ جگت کو ہنس راج کی بات پر پکا یقین ہوگیا۔ انتقام لینے کے لیے آدمی ہر خطرے کا مقابلہ کرلیتا ہے اس کا خود اسے تجربہ تھا۔

صبح اٹھتے ہی جگت نے تو سو دو نمبر قیدی کو دیکھنے کے لیے نظریں گھمائیں، آنکھیں ایک چہرے پر جم گئیں۔ کیونکہ مخالف سمت سے اشارے میں جواب ملا تھا۔ جگت اسے دیکھنے لگا۔ اس چہرے پر ارادے کا یقین جھلک رہا تھا، پھر اس نے ہنس کر منہ پھیر لیا۔

O......❖......O

مگر دو تین ماہ تک وہ خاموش نہیں رہنا چاہتا تھا۔ وہ دوسرے قیدیوں پر مٹو کا رعب ختم کرنا چاہتا تھا۔ آہستہ آہستہ اس نے ماجا گروپ میں یہ بات پھیلادی کہ اگر ہم سب اتحاد کرلیں تو کوئی طاقت ہمیں دبا نہیں سکے گی۔ جگت کی بیرک میں بارہ مالوا قیدی تھے۔ جگت نے ان میں سے سات آٹھ کو ان کے گروپ کے قیدیوں میں بدلی مانگنے کے لیے سمجھادیا۔ اس طرح اس نے اپنی بیرک میں ماجا قیدیوں کی اکثریت جمع کرلی۔ اتنا عرصہ مٹو کی نظر میں نہ آنے کا اس نے پورا خیال رکھا تھا۔ جب اسے پتہ چلا کہ چار سو کے قریب ماجا قیدی اس کا ساتھ دینے کے لیے تیار ہیں تو اس نے مشورے شروع کردیے اور میٹنگیں کرنے لگا۔ صرف تنخواہ دار چوکیداروں سے جیل کا کام نہیں چلتا۔ قیدیوں سے بھی کچھ لوگ مختلف کاموں کے لیے پسند کیے جاتے ہیں۔ ان قیدیوں کو کافی چھوٹ دی جاتی ہے۔ اگر میٹ چاہے تو دوسرے قیدیوں کی غلطیوں کی جانب سے آنکھیں بند کرسکتا ہے۔ عہدے کے مطابق اس قیدی کے لباس پر سبز یا بھورے رنگ کی پٹی ہوتی ہے اس سے میٹ کا پتہ چلتا ہے۔ اب تک سوپر مٹو نے مالوا قیدیوں کو نوازا تھا لہٰذا ماجے دبے ہوئے رہتے تھے۔ جگت نے ان میں انتشار کی تحریک شروع کردی۔

"ہم سب کو اتحاد کرکے جب بڑے صاحب آئیں ان کے سامنے مطالبہ پیش کرنا ہے۔ مٹو کے خلاف فریاد کرنی ہے۔" جگت نے اپنے ساتھی ماجا قیدیوں کو سمجھایا۔

"جگت! مٹو کی کھلم کھلا مخالفت کرکے بازی بگڑ جائے گی۔" ہنس راج نے اسے خبردار کیا۔

"سر نہیں اٹھاؤ گے تو وہ لوگ سر کاٹ لینے تک سے باز نہیں آئیں گے۔" جگت پرجوش لہجے میں کہہ رہا تھا۔ "انگریز گئے مگر جیلیں اب بھی ویسی ہی ہیں۔ یہاں ہماری داد فریاد سننے والا کوئی نہیں ہے۔" پھر اس نے سب کو ہمت دی۔ "ایک

بار متحد ہو کر ہمت سے کام لو پھر دیکھو جو میں کہتا ہوں ویسا ہوتا ہے یا نہیں؟" جگا کی سوئی ہوئی بغاوت کی آگ کی گرمی سے سوپر مٹو گرم ہو گیا۔

"میں سمجھتا تھا کہ میرے ڈر سے ڈھیلا پڑ گیا ہے۔ اب مجھے اسے سیدھا کرنا پڑے گا۔"

ڈسٹرکٹ سوپر جیل کے معائنے کے لیے آنے والا تھا۔ پہلے دوسری جیلوں میں اس کے ظلم کے خلاف فریادیں ہوئی تھیں اس لیے یہاں بڑے صاحب کو اسے اپنی نرم دلی دکھانے کی ضرورت تھی۔ اس نے جگا سے نمٹنے کے لیے معائنے کے بعد سوچا تھا۔ مگر جگت نے بڑے صاحب کی ملاقات کے وقت بغاوت کا فیصلہ کر لیا۔

"بڑے صاحب کے آنے سے پہلے ہمارے مطالبات منظور ہونے چاہئیں۔ نہیں تو پھر مٹو سیدھا نہیں ہو گا۔"

"مگر اس کے لیے ہمیں کیا کرنا چاہیے؟" ہنس راج نے پوچھا۔

"اس کا راستہ میں نے سوچ لیا ہے۔" یہ کہہ کر جگت نے اس کے کان میں کچھ کہا جسے سن کر ہنس راج کی آنکھیں پھیل گئیں۔

"جگا! احتیاط کے ساتھ۔ مٹو بڑا خطرناک ہے۔ وہ بے رحم کوڑے لگوا کر قیدیوں کی چمڑی اتار لیتا ہے۔"

"ہنس راج! مجھے ہنٹروں کا ڈر نہیں ہے۔ تم سب کی بجائے یہ ظلم میں برداشت کر لوں گا۔ اگر تم لوگ ساتھ دیتے ہو تو میں تیار ہوں۔" ایک کے بعد ایک بیرک کے قیدیوں کے کان سے بات گزرنے لگی۔ مٹو کی دھاک سے دبا ہوا جوش جگت کی ہمت سے سر اٹھانے لگا۔ بڑے صاحب کے معائنے کو چار دن کی دیر تھی تو جگت نے ہنگامہ کھڑا کر دیا۔

صبح کے قیدیوں کو جیل کے کارخانے لے جانے کے لیے داروغہ بیرک میں آیا۔ تالا کھول کر دروازہ کھولنے لگا مگر تالا نہیں کھلا۔ داروغہ کی گرج سنائی دی۔ وہ سلاخ ہاتھوں میں ڈال کر اندر سے دروازہ کھولنا چاہتا تھا اسی لمحے جگت آگے بڑھا۔

"دروازہ نہیں کھلے گا...... پہلے سوپر سے کہو! ہمارے مطالبات منظور کرے۔" دوسرے قیدی بھی دروازے کے قریب جمع ہو گئے۔ داروغہ نے آنکھیں نکالیں مگر کسی پر اثر نہیں ہوا۔ قیدی دروازے کی سلاخیں تھامے کھڑے رہے۔

"میں ابھی سوپر صاحب کو اطلاع دیتا ہوں۔" اس نے دھمکی دی۔

"ہم بھی یہی کہتے ہیں۔ اپنے صاحب کو بلا لاؤ۔" وہ بڑبڑاتا ہوا چلا گیا۔

جگت نے سب کو خبردار کیا۔ "اب امتحان کا وقت آ گیا ہے۔ پیچھے نہیں ہٹنا۔"

"ہم تمہارے ساتھ ہیں جگا۔ آج پیچھے نہیں ہٹیں گے۔" سب بول اٹھے۔ دوسری بیرک کے قیدی بھی جوش میں پکار اٹھے۔ "مٹو مردہ باد۔" صورت حال کشیدہ ہو گئی۔

غصے میں بل کھاتا ہوا مٹو آ گیا۔ "کیا شور مچایا ہے؟ کون کام پر نہیں جانا چاہتا۔" اس نے چہرے پر غصہ لا کر کہا۔

"ہم سب لوگ۔" جگت نے جواب دیا۔ "جب تک ہمارے مطالبات منظور نہ ہوں، بیرک سے باہر نہیں آئیں گے۔"

"بھوکے پیاسے مر جاؤ گے۔" مٹو چیخا۔

"اس کی ذمے داری تم پر ہو گی۔" جگت نے فوراً جواب دیا۔ مٹو کا دماغ سنسانے لگا۔ مٹو مردہ باد کے نعرے سن کر اس کی آنکھوں میں خون اتر آیا۔

چوکیدار اور میٹ دھڑکتے دلوں سے یہ منظر دیکھ رہے تھے۔ مٹو جھکے گا نہیں یہ سب جانتے تھے۔

''لے آؤ نوک دار بانس اور گھسیڑ دوان کے پیٹ میں۔'' اس نے حکم دیا۔

چوکیدار دوڑے کہ اگر صاحب کا غصہ ان پر اترا تو مصیبت آ جائے گی۔ اس خوف سے سب بے قرار تھے۔ آٹھ دس چوکیدار نوکدار بانس لے آئے تو مٹو گرجا۔

''دروازے کے سامنے سے ہٹ جاؤ! ورنہ پیٹ پھٹ جائے گا اور بغاوت مہنگی پڑے گی۔'' جگت نے پھرتی سے سوچا' اس نے آہستہ سے ساتھیوں سے کہا۔

''گھبرانا نہیں۔ ہم ان کے بانس چھین لیں گے۔'' مٹو نے پھر وارننگ دی مگر کسی نے کان نہ دھرے۔ تب مٹو نے چوکیداروں کو اشارہ کیا۔

''آزماؤ اپنی طاقت۔'' چار پانچ بانس دروازے کی سلاخوں کے درمیان سے اندر داخل ہوئے۔ جگت نے با آواز بلند کہا۔ ''پکڑلو ان کے بانس۔'' پھر اس نے پہل کر کے دونوں ہاتھوں سے ایک بانس تھام لیا۔ ہنس راج اور دوسرے بھی ایک ایک بانس سے لپٹ گئے۔ چوکیداروں نے بانس واپس لینے کے لیے زور لگایا۔ سامنے دگنے زور سے بانس ایک جانب کھینچے جا رہے تھے۔ اب ایک ایک بانس سے تین تین چار چار قیدی چمٹ گئے۔ ایسا مٹو کے لیے خلاف توقع تھا۔ وہ کچھ کرے اس سے پہلے کے قیدیوں نے چوکیداروں کے ہاتھوں سے بانس چھین لیے۔ پہلی جیت پر سب مسرت کے جوش میں چیخنے لگے۔ اب قیدی بانس کی نوکیں چوکیداروں کی جانب دھکیل رہے تھے۔ ان کا جنون دیکھ کر مٹو پیچھے ہٹ گیا۔ بہت شور بلند ہوا۔ سو پر اپنی بے عزتی دیکھنے وہاں کھڑا نہیں رہ سکا۔ کچھ دیر بعد داروغہ دوڑتا ہوا بیرک کے قریب آیا۔

''صاحب تمہارے مطالبات پر سوچنے کے لیے راضی ہیں۔ انہوں نے تمہارے دو نمائندے آفس میں بلائے ہیں۔' قیدی خوشی سے چیخنے لگے۔

''جگا زندہ باد' ہماری لڑائی کامیاب رہی۔'' جگت اور ہنس راج بیرک سے باہر آئے۔

''تم لوگ ہمارے لوٹنے تک کام پر نہیں جاؤ گے۔ بانس واپس نہ دینا نہ ہی باہر آنا۔'' پھر مزید بولا۔ ''ممکن ہے یہ سوپر کی چال بازی ہو۔'' سب نے یقین دلایا کہ آخر تک لڑیں گے۔

جگت کا اندازہ سچ ثابت ہوا۔ اسے اور ہنس راج کو سیل میں دھکیل دیا گیا۔

''اب سب کے درمیان غلط رویے کی معافی مانگو! ورنہ ہنٹر مارے جائیں گے۔''

''ہم سب برداشت کرنے کو تیار ہیں بے ایمان۔'' جگت نے دانت پیس لیے۔ ''تم سے جو ہو وہ کرلو۔'' سو پر مٹو یہ جواب برداشت نہیں کر سکا۔ اس نے دوسرے قیدیوں کو للچایا' دھمکایا مگر کوئی نرم پڑنے پر تیار نہیں تھا۔ دو تین دن ضد میں نکل گئے۔ یہاں تک کہ بڑے صاحب کی ملاقات کا وقت آ گیا۔ آخر مٹو نے راستہ نکالا۔ اس نے جگا کو سیل سے نکال کر فوراً انبالہ ٹرانسفر کر دیا اور ہنس راج کو پھر بیرک میں بھیج دیا۔ روانگی کے وقت جگا سے بولا۔

''اس بغاوت کا حساب صاف کرنے تمہیں پھر واپس آنا پڑے گا۔ یہ یاد رکھنا۔''

''تب دیکھا جائے گا......'' جگت نے ہنس کر جواب دیا۔ ''کل کی کسے خبر ہے؟'' ہنس راج نے

اپنے آدمی کے ذریعے پیغام بھیجا۔

''جلدی آنا! تب تک اپنا پلان ملتوی کرتا ہوں۔''

مگر قدرت کے راز کوئی نہیں جانتا۔ جگت کو جہاں بھی ٹرانسفر کیا گیا' وہاں کے جیل والوں کے لیے وہ دردسر بن گیا۔ وہ جیل کے قانون کی پروا نہیں کرتا تھا نہ دھمکی سے ڈرتا۔ ظلم ہنستے ہوئے برداشت کرلیتا۔ ''اس قیدی کی وجہ سے دوسرے قیدی بھی بگڑ رہے ہیں۔'' یہ سبب بتا کر جیل کے حکام اس دردسر کو ٹرانسفر کردیتے تھے۔ سزا بھگتنے کے باوجود سزا کم نہیں ہوئی تھی۔ ایک جیل میں دو تین ماہ رہ کر جاتا اس کے مقابلے میں چھ سے آٹھ ماہ سزا بڑھ جاتی۔ قانون کی خلاف ورزی اور انتشار پھیلانے کے جرم میں سزا اور بڑھ جاتی۔ انبالہ والوں نے جگت کو رہتک جیل میں دھکیل دیا۔

''ہندوستان کی کوئی جیل دیکھے بغیر نہیں رہنا۔ جیل کی مسافرت جاری رہے گی۔ شاید جیلیں کم پڑجائیں' مگر سزا کم نہیں ہوگی۔'' جگت بار بار ہنس کر کہتا تھا۔ تین ماہ میں رہتک والے بھی پریشان ہوگئے اور اسے جالندھر بھیجنے کے متعلق سوچ رہے تھے کہ فیروز پور سے سوپر مٹو کا پیغام ملا۔ ''جگا کو یہاں بھیجو میں ریٹائر ہونے سے پہلے اسے سیدھا کرنا چاہتا ہوں۔''

فیروز پور جیل میں قدم رکھتے ہی دو خطرناک دشمنوں کی نظریں ٹکرائیں۔ سوپر مٹو کی آنکھوں سے شعلے برسنے لگے۔ جگت نے دانت پیس کر اس کا جواب دیا۔

''اسے سیل میں لے جاؤ۔'' سوپر نے حکم دیا۔

''سیل میں نہیں جاؤں گا۔ میں پھانسی کا قیدی نہیں ہوں۔ مجھے بیرک ملنی چاہیے۔'' جگت نے جواب دیا۔

''مجھے قانون سکھا رہا ہے؟'' مٹو گرجا۔ چوکیداروں کو بھی ڈانٹا۔ ''میرا منہ کیا دیکھ رہے ہو؟ زبردستی اسے سیل میں دھکیل دو۔''

''تیرے باپ کا راج چلتا ہے؟'' جگت تو تڑاک پر اتر آیا۔ ''دیکھتا ہوں مجھے سیل میں کون لے جاتا ہے۔'' دو چوکیدار اس کے بازو تھام کر زبردستی لے جانے لگے۔ جگت نے نہ جانے کے لیے زور آزمایا۔ دو قدم آگے جاتے ہی تین قدم پیچھے ہٹ جاتا۔

''سالے کو ہاتھ پیروں پر لٹکا کر لے جاؤ۔'' سوپر نے غصے میں بل کھا کر کہا۔ دوسرے دو چوکیدار مدد کے لیے آگئے پھر بھی جگت کو اٹھا کر لے جانا مشکل تھا۔ تب ہاتھ پھیر کھینچ کر گھسیٹنے لگے۔ حلق پھاڑ کر گالیاں بکتے ہوئے جگت نے جیل میں شور مچا رکھا تھا۔ قیدی سمجھ گئے کہ جگا آگیا ہے۔ اسے گھسیٹتے ہوئے چوکیدار میدان پار کر گئے۔ سیل کا دروازہ بھی کھل گیا۔ جگت نے آخری زور آزمایا پھر تھامنے والے چوکیدار کے پیٹ میں اس نے لات ماری۔ وہ بیچارہ چار چھ قدم دور جا کر دیوار سے ٹکرایا اور پیٹ تھام کر بیٹھ گیا۔ اس کے منہ سے جھاگ بہنے لگا۔ اس کی حالت دیکھ کر پیر تھامنے والا دوسرا چوکیدار دس گز دور بھاگ گیا۔ سوپر دوڑتا ہوا آیا۔ اس نے سب سے پہلے چوکیدار کو اٹھوا کر اسپتال بھجوایا' پھر جگت کی باری آئی۔

''اچھی بات ہے...... تم سیل میں نہیں جانا چاہتے۔ ٹھیک ہے۔ جمال کو بلاؤ پہلے اس کی کھال اتاروں گا۔'' ہنٹر مارنے والے جمال کا نام سن کر قیدی لرزنے لگا۔ اس سے قصائی اچھا۔ وہ ہنٹر مارتا تو سات پشتیں یاد کرادیتا تھا۔ بڑی مشکل سے جگت کو فولادی کھمبے سے جکڑ دیا گیا۔ اسی لمحے

جمال آ گیا۔ محی الدین جیسا بھیانک نہ ہونے کے باوجود وہ طاقتور تھا۔

''جمال ہر بات تمہیں نصف بکرا ملتا ہے کھانے کو۔ آج پورا بکرا بخش دوں گا۔'' سوپر مٹو نے اسے لالچ دیا۔ مگر اس کا پانی اتارنا ہے۔''

بکرے کا نام سن کر جمال ہونٹوں پر زبان پھیرنے لگا۔ ''صاحب! اسے پورا خشک کردوں گا۔ یہ بھی یاد کرے گا۔'' پھر جگت کے مضبوط جسم کو باریکی سے دیکھنے لگا۔ ''صاحب! اسے تیس ہنٹر کم رہیں گے۔''

''تمہاری طاقت کہاں تک ہے؟''

''صاحب! سو کا ہندسہ اچھا رہے گا۔'' جمال خونی انداز میں مسکرایا۔ ''پوری ورزش ملے تو پورا بکرا کھانے کا مزہ بھی آ جائے گا۔''

''شاباش! تیس ہنٹروں کی سزا ہے مگر تین بار کی ضرب ایک ہی گنی جائے گی۔''

جگت کے بال کھڑے ہو گئے۔ ''بیوقوف! تم بھی جیل کے قانون کا احترام نہیں کرتے۔ اس سے پہلے کہ وہ جملہ پورا کرے جمال کے ہاتھ چلنے لگے۔ کھلی پشت پر ہنٹر لگنے شروع ہوئے۔ پانچویں ضرب پر جلد پھٹ گئی۔ زخم گہرا ہوتا گیا۔ خون بہنے لگا اور تیس ہنٹر پورے پڑنے پر گوشت کے لوتھڑے باہر آ گئے۔ گوشت دیکھ کر جمال کو بکرا یاد آ گیا۔ وہ پورے جنون سے ہنٹر مارنے لگا۔ ماجا کا ہر قیدی ہنٹر گن رہا تھا۔ تیس ہنٹر پورے ہونے کے بعد بھی آواز سنائی دیتی رہی تو سب بے چین ہو گئے۔

''سالا مٹو جگت کو ختم کردے گا' بے رحم۔'' ساٹھ ہنٹروں پر قیدیوں کی آنکھیں بہنے لگیں۔ کئی تو دیوار سے سر ٹکرانے لگے۔ ''گرو گوبند! اس مٹو کو جہنم کی سزا دے۔'' جگت گرو گوبند کا نام دہراتا بے ہوش ہونے لگا۔ ایک بار تو اسے خیال آتا کہ یہ ظلم برداشت نہیں ہوتا کہہ دوں کہ سیل میں جاؤں گا مگر پھر خون اتر آتا۔ ''چاہے جان سے مار دے...... جسم کے چیتھڑے اتار دے مگر اس نالائق کے سامنے سر نہیں جھکاؤں گا۔'' ستر کے قریب ہنٹروں پر تو خود جمال ہانپ گیا۔ اس میں آخری تیس ہنٹر مارنے کی قوت نہیں تھی پھر بھی پورا بکرا کھانے کے لالچ میں اس نے ہنٹر مارنا جاری رکھے۔ اس وقت تک کہ جگا بے ہوش ہو چکا تھا۔ نوے ہنٹر پر جمال کو چکر آ گئے اور وہ بھی زمین پر گر پڑا۔ ادھ موئے جگت کو جیل کے دواخانے بھیجا گیا۔ وہاں اس کی حالت دیکھ کر ڈاکٹر بھی لرز گیا اور اس کی نبض دیکھ کر بڑبڑایا۔

''اس سے تو کوئی مردہ لانا بہتر ہے۔''

O......❖......O

ڈاکٹر کو موت کا سرٹیفیکیٹ نہیں دینا پڑا۔ کیونکہ قدرت کو یہ منظور نہیں تھا۔ پانچویں دن جگت پوری طرح ہوش میں آ گیا۔ ڈاکٹر کو اطمینان ہوا۔

''بھگوان نے تمہیں بچالیا ورنہ سوپر تم کو ہلاک کرچکا تھا۔'' ڈاکٹر کے چہرے پر ہمدردی دیکھ کر جگت بمشکل اتنا بول سکا۔

''وہ میری سزا بڑھا سکتا ہے زندگی کم نہیں کرسکتا۔''

پندرھویں دن جگت کو ڈاکٹر نے خبر دی۔ ''تمہاری وجہ سے مٹو صاحب کو جلدی ریٹائر ہونا پڑے گا۔ اب ایک ہفتے کا مہمان ہے۔ جالندھر سے مہتا سوپر چارج لینے آ رہا ہے۔''

''مٹو یا مہتا میرے لیے سب برابر ہیں۔'' جگت کا جوش ذرا بھی کم نہیں ہوا تھا۔ ''یا تو میری بدلی کرنی پڑے گی یا پھر اسے یہاں سے جانا پڑے گا۔''

''اس طرح تم کبھی مارے جاؤ گے۔'' ڈاکٹر نے اسے ڈانٹ دیا۔
''مگر جی کر کرنا بھی کیا ہے؟''
سولہویں دن سوپر منٹو آ گیا خبر لینے کے لیے۔
''ڈاکٹر! آج چھٹی دے رہے ہو؟''
''کچھ دن رک جاؤ پھر ٹھیک رہے گا۔ ابھی اس کے جسم میں پوری قوت نہیں آئی ہے۔''
''اس سے پہلے کہ نئے سوپر آئیں مجھے اسے سیل میں دھکیل دینا ہے۔ اس میں طاقت نہیں یہی بہتر ہے۔''
''جیسی آپ کی مرضی۔'' ڈاکٹر نے ضد نہ کی۔ جگت کو اسٹریچر پر ڈال کر اسپتال سے لے جایا گیا۔ سیل کا دروازہ کھلا تو جگت نے بہت شور مچایا۔
''میں اندر نہیں جاؤں گا۔ مجھے بیرک میں رکھو۔'' سوپر کا اندازہ ٹھیک تھا۔ جگا میں مقابلہ کرنے کی طاقت نہیں تھی۔ پندرہ دن کے بعد جگت کو دیکھنے والے چوکیدار یا قیدی بھی پہلی نظر میں اسے پہچان نہیں سکے۔ چار آدمیوں نے اسے پکڑ کر سیل میں دھکیل دیا۔ کھڑے ہونے کی طاقت نہ ہونے کے باوجود سلاخیں تھام کر جگت نے بند ہوتے ہوئے دروازے کے عقب میں کھڑے ہوئے سوپر منٹو کو گھورا۔
''تمہاری دادا گیری کا جواب تمہیں مل جائے گا۔''
سوپر منٹو فتح مندانہ مسکراتا ہوا چلا گیا۔ شام تک جیل میں یہ بات پھیل گئی کہ جگا نے بھوک ہڑتال کردی ہے۔ سوپر منٹو نے بات ہنس کر ٹال دی۔ ''یہ ڈاکو بھی گاندھی جی کی نقل کر رہا ہے۔ اچھا ہے بھوکا مرنے دو۔'' مگر اڑتالیس گھنٹے کے بعد سوپر گھبرا گیا۔
''سالا بڑا ضدی ہے۔ مر گیا تو آفت مجھ پر آ جائے گی۔'' ربر کی نلی سے زبردستی کچھ پلانے میں بھی کامیابی نہ ہوئی۔ جگا صرف ایک بات کر رہا تھا۔ ''میں سیل میں نہیں رہوں گا۔''
سوپر سوچ میں پڑ گیا۔ آج تک کبھی اس نے قیدیوں کے سامنے سر نہیں جھکایا تھا۔ اب جاتے ہوئے ہار قبول کرنی پڑے گی۔ اس سے پہلے کہ نئے سوپر چارج لیں اسے فیصلہ کرنا تھا۔ تیسرے دن اس نے جگت کے گھر تار بھیجا۔ ''جگا کی ماں اور بیوی کو لے کر جلدی آؤ! وہ بھوک ہڑتال پر ہے اور اس کی حالت خراب ہے۔'' تار دیکھ کر بخار میں پڑے ہوئے سوہن سنگھ گھبرا گئے۔ تار کس کا آیا؟ کیا بات ہے؟ تار پڑھنے کے لیے گاؤں سے ایک پڑھے لکھے نوجوان کو لے آئے۔ اس وقت تک چندن کور اور ماں جی کا دل گھبرا گیا تھا۔ ماں جی بڑبڑائیں۔
''کیا وہ جیل سے فرار ہو گیا ہے؟'' چندن کور نے سوا دو سال کے بچے کو سینے سے لگا لیا۔
''بھگوان ان کی حفاظت کرنا۔'' بھوک ہڑتال اور خراب حالت یہ دو الفاظ دونوں عورتوں کے دل کو پھیرنے کے لیے کافی تھے۔ سوہن سنگھ بھیگی آنکھوں سے اس طرح بڑبڑانے لگے جیسے آنکھوں سے دور بیٹے کو ڈانٹ رہے ہوں۔
''کیوں دکھی ہو رہا ہے...... ساتھ ہی سب کو دکھ پہنچا رہا ہے۔''

(باقی ان شاء اللہ آئندہ ماہ)